اسالیب
ترتیب
عنبرین حسیب عنبر

بسم الله الرحمن الرحیم

اسالیب کراچی

سرپرست

پروفیسر سحر انصاری

ترتیب

عنبریں حسیب عنبر

اسالیب پبلی کیشنز

اسالیب–۵

کتابی سلسلہ (سال نامہ جلد دوم)

جولائی ۲۰۱۱ء– دسمبر ۲۰۱۲ء

قانونی مشیر: خالد داؤد پوتہ

سرورق: عرفان خان

ترتیب

عنبریں حسیب عنبر

قیمت مکمل سیٹ: ۲۰۰۰ روپے (پاکستان میں)

۱۰۰ امریکی ڈالر (بیرون ملک)

رابطہ:

C-147، بلاک J

نارتھ ناظم آباد

کراچی۔ 74700

فون: 0333-2140977

ای میل: asaleebkarachi@hotmail.com

فہرست

اداریہ

نعت

افسانے

سفرنامہ

شاعری

تراجم

فلم، ٹی وی، موسیقی، اداکاری

رضیہ فصیح احمد — مطالعے کے چند پہلو

خصوصی مطالعہ

کتابوں پر تبصرے

خطوط

○○○

(اداریہ)

پیش آہنگ

سالِ نو کی آمد آمد ہے۔ اکیس ویں صدی کا سفر جاری ہے اور بعض معاملات میں اس سفر کے دوران جو غیر معمولی واقعات و تجربات منظر نامے پر اُجاگر ہو رہے ہیں، وہ گزشتہ صدی کے مقابلے میں کہیں زیادہ زود رفتار اور حیرت ناک بلکہ بسا اوقات عبرت ناک بھی محسوس ہوتے ہیں۔ میتھیو آرنلڈ نے اپنے زمانے کے معاشرے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک تہذیب ختم ہو رہی ہے اور دوسری ابھی پوری طرح نمایاں نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں بھی یہ عمل کچھ محسوس اور کچھ غیر محسوس طریقے سے نمایاں ہو رہا ہے۔ اس وقت پاکستانی معاشرے کو دو تناظر میں دیکھا جا رہا ہے، ایک کا رُخ انتہائی قدامت کی طرف ہے جب کہ دوسرا رُخ جدت طرازی اور نادرہ کاری، نئے تجربات اور نئی فتوحات کی طرف مائل ہے۔ قدامت کی بات پر ہم زیادہ توجہ صرف نہیں کریں گے کیوں کہ اُس کا معاشرے میں پایا جانا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے۔ البتہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کو کسی ایک رُخ سے دیکھ کر مختلف شعبوں میں ہونے والی پیش رفت کا اندازہ اضطراری یا ہنگامی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے قدیم و جدید علوم اور علم و آگہی کے نئے دریچے وا کرنے ہوں گے۔ مثلاً اس وقت پاکستان کی آبادی تقریباً اٹھارہ کروڑ ہے، اس میں نصف سے زائد خواتین کی تعداد ہے۔ اسی طرح اٹھارہ سے تیس سال تک کی عمر کے افراد کُل آبادی کا ساٹھ فی صد ہیں، گویا عرفِ عام میں آبادی کے اس حصے کو ہم پاکستان کی نئی پود سے تعبیر کر سکتے ہیں، اس نئی پود کی ذہنی تربیت اور پرورش و پرداخت جس ماحول میں ہو رہی ہے، وہ اس سے پہلے کی نسلوں کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ یعنی ترسیل و ابلاغ کے نئے ذرائع، جن میں سیارہ جاتی مواصلات، کمپیوٹر،

انٹرنیٹ بھی شامل ہیں، اس سے پہلے کی نسلوں کے لیے ایک طلسمِ ہوش رُبا کے سوا کچھ نہ تھے۔ آج موبائل فون کی فروخت اور استعمال پر نگاہ ڈالیے تو لگتا ہے کہ آنکھ، ناک، کان کی طرح یہ بھی انسانی جسم کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک کون سا فرد ہے جو اس کا اور کیلکولیٹر جیسی مشینوں کا عادی نہیں بنتا جا رہا ہے۔ پھر خواتین جس طرح غیر روایتی شعبوں میں اپنی مہارتوں کا ثبوت دے رہی ہیں اور نام پیدا کر رہی ہیں، وہ بھی ہر لحاظ سے دیدنی و گفتنی ہے۔ خلابازی، ہوابازی، فوجی ذمے داریاں، طب اور سائنس کے نئے نئے میدانوں میں تحقیق کی مثالیں، فلم سازی، موسیقی، اداکاری، مختلف کھیلوں میں عالمی سطح کی نمائندگی اور کامیابیں، پھر درس و تدریس، ذرائع ابلاغ سے وابستگی، تصنیف، تالیف اور تخلیق کے نئے نئے تجربے دنیا کے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت، کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت، عدالت، حکومت اور سیاست میں بھرپور شرکت اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی جدوجہد یہ چند ایسے مناظر ہیں جن کو دائرۂ تحقیق میں لائے اور سائنسی مطالعے کے بغیر پاکستانی معاشرے کے حال اور مستقبل کے بارے میں کسی حقیقت آمیز اور خوش آئند مستقبل کا تصور بھی کرنا محال ہوگا۔

اس صورتِ حال کو جب ہم دیگر حقائق کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کی اس نئی تشکیل میں حصہ لینے والوں کے لیے ماحول بہت سازگار نہیں ہے۔ مختلف قسم کی سختیاں، دہشت گردیاں اور تباہ کاریاں اگرچہ پورے معاشرے کو اپنے شکنجے میں لیے ہوئے ہیں لیکن نژادِ نو پر اس صورتِ حال کے منفی اثرات زیادہ مرتب ہو رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بقولِ فیض:

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

سائنس کا طبیعیاتی اصول ہے کہ کسی بھی جسم کی رفتار کے لیے ایک نوع کی مزاحمت یا Fraction ضروری ہے۔ لہٰذا صادق حسین صادق کا یہ شعر ہم دُہرا دیں گے جسے اُس کے اسلوب کی بنا پر ہمیشہ علامہ اقبال کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے:

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

اب ظاہر ہے کہ تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دیا جا سکتا۔ علم و آگہی، تہذیب و شائستگی کا درس یہی ہے کہ اپنے حصے کی شمع جلاتے جائیں اور اندھیرے کی مذمت کرنی چھوڑ دیں، کیوں کہ اس میں ایک نیک کام کے لیے وقت صرف کرنے کے بجائے شب و روز کا زیاں ہی ہو جائے گا۔

پاکستان اقوامِ عالم میں کوئی جزیرہ نہیں ہے، عالمی سطح پر جو تحریکیں، فیصلے، فلسفے اور آئینِ جہاں بانی کے زاویے وضع کیے جاتے ہیں، اُن سے پاکستان بھی براہِ راست متاثر ہوتا ہے، ویسے بھی ہماری ذہنی اور مادّی ضرورتوں کو اس طرح دوسروں کا دستِ نگر بنا دیا گیا ہے کہ ہم عقل و عمل دونوں شعبوں میں صرف صارفین (Consumers) بنتے جا رہے ہیں۔ ہماری اپنی ایجاد و اختراع کی مثالیں ابھی طلوعِ آفتاب سے نہیں بلکہ اندھیری رات میں چمکنے والے چند جگنوؤں سے مماثلت رکھتی ہیں لیکن یہ روشنی کی چنگاریاں بھی ایک نہ ایک دن شعلۂ جوالہ بن سکیں گی کیوں کہ:

کم سے کم انسان نے خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک، اُدھر دیکھا تو ہے

جب کبھی مایوسی کے بادل منڈلانے لگتے ہیں تو یہی احساس روشنی کی کرن بن جاتا ہے کہ ہمیں بھی آگ کو گلزار بنا کر ایک مثال قائم کرنی چاہیے۔

پاکستان کی اس سماجی، سیاسی اور تہذیبی دھوپ چھاؤں میں زندگی بسر کرتے ہوئے یہی خیالات حقائق کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ہم شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں سے اسی لیے اپنا اور آپ کا رشتہ استوار رکھنا چاہتے ہیں کہ اگر اس وقت زندگی زہر ہے تو اس کا تریاق بھی ہمیں کو تیار کرنا ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم بے حسی، لاتعلقی اور بے عملی کی زندگی کو ترک کر کے اس مثالی جدوجہد میں شامل ہو جائیں جس کا ابھی کوئی نام، کوئی مقام، کوئی پرچم اور کوئی نشان نہیں اور جسے ہم صداقتِ اصل تک پہنچنے کی ایک خواہش ہی کا نام دے سکتے ہیں۔

قارئینِ اسالیب کو نیا سال مبارک۔

عنبریں حسیب عنبر

نعت

نعت

شبنم شکیل

میرے آقاؐ
سب کے آقاؐ
حشر کے دن جب گنہ گاروں کی اک لمبی قطار
ہاتھ میں اعمال نامے اپنے اپنے تھام کے
آپؐ کی چشمِ کرم کی منتظر ہوگی کھڑی
اک بھکارن سب سے آخر میں کہیں ہوگی وہاں
اس کی قسمت نے اگر کی یاوری تو آپؐ کو
وہ بھی آئے گی نظر ان سب گنہ گاروں کے بعد
ایک میلی اوڑھنی میں منہ چھپائے سر جھکائے
چپکے چپکے آہیں بھرتی اشک برساتی ہوئی
اوڑھنی پر اس کی لاکھوں داغ بھی ہوں گے ضرور
فرد بھی اس کے گناہوں کی بہت ہوگی طویل
نیکیاں دامن میں اس کے ہوں گی تو لیکن قلیل
آپؐ کا رحم و کرم ہی ہوگا بس اس کا وکیل
میرے آقاؐ

سب کے آقاؐ

ربِّ عالم کی طرح سے مہرباں ہیں آپؐ بھی
آپؐ بھی اس کی طرح بخشندۂ تقصیر ہیں
اور لقب بھی آپؐ کا ہے رحمت للعالمیں
آپؐ محبوبِ خدا ہیں اس میں کوئی شک نہیں
آپؐ ہی کی ذات تو ہے شافعِ یومِ حساب
اور وہ ادنیٰ بھکارن آپؐ ہی کی اُمتی
بھیک بخشش کی خدارا دیجیے گا اس کو بھی
میرے آقاؐ وہ بھی اک کشکول لے کے آئے گی

○○○

شبنم شکیل

وِرد ہر دم ہے یارسول اللہؐ
ذکرِ پیہم ہے یارسول اللہؐ
آپؐ کی یاد زخمِ جاں کے لیے
ایک مرہم ہے یارسول اللہؐ
آپؐ کے ذکر سے دلِ بے تاب
خوش و خرم ہے یارسول اللہؐ
آپؐ کے نام اور شفاعت میں
ربطِ باہم ہے یارسول اللہؐ
آپؐ اگر مہرباں نہ ہوں تو مرا
کون ہمدم ہے یارسول اللہؐ
میں نے دیکھی ہے ماہیِ بے آب
میرا عالم ہے یارسول اللہؐ
آپؐ کی مدح کے لیے یہ ایک
زندگی کم ہے یارسول اللہؐ
سرِ تعظیم آپؐ کے در پر
ہر گھڑی خم ہے یارسول اللہؐ
دشتِ بطحا کے ذرّے ذرّے میں
چشمِ شبنم ہے یارسول اللہؐ

○○○

ماجد خلیل

وحیِ حق طاقتِ دل مشغلۂ لب الہام
میرے آقاؐ نے جو ارشاد کیا سب الہام

نفسِ امّارہ بھلا کیا ہے، فقط ننگِ وجود
مطمئن قلب کا ہے جامۂ انسب الہام

خیرِ مطلق ہے پسِ پیرویِ خُلقِ عظیم
عرصۂ فکرِ ثنا میں ہُوا اک شب الہام

خدمتِ نعت کی نسبت سے عطا کرتا ہے
میرے سرکارؐ کا ممدوح، مرا رب الہام

صورتِ نعت سجایا اسے نجماً نجماً
میں نے ہوتے ہوئے محسوس کیا جب الہام

اس میں ہوتا ہے سدا رمزِ فلاحِ دارین
کبھی ہوتا نہیں بے مقصد و مطلب الہام

ماجدؔ ایماں کی روایاتِ مصدّق ہیں گواہ
قلبِ پُرجہل کو ہوتا نہیں طیّب الہام

○○○

ماجد خلیل

چند فی صد ہوسکی تسخیر شاید کائنات
اور مرے دل میں بسا ہے حاصلِ صد کائنات

اُس نظر کی دسترس ہے جنت الفردوس تک
ہوچکا ہے جس نظر کی سبز گنبد کائنات

دفترِ عرشِ علیٰ میں ہو رہے ہیں درجہ بند
کر رہا ہے جذب جن بوسوں کی اسود، کائنات

ہے بیاں تیرا یکِ از فخرِ اسلامی ادب
تیرے گھر آئی تھی چل کر امِّ معبد کائنات

ایک گھر اللہ کا، اک در رسول اللہؐ کا
حاضر آتی ہے جہاں از شوقِ بے حد کائنات

روز افزوں ہے جو آثارِ قیامت کا ظہور
ہے قریب الختم تیری عمر شاید کائنات

آخرش دینِ محمدؐ مصطفیٰ رہ جائے گا
خود کرے گی باقی سب ادیان کا رد کائنات

اور یہ ربِّ محمدؐ کی عطائے خاص ہے
ہم فقیروں کی ہے جو عشقِ محمدؐ کائنات

صاحبِ معراج، امام الانبیا، محبوبِ رب
انؐ کے تو نعلین کی ماجد ہے مسند کائنات

○○○

سلیم کوثر

دلوں میں جن کے بسی ہو فضا مدینے کی
وہ حاضری میں رہیں گے سدا مدینے کی

درود پڑھتے ہوئے دھڑکنوں کی رِم جھم میں
مہک رہی ہے لبوں پر دُعا مدینے کی

گزر رہا ہوں میں ہجرت کے بابِ سیرت سے
سو ہر گلی ہے اک حیرت سرا مدینے کی

حضورؐ آپ کی تشریف آوری کے لیے
حرم سے نکلی ہے راہِ وفا مدینے کی

یہاں سلیقۂ آدابِ گفتگو ہے الگ
کہ خامشی ہے سخن آشنا مدینے کی

طواف کرتے ہوئے دیکھ صحنِ کعبہ میں
کہ خوش روی میں ہے یکتا صبا مدینے کی

تمھیں خبر ہی نہیں ہے مرے مسیحاؤ
مرا علاج ہے آب و ہوا مدینے کی

چنا گیا ہوں ثناخوانِ مصطفیٰؐ میں بھی
عطا ہوئی ہے مجھے بھی قبا مدینے کی

بدن سے روح تلک زخم بھر گئے ہیں سلیم
عجیب خاک ہے خاکِ شفا مدینے کی

○○○

شہاب صفدر

اس واسطے دل نے برائے نعت لکھا دل کشی!
حرفِ تکلّم، چاشنی، اسلوب و لہجہ دل کشی
سنتا رہوں جب تک شگفتِ گل سے وِرد اُس نام کا!
چُنتی رہے سانسوں کی مالن غنچہ غنچہ دل کشی
رنگوں اُمنگوں میں ہے جس الہام سے پیدا کشش
سازوں ریاضوں میں اثر اُس کا سراپا دل کشی
ہوتی نہ وہ تصویر تو رہتا مصوّر بے نشاں
پاتا نہ فنِ اظہار تو کیا دلبری کیا دل کشی
آئینۂ اجمال میں عکسِ جمالیں دیکھ کر
وجدان بولا روشنی، احساس بولا دل کشی
یہ گھٹتا بڑھتا چاند کیا پائے گا اُس کی گرد کو
بڑھتی گئی جس بدر کی حلقہ بہ حلقہ دل کشی
یوں اُنؐ کے قدموں کے اُجالے باغبانی کر گئے!
ویرانیاں شاداب ہیں در دشت و صحرا دل کشی
ہر مرحلہ بہرِ قلم دل کش تھا خوشبو کا سفر!

اک پھول کے مضموں کا یوں عنوان ٹھہرا دل کشی
آغاز سے انجام تک ہوتی ہے بارش نور کی!
صبحوں سے بھی رکھتی ہے بڑھ کر لیلِ اسریٰ دل کشی
اخلاص کے آئین میں، یٰسین میں والتّین میں
مفہوم سچے دین میں ہے سادگی کا دل کشی
سارے شہابِ اہلِ سِیَر، اہلِ یقیں اہلِ نظر
ہیں متفق اس بات پر دلبر کا حلیہ دل کشی☆

○○○

☆ دل کشی ردیف پر ہونے والے نعتیہ مشاعرے کے لیے لکھی گئی
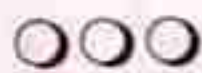
افسانے

تسلیم و رضا

اقبال مجید

رحمت اللہ سے متعلق پہلی شکایت مفتی غلام محمد کے پاس یہ آئی کہ وہ مولوی احمد علی نانوتوی کا اس بات پر مذاق اُڑاتا ہے کہ سبز رنگ کا جوتا یا چپل اس لیے نہیں پہننا چاہیے کہ سرورِ کائنات کے گنبدِ خضرا کا رنگ سبز ہے۔ رحمت کا کہنا تھا کہ حضورﷺ کی پہچان ہرے، لال، پیلے رنگ سے نہیں، اُن کے کردار اور عمل سے ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں دوسری شکایت یہ آئی کہ مدرسے کے بزرگ معلم کے کتابچے کا رحمت ہر وقت مذاق اُڑاتا ہے جس میں لڑکیوں کو یہ کہہ کر ڈرایا گیا تھا کہ اگر وہ ٹی وی دیکھیں گی تو اُن کی لاش کو قبر اس وقت تک قبول نہیں کرے گی جب تک لاش کے ساتھ ٹی وی بھی نہیں دفنایا جائے گا۔ اس شکایت کو ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ اگلی شکایت نے مفتی غلام محمد کو خاصا فکرمند کر دیا۔ شکایت یہ تھی کہ نماز کی صف میں جب رحمت اللہ کھڑا ہوتا ہے تو پاس والے نمازی کو اُس کے منہ سے بو آتی محسوس ہوتی ہے، اور یہ جان کر ہی مولوی احمد علی نانوتوی نے مدرسے کی مسجد میں جمعے کے خطبے میں قرآن شریف کا یہ حکم نمازیوں کو یاد دلایا تھا کہ نہ جاؤ نماز کے قریب جب تم نشے میں ہو۔

مدرسے کے امیر مفتی غلام محمد کو ان خبروں میں رحمت اللہ کے خلاف سر اٹھانے والی سازشوں کی بو اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ وہ مدرسے کے ایسے سربراہ تھے جو اندر کی چھچھوری سیاست پر نظر رکھے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ایک شام بعد نمازِ مغرب امیر کے دفتر میں لمبے چوڑے اور گورے چٹے رحمت اللہ کی طلبی ہوئی۔ پوچھا گیا:

''تم نے سبز رنگ کا جوتا نہ پہننے پر احمد علی نانوتوی صاحب کا مذاق اُڑایا؟''

''جی ہاں، وہ حماقت بھرے وعظ دیتے ہیں۔''

''تم نے مولوی محمد حسین کے کتابچے کا مذاق اُڑایا کہ وہ ٹی وی کو لے کر جہالت کی باتیں کرتے ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''اب یہ خبر گشت کر رہی ہے کہ...''

''میرے منہ سے بو آتی ہے۔ شراب کی بو، یہ میرے خلاف سازش ہے۔''

''اگر تم بغیر سوچے سمجھے کچھ بھی بولتے رہے تو ایک دن تمھارے کمرے سے شراب کی بوتل نکلے گی۔ تم جا سکتے ہو۔''

رحمت اللہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خاموشی سے چلا آیا۔

صبح وضو کے لیے لق و دق صحن کے حوض کی منڈیر پر بیٹھا تو اُس حوض کو غور سے دیکھتا رہا جس میں پانچ وقت باجماعت وضو کیا جاتا تھا۔ یہ حوض کئی بار رحمت اللہ کو یہ احساس دلا چکا تھا کہ وہ صرف مسلمان ہے اور باقی لوگ انسان۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ وضو کرتے کرتے رحمت اللہ کو یاد آیا کہ اس کے کاشت کار باپ نے اس وقت خودکشی کر لی تھی جب رحمت کی عمر سات سال کی تھی۔ اس کو مدرسۂ صحابہ میں اپنے داخلے کے بارے میں اتنا یاد تھا کہ تنگ دستی اور بے سروسامانی کے زمانے میں اس کے قصبے میں ایک بار ایک تبلیغی جماعت آئی تھی جس میں اس کی ماں کا ایک دُور کا رشتے دار بھی تھا جو آج مدرسے کا امیر ہے۔ اسے یاد آیا کہ نیم کے پیڑ کے نیچے اُس سرخ سرخ آنکھوں والے کے سامنے اس کی ماں روئی پیٹی تھی اور رحمت کو اپنے ساتھ لے جانے کی درخواست کی تھی۔

مدرسے کی دنیا سے باہر گلی میں عبدالعلی کی مسالوں کی دکان تھی جو رحمت اللہ کے بیٹھنے کا اڈا تھا۔ عبدالعلی دو سال پہلے ہی مدرسے کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوا تھا۔ پھر اس نے مسالے کی چکی لگا کر ایک دکان کھول لی تھی اور مدرسے کے مطبخ کو مسالے فراہم کرتا تھا۔ ایک دن اپنے دل کا درد بیان کرتے ہوئے رحمت نے عبدالعلی سے دکان پر بیٹھے بیٹھے کہا تھا:

''ہم تم اور مدرسے کا امیر، ایک ہی نماز پڑھتے ہیں، ایک ہی جیسا سجدہ کرتے ہیں، پھر ایسا کیوں ہے کہ تم کچے آنگن کے مکان میں رہتے ہو، تمھارے روزے میں میونسپلٹی کا بابو بھی نہیں آتا اور امیر کے روزے کے افطار میں چیف منسٹر آتا ہے۔'' یہ سن کر عبدالعلی ہنسا تھا اور جواب میں کہا تھا، ''تمھارے امیر کو کچھ خاص دعائیں یاد ہیں، جو وہ سب کو نہیں بتاتا۔''

مدرسۂ صحابہ کی عمارت بہت بڑے رقبے میں ایستادہ تھی۔ اس وسیع و عریض عمارت کے درمیانی حصے میں ایک خوب صورت باغ سے گھری ایک مسجد تھی اور اس کی داہنی سمت عملے میں شامل قاریوں، مولویوں اور معلموں وغیرہ کی رہائش کا انتظام تھا۔ باغ کے پچھواڑے اونچی دیواروں سے ملحق طلبہ کے کمرے تھے اور ایک بڑا سا ہال بھی جس میں قرأت کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔

ایک دن مفتی غلام محمد خاں جن کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں تھیں اور افغانستان میں افیم کی کھیتی کرنے والے ایک عزیز سے گہری چھنتی تھی، کی جانب سے رحمت اللہ کو حکم ملا کہ وہ نماز جمعہ کے بعد اور عصر کی نماز سے پہلے ان کے دفتر میں حاضر ہو۔ اس طرح کے احکامات سے شروع شروع میں رحمت اللہ خاصا پریشان ہو جایا کرتا تھا لیکن تیرہ برس گزار کر اب رحمت اللہ نے وہاں سب سے ہی ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ خدا نے اس کے لحن میں کچھ ایسا سوز دیا تھا کہ قرأت کے بیرونی مقابلوں میں وہ مدرسۂ صحابہ کو اول انعام دلواتا تھا جسے سن کر سامعین رو دیا کرتے۔ اس کی زیر تربیت مدرسے کی جماعت کی قرأت ایمان والوں کے رونگٹے کھڑے کر دیا کرتی تھی۔

رحمت عصر کی نماز سے پہلے کمرے سے نکل کر باغ میں آیا جس کے درمیان میں ایک پرانا برگد کا درخت تھا، جس کے تنے کے چاروں طرف ایک پختہ چبوترہ تھا، جس پر دوپہر چھاؤں میں رحمت لیٹ جایا کرتا تھا اور جب اسے لگتا تھا کہ برگد کے پتوں کی سرسراہٹ اس کے کان میں کچھ کہہ رہی ہے تو وہ اپنے دل کے پھپھولے برگد سے کہہ کر چھوڑا کرتا تھا۔ اس بار رحمت چبوترے پر لیٹا تو برگد خلاف معمول مایوسی کے ساتھ رحمت کے کچھ بولے بغیر مخاطب ہوا:

''آج امیر کے دفتر میں تمھاری پیشی ہے۔''

''ہاں—''

''لال لال آنکھیں دکھائے گا وہ۔''

''دکھائے، کیا کرے گا میرا؟'' رحمت نے جواب دیا۔

''یاد دلائے گا کہ بچپن میں کس جہنم سے اٹھا کر تم لائے گئے تھے۔ پھر احساس دلائے گا کہ تم ایک غریب انسان ہی نہیں بلکہ بہت بڑے بیوقوف بھی ہو۔ تمھاری ایسی تیسی کر کے رکھ دے گا اور تم چپ چاپ سنتے رہو گے۔''

''نہیں، اب میں چپ چاپ نہیں سنتا— میں بھی بولتا ہوں۔'' یہ سن کر برگد کچھ فکر مند ہو گیا اور پوچھا، ''تو کیا تم یہ تو نہیں بولو گے کہ وضو کرنے کے حوض میں جس کم عمر لڑکے کی لاش تیرتی ملی تھی، وہ کن دو لوگوں کے درمیان آپس میں رقابت کا نتیجہ تھی؟''

''نہیں— اب اتنا بیوقوف بھی نہیں ہوں۔'' جواب سن کر برگد خوش ہوا، بولا:

''میں ڈیڑھ سو برس کا ہو چکا ہوں، میرے خاندان نے بڑے بڑے مدرسے اور پاٹھ شالائیں دیکھی ہیں۔ اچھے اور بُرے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ایسا راز کبھی کسی سے نہ اُگلنا جس کا اس چہار دیواری سے باہر نکلنے میں تمھاری موت ہو۔''

''جانتا ہوں۔ اس عمارت میں مجھے چودہ برس ہو چکے ہیں۔''

برگد نے پھر کریدا، ''وہ پہلے بھی تم سے پوچھ چکا ہے، ہوسکتا ہے، پھر پوچھے کہ تم خدا کو مانتے ہو؟ تم کیا جواب دو گے؟''

''وہی جو پہلے دے چکا ہوں۔''

''پہلے تو تم رو پڑے تھے، پھر کہا تھا کہ ہاں مانتے ہو— تم روئے کیوں تھے؟''

''کیوں کہ میں خدا کو مانتا تھا مگر اس خدا کو نہیں جس کو مدرسہ منوانا چاہتا ہے۔''

''تو تم مدرسے میں رہ کیوں رہے ہو؟''

جواب میں رحمت اللہ نے صاف واضح کر دیا کہ وہ مدرسے میں اچھے قاری پیدا کرنے کے لیے ہے، یہ بتانے کے لیے نہیں کہ اس کا خدا کیا ہے اور مدرسے کا خدا کیا۔

مدرسے کے ہر کونے میں کب کیا ہو رہا ہے، برگد خوب جانتا تھا۔ اس نے رحمت کو ٹٹولا:

''کیا تم جانتے ہو کہ امیر نے تمھیں کیوں طلب کیا ہے؟''

''وہی قصہ ہے، اکرم بکوم بمبے بو والا۔''

''تم دس لڑکوں کو لے کر کسی گھر میں تیجے کی قرآن خوانی میں گئے تھے۔''

''ہاں، اور سیپارے ہاتھ میں تھام کر آیتوں کے بجائے 'اکرم بکوم بمبے بو اسی نبے پورے سو، سو میں لگا دھاگا، چور نکل کر بھاگا' بڑبڑا رہا تھا، وہاں جو بریانی کھلائی گئی تھی، اس میں مسالا نمک نہیں تھا۔''

''اس بیہودہ حرکت پر باز پُرس ہوگی تو کیا جواب دو گے؟''

''کہہ دوں گا قرآن شریف مُردوں کو بخشوانے کے لیے نہیں، عمل کے لیے ہے۔ پھر مُردے بھی ایسے کالے منہ والے بخشوائے جاتے ہیں کہ شرم آتی ہے۔''

پھر درخت نے رحمت کو ایک راز کی بات بتائی۔

''تمھارا امیر کبھی کبھی ظہر کی نماز میرے سائے میں ادا کرتا ہے اور دعا میں ہچکیوں سے روتا ہے اور اللہ سے گڑگڑاتا ہے۔''

''کیا کہتا ہے؟ تم تو سنتے ہو گے۔'' رحمت نے پوچھا۔

''کہتا ہے___ اے مالکِ دو جہاں، میں نے ہمیشہ تیرے فیصلے کے آگے بندگی اور عبودیت، تواضع اور انکسار سے سپر انداز ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اولاد سے محروم ہوں تو تیرے حکم سے اور چودہ کمروں کے مکان کا مالک ہوں تو تیری رضا سے___ مالک اس عمارت کے چودہ کمروں میں سے گیارہ مقفل ہیں جن میں کوئی نہیں رہتا۔ کسی بہانے ایک بڑھاپے کی لاٹھی عطا فرما۔ تیری خدمت پر اس لیے معمور ہوں کہ تیرے گھروں میں اذان دینے والے پیدا ہوں، میرے مخالفین بڑھ رہے ہیں، کیا کروں۔ تجھے چھوڑ دوں تو نہ کوئی تدبیر رہ جائے گی اور نہ طاقت۔''

امیر کے دفتر میں حاضری دینے سے پہلے رحمت اللہ کو لگا کہ شاید آر پار کی لڑائی لڑنا پڑ جائے۔ اس نے پچھلے دو برسوں میں ایک موٹر مکینک کی شاگردی میں موٹر کی مرمت کا کام سیکھ لیا تھا اور اسی کے بل بوتے پر اس کے استاد نے اسے ایک آدھ بار کچھ کمائی بھی کرادی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ باقاعدگی سے کام کرنے کے لیے اور بھی ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ مدرسے کی دُنیا میں حالات کچھ عجیب و غریب تھے۔ مفتی غلام محمد، فکرمند اور پریشان سا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کے دروازے پر ایک بار دیسی بم بھی پھوٹا تھا اور مدرسے کے اندر کی دنیا میں منصب اور اقتدار کی سازشیں بار بار سر اٹھا رہی تھیں۔

رحمت وقتِ مقررہ پر امیر کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کی دیوار کی کھلی الماریوں میں علومِ نبوت کے پیچیدہ مسائل سے متعلق پچاسوں جلدیں قرینے سے چُنی ہوئی تھیں۔ مقاصدِ شرعیہ پر ہوئے مباحث کے رسالے اور فتاویٰ تاتارخانیہ کی موٹی موٹی جلدیں چمچما رہی تھیں۔ چاندنی کے سفید فرش پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سرخ آنکھوں اور وجیہ شخصیت کے ساتھ کلغی دار مکلف اور بزاق دستارِ فضیلت میں مفتی غلام محمد خاں دو چار خرانٹ قسم کے معلموں کے ساتھ نیم دراز تھے اور کمر کے نیچے گرم پانی کی بوتل دبی ہوئی تھی۔ وہ جیپ سے لمبا سفر طے کر کے اُسی وقت آئے تھے۔ رحمت نے سلام علیکم کی چلتاؤ رسم ادا کی اور سر پر منڈھی ہوئی ٹوپی اور جھکی نظروں کے ساتھ کونے میں مؤدب کھڑا ہو گیا۔ معلموں کے برخاست ہونے پر کچھ دیر کے لیے مفتی غلام محمد یہ طے نہیں کر پائے کہ اس ملاقات میں وہ سامنے کھڑے مدرسے کے سرکش کارندے سے کس طرح نپٹیں۔ کچھ دیر بعد ایک الماری کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔

''پہلے خانے کے داہنے سے تیسری جلد نکالو۔'' تعمیل کی گئی۔ وہ کتاب کو الٹتے پلٹتے رہے، غالباً کچھ کہنے کے لیے جب انھوں نے وقت کما لیا تو بولے:

''اطلاعیں مل رہی ہیں کہ جو دین یہاں تمھیں سکھایا گیا ہے، اس پر سے تمھارا عقیدہ ہٹتا جا رہا ہے۔''

''یہ شکایت تو پرانی ہو چکی ہے۔'' رحمت نے زمین دیکھتے دیکھتے جواب دیا۔

''کبھی تم نے سوچا کہ اگر تم یہاں نہ ہوتے تو کہاں ہوتے۔ تمھاری ماں کو تمھیں پالنے کے لالے پڑے تھے۔'' اب رحمت نے نظریں اوپر کر کے جواب دیا۔

''ہم جیسے یہاں کے علاوہ اور کہیں نہیں ہو سکتے۔ مگر میں یہاں آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔ چودہ برس میں اس جگہ میں نے مسلمان کم اور بیوقوف زیادہ دیکھے ہیں۔''

امیر نے جملہ سنا، چہرے پر ایک رنگ آیا اور گیا۔ وہ اپنے مقابل کو جھنجھوڑ کھانے میں ماہر تھا۔ راحت کو بھی کبھی کبھی نوچ ناچ کر پھینک چکا تھا۔ مگر چپ رہا۔ امیر کا برتاؤ دیکھ کر رحمت کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا منشا غصہ دکھانا نہیں، کچھ اور ہے۔ اس درمیان میر ہاتھ کی کتاب کھولے یہ عبارت پڑھ کر رحمت کو سنانا چاہتا تھا۔

''ہمیں علومِ نبوت کے اتنے بڑے سرمایے کی علم داری کرنے والا مولوی درکار ہے جو صرف مولوی ہو۔'' لیکن عبارت سنانے سے پہلے امیر کو خیال آیا کہ اس عمارت سے ہر طالبِ علم مولوی بن کر نہیں نکل پاتا اور طلبہ کی بے راہ روی کی ذمے داری مدرسے کا وہ ڈھیلا ڈھالا نظام اور تربیت ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ غرّا کر بولا، ''تمھارے اندر یہ باغیانہ تیور ہرگز نہ پنپتے، اگر ہم اپنے تعلیمی نظام کو اتنا ہی ٹھوس اور چست اور پختہ بنا سکتے جتنا عیسائی پادریوں کا ہوا کرتا ہے۔''

لیکن اس وقت امیر کے دماغ میں ایک اور خیال بار بار کی طرح اس بار بھی اُسے یاد دلا رہا تھا کہ رحمت اللہ کی شخصیت وجیہ ہے، دوسروں کو مرعوب کر لیتا ہے اور اپنی ذہانت کے سبب امیر کی دوسری ضرورتیں پوری کرنے میں کام آ سکتا ہے۔ اس لیے امیر نے طے کیا کہ یہی موقع ہے جب رحمت سے معاملے کی دو ٹوک بات کر لینا بہتر ہوگا۔ اس لیے وہ بغیر کسی تمہید کے شروع ہو گیا۔

''جس جمہوری اور برہمنی نظام میں تم بعض دوستوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہو، کوشش کرو کہ اس کے جراثیم یہاں نہ لاؤ، ورنہ نہ تم یہاں رہ پاؤ گے اور نہ میں۔ جس میں تم ہو، وہ ایک چہار دیواری اور عمارت نہیں بلکہ ایک بڑے تاریخی پس منظر کے ساتھ خود کو منوا چکا ہوا ایک طور اور طریقہ ہے۔ تمھاری زندگی کی فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا ویسی ہی ہونی چاہیے جیسی یہاں سب کی ہے۔ اُس پہچان کو نہ تم بدل سکتے ہو اور نہ میں۔ ایسا کچھ نہ کرنا کہ میں تمھیں نہ بچا پاؤں۔'' اتنا کہہ کر امیر اپنے دفتر سے نکل کر چلا گیا۔

رحمت اللہ کی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں، وہ عبدالعلی کی مسالوں کی دکان پر جا کر بیٹھتا، بیڑیاں سلگاتا، بات بے بات پر عبدالعلی سے چڑچڑے پن کے ساتھ جھگڑتا اور چارپائی پر دراز ہو کر کھٹملوں سے بدن نچواتا۔

ایک دوپہر وہ برگد کے سایے میں جا کر چبوترے پر لیٹا تو برگد جیسے بھرا بیٹھا تھا اور اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ ایک پل ضائع کیے بغیر مخاطب ہوا۔

''کیا تم نے یہ بات محسوس کی کہ تمھارے اندر جو خدا پنپ رہا ہے، تمھارا امیر اس سے ٹکرانا نہیں چاہتا۔ مدرسے کی املاک کی حفاظت اور ترقی اس کی ذمے داری ہے، اسے سر کی ٹوپی، پیشانی کے نشان اور چہرے کی داڑھی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ایسا چاہیے جو ہر دور میں چاہا گیا ہے۔ اور جس کے بغیر اُس زندہ وجود کی حفاظت ممکن نہیں جو ان نشانیوں کو زیب تن کرتا ہے۔'' اتنا کہہ کر برگد نے کچھ توقف کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ رحمت اللہ اس کی باتیں سن کر اندر ہی اندر کھول رہا تھا مگر برگد نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی۔

''کل صبح امیر تم کو اپنے کمرے میں بلائے گا۔ تمھاری ذہانت، فطانت اور نیک دلی کی تعریف کرے گا، پھر تم سے کہے گا کہ اگر تم کو قرآن بخشوانا نہیں تھا تو تم نے اکڑ بکڑ بمبے بو کا ورد اس طرح کیوں کیا کہ دوسرے بھی سن لیں، کم سے کم جو دل میں تھا، زبان پر نہ لاتے۔ یہ اُس خدا کی عبادت کا ایک طریقہ ہے جو تمھارے اندر پنپ رہا ہے۔ کیوں کہ تم دریا میں بھی رہنا چاہتے ہو اور مگرمچھ سے بیر بھی رکھنا چاہتے ہو۔ تم کو چاہیے کہ پانی کے اوپر سر نکال کر رہنے کی مشق کرتے رہو، کیوں کہ سر سے پانی گزرتے رہنے میں موت ہے۔ زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ تم یہ دیکھتے رہو کہ یہ عمارت تم سے کتنا لے کر کتنا دے رہی ہے۔''

مدرسے کی گلی میں اس رات مسالے والے عبدالعلی کی دکان دیر تک کُھلی رہی تھی۔ اس کو دکان کے سامان کا حساب کتاب کرنا تھا۔ وہ جب تک کام میں مشغول رہا، رحمت اللہ نے تپائی پر بیٹھے بیٹھے آدھی ماچس اور چوتھائی بیڑی کا بنڈل پھونک ڈالا۔ عبدالعلی انکھیوں سے رحمت کی ذہنی کیفیت کو بھانپتا رہا۔ پھر کام ختم کر کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ تب تک گلی کی باقی دکانیں بند ہو چکی تھیں اور سناٹا پھیل چکا تھا۔ ایک بیڑی سلگا کر عبدالعلی نے رحمت کو کریدا۔

''کیا بات ہے؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔''

رحمت اللہ کچھ دیر تو چپ رہا، پھر رو پڑا۔ وہ کئی بار کی کہی ہوئی بات کو پھر کیا دہراتا کہ برسوں ہو گئے، اس کی چہار دیواری کے سارے موسم کبھی نہ بدلے۔ نہ رات بدلی، نہ دن — ایک

سا شور اور ایک سا سناٹا۔ یہاں تک کہ کئی برسوں سے مدرسے کا ناشتا اور کھانا بس ایک بار پکا کر رکھ لیا جاتا ہے اور مسلسل اس پھیکے سیٹھے ذائقے کو برسوں کھلایا جاتا ہے۔

عبدالعلی جس نے دو سال پہلے مدرسہ چھوڑا تھا، اس نے رحمت کو صلاح دی کہ وہ اپنے قصبے میں لوٹ جائے اور کسی مسجد میں ٹھکانا ڈھونڈے لیکن وہاں کی زندگی کے تصور سے ہی رحمت کانپ جاتا تھا۔ تب عبدالعلی نے دوسری بیڑی جلائی اور سوال کیا:

''سنا ہے بعض جہادی تنظیموں کے کارکن کام کے لڑکوں کی تلاش میں نکلتے رہتے ہیں، کہو تو ان کا پتا لگاؤں، جاؤ گے؟''

''شہادت میں مجھے دل چسپی نہیں، زندگی ایک بار ملتی ہے، اسے بھرپور جینا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر عبدالعلی نے اسے موٹر گیراج کھولنے کا مشورہ دیا۔ رحمت نے بتایا کہ جب تک تین چار معرکے کی گاڑیوں کی مرمت کی تربیت نہ ہو، گیراج نہیں چلتا۔ پھر اسے کھولنے کے لیے کم سے کم تین لاکھ کے سرمایے کی ضرورت ہوگی اور کیوں کہ ہم مسلمان ہیں، اس لیے ہمارے لیے جنت کی آسائشیں خریدنے کے وسائل تو ہیں، دنیا کی آسائشوں کے لیے نہیں۔ یہ سن کر عبدالعلی نے رازداری کے ساتھ پوچھا، ''شہید نہیں ہونا چاہتے تو شہادت کا کام کرنے والوں کو پیسا پہنچانے میں مدد تو کر سکتے ہو۔''

''وہ کیسے؟'' رحمت نے سوال کیا۔

''برہمنی نظام کے بنائے قانون کی خلاف ورزی کر کے اکٹھا کیے سرمایے کو خدا کے خدمت گاروں تک پہنچانا اور اُس لوٹ کے کمیشن سے آرام کی زندگی بسر کرنا — بڑا ہاتھ مارنے پر اتنا مل جائے گا کہ اپنا گیراج کھول لو، جو کام مدرسے اور اوقاف کی آمدنی ہماری سرمایہ کاری کے لیے نہیں کر سکتی، اس کی سبیل ان راستوں سے نکل سکتی ہے۔''

رحمت نے تجویز یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ اس میں ڈاکے ڈالنے کی ہمت نہیں۔ اس بیچ عبدالعلی کو ایک اور تدبیر یاد آئی، بولا:

''اب تو کئی نئے کام نکل آئے ہیں، بستیوں میں ہونے والے فساد، لوٹ مار، آتش زنی اور مظالم پر بنائی گئی ویڈیو فلموں کی ملک مخالف پروپیگنڈے کے واسطے باہر اچھی مانگ ہے، پیسے اچھے مل جاتے ہیں، تمھیں فوٹوگرافی کا کچھ شوق بھی ہے؟''

رحمت نے بات سنی اور منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ عبدالعلی منہ ہی منہ میں خود کلامی کرتا رہا۔

''بم بنانا بھی ایک انڈسٹری ہے۔ گھریلو بموں کی اچھی مانگ ہے۔ بم بنانے کے ہندو

مستری مسلمانوں کے لیے بھی بم بناتے ہیں۔ جب سے بموں کی ساخت کی مدد سے پولیس تنظیموں تک پہنچنے لگی ہے، ان کے بنانے میں بھی تکڑم ہونے لگی ہے۔'' رحمت کچھ بولے بغیر بُرا سا منہ بنائے دکان سے اُٹھنے لگا تو عبدالعلی نے اسے دلاسا دیا:

''تم تو مجھ سے بہتر ہو، میرے پاس تو عقل کی کمی بچپن سے رہی ہے، اسی لیے مسالے بیچ رہا ہوں، پھر یہ بات تو طے ہے کہ امیر تمھارے لیے اس طرح نہیں سوچتا جیسا دوسروں کے لیے سوچتا ہے۔''

''لیکن میں مولوی نہیں بننا چاہتا۔'' عبدالعلی نے اَن سنی کرتے ہوئے سمجھایا۔

''لاکھوں لوگ وہ پیشے اپنائے ہوئے ہیں جن کو وہ دل سے پسند نہیں کرتے۔ یا تو سیدھے سادے مسلمان ہوکر میری طرح مسالے بیچو یا پھر ڈھنگ کے مسلمان ہوجاؤ۔ ڈھنگ کا مسلمان روزہ رکھتا ہے تو افطار میں چیف منسٹر روزہ کھولنے آتا ہے اور مسالے بیچنے والا افطار کراتا ہے تو میونسپلٹی کا بابو بھی نہیں آتا۔''

عبدالعلی دکان بند کرنے لگا تو رحمت اللہ تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں داخل ہوا اور روشنی جلائے بغیر کھٹملوں بھری چارپائی پر ڈھیر ہوگیا۔

صبح ہوئی تو رحمت کے پاس امیر کے دفتر میں حاضر ہونے کا فرمان آگیا۔ کمرے میں پہنچ کر رحمت کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مفتی غلام محمد نے اس سے لفظ بہ لفظ وہی باتیں کیں جو برگد رحمت کو بتا چکا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور باتیں بھی ہوئی تھیں۔ رحمت کو احساس دلایا گیا کہ جو حلوے مانڈے وہ مدرسے میں رہ کر کھا رہا ہے، وہ بہتوں کو میسر نہیں اور وہ مفت کی بریانی کھا کر کہتا ہے، اس میں نمک نہ تھا، پھر امیر چیخا تھا۔ ''ہم اپنی زندگی کو پیٹ پر پتھر باندھنے والوں کی زندگی کی روشنی میں درست کرنا چاہتے ہیں، قال اللہ وقال الرسول کے وارث ہیں۔'' پھر کچھ سوچ کر اُس نے اپنے غصے پر قابو پایا۔ پھر عاجزی سے ایک نئے لہجے اور نئی آواز میں بولا:

''تم اگر میرے خدا کے دوست نہیں بن پا رہے تو کم سے کم فی الحال میرے ہی دوست بن جاؤ۔ کیوں کہ مجھے اپنے خدا کا دوست بنے رہنے کے لیے کچھ ضروری امداد درکار ہے — خیر، مدینہ منورہ سے کچھ تسبیحیں آئی ہیں، شام کو گھر جا کر اپنی ممی جی سے وہ پیکٹ مانگ لانا، وہ تمھیں پوچھ بھی رہی تھیں۔''

دوپہر کے ویران سناٹے میں رحمت اللہ سوچتا رہا کہ رنج اور پریشانی کے تدارک کے لیے جو دعائیں اس نے یاد کی تھیں، وہ کیا کام کریں گی جب رنج و پریشانی سے انسان کو مفر نہیں

ہے۔ رحمت باغ میں آیا۔ برگد کے پاس کنویں کی منڈیر پر پانی نکالنے کی رسّی دیکھ کر پھر جی میں آئی کہ شاخ میں باندھ کر لٹک جائے۔ اس کا یہ ارادہ بھانپ کر برگد نے آواز دی۔

''پھر مرنے کی سوچ رہے ہو، معلوم نہیں کہ قسمتیں پلٹتی بھی ہیں۔''

''معلوم ہے لیکن میرے اور مدرسے کے درمیان لمبی کھائی ہے۔''

''کیسی کھائی ___؟''

''کھائی یہ کہ مخلوق کس چیز کو اچھا سمجھتی ہے اور کس کو برا، یہ خیال رکھا جائے، یا یہ کہ شرع کے نزدیک کون سی چیز اچھی اور کون سی بری ہے۔ ایسے موقعے پر مدرسہ شرع کے ساتھ ہو جاتا ہے اور میں مخلوق کے ساتھ۔ امیر میری یہ پریشانی نہیں جانتا۔''

''جانتا ہے۔'' برگد فوراً بولا، ''تمھارے جیسے لونڈوں کو وہ چرا کر پھینک چکا ہے۔ اب ذرا عقل کے ناخن لو، تم تسبیحوں کا پیکٹ لینے شام کو اس کے گھر جاؤ گے۔ امیر کی بیوی جسے تم ممّی جی کہتے ہو، جس کی ناک میں فیروزے کی کیل ہے اور سر کے بال دوپٹے سے ڈھکے رہتے ہیں، جس کا وضو کبھی نہیں ٹوٹتا، وہ محبت سے تمھیں چاندنی بچھے تخت پر اپنے پاس بٹھائے گی، روح افزا کے گلاس سے تمھاری خاطر کرے گی۔ یاد دلائے گی، کہ اس کا شوہر جسے وہ 'میاں جی' کہتی ہے اور جو تمھارا امیر ہے، تم کو بہت چاہتا ہے۔ اسی وقت ممّی جی کے برابر والے کمرے سے ایک دبلی پتلی خوب صورت آنکھوں اور چاندنی جیسے رنگ کی لمبی اور گھنے لمبے بالوں والی لڑکی سر پر دوپٹہ برابر کرتے ہوئے نیچی نظروں کے ساتھ کمرے کے باہر آئے گی۔ شبانہ کہہ کر وہ اس کو پکارے گی، لڑکی رُک جائے گی۔ تم سے اس کا تعارف کراتے ہوئے بتائے گی کہ وہ اس کی بہن کی بیٹی ہے، جس کا نہ باپ زندہ ہے اور نہ ماں ___ شبانہ کی قرأت درست کرنے کے لیے تم کو معمور کرے گی۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد ایک چاند سے چہرے والی، جھکی جھکی نظروں والی، ایک بھولی بھالی لڑکی تمھارے سامنے ہوگی۔ کچھ دنوں بعد تمھیں وہ ہر صبح بے لطف، اداس اور کھوئی کھوئی سی لگے گی، جس صبح تم شبانہ کو نہیں دیکھو گے۔ تم اس کو خط لکھو گے تو وہ جواب نہیں دے گی۔ پھر لکھو گے تو وہ تم سے کہے گی، سارے مرد ایک ہی وقت میں بہت سی چیزوں کے طالب ہوتے ہیں، لیکن عورت صرف اور صرف اُسی کی طالب ہوتی ہے جسے وہ پیار کرتی ہے۔ وہ بتائے گی کہ اس کا باپ جو کچھ پانا چاہتا تھا، جب وہ نہیں پا پاتا تھا اور اس کی ماں کے بستر پر ہفتوں نہیں آتا تھا اور صبر و قرار کھو کر گالیاں بھی بکنے لگتا تھا تو اس کی غریب ماں اندھی اور دیوانی ہو کر ایسے پیار کی تلاش میں بلک بلک کر روتی تھی جو اس کے باپ کو آسودگی اور سکون کی گود میں تھپک کر سلا دے۔ تم یہ جاننے کے لیے بے قرار

رہو گے کہ شبانہ بھی تم سے پیار کرتی ہے یا نہیں۔ کیا تم اس کو بھی پسند ہو یا نہیں۔ جب تم اس سے مدرسے سے اپنی بغاوت کا ذکر کرو گے تو وہ تم سے اس طرح روٹھ جائے گی جیسے تم نے کوئی بڑا جرم کیا ہو۔ پھر تم اس کو مناؤ گے تو وہ بڑی ہوشیاری سے مگر بڑے صبر کے ساتھ تمھیں اتنا نرم کر دے گی کہ تم یہ رضا و رغبت خود کو اُسے سونپ دو اور یہ سب کچھ اس قدر غیر محسوس طریقے سے ہوگا کہ تمھیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ پھر وہ تمھارا سر اپنے زانوؤں پر رکھ کر تمھیں پیار سے یاد دلائے گی کہ تم کس قدر کم ترین اور حقیر ہو اور ایسی ناطاقتی کی حالت میں تسلیم و رضا ہی بیڑا پار لگاتی ہے۔ پھر ایک دن شبانہ کی محبت جب تمھیں پل پل تڑپانے لگے گی اور اُسے تم سے روپوش کر دیا جائے گا اور تب تم امیر کے دروازے پر ٹکریں مارو گے تو مفتی غلام محمد کی بیوی باہری دروازے کا پٹ پکڑ کر دھیرے سے تم سے پوچھے گی:

"تمھیں نہیں لگتا کہ تم اپنے امیر کے، جو اپنے مخالفوں میں گھرا ہوا ہے، مقروض ہو اور اس قرض کے لیے تم نے کچھ گروی رکھا تھا۔ یاد کرو کیا رکھا تھا؟"

پھر ہر طرف سے تمھارے کانوں میں آواز آئے گی:

تسلیم و رضا!

تسلیم و رضا!

وقت کی تیز آندھی پرانے درختوں کو اُکھاڑ کر پھینک چکی ہے۔ اب نہ مفتی غلام محمد خاں زندہ ہیں اور نہ ناک میں فیروزہ پہننے والی ان کی پاک باز بیوی۔ البتہ مدرسۂ صحابہ کی عمارت، کشادہ باغ اور پرانا برگد اب بھی موجود ہے۔ مفتی غلام محمد خاں کی کوٹھی کے گیارہ کمروں میں اب مفتی رحمت اللہ امیر مدرسۂ صحابہ اپنی اولادوں کے ساتھ قابض ہیں۔ مفتی غلام محمد کی بیوی کی فیروزے کی کیل اب مفتی رحمت اللہ امیر مدرسہ کی زوجہ کی ناک میں ہے۔ مفتی رحمت اللہ کے مدرسے کے بعض حرص و ہوس کے پتلے معلم جن کی خفیہ فہرست رحمت اللہ کے پاس ہے، انھی میں سے کوئی معلم رحمت اللہ سے سوال کرتا ہے۔

"مخلوق کس چیز کو اچھا سمجھتی ہے اور کس کو برا، یہ خیال رکھا جائے یا یہ کہ شرع کے نزدیک کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی بُری؟"

مدرسے کے باغ میں برگد کے پتے اب بھی ہواؤں سے ویسے ہی سرسراتے ہیں اور اس کی گھنی چھاؤں رحمت اللہ کو پکے چبوترے پر مصلیٰ بچھا کر کبھی کبھی اپنے خدا سے گریہ وزاری کے

ساتھ یہ کہتے ہوئے سنتی ہے:

''اے مالک دو جہاں، ترے احسانات کا یہ بندہ منکر نہیں، بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا تیرا یہ کم زور بندہ عاجزی اور فروتنی سے اپنے دل کے خوف اور وسوسے تجھ سے بیان کر رہا ہے۔ تو دیکھ رہا ہے کہ میرے مخالف اور دشمن بڑھتے جا رہے ہیں، اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔ تجھے چھوڑ دینے میں نہ کوئی تدبیر رہ جائے گی اور نہ طاقت۔''

مفتی کی کوٹھی کے ایک کمرے میں ایک پاک باز خاتون ناک میں فیروزے کی کیل پہنے مدرسے کے کسی بھروسا مند شاگرد کو بلا کر پوچھتی رہتی ہے:

''کیا تم میاں جی کے مقروض نہیں ہو— سوچنا، تم نے اس قرض کے لیے کیا گروی رکھا تھا؟''

○○○

غالبِ خستہ کے بغیر

رشید امجد

گھنا گہرا جنگل، جس میں سے گزرنے کا راستہ بھی مشکل، درختوں پر چہچہاتے پرندے، شاخوں سے الجھتے مختلف جانور، اور اس گھنے گہرے جنگل کے درمیان چھوٹا سا وہ دائرہ، جس کے بیچوں بیچ بڑ کا زمانوں سے ماورا پیڑ، پیڑ کی شاخوں نے دائرے کے بڑے حصے پر چھتنار کیا ہوا ہے اور اس پیڑ کے پاؤں پر آنکھیں بند کیے وہ، اس کی آنکھیں کب سے بند تھیں اور یہ دائرہ کب سے زمان ومکاں کی قید سے آزاد تھا، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ اپنے پیچھے محلات کی چکا چوند، محبت کے اَن مول رشتے اس لیے چھوڑ آیا تھا کہ جان سکے دکھ کیا ہے، زندگی کیا ہے اور سچائی کہاں ہے؟ آنکھیں بند کیے، نہ معلوم کتنے زمانوں سے آنکھیں بند کیے وہ کسی سوچ میں ایسا گم تھا کہ اپنی ذات کا احساس بھی جاتا رہا تھا۔

پھر اس کی آنکھیں کھلیں، ہڈیوں بھرے وجود میں، جہاں اب گوشت صرف چمڑی کی صورت رہ گیا تھا، سانس نے کروٹ لی، اُس نے جانا اور اسے بیان کیا— پھر ہمیشہ کے لیے گم ہوگیا۔ یہی ہوتا ہے، جاننا— جاننے کے لیے تپسیا کرنا، وجود کا گوشت چمڑی میں بدلوا لینا، اور حقیقت، حقیقت کے شاید ذرا سے حصے کو جان لینا، یہی اس جان لیوا مراقبے کا انعام ہے، لیکن حقیقت کی اتھاہ کیا ہے؟

''میں کون ہوں اور کہاں ہوں؟'' یہ سوچتے ہوئے اُسے یہ ساری کہانی یاد آتی ہے اور وہ اس منظر سے صدیوں آگے کے سفر میں زندگی کی شاہراہ پر رُک کر سوچتا ہے— ''یہ وقت کی قید کیا شے؟''

مرشد کہتا ہے— ''وقت ایک حقیقت ہے لیکن ہم بے حقیقت ہیں۔''

وہ پوچھتا ہے— ''زماں کی قید، مکاں کی قید اور کشش کی قید کہ ہم اس زمان و مکاں سے جڑے ہوئے ہیں، چاہیں بھی تو اس سے باہر نہیں نکل سکتے، کیوں؟''

مرشد مسکراتا ہے، ''یہ تینوں اسی کی صفات ہیں۔''

وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا ہے، پھر تادیر خاموش رہنے کے بعد کہتا ہے— ''وہ وقت تھا، پھر اُس نے مکاں پیدا کیا، لیکن یہ کشش کیا ہے؟''

مرشد بولا— ''یہ کشش ہی تو اصل چیز ہے، اسی کے ذریعے تو سب کچھ اُس سے جڑا ہوا ہے، اسی کا پرتو ہے، زمان و مکاں سے ماوراوہ دائرہ، اُس کے بیچوں بیچ بڑ کا وہ گھنا گہرا درخت، اُس کے نیچے صدیوں سے آنکھیں بند کیے بیٹھا وہ، جو سچ کو جاننا چاہتا ہے— یہ سب وہی ہے، سچ بھی وہی ہے اور سچ کی تلاش کرنے والا بھی وہی۔''

''سب بھید ہے— بھید ہی بھید۔'' وہ بڑبڑاتا ہے۔

مرشد نے بہت ہی دھیمی آواز میں جسے وہ بمشکل سن سکا، کہا— ''اور جس نے اس بھید کو پالیا، اُس نے اپنے آپ کو پالیا۔''

اُس نے نفی میں سر ہلایا— ''اس بھید کو پانے کے باوجود میں اپنے آپ کو نہیں پا سکا۔''

مرشد ہنسا، خوب ہنسا، پھر بولا— ''یہ زعم تو بہت سوں کو ہوتا ہے کہ انھوں نے بھید کو پا لیا ہے، لیکن کیا واقعی وہ بھید کو پا لیتے ہیں؟''

اُسے مرشد کی بات بُری لگی، یہ تو اُس کی تپسیا پر طنز تھا۔ وہ جو زمان و مکاں سے ماورا اُس دائرے میں، بڑ کے گھنے درخت تلے آنکھیں موندے بیٹھا، بھید کو پانے کی کوشش کر رہا تھا، اور اس تپسیا میں اُس کے وجود کا گوشت صرف چمڑی کی صورت باقی رہ گیا تھا، اور تب سے صدیوں کے اس سفر کے بعد اس مقام پر، جہاں وہ اور مرشد مکالمہ کر رہے تھے— اُس نے کچھ نہیں پایا، کچھ نہیں سمجھا، ابھی بھی بھید، بھید ہی ہے، اس تکلیف دہ احساس نے اُسے اور اداس کر دیا۔

''تو میرا یہ سارا سفر رائگاں ہے؟''

مرشد کچھ نہ بولا۔

''اپنی جڑیں تلاش کرنے اور سچائی جاننے کے لیے میں دریا کے کنارے کنارے کہاں کہاں نہیں گیا، میں نے تاریخ کے قبرستان کا ایک ایک کتبہ پڑھا جو قوموں کی قبروں پر لگا ہوا ہے اور—''

مرشد نے ہنکارا بھرا — ''اور یہ کہ اپنے اندر اتر بھی دیکھا، لیکن روشنی نہ ہو تو اندر ایک اندھیرے کمرے کی طرح ہے، جہاں کچھ نظر نہیں آتا، تم نے اندھیرے کمرے کی یاترا کی۔''

''اندھیرا تو باہر بھی ہے۔'' اُس نے کہا — ''اس باہر والے اندھیرے میں کبھی کبھی، بلکہ اب تو روز ہی ایک دھما کا تھوڑی سی روشنی کر دیتا ہے، پھر لاشوں کے بکھرے اعضا، خود کُش کا اُڑا ہوا سر یا ٹانگیں — بس یہی حقیقت ہے۔''

''حقیقت اس اندھیرے اور روشنی کے درمیان ہی کہیں ہے، ایک سرمئی دھند کی صورت۔''

''دھند میں اترنے کی ہمت نہیں۔'' وہ بولا — ''اور باہر رہنا پسند نہیں۔''

مرشد ہنسا۔

پی اے نے فائل اُس کے سامنے رکھتے ہوئے سرگوشی کی، ''سب کچھ طے ہو گیا ہے، بڑے صاحب کو ان کی پسند کے ووائے سی بھجوا دیے ہیں اور آپ کا لفافہ بیگم صاحب کو پہنچ گیا ہے۔''

اُس نے آنکھیں بند کیں اور دستخط کر دیے۔

''ان بند آنکھوں کے پیچھے تو گیان دھیان کی منزلیں تھیں۔'' اُس نے لمحہ بھر کو سوچا، اُسے زمان و مکاں سے ماورا وہ دائرہ یاد آیا، جس کے بیچوں بیچ بڑ کے گھنے درخت تلے آنکھیں بند کیے وہ زمانوں سے سچ کی تلاش میں تپسیا کر رہا تھا، اس کے جسم کا گوشت چمڑی میں بدل گیا تھا، وقت رُکا ہوا تھا، واقعی؟

ننگے وجود پر جہاں چمڑی کے نیچے ہڈیاں ہی رہ گئی تھیں، سانس نے کروٹ لی، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، فون کا بزر — پی اے کہہ رہا تھا، ''بیگم صاحب بات کرنا چاہتی ہیں۔''

دوسری طرف بیوی کی کلکلیں بھرتی آواز کی گنگناہٹ تھی — ''لفافہ مل گیا ہے، رات کو کیا کھائیں گے، میرا تو خیال ہے آج باہر چلتے ہیں، بچے بھی کہہ رہے ہیں۔''

اُس نے واجبی سی ہوں کی اور فون بند کر دیا۔

''میں پھر وہی تپسیا کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس نے مرشد سے کہا۔

مرشد تا دیر چپ رہا۔ پھر بولا — ''سوچ لو۔''

''سوچ لیا ہے۔'' اُس نے ایک ایک لفظ پر زور ڈال کر کہا — ''میں نے سوچ لیا ہے۔''

مرشد کے ساتھ وہ اس گھنے جنگل میں جہاں ایک دائرہ زمان و مکاں سے ماورا تھا، بڑ کا گھنا گہرا درخت اسی طرح موجود تھا، وہ آلتی پالتی مار کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ایک لمحہ — دو لمحے یا صدیاں — وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے اندھیرے میں

ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا— روشنی کی کرن کہیں سے نہ پھوٹی، اندر اندھیرے کمرے میں، وجود کی دیواروں سے ٹکراتے ٹکراتے اس کا وجود لہولہان ہوگیا— باہر بھی اندھیرا اور اس اندھیرے میں بار بار ہوتے دھماکے۔

بیوی کی چیختی آواز— ''بچوں کے اسکول کے باہر خودکش حملہ، بچوں کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔''

''سچ کیا ہے، زندگی اور موت کے درمیان کتنا فاصلہ ہے، ایک سرمئی دھند جس میں اترنے کا حوصلہ نہیں اور باہر—!''

اُس کے سر پر کوئی لسلسی شے گری جو ماتھے سے ہوتے ہوئے اُس کے چہرے پر بہنے لگی، گھبرا کر آنکھیں کھولیں، درخت پر بیٹھے پرندوں کی بیٹھوں سے اس کا چہرہ لتھڑ گیا تھا، وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا اور درخت کے چھتنار سے باہر آگیا، موبائل کی گھنٹی پھر بجی، بیوی کہہ رہی تھی— اور اُس کی آواز میں رونا اور خوشی دونوں شامل تھے— ''بہت سے بچے مارے گئے لیکن شکر ہے سمیر اور عائشہ دونوں ٹھیک ہیں، ابھی اسکول کے اندر ہی ہیں، میں وہیں جا رہی ہوں۔ آپ بھی فوراً پہنچیں۔''

''میرا گیان اور تپسیا— سرمئی دھند— ''سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ روئے یا ہنسے، مرشد کی دور دور تک کوئی خبر نہیں تھی۔

OOO

آنکھیں اور انقلاب

یونس جاوید

ہجوم کی رگیں دور دور تک راستوں، گلیوں، بازاروں میں تنی تھیں۔ ہجوم کیا تھا، بے چینی کا ایک سمندر تھا۔ ٹھاٹھیں مارتا، لہلہاتا جوار بھاٹا سا۔ محسوس ہوتا تھا سب کا لہو گرم ہے۔ واقعی ہر فرد کی آنکھیں اُبل رہی تھیں، ہاتھ لہرا رہے تھے، چیخنے سے گلے پھٹ رہے تھے۔ ہاؤ ہو، شور شرابا، اُڑتے کف، سانس، جیسے تپتی ریت سے اُٹھتی بھاپ۔

ساجی حیران حیران سا اس جلوس میں کل دار کھلونے کی طرح چل رہا تھا جس کا شروع کا حصہ منظم اور درمیانی بکھرا بکھرا تھا۔ اور آخری تو بالکل جیسے جنازے سے واپسی ہو۔

کوئی قتل ہو گیا تھا — کوئی لیڈر تھا شاید — شاید لومبا قتل ہوا تھا؟ ساجی کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ لومبا کون ہے مگر سب چونکہ اس کا نام بار بار لے رہے تھے اور لومبا کا خون رائگاں نہ جانے دینے کا اقرار کر رہے تھے، لہٰذا اسے یہ نام تو ازبر ہو گیا تھا — مگر یہ نام تو اس نے بچپن سے لڑکپن میں داخل ہوتے سنا تھا، جب وہ قتل ہوا تھا۔

ان لوگوں کو دیر بعد اس کا خیال کیوں آ رہا تھا۔ شاید حقوق کے لیے ہر قتل ہونے والا لومبا ہی کہلاتا ہے۔ ہاں شاید — وہ لوتھر کنگ، لومبا، بھٹو، چے گویرا کچھ بھی کہلا سکتا ہے۔

اس وقت جنید سب سے زیادہ جوش میں تھا۔ اس نے دس منٹ تک گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگوائے۔ پھر ہف کر پسینا پونچھتے ہوئے اپنے ساتھی ناصر کے پاس آ کر پھٹ کر بولا:

"ناصر — وہ بے وفا ہے — ہرجائی اور بے مروت ہے۔ یقین کرو، وہ یہی پروفیشنل ہے۔ اس نے میری محبت کا صلہ کس بے حیائی سے اسلم ملک کے ساتھ اکھ مٹکا کرتے ہوئے دیا۔

لگتا تھا وہ اسلم ملک پر گر پڑے گی— دانستہ۔ وہ دانستہ ٹھوکریں کھا کھا کر اس پر گرتی تھی— مجھے دکھا دکھا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی تھی اور قہقہے لگا لگا ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار جیسی بتیسی نکال نکال کر نمائش کرتی تھی— یقین کرو— سیٹر ڈے ایوننگ کو دونوں نے آواری میں ڈنر بھی کیا— یقین کرو— میں تو اُسی دن مر گیا تھا یار ناصر—''

''بور نہ کرو— جانے، ڈنر تو دوستوں میں چلتا ہی ہے۔ وہ بھی تو کلاس فیلو ہے آخر اور یہ کیا سارا انقلاب، سارا جوش محبوبہ کی بے وفائی سے اٹھا ہے؟ ہوسکتا ہے کبھی کا یہی معاملہ ہو— جیسے— جیسے ہم اپنے دکھوں پر امامِ عالی مقام کا نام لے لے روتے ہیں۔''

''تم سمجھ ہی نہیں رہے— تم سمجھ سکتے ہی نہیں— میرا کلیجا کباب ہو رہا ہے۔ ناصر میں جل رہا ہوں۔ میرا لہو اُبل اُبل کر زہرناک ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے— جی چاہتا ہے— شوٹ کردوں زرینہ مجید کی بچی کو، آنکھیں نکال کر اُس کی ہتھیلی پہ رکھ دوں اُس کی— وہی آنکھیں جنھوں نے مجھے لوٹ لیا تھا۔''

''ری لیکس، ری لیکس— پلیز۔'' ناصر نے کہا، ''نارمل رکھو خود کو— اس وقت تم جلوس لیڈ کرنے والوں میں شامل ہو۔ واپس آؤ۔''

جنید واقعی واپس آ گیا تھا۔ دو تین لمبے لمبے ڈگ بھر کر اس نے لیڈروں کی طرح بازو لہرایا— اور چیخ کر اُبل پڑا، ''انقلاب— انقلاب— انقلاب— انقلاب!''

ہر انقلاب کے بعد 'زندہ باد' سن کر اس کا جوش بڑھتا بھی جا رہا تھا اور اس کا کیتھارسس بھی ہوتا جا رہا تھا۔ سو وہ لگاتار نعرے لگاتا رہا حتیٰ کہ انقلاب کے بعد— سبز انقلاب— سرخ انقلاب— سفید انقلاب کے نعرے گڈمڈ ہونے لگے، کہ تصور میں رنگوں کی ایک دھنک سی بننے لگی۔

شاید جنید ہوش میں نہیں تھا۔ اسے یہ یاد ہی نہیں تھا کہ یہ جلوس بس پر چڑھتے ہوئے سیکنڈ ایئر کی ایک لڑکی زبیدہ صہبائی کے گر کر زخمی ہو جانے کے ردِعمل کے طور پر نکلا تھا جس میں لومبا سے چے گویرا تک سبھی گن دیے گئے تھے مگر لڑکی کا نام نہیں لیا گیا تھا— جو کہ ابھی ابھی معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے جنید سے کہا، ''زخمی ہو جانے والی لڑکی کا نام زبیدہ صہبائی ہے۔''

''میرے نزدیک سبھی زرینائیں ہیں— چھوڑو۔'' پھر وہ سرخ انقلاب، سبز انقلاب کے نعرے لگاتا ہوا جی پی او چوک کے درمیان آن پہنچا تو اس کے سامنے مجسم سرخ سبز جلتی بجھتی بتی اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑی تھی— محسوس ہوتا تھا، وہ مسکرا رہی ہے— جنید نے لمحے بھر

اس بتی پہ آنکھ جمائی— اور پھر اپنی ہاکی سے بتی کی آنکھ پھوڑ دی— اور اس پر چڑھ کر چلاّیا، ''انقلاب— انقلابی ساتھیو—'' اس نے تقریر شروع کرنا چاہی مگر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، ''ساتھیو!'' اس نے آغاز کیا، ''علامہ اقبال نے کہا تھا، 'مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'، یقین کریں ہم لومبا کا خون رائگاں نہیں جانے دیں گے۔ ہم اس کا بدلہ لیں گے— بدلہ لیں گے۔ یاد رکھو— میرے دوستو— حق مانگ کر نہیں ملتا— چھین کر لینا پڑتا ہے۔ اور ہمیں اپنا حق چھین لینا ہوگا، ہر ظالم سے، ہر جابر سے، ہر وڈیرے سے۔''

پھر میں نے دیکھا کہ ہماری کلاس کا ہیرو ساحر زور زور سے بول رہا ہے— اس نے کہا، ''سب ٹھیک ہے دوستو! مگر لومبا کے لہو کو بہے ہوئے آدھی صدی گزر چکی ہے، گویا رائگاں چلا گیا ہے— وہ لہو!''

''غلط غلط— رونگ—'' عبید چیخا۔ ''ان شہیدوں کے لہو سے ہی آزادی کے چراغ روشن ہوئے۔ فریڈم فائٹرز جتنے بھی ہیں، سراج الدولہ ہو یا سلطان ٹیپو یا بخت خاں ہو یا بھگت سنگھ— یا احمد خاں کھرل یا— لوتھر کنگ یا لومبا یا بھٹو— سب کے لہو نے آج— آج اور آپ کے اور ہمارے کل کو روشن بلکہ روشن تر بنا دیا ہے۔ انھی کی قربانیوں سے آج شہروں میں روشنی ہے— بتیاں جلتی ہیں— زندگی رواں دواں ہے۔'' پھر اس نے کف اڑا اڑا کر زور زور سے نعرے لگوائے، ''انقلاب— زندہ باد— آزادی— زندہ باد— احتجاج— زندہ باد...''

اور پھر راستے کی تمام ٹریفک سگنل کی بتیاں توڑ دی گئیں۔ حادثات سے بچانے والی بتیاں، روشنیاں بکھیرنے والی بتیاں، کھمبوں پر لگے نیون سائن بورڈ کی بتیاں— ٹوٹنے بکھرنے لگیں۔ اور اندھیرا پھیلتے پھیلتے ہجوم اسمبلی ہال پہنچ گیا۔ اور تھک ٹوٹ کر بکھرنے لگا— جنید، ناصر اور میں— سبز گھاس پر بیٹھ گئے— میں نے پاؤں سہلائے۔ جنید سنیما کی کینٹین سے کاغذی گلاسوں میں چائے لے آیا۔ اور سرو کرتے ہوئے مسکرایا بھی۔

''تمھارے نارمل ہونے اور مسکرانے پر حیرت ہونے لگی ہے مجھے۔'' میں نے کہا۔

''ساجد کے بچے— ساجی جن— تو میرا درد سمجھے گا نہ درماں۔'' پھر اس نے ناصر کو مخاطب کر کے کہا۔

''یار ناصر— ساجی کے بچے کو سمجھا دے— عورت کی آنکھوں میں کیا کیا کمال ہوتا ہے۔'' وہ رُک کر مسکرایا اور مجھے سمجھاتے ہوئے بولا، ''ساجی پیارے— زرینہ کمینی کی آنکھیں بولتی ہیں یار— کمانڈ کرتی ہیں۔''

''مگر— کہاں؟ ناصر بولا۔

''یاد آتی ہیں تو میں پگھل جاتا ہوں۔ ہائے ہائے ہائے ہائے۔''

''صرف آنکھیں یا...'' میں نے اُسے اُکسایا۔

''نا یار— وہ ساری کی ساری ایک کشش ہے، ایک ترغیب ہے— ایک دعوت ہے، اٹریکشن ہے— ہلا دینے والا اس کا بدن— اور لوٹ لینے والی چھاتیاں— اور چھا جانے والی آنکھیں— دھوپ جیسی...''

''بس بس بس، تمھارا مسئلہ تو sex ہے صرف— آگے مت بڑھو۔'' میں نے اسے روک دیا۔

''نہیں نہیں— '' ناصر بولا، ''چلتے ہیں پھر کیمپس— زرینہ مجید کے ہوسٹل چلیں؟''

''چلو— '' جنید نے بے دھڑک کہہ دیا، ''بے شک چلو— آزمالو— ''

گلاسوں میں بچی چائے چھوڑ کر ہم تینوں اُٹھ گئے۔ باقی ہجوم اِدھر اُدھر بکھر کر ٹولیوں میں بٹا تھا۔ بے سمت، بے مقصد—

''بھئی میں تو جاؤں گا نہیں۔'' میں نے فیصلہ سنا دیا، ''تم لوگ ہو آؤ۔'' وہ دونوں واقعی کسی اصرار کے بغیر مجھے چھوڑ کر سڑک کراس کر گئے۔

میں تھکی چال چلتا ہوا بے تکی گفتگو یاد کرنے لگا۔

کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ سڑک کے بالکل ساتھ سبزہ زار سا تھا، فوراً بیٹھ گیا۔ خیال تھا کچھ وقت سکون سے گزار لوں گا کہ آواز آئی، ''بڑی آگ ہے جی سینوں میں— بڑا جوش، بڑا غصہ...''

میں نے مڑ کر دیکھا، ایک موٹا آدمی ایک مالشیے سے پنڈلیاں دبوا رہا تھا، ''ڈیمانڈ کیا تھی؟'' موٹا بولا۔

''خدا رسول کی قسم! کچھ سمجھ نہیں آئی مجھے۔'' مالشیا کہنے لگا، ''مگر ڈیمانڈ تھی جائز۔''

''کمال ہے— جائز تھی— پر تھی کیا؟''

''میں صبح سے ساتھ ہوں چوہدری صاحب— تین کھمبے ٹیڑھے ہوئے ہیں، چار چوکوں کی بتیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ ایک کار کا فرنٹ شیشہ چکنا چور— یہ تو میرے سامنے کا حساب ہے— مگر یہاں تک آتے آتے لوگ اتنا ہنف گئے تھے— کہ مجھے کام بہت مل گیا ہے۔ میرے تین شاگرد مالش پہ لگے ہیں اور مٹھی چاپی پہ۔ وہ دیکھو— پانچوں کے پانچوں ہانپ رہے ہیں— اصل میں میرے جتنا تجربہ نہیں ہے انھیں نال— چوہدری صاحب۔''

''ہوں۔'' موٹا آدمی اونگھ رہا تھا۔

''سنا ہے— کراچی میں بھی بڑے جلوس نکلتے ہیں۔'' مالشیا بولا۔

''ہر روز اور ہر بڑی سڑک پر— وہاں تو سو بندہ بھی لے جاؤں تو کم پڑے گا کام کے لیے— کیا خیال ہے چوری صاحب؟''

''ہاں ہاں— کراچی، شہروں کا شہر ہے کاکے— مگر پنڈلی ذرا اور دبا یار— اے— ہاں ایسے— اب آیا مزہ— ذرا سا اور مگر ہاتھ نرم رکھ— پتر اوئے، خوش کردوں گا تجھے۔''

ایک لمحہ خاموشی سے گزر گیا— تو مجھے سکون آ گیا— پھر مالشیا پوچھنے لگا—

''جناب— یہ ممبا کون تھا؟''

''ممبا؟''

''ممبا یا بمبا۔''

''ایمان سے مجھے بھی نہیں پتا، حالانکہ میں آٹھویں پاس ہوں— میں نے تو آج ہی سنا ہے یہ نام— ہاں— بمبا تو ریل گاڑی کے انجن کو کہتے ہیں مگر ممبا کا پتا نہیں— تو کس لیے پوچھتا ہے؟''

''سارے رستے اس کا بڑا ذکر آیا تھا جلوس میں— کوئی بڑا ہی ہوگا— حیرت ہے— مجھ ایسا میدا مالشیا جسے دنیا کی پل پل کی خبر ہے، ممبا کو نہیں جانتا— کمال ہے۔'' پھر اس نے زور سے مڑ کر اپنے شاگرد کو آواز دی۔

''اوئے جیرے— ؟'' جیرا قریب آیا، ''تو میدا مالشیا نے پوچھا، ''ممبا کون تھا اوئے؟''

''کالا حبشی تھا۔ ابھی ابھی مشتاق صاحب بتا کر گئے ہیں— کہتے تھے، غریبوں کی بات کرنے والا تھا— اس چکر میں مارا گیا۔''

''کب کی بات ہے؟''

''بس اج کل کی ہی بات ہوگی— جبھی تو اتنا بڑا جلوس نکلا ہے۔''

''اچھا ہی ہوگا— مرتے مرتے بھی بہت سے لوگوں کی دیہاڑی کھری کرا گیا ہے۔ تم نے کتنے نمٹائے— ؟'' میدے نے جیرے سے پوچھا۔

''سولہ کڑکا دیے ہیں استاد— ابھی بہت کام ہے۔ مگر جو جو انصاف کی، غریبوں کی اور ممبا کی بات کرتا تھا، وہ گاہک ادھار کر گیا ہے۔ خلیفہ جی— باؤ سلیم— کاکا گجر— ٹنڈا باقر خانی والا— صرف جمیل کلرک نقد دے گیا ہے— مگر سارے لکھی— میرا مطلب ہے جتنے بھی لا کھ چی— آئے— ادھار پھڑ کائے ہیں۔''

''چلو — چلو جلدی نمٹاؤ۔ اب ادھار نہ کرنا — سنا؟''

جیرا چلا گیا تو میدے نے چودھری سے کہا، ''چوری صاحب — بڑی کڑکی ہے آج — اوھار پہ یہ کام چل نہیں سکتا — ہمیں مالش کرنے کے لیے خود کو تیار کرنا پڑتا ہے سرجی — اچھی خوراک لینا پڑتی ہے — خون جلانا ہوتا ہے جی مالش — جانتے ہیں۔ ادھار تو غلط ہے نا سرکار —؟''

''کبھی کبھار تو...'' چوری بولنے لگا تو میدے نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نا چوری صاحب — آپ ایسی بات نہ کریں، بلکہ آج پانچ سو کا نوٹ دے دیں۔ ایک مالش بعد میں کردوں گا۔''

میں بور ہو کر اُٹھ آیا۔ سامنے صاف ستھرے فٹ پاتھ پر پان کی پیک بجھی تھی یا خالی سگریٹ کے پیکٹ۔

آج صبح ہی جس فٹ پاتھ کو کارپوریشن کا عملہ دھوسنوار کر گیا تھا، وہ اب دیکھنے کے قابل بھی نہ تھا — مجھ سے چند قدم آگے ایک ہٹا کٹا آدمی خراماں خراماں چل رہا تھا — اسے تھوکنے کے لیے بار بار رُکنا پڑتا تھا۔ وہ پان نہیں نسوار کو منہ میں رکھے تھا۔ میں نے قدم تیز کیے تو اس نے زور سے کہا، ''دھت تیرے سؤر کے پتر کی — حرام زادے، آج تیرے ٹوٹے کر دوں گا — ڈکرے کروں گا ڈکرے۔''

ایک آدمی سامنے سے اس ہٹے کٹے کو گھورتا صدر نکل گیا۔

وہ وشکرا قسم کا مدہوش سا آدمی گویا اپنے آپ سے کلام کر رہا تھا۔ بولا، ''آج نہیں بچے گا تو میرے ہاتھ سے —'' اس نے عالمِ سکرات میں آسمان کو گھورتے ہوئے کہا، ''زیادہ سے زیادہ پھاہے ہی لگ جاؤں گا ناں؟ بیا شک لگ جاؤں پھانسی — پر تُو آج مرے گا میرے ہاتھ سے۔''

اس آدمی نے کاغذ میں لپٹا کچھ نکال کر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میرے کان الرٹ تھے — میں اس کے برابر آچکا تھا مگر وہ شخص ابھی تک خودکلامی میں ڈوبا تھا، ''سؤر کے پتر — میرا خاندان یوں بھی مرے گا — ووں بھی — تو مجھے پار کرے گا — تو میں بھی آج آر یا پار —''

''کیا ہوا — کیا بات ہے جی؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''آپ کو کیا مسٹر — آپ جاؤ۔''

''آپ بتائیں تو سہی — مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ یہ ہے کہ مجھے آج مارنا بھی ہے اور مرنا بھی ہے۔''

''کیوں مرنا ہے — مرنا آسان بھی نہیں ہے — اور نہ ہی کسی کو مارنا — کسی کو مارنا

ہی خود کو قتل کرنا ہے — آپ ایسا کریں.....''

اس نے میری بات کاٹ کر کہا، ''قتل شتل کو چھوڑیں جی — کلیجا پھٹنے سے بہتر ہے آدمی خودکشی کر کے دکھوں سے چھٹکارا پالے۔''

''غلط! بالکل غلط — آپ اس وقت غصّے میں ہیں — اور غصّے میں کیا ہوا فیصلہ غلط ہوتا ہے — جناب غصہ ایک طاقت ہے اس سے بہت کام لیا جا سکتا ہے۔''

''آپ نے پڑھے لکھوں والی باتیں شروع کر دی ہیں۔ میرے بچے بلک رہے ہیں دودھ کے لیے — دوا کے لیے — ایک ڈینگی بخار میں تڑپ رہا ہے۔ ہمارے پاس صاف پانی تک نہیں ہے — کہتے ہیں سیب کا جوس لاؤ۔ کبھی کہتے ہیں ڈرپ لاؤ — اوپر سے چار مہینے سے کام کروا کر غلام فرید چیمہ نے تنخواہ دینے کی بجائے تھانے میں درخواست دے دی ہے کہ میں نے فیکٹری سے پردے چرا لیے ہیں، بتائیں؟ — ہے ناواجب اس کا قتل؟ اور پھر اپنا بھی؟''

''تو — نہیں — قتل کرنا حرام اور خودکشی بھی حرام۔''

''چھوڑیں صاب جی — آپ گوالمنڈی کا رستہ بتا دیں مجھے۔''

''گوالمنڈی! وہاں کیا ہے؟''

''اُدھر ہی تو ہے غلام فرید چیمہ — جس کا بنے گا آج قیمہ —'' اس نے کاغذ میں لپٹا ہوا خنجر نکال لیا اور بولا، ''یہ خنجر میں آج ہی قیوم کالے کی دکان سے سان پر لگوا کر لایا ہوں۔ ایک ہی وار میں چیمہ اور دوسرے میں یہ گناہ گار —'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر لمبی سانس لی جیسے کوئی آہ کھینچتا ہے — اور کہنے لگا، ''قسم کھا کر گنہ گار ہو جاؤں گا کہ میں نے کچھ کھا لیا ہے حالانکہ قسم سے پیٹ نہیں بھرتا — یقین کریں میں اور میرے گھر کا ہر بچہ دو راتوں اور تین دنوں سے فاقے سے بلک رہا ہے — اور وہ چیمہ میرے پیسے نہیں دے رہا — کیا یہ ظلم نہیں؟''

''سراسر ظلم ہے — بے حد زیادتی ہے — مگر میرے انکل جی — یہ قتل کرنا — اپنا اور اپنے پورے خاندان کا قتل ہے، اگر کوئی زندہ بچ گیا تو دکھوں کی ایک لمبی کہانی شروع ہو جائے گی — آپ سوچتے کیوں نہیں —''

''تین دن سے سوچ ہی تو رہا ہوں —''

''انکل آپ اپنا ارادہ بدل دیں۔''

''ارادہ بدلنے سے میرے بچوں کو دودھ مل جائے گا؟ میرے پیٹ میں کھانا آ جائے گا، میری بیوی کو...'' رُک کر وہ سسک پڑا — پھر بولا، ''بچوں کی بھوک، اُن کا بلکنا، سسکنا، مطالبے،

خواہشیں— کسی باپ سے برداشت نہیں ہو سکتیں جوناب— نہیں ہو سکتیں۔"

"انکل جی— سنیں— جب آپ قتل کر کے خودکشی کر لیں گے تو ان بچوں کی زندگی جہنم سے زیادہ اذیت ناک ہوگی— آپ کی بیوی، بیٹی— یا والدین— مجھے بتائیں اُن کا کیا ہوگا؟"

"اوئے—" وہ چونکا، "یہ تو آپ نے بروقت مشورہ دے دیا ہے— ویری گڈ— مگر ہم نہ ہوں گے تو دیکھے گا کون— چلو اللہ اللہ خیر سلاّ—"

"آپ کو میری بات سمجھ آگئی ہے نا؟" میرا خیال تھا اس نے ارادہ بدل دیا ہے۔

"کوڈی کوڈی سمجھ گیا ہوں جی— میں نے فیصلہ، ایک منٹ میں فیصلہ— جی ہاں— کرلیا ہے— پکا پکا۔"

"شکر ہے آپ نے فیصلہ کرلیا ہے۔" مسکرا کر میں نے کہا، "آپ نے دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔"

"ہاں تو اور— اب پہلے بچوں کو اور پھر بیوی کو ذبح کروں گا— پھر چیمہ اور پھر خود کو— آپ کا شکریہ— آپ کا مشورہ...نمبر ایک ہے۔"

"ارے انکل جی— یہ مشورہ نہیں، خدا کے لیے میری بات کو سمجھیں— میں نے ہر قسم کے تشدد، قتل، خودکشی سے روکنے کے لیے کہا تھا— کہ..."

کوئی ٹولی نعرے لگاتی ہوئی سامنے سے آ رہی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ حاجی امتیاز کی سزائے موت ختم کرو— وہ بار بار نعرے لگا رہے تھے کہ عدالت کا فیصلہ بدلا جائے— حاجی کو رہا کیا جائے۔

"یہ حاجی امتیاز کون ہے؟" وہ شخص فوراً بولا۔

"یہ ایک قاتل ہے— اُس نے قتل کیا تھا، عدالت نے اسے سزا سنائی ہے مگر ان لوگوں کا مطالبہ ہے کہ..." نعرے اس قدر بلند تھے کہ میری آواز دب گئی— اور ٹولی آگے نکل گئی۔ میں نے دل بڑا کر کے اپنی فیس کی رقم سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر انکل سے کہا۔

"اگر آپ میری گزارش اور رب کریم کے احکام پر عمل کریں تو مجھے بھی ثواب ہوگا— آپ یہ پانچ سو روپے سے پہلے گھر والوں کے کھانے کا بندوبست کر آئیں— اور پھر میری بات کے بارے میں فیصلہ کریں، مجھے بھی خوشی ہوگی اور شاید اللہ کریم بھی مہربان ہو جائے۔ کیا خیال ہے؟"

اس نے تھوڑے توقف کے بعد نوٹ لے لیا— ابھی میں نے قدم اور اُس نے بات آگے نہیں بڑھائی تھی کہ دائیں طرف سے چھوٹا سا جلوس بڑے منظم طریقے سے نعرے لگاتا ہوا

ہمارے قریب آنے لگا، ہم دونوں چوکنے ہو کر دیکھنے لگے۔

''چوری چکاری نہیں چلے گی''

''رشوت خوری نہیں چلے گی''

''مہنگائی کو بند کرو''

''آٹا واٹا سستا کرو''

''چینی چور — ہائے ہائے''

''بجلی چور — ہائے ہائے''

''گنڈے چور، آٹا چور، روٹی چور — ہائے ہائے —''

وہ ہٹا کٹا آدمی پورے جوش سے نعروں میں شریک ہو گیا۔

شاید اس کا بھی کتھارسس ہو رہا تھا، وہ ہائے ہائے کہنے والوں میں سب سے نمایاں تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر دو ٹائروں کو آگ دکھائی — اور ایک کھمبے پر دوسروں کے ساتھ مل کر پتھراؤ کرنے کے بعد ٹولی کے ساتھ دور نکل گیا۔

اس کو گوالمنڈی کے راستے کے مخالف جاتے ہوئے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی — شاید وہ اپنا دکھ وقتی طور پر بھول چکا تھا۔ میں اس سرشاری کے باعث راستے کے پہلے بس اسٹاپ پر ایک بنچ پر آ بیٹھا — میں صبح سے اب تک کے واقعات کی بے ترتیبی کو مرتب کرنے لگا تھا کہ لارنس گاڈرن کی طرف سے ایک گاڑی عین اسٹاپ پر آ کر رُکی — اور جنید مسرتوں سے لدا پھندا ڈراپ ہوا — ڈرائیونگ سیٹ پر زرینہ مجید بیٹھی تھی۔

''زرینہ مجید!'' نے مجھے دیکھ کر گاڑی کو سلیقے سے پارک کیا اور اتر کر میرے پاس آئی — اور نفاست سے بولی، ''تم ادھر کیا کر رہے ہو ساجد — لارنس گارڈن کیوں نہیں آئے تم؟''

''مجھے اچھا لگا تھا یہاں بیٹھنا۔''

''اچھا سنو، جنید صولت کو سیکریٹریٹ والی ایک نمبر بس میں بٹھا دینا۔ اسے کچھ ہوش نہیں ہوتا — اکثر غلط بس میں بیٹھ جاتا ہے — او کے؟''

''او کے!''

وہ طمطراق سے چل کر گاڑی میں بیٹھی اور ایک وقار سے ڈرائیو کر کے فریم سے نکل گئی۔

''ملاقات ہو گئی؟'' میں نے کنکھیوں سے دیکھ کر جنید سے پوچھا۔

''لارنس گارڈن میں — وہ مجھے تلاش کرتی ہوئی آئی تھی۔ کمال لڑکی ہے۔''

عجیب ہے کہ ایک موٹر سائیکل بھی سیدھے سبھاؤ ہمارے پاس آکر رُکی۔ ناصر پیچھے بیٹھا تھا، اتر کر غم سے بوجھل قدموں سے ہمارے پاس آیا اور دکھ سے بولا:

''یار— زخمی زبیدہ صہبائی مر گئی۔''

''کون زبیدہ صہبائی؟'' جنید نے لاپروائی سے پوچھا۔

''جس کے لیے اتنا زبردست احتجاج کیا تم نے، جس کے لیے جلوس نکالا، نعرے لگائے— گلے پھاڑے— اور تم نے سب کو لیڈ کیا۔ وہ— وہ زبیدہ صہبائی—''

جنید نے کوئی جواب نہ دیا تو ناصر نے بات بڑھائی۔

''آج رات دس بجے اس کا جنازہ ہے ریواز گارڈن میں— او کے؟''

ناصر اور اُس کا دوست، دونوں چلے گئے تو میں نے جنید سے کہا، ''زبیدہ کے جنازے میں تو شریک ہونا ہی چاہیے۔ خوب صورت، جوان جہان، اکلوتی اور زیرک تھی بے چاری—''

''زرینہ مجید کی آنکھیں کون سی زبان بولتی ہیں یار— شاید آدمی کو خود سے چھین لینے والی زبان ہے کوئی۔'' جنید نے زبیدہ صہبائی کا نام سنا، نہ جنازے کو اہمیت دی، نہ کسی دکھ کا اظہار کیا، نہ افسوس— آنکھوں کے انقلاب میں ڈوب کر وہ مسکرا رہا تھا۔

ساری فضا میں میرے لیے ایک تحیر بچھ رہا تھا۔

○○○

مہر و ماہ اور اختر، آسماں انھی سے ہے

اخلاق احمد

تنویر نے بٹن دبایا تو اپارٹمنٹ کے اندر دور کہیں گھنٹی بجی۔

ریلیکس— ابو جی ہمیشہ کہتے تھے۔ دروازے کے پیچھے نہ جانے کون ہوگا۔ اس کی پہلی نظر تم پر پڑے تو تم مطمئن اور پُر اعتماد نظر آؤ۔

کشادہ گیلری میں ایک گہرا سناٹا تھا۔ مہنگے اپارٹمنٹس کی روایتی خاموشی۔ تنویر کو اپنا کراچی والا اپارٹمنٹ یاد آیا۔ بچوں کا ہنگامہ اور ٹریفک کا شور اور طرح طرح کی آوازیں۔

دروازہ ایک ہلکی سی کلک کے ساتھ کھل گیا۔

تنویر نے دروازہ کھولنے والی عورت پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ دراز قد تھی اور ادھیڑ عمری کی دہلیز پر کھڑی ہوئی تھی لیکن اس کے انداز میں وقار تھا اور شاید تھوڑی سی تمکنت تھی جسے تنویر نے اس پہلی نظر میں خوش حال لوگوں کے قبیلے سے تعلق کی علامت سمجھا۔

"مجھے مسز مہر بانو سے ملنا ہے۔" تنویر نے کہا، "میں کراچی سے آیا ہوں۔ میرا نام تنویر ہے، تنویر اختر۔"

عورت کی نظریں تنویر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ دروازہ کھولتے ہی یوں ساکت ہوگئی تھی جیسے کسی نے اس کو پتھر کی مورتی بنادیا ہو۔ اس کے ملیح چہرے پر حیرت تھی اور چشمے کے نازک فریم سے جھانکتی آنکھوں میں بے یقینی۔

وہ بولی تو اس کی آواز ایک سرگوشی کی طرح تھی، "تم— تم اختر کے بیٹے ہو؟"

تنویر نے سر ہلایا۔

کچھ کہے بغیر مہربانو نے دروازہ کھول دیا۔

ڈرائنگ روم ایک چمکتا دمکتا شوروم تھا جہاں ہر چیز ان چھوئی اور قیمتی لگتی تھی۔ کرسٹل کے گلدان اور شوپیس اور دیوار پر نصب جہازی سائز کا ٹی وی۔ تنویر نے اپنا بریف کیس احتیاط سے شفاف شیشے کی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔

مہربانو اس کے بالکل سامنے، چھوٹے صوفے پر بیٹھ گئی، ''تم تو باہر گئے ہوئے تھے نا، بارایٹ لا کرنے؟''

تنویر نے اپنی حیرت کو چھپا کر کہا، ''جی آنٹی! پچھلے سال آ گیا تھا میں۔''

مہربانو غور سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا، ''میں تو سمجھی تھی، رانا صاحب جلدی آ گئے۔ رانا ہاشم، میرے شوہر ہیں۔ دروازہ کھولا تو تم کھڑے تھے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں—'' وہ بولتے بولتے لمحہ بھر رُکی۔ ''—تم بالکل کاربن کاپی ہو اختر کی۔ تم نے دیکھی ہوں گی پرانی تصویریں اس کی—''

''جی۔'' تنویر مسکرایا، ''ابو کے پرانے دوست تو مجھے چھوٹا اختر کہتے ہیں۔''

مہربانو کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا، ''ہاں، ایک بار مَیں نے فون کیا تھا۔ شاید تین چار سال پہلے۔ مجھے پتا چلا تھا تمھاری امی کے انتقال کا، مگر اس نمبر پر کسی عورت نے کہا کہ اَب یہاں اختر صاحب نہیں رہتے۔ کوئی دوسرا نمبر بھی نہیں تھا اس کے پاس—''

''ہم شفٹ ہو گئے ہیں آنٹی۔'' تنویر نے کہا، ''وہ دادا جان والا مکان بیچ دیا تھا۔ اَب دوسرے علاقے میں اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں—''

مہربانو اُداسی سے مسکرائی۔ ''سب جگہ یہی ہو رہا ہے۔ لوگ پرانے مکان بیچ رہے ہیں۔ پرانے علاقے چھوڑ رہے ہیں۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ اختر کیسا ہے؟''

تنویر نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور رُک گیا۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے اس نے بہت تیاری کی تھی، مگر اَب جیسے اچانک اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ سر جھکائے دبیز قالین کے نقش دیکھتا رہا۔

بہت دیر بعد مہربانو نے لرزیدہ آواز میں پوچھا، ''کب؟''

تنویر نے بمشکل سر اُٹھایا اور کہا، ''چھ مہینے ہو گئے ہیں۔''

''چھ مہینے؟'' مہربانو نے کانپتی ہوئی آواز میں بے یقینی سے دہرایا، ''کیسے ہو سکتا ہے؟''

تنویر نے دیکھا، آنسو مہربانو کی آنکھوں سے نکلتے، قطار در قطار گالوں سے گزرتے، تھوڑی

کی سرحد پار کر کے دوپٹے پر گرتے جاتے تھے۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے آنسوؤں کی راہ روکنے کی، انھیں صاف کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر کچھ بھی اس کے قابو میں نہ تھا۔ وہ کسی طوفان کی زد میں تھی اور اس کا کانپتا بدن اور خاموش گریہ اس کمرے کو یوں ہلائے ڈالتا تھا جیسے کسی آتش فشاں کے پھٹنے سے پہلے ساری زمین ہولے ہولے لرزنے لگتی ہے۔

پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس نے تنویر کی طرف دیکھے بغیر کہا، ''میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ تیز تیز قدموں سے، تقریباً بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

تنویر دم بخود بیٹھا رہا۔

سب کچھ ایک خواب جیسا تھا۔ مہربانو کو پہلی بار دیکھنا۔ اس سے باتیں کرنا۔ اسے ابوجی کے رُخصت ہوجانے کی خبر سنانا۔ اور پھر ان آنسوؤں کو دیکھنا جو ایک دل میں پوشیدہ دُکھ کو آشکار کرتے تھے۔

تین ماہ پہلے اُس نے مہربانو کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کسی سے مشورہ کیے بغیر۔

تین ماہ پہلے تک وہ مہربانو کے وجود سے بھی نا آشنا تھا۔ ابوجی ایک ذہین آدمی تھے۔ ایک کامیاب وکیل۔ تیس برس کی پریکٹس کا اعتماد ان کی شخصیت میں، ان کے قہقہے میں اور ان کی گفتگو میں جھلکتا تھا۔ ایک تنویر ہی کیا، شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اعتماد کی اس فصیل کے پیچھے کیا ہے۔

وہ فولڈر تنویر کو چیمبر کی دیوار گیر الماری میں ملا تھا جہاں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ قانون کی کتابیں، دنیا بھر کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے، آئینی کتابیں، ثالثی اور خاندانی تنازعات اور کمپنی قوانین کی کتابیں۔ اور انھی کے درمیان شعری مجموعے۔ عزیز حامد مدنی اور مجید امجد اور فیض اور کلاسیکی شاعروں کے مجموعے۔ قانون اور شاعری، دونوں ابوجی کے شوق تھے۔

چمڑے کے اس پرانے فولڈر میں پانچ چھ خاکستری لفافے تھے۔ اور ان لفافوں میں ایک پورا جہاں آباد تھا۔ محمد اختر صدیقی ایڈووکیٹ کی دنیا — جس کی خبر کسی کو نہ تھی۔ غزلیں، جو کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ بے نام خطوط، جو کبھی پوسٹ نہیں کیے گئے۔ چھوٹی بڑی بے شمار نظمیں، جنھیں تاریخ کے حساب سے ترتیب وار دیکھا جاتا تو ایک داستان کے خال و خد واضح ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ تہ کیے ہوئے پرانے کاغذات، کاپیوں اور رجسٹروں سے پھاڑے گئے صفحات۔ آرٹ پیپر پر کتابت شدہ چند غزلیں۔ کسی ماہر خوش نویس کے ہاتھوں کئی مختلف انداز سے لکھا ہوا عنوان ''مہر و ماہ''، جو مجموعۂ کلام کا نام ہوسکتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پُرزے، جن پر متفرق اشعار اور مصرعے لکھے ہوئے

تھے۔ ایک پرانا شادی کارڈ۔ عزیزی مہربانو ہاشمی کی شادی خانہ آبادی رانا محمد قاسم کے فرزند رانا محمد ہاشم کے ساتھ ہونا قرار پائی ہے۔ ایک خستہ کاغذ، جس پر سبز روشنائی سے بار بار لکھا تھا۔ مہرو ماہ اور اختر، آسماں انھی سے ہے۔ مہرو ماہ اور اختر، آسماں انھی سے ہے۔ سمجھ میں نہ آنے والی بہت سی گتھیوں کو وہ بے نام خطوط سلجھاتے تھے جن میں سے کچھ بہت مختصر تھے، کچھ بے حد طویل۔ کئی برسوں پر محیط یہ خطوط ایک تنہا آدمی کے سفر کی داستاں تھے۔ ہجر کی سرزمین پر ختم نہ ہونے والے سفر کی داستاں۔

تنویر اس رات بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔

طرح طرح کے خیالات ہر جانب سے یلغار کرتے تھے۔ کیا ابو کے قہقہے اور محفل آرائی اور چہرے پر چھایا اطمینان، سب مصنوعی تھا؟ کیا کوئی آدمی اپنے اندر کی اُداسی کو اس خوبی سے چھپا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ شب وروز بسر کرنے والوں کو خبر ہی نہ ہو؟ پچیس، تیس برس تک خبر نہ ہو؟ کون تھی یہ مہربانو ہاشمی جس کے بغیر انھوں نے ایک پوری، بھرپور زندگی گزار دی مگر اس کی یادوں کو چمڑے کے ایک پرانے فولڈر میں محفوظ رکھا؟ کارڈیو ویسکولر ہسپتال کے ایمرجنسی یونٹ میں اس دنیا سے رُخصت ہوتے وقت انھوں نے کس کس کو یاد کیا تھا؟ سوالات تھے جو تنویر کو سونے نہیں دیتے تھے۔ اسے پریشان کرتے تھے۔ ضدی گداگروں کی طرح اس کا دامن کھینچتے تھے۔ یہ سب انھوں نے اپنے اس لاچیمبر میں کیوں رکھا ہوا تھا جس کا کنٹرول وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے کو دے چکے تھے؟ کیا وہ چاہتے تھے کہ اس دنیا میں کم ازکم ایک شخص یہ اَن کہی داستان سن لے؟

تنویر خیالوں میں گم تھا کہ اچانک پردہ ہلا اور مہربانو کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا آیا۔

''آئی ایم سوری۔'' مہربانو نے کہا۔'' تم پریشان ہو گئے ہو گے، مگر میں بالکل ذہنی طور پر تیار نہیں تھی کوئی صدمہ برداشت کرنے کے لیے۔ اتنا اچانک—'' چشمے کے پیچھے وہ آنکھیں تھوڑی سی متورم نظر آتی تھیں۔ تھوڑی سی سرخ بھی۔ وہ یقیناً کسی باتھ روم میں جی بھر کر رو لینے کے بعد ہاتھ منہ دھوکر، تازہ دم ہو کر آئی تھی۔

''معذرت تو مجھے کرنی چاہیے۔'' تنویر نے کہا،''میں اچانک آ گیا آپ کو رُلانے کے لیے—''

مہربانو نے چائے بناتے بناتے کہا،''اچھا، دیکھو، یہ چائے میں تمھیں یوں ہی پلا رہی ہوں۔ یہ جو الّم غلّم ٹرالی پر رکھا ہے، اسے کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ بھوک خراب ہو جاتی ہے۔ ابھی

راناصاحب آنے والے ہوں گے۔ تم ان سے مل کر، رات کا کھانا کھا کر جاؤ گے۔ از دیٹ کلیئر؟"

تنویر نے سر ہلایا۔

مہربانو نے کہا، "دوسری بات یہ ہے کہ—" وہ بولتے بولتے لمحہ بھر کو رُکی۔ "—میں فی الوقت رونا نہیں چاہتی۔ پتا نہیں تم سمجھ پاؤ گے یا نہیں۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تم پہلی بار گھر آئے ہو—"

تنویر نے کچھ کہے بغیر اپنا بریف کیس کھولا اور اس کے اندر ترتیب سے رکھی کتابوں میں سے ایک نکال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مہربانو کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر اس نے کتاب مہربانو کو تھما دی۔ "ابو کا مجموعہ کلام ہے آنٹی۔ پچھلے ہفتے ہی چھپ کر آیا ہے۔ ان کے سب دوستوں میں تقسیم کر رہا ہوں۔"

وہ چائے پیتا رہا۔ مہربانو ورق گردانی کرتی رہی۔ کسی صفحے پر وہ ٹھٹک کر رُک جاتی تھی۔ کسی پر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتی تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کے رنگ بج جاتے تھے۔ کبھی کسی گہری اُداسی کے بادل چھا جاتے تھے۔ ایک دو مرتبہ اس نے سر جھٹک کر تیزی سے صفحہ پلٹ دیا۔ کتاب کے آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے اس نے کچھ صفحات کو اُوپر سے نیچے تک بار بار دیکھا اور ایک اُداس سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر سایہ فگن رہی۔

کتاب ایک جانب رکھ کر اس نے تنویر پر ایک نظر ڈالی۔

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

مہربانو نے کہا، "اختر کے جیتے جی تو یہ کتاب نہیں چھپ سکتی تھی۔"

تنویر نے کہا، "ان کے جیتے جی تو میں یہ غزلیں، نظمیں دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔"

"لیکن اچھا کیا تم نے۔" مہربانو نے سوچتے ہوئے کہا، "وقت گزر جاتا تو یہ سب ضائع ہو جاتا۔ اختر کو خبط تھا اپنی شاعری چھپا کر رکھنے کا۔"

"جی، آنٹی۔" تنویر نے کہا۔

"بہت خوب صورت کتاب چھاپی ہے تم نے۔" مہربانو نے کہا، "ترتیب میں بھی سلیقہ نظر آتا ہے۔"

"پبلشر کا کمال ہے آنٹی۔" تنویر مسکرایا۔ "ایک پرانا دوست ہے۔ اسی نے کیا ہے سارا کام۔"

"اور اس کا نام کس نے رکھا ہے؟" مہربانو کی نظریں تنویر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ابو نے۔'' تنویر نے آہستہ سے کہا، ''پرانے کاغذوں میں کچھ اُدھورے ڈیزائن موجود تھے، کتابت شدہ—''

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔

پھر تنویر نے کہا، ''اپنے چیمبر میں سنبھال کر رکھے تھے ابو نے سب کاغذات۔ غزلیں، نظمیں اور نہ جانے کیا کچھ۔ بالکل نجی چیزیں تھیں۔ ایک دو دن تو میری عجیب کیفیت رہی۔ جیسے آدمی بیک وقت شرمندگی اور صدمے کے عالم میں ہو—''

''شرمندگی؟'' مہربانو نے تیز آواز میں کہا، ''کس بات کی شرمندگی؟ کہ تمھارا باپ شاعری کیوں کرتا تھا؟ صرف وکیل کیوں نہیں تھا؟ یا اس بات کی شرمندگی کہ وہ عشق جیسی فضولیات میں—''

''اس بات کی شرمندگی...'' تنویر نے کہا، ''کہ مجھے کبھی پتا ہی نہیں چل سکا کہ ابو ایک تنہا آدمی ہیں۔ انھوں نے کبھی پتا ہی نہیں چلنے دیا۔ ان کاغذات میں اور بھی بہت کچھ تھا آنٹی۔ بے نام خطوط تھے جو تواتر سے لکھے جاتے رہے۔ یوں جیسے کوئی اپنی تنہائی کا اور محرومی کا ریکارڈ مرتب کرنا چاہتا ہو۔ اپنے سینے کا بوجھ اُتارنا چاہتا ہوتا کہ عام لوگوں کی طرح زندگی گزار سکے—''

مہربانو اسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا، ''تم اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتے ہو۔ آخر اختر کے بیٹے ہونا!''

دروازے کی اطلاعی گھنٹی اچانک بجی اور پھر بجتی ہی چلی گئی۔ یوں لگتا تھا، کوئی دروازہ توڑ کر اندر آنا چاہتا ہے۔

''آ گئے رانا صاحب۔'' مہربانو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اتنا شور وہی مچا سکتے ہیں۔''

مہربانو دروازہ کھولنے گئی تو تنویر کو وہ خط یاد آیا۔ ابو کے بے شمار خطوط میں سے ایک خط۔ انھوں نے لکھا تھا، ''کبھی کبھی ایک خوف دل کو جکڑ لیتا ہے۔ اگر کبھی اس سے ملاقات ہوگئی تو کیا ہوگا؟ زندگی کے اتنے بہت سے برس گزر جانے کے بعد اگر قسمت نے یا کسی اتفاق نے ہمیں ایک دوسرے کے مقابل کردیا تو کیا ہوگا؟ خدا کرے، ایسا کبھی نہ ہو۔ خدا کرے، مجھے کبھی نارمل اور خوش و خرم نظر آنے کی اداکاری نہ کرنی پڑے۔ اُس کی اداکاری نہ دیکھنی پڑے۔ مگر دُعاؤں سے کیا ہوتا ہے؟ آج تک دُعاؤں سے کیا ہوسکا ہے؟''

دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

خوش قامت، باوقار مہربانو اور ایک بے حد فربہ، بے ڈول رانا ہاشم، جو صورت سے ہی

باتونی اور ہنسوڑ اور اپنے عشق میں گرفتار لگتا تھا۔ کڑکڑاتے سفید کرتا شلوار اور سیاہ واسکٹ میں پھنسا ہوا رانا ہاشم۔

''یہ اختر بھائی کا بیٹا ہے۔'' مہربانو نے کہا۔

''بھئی اپنا، بہت خوشی ہوئی۔'' رانا ہاشم نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، ''اتفاق کی بات ہے بالکل، کہ کبھی ملاقات نہیں ہو سکی اپنا، اختر بھائی سے۔'' وہ ہنسا۔ ''مصروفیت ہی اتنی رہتی ہے۔''

'اپنا، یقیناً اس کا تکیہ کلام تھا۔

''اختر بھائی کا انتقال ہو گیا ہے پچھلے سال۔'' مہربانو نے کہا، ''دور کے کزن تھے ہمارے۔''

کزن؟ تنویر حیران رہ گیا۔

رانا ہاشم صوفے میں دھنس گیا۔ ''بھئی دیکھو اپنا، نوجوان۔ میں اتنا شرمندہ رہتا ہوں اپنی بھاگ دوڑ کی وجہ سے۔ نہ اپنے خاندان والوں سے مل پاتا ہوں نہ بیوی کے گھر والوں سے۔ زندگی اپنا، گھن چکر بن کر رہ گئی ہے۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی — اَرے ہاں، پہلے فاتحہ نہ پڑھ لیں اختر بھائی کے لیے؟''

دُعا مانگنے کے لیے ہاتھ اُٹھائے اُٹھائے تنویر نے دیکھا، رانا ہاشم کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے اور اس نے دونوں ہاتھوں کو یوں آسمان کی جانب پھیلا رکھا تھا جیسے اپنی درخواست کی فوری قبولیت کا خواہاں ہو۔ مہربانو نے دوپٹے سے سر ڈھانپ رکھا تھا اور سر جھکا رکھا تھا۔ پورا منظر عجیب وغریب تھا۔ تنویر نے خود سے کہا۔ عجیب وغریب اور ناقابلِ یقین۔ جیسے کسی فیملی کورٹ سے ملحق کمرے میں ایک عورت کے دو دعوے داروں کو مصالحت کا آخری موقع دیا گیا ہو، جیسے — جیسے وہ ابو جی کی نمائندگی کرنے آیا ہو۔ تنویر نے سر جھٹک کر ان خیالات سے جان چھڑائی۔

مہربانو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

''چائے تو پلوا دو۔'' رانا ہاشم نے کہا، ''اور یہ ٹرالی کہاں لے جا رہی ہو؟''

''کچن میں۔'' مہربانو نے کہا، ''تاکہ یہ آپ سے دور رہے۔ چائے بھجواتی ہوں ابھی۔''

''ایک گلاب جامن تو دیتی جاؤ۔''

مہربانو نے رُک کر ٹرالی میں سے ایک بسکٹ اُٹھایا اور رانا ہاشم کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' رانا ہاشم نے کہا، ''میں گلاب جامن مانگ رہا ہوں اور تم——''
مہربانو ٹرالی سمیت باہر نکل گئی۔
''دیکھ رہے ہو تم؟'' رانا ہاشم نے کہا، ''اسی لیے سیانے کہتے ہیں اپنا، کہ حق مانگنے سے نہیں ملتا۔ چھیننا پڑتا ہے۔''
تنویر مسکرایا۔ ''شوگر کا مسئلہ ہوگا آپ کو۔''
رانا ہاشم نے کہا، ''او یار، شوگر کا مسئلہ بالکل کنٹرول میں ہے۔ دوپہر میں انسولین لے چکا ہوں۔ مگر اپنا، تنویر بیٹا، شادی کو بیس پچیس سال گزر جائیں نا، تو یہی ہوتا ہے۔ بیوی گلاب جامن کے بجائے بسکٹ پکڑا دیتی ہے اور اپنا، آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔'' اس نے قہقہہ مارا۔ تنویر بھی اخلاقاً ہنسا۔
اگلا ایک گھنٹا یوں ہی گزرا، رانا ہاشم کی گفتگو اور قہقہوں کے درمیان۔ اور کیوں کہ وہ ایک نہایت باتونی اور اپنے آپ سے عشق کرنے والا اور اپنی کامیابیوں کے نشے میں چُور رہنے والا آدمی تھا، لہٰذا اس ایک گھنٹے میں تنویر کو سب کچھ پتا چل گیا۔ ان کے دو ہی بچّے تھے۔ بیٹی کی شادی گجرات کے ایک فوجی گھرانے میں ہو چکی تھی۔ بیٹا چار سال سے لندن میں تھا اور تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ رانا ہاشم تعمیراتی ٹھیکے داری کرتا تھا۔ اُس کے پاس کروڑوں کی تعمیراتی مشینری تھی جس کی بدولت وہ رہائشی منصوبوں کے اندرونی ترقیاتی کاموں کے اور سڑکوں کے اور پُلوں کے بڑے بڑے ٹھیکے حاصل کرتا تھا۔ اس کے بلند قہقہوں کے دوران ہی تنویر کو پتا چلا کہ وہ ہائی بلڈ پریشر اور انجائنا کے مسائل سے بھی دوچار ہے اور اسے دنیا کی تمام سبزیوں سے نفرت ہے اور بیشتر ماہر ڈاکٹر نہایت اَحمق ہیں۔
مہربانو نے جب کھانا لگنے کا اعلان کیا، اس وقت رانا ہاشم اسے بتا رہا تھا کہ کتنے وفاقی سیکرٹری اور صحافی اور آرکان اسمبلی اس کے ذاتی دوستوں میں سے ہیں۔
کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہی رانا ہاشم نے کہا، ''واہ جی واہ۔ آج تو اپنا، بڑا خاص اہتمام کیا ہے بھئی۔''
''پہلی دفعہ آیا ہے تنویر۔'' مہربانو نے کہا، ''کیوں نہ کرتی اہتمام؟''
تنویر نے میز پر سجے کھانوں کو دیکھا۔ پلاؤ، شامی کباب، ماش کی دال، بھنا ہوا گوشت۔ حیرت کی کوئی لہر تھی جو اس کے اندرون سے اُٹھتی تھی اور سارے بدن میں سفر کرتی جاتی تھی۔ مہربانو نے یہ سارا اہتمام کسی اور کے لیے کیا تھا۔ کسی ایسے شخص کے لیے، جس کی پسند ناپسند کو وہ

یوں جانتی تھی جیسے آدمی اپنے ہاتھ کی لکیروں کو جانتا ہے۔

تنویر کی پلیٹ میں پلاؤ ڈالتے ہوئے مہربانو نے کہا، ''پتا نہیں، تمھیں پسند آئے گا یا نہیں۔ اختر کو تو... اختر بھائی کو تو بہت پسند تھا پلاؤ۔''

''جی۔'' تنویر نے کہا، ''انھیں ماش کی دال اور کباب بھی بہت پسند تھے اور...''

رانا ہاشم نے کہا، ''تنویر بیٹا، یہ اپنا، کباب تو دینا ذرا۔''

''بالکل مت دینا۔'' مہربانو نے سختی سے کہا، ''اور یہ گوشت بھی ان سے دور رکھنا۔''

رانا ہاشم نے بے بسی سے کہا، ''او بھائی، کبابوں میں کیا خرابی ہے؟''

''خرابی کبابوں میں نہیں، آپ میں ہے۔'' مہربانو نے کہا، ''تنویر کی وجہ سے آج آپ کو رعایت مل گئی ہے پلاؤ کھانے کی۔ ورنہ—''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' رانا ہاشم نے پلاؤ پر حملہ آور ہوتے ہوئے کہا، ''ایک دن آئے گا جب تم اپنا، پچھتاؤ گی۔ یہ ساری پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔''

مہربانو کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ''اچھا جی؟''

''جس دن رانا مقبول آئے گا۔'' رانا ہاشم ہنسا۔ ''ہمارا ولی عہد۔ اور اپنے ابا جی کو ان پابندیوں سے آزاد کرائے گا۔ تم اپنا، دیکھتی رہ جاؤ گی۔''

تنویر نے دیکھا، مسکراہٹ مہربانو کے چہرے سے یوں رُخصت ہوئی جیسے پیاسی زمین پر چھایا بادل کا مہربان سایہ اچانک ہٹ جاتا ہے اور تیز، تکلیف دہ دُھوپ راج کرنے لگتی ہے۔

مہربانو نے سر جھکائے جھکائے کھانا کھاتے ہوئے آہستہ سے کہا، ''وہ نہیں آئے گا رانا صاحب۔''

ذرا دیر کو ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ چمچوں کانٹوں کے پلیٹ سے ٹکرانے کی آوازیں اور خاموشی۔

اس خاموشی کو رانا ہاشم نے ایک پھیکے سے قہقہے کے ذریعے توڑا۔ ''بس چار پانچ مہینے کی بات ہے۔ پرسوں ہی اپنا، اُس سے بڑی لمبی بات ہوئی تھی۔ چار پانچ مہینے میں—''

مہربانو نے سرد، ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا، ''یہ چار پانچ مہینے کب سے چل رہے ہیں؟''

رانا ہاشم نے چمچے کے ذریعے پلاؤ کی ایک بڑی بوٹی سے لڑتے ہوئے کہا، ''او بابا، انگلینڈ کی پڑھائی ہے۔ اپنا، مذاق نہیں ہے۔ ٹائم تو لگتا ہے۔ یار تنویر بیٹا، تم ہی سمجھاؤ۔''

''یہ کیسے سمجھائے گا۔'' مہربانو نے کہا، ''یہ خود وہیں سے بار ایٹ لا کر کے آیا ہے۔''

رانا ہاشم لمحہ بھر کو ساکت بیٹھا رہ گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا، ''اچھا، اچھا، ویری گڈ بھئی۔ یار اپنا، اتنی دیر سے بتایا ہی نہیں۔ کون سی یونی ورسٹی تھی بھئی — ؟''

تنویر نے کہا، ''کنگز کالج ہے جی۔ لندن میں — ''

''چوتھا سال ختم ہو رہا ہے۔'' مہربانو کی نظریں اپنی پلیٹ پر مرکوز تھیں۔ ''اُصولاً تو دو ڈھائی سال میں اسے ماسٹرز کی ڈگری مل جانی چاہیے تھی، مگر مجھے لگتا ہے کہ اس نے پڑھائی کا جھگڑا پالا ہی نہیں ہے۔''

رانا ہاشم نے کم زور آواز میں کہا، ''اَب خیر ایسا بھی اندھیر نہیں ہے کہ — ''

مہربانو نے ایک نظر رانا ہاشم پر ڈالی اور کہا، ''جسے اپنے باپ کی طرف سے ہر مہینے ہزار ڈیڑھ ہزار پونڈ باقاعدگی سے ملتے رہتے ہوں اور جس کے پاس اپنی کار ہو اور جسے معلوم ہو کہ وہ ایک بہت بڑے کاروبار کا وارث ہے، وہ پڑھائی کیوں کرے گا؟''

یاد کے نہاں خانوں سے ایک خیال اُبھرا۔ تنویر کو پرانے فولڈر میں محفوظ ایک خط یاد آیا۔ ابو جی نے لکھا تھا، ''دیکھنے میں وہ اتنی نازک سی ہے جیسے کانچ کی بنی ہوئی ہو، مگر اندر سے بے حد مضبوط۔ آج پلٹ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ خود میں نے اس نازک سی لڑکی سے ارادوں کو مضبوط رکھنے کے اور غلط بات کو بہ بانگ دہل غلط کہنے کے کتنے ہی سبق سیکھے ہیں، مگر میں اندر ہی اندر خوف زدہ رہتا ہوں۔ نہ جانے اس عادت نے اُسے کتنا نقصان پہنچایا ہوگا۔ نہ جانے زندگی نے اُسے کتنی سزا دی ہوگی۔ کیا خبر، وہ سارا کانچ اَب کرچیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہو۔ مگر یہ سب بھی تو ایک مفروضہ ہی ہے۔ محض ایک اندیشہ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ جیت گئی ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنی ذہانت اور اپنی قوتِ ارادی کے ذریعے زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا ہو۔''

کمرے میں ایک تکلیف دہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔

مہربانو نے کہا، ''وہ اُس دن واپس آئے گا، جس دن آپ چاہیں گے۔''

رانا ہاشم نے زخمی نظروں سے تنویر کو دیکھا۔ ''او بھائی، میں تو خود اسے جلد از جلد بلانا چاہتا ہوں۔ لیکن اَب اپنا، اُس کا کان پکڑ کر تو نہیں لا سکتا۔ جوان بچہ ہے — ''

''جوان بچے کیا واپس نہیں آتے — ؟'' مہربانو کی آواز نرم تھی مگر اس میں تلخی نمایاں تھی۔ ''تم بتاؤ تنویر بیٹا۔ تم کیوں واپس آ گئے؟''

''میں — ؟'' تنویر نے گھبرا کر کہا، ''میں تو بس — پڑھائی ختم ہو گئی تھی اس لیے — پھر ابو

یہاں اکیلے تھے۔''

''ایک وجہ تو یہ تھی۔ ٹھیک ہے۔'' مہربانو نے کہا، ''دوسری وجہ؟''

تنویر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مہربانو اور رانا ہاشم کی نظریں اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ رانا ہاشم کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ یوں جیسے کوئی اہم سودا اُس کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہو۔ اور مہربانو مطمئن نظر آتی تھی۔ کسی شفیق ٹیچر کی طرح، جو کلاس کو ایک اہم نکتہ ذہن نشین کرانا چاہتی ہو۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا، لیکن اس کی آنکھیں جیسے کچھ کہتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک اُمید تھی جو لو دیتی تھی اور ایک پیغام تھا جو کسی سرگوشی کی طرح سنائی دیتا تھا۔

تنویر نے اس ایک لمحے میں بہت کچھ جان لیا۔ اُس پوری داستان کو سمجھ لیا جو گزر جانے والے وقت کی راہ گزر پر جگہ جگہ بکھری پڑی تھی۔ اُس تعلق کی بے پناہ قوت کو دیکھ لیا جس نے برسوں پر پھیلے سارے فاصلے اور ساری دوری کے باوجود ابوجی اور مہربانو کو ایک ریشمی ڈور سے باندھے رکھا تھا۔ چشمے کے نازک فریم سے جھانکتی اُس نظر کو پہچان لیا جو تنویر کے چہرے پر مرکوز تھی لیکن دراصل اس چہرے میں کوئی اور چہرہ ڈھونڈتی تھی۔ اور اتفاقات کی بھول بھلیوں میں کسی شرارتی بچے کی طرح بھاگتے اُس بھید کو جان لیا جو کسی خاص وقت، کسی خاص لمحے، کوئی خاص ڈیوٹی انجام دینے کے لیے انسان سے اچانک آ ٹکراتا ہے۔

''دوسری وجہ یہ تھی۔'' تنویر نے آہستہ سے کہا، ''کہ وہاں زندگی بہت سخت تھی۔ اتنی سخت کہ یہاں اُس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لرزا دینے والی زندگی۔''

کمرے میں ایک سناٹا سا چھا گیا تھا۔

''پانچ، چھ پاؤنڈ فی گھنٹا کی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں اور ہڈیوں میں اُتر جانے والی سردی اور ایک نظر نہ آنے والا تعصب اور— اور گھر سے دور ہونے کا اور محروم ہونے کا اور بے سہارا ہونے کا احساس جو آدمی کو ایک مسلسل، کبھی ختم نہ ہونے والے دُکھ سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔''

رانا ہاشم ساکت بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے کسی لاعلم شخص کے سامنے کوئی تکلیف دہ حقیقت پہلی بار کھلتی جا رہی ہو۔

تنویر نے کہا، ''گیارہ قریبی دوست تھے میرے۔ ان میں سے آٹھ تعلیم مکمل کرتے ہی واپس آ گئے۔ تین وہیں رُک گئے۔ ان تینوں میں سے ایک وزیرِ اعظم کا بھتیجا تھا۔''

''وزیرِ اعظم کا؟'' رانا ہاشم نے تڑپ کر پوچھا۔

''یس۔ سگا بھتیجا۔ باقی دو بھی بہت دولت مند گھرانوں کے تھے۔ وہاں وہی رُک سکتا ہے

جسے مین اسٹریم کی اچھی ملازمت مل جائے، اچھی تنخواہ والی ملازمت۔ یا وہ، جسے گھر والوں کی طرف سے خرچا ملتا ہو۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہے وہاں رہنے کی۔"

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

پھر مہربانو نے اچانک کہا، "کن باتوں میں اُلجھا دیا ہم نے تمھیں۔ چھوڑو اس قصے کو۔" اس نے ایک ڈش تنویر کی جانب بڑھائی۔ "کئی مہینے بعد میں نے بنایا ہے یہ بھنا ہوا گوشت۔ رانا صاحب کے پرہیز کے چکر میں ایسی چیزیں پکتی ہی نہیں ہیں۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔ یوں جیسے وہ تناؤ بھری فضا اردگرد موجود ہی نہ ہو۔

تنویر کو ایک اور پرانا مکتوب یاد آیا۔ ابوجی نے لکھا تھا۔ "وہ روٹھتی بھی ہے تو بس ایک خاص حد تک، ایک خاص وقت تک۔ ایک بے حد سمجھ دار استانی کی طرح۔ کہاں مسکرانا ہے، کہاں آنکھوں کے دریچے میں بے مہری کو سجانا ہے، کہاں خاموش رہ کر نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبانا ہے، کہاں بحث کے دوران اچانک کسی دوسرے کام میں مشغول ہوجانا ہے۔ استانی جانتی ہے کہ کہے بغیر اپنی بات کیسے کہی جائے۔ اور یہ بھی کہ سزا کو جرم سے بڑا نہیں ہونا چاہیے۔"

تنویر کو کچھ یاد نہ رہا کہ باقی وقت کیسے گزرا۔ وہ کسی اور نگر میں تھا۔ کسی اور دنیا میں۔ بظاہر وہ اسی کمرے میں موجود تھا۔ باتیں کرتا، سوالوں کے جواب دیتا، مہربانو اور رانا ہاشم کی گفتگو غور سے سنتا، اپنی باتوں سے انھیں چونکاتا اور ہنساتا اور حیران کرتا۔ مگر دراصل وہ کہیں اور تھا۔ بیت جانے والی زندگی کی دُھندلی راہداریوں میں ابوجی کی انگلی تھامے، وہ ایک ننھے بچے کی طرح آگے بڑھتا جاتا تھا اور اس نئی دنیا کو حیرت سے اور خوشی سے دیکھتا جاتا تھا جہاں ہر دریچے سے، ہر نیم وا دروازے سے مہربانو جھانکتی تھی اور مسکراتی تھی۔

رات گئے اس نے اجازت طلب کی تو رانا ہاشم نے کہا، "بھئی اپنا، دیر بہت ہوگئی ہے۔ میں چھوڑ آتا ہوں تمھیں۔"

تنویر نے کہا، "آپ بالکل تکلف نہ کیجیے۔ سامنے مرکز میں درجنوں ٹیکسیاں—"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" رانا ہاشم نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا، "ڈرائیور جاچکا ہے، لیکن میں اپنا، خود زبردست ڈرائیونگ کرتا ہوں۔"

وہ گاڑی کی چابی لینے اندر چلا گیا۔

مہربانو نے دروازے کے پاس پہنچ کر کہا، "آتے رہنا بیٹا۔"

"جی، بالکل آتا رہوں گا۔" تنویر نے کہا۔

مہربانو اسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا، ''تم سے بات کرنا، کمیونیکیٹ کرنا اتنا آسان لگتا ہے، بالکل اختر کی طرح۔ کہے بغیر میری بات سمجھ لیتا تھا وہ۔''

تنویر خاموش کھڑا رہا۔

مہربانو کے ہونٹ کپکپائے۔ یوں جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے، ایک سرگوشی کے انداز میں کہا، ''تم— تم میرے بیٹے ہو سکتے تھے— جانتے ہو نا؟''

تنویر نے ان آنکھوں کو دیکھا جن کی چلمن سے نمی جھانکتی تھی اور کہا، ''میں آپ ہی کا بیٹا ہوں!''

رانا ہاشم اسی وقت چابی لہراتا کمرے میں داخل ہوا۔ ''چلو بھئی۔''

مہربانو نے تنویر کا ماتھا چوما اور رُندھی ہوئی آواز میں کہا، ''وعدہ کرو، جب بھی اسلام آباد آؤ گے تو یہاں—''

''اوبابا، ضرور آئے گا۔'' رانا ہاشم ہنسا۔ ''کیوں نہیں آئے گا۔ ایک تو تم عورتوں کو بات بات پر رونا بہت آتا ہے۔ چلو اپنا، بیٹا تنویر، تمھیں بلٹ پروف گاڑی کی سیر کرائیں۔''

تنویر اُس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔

○○○

یخ رات کا ایک ٹکڑا

مُبین مرزا

تو عزیزو، میں تمھیں اُس یخ رات کا واقعہ سنا رہا ہوں جو برسوں بلکہ دہائیوں سے میری یادوں کی کٹھالی میں پڑی ہے اور اس کی ٹھنڈک آج بھی میری ریڑھ کی ہڈیوں میں سرسراتی ہے، بلکہ ٹھنڈک ہی نہیں، اس کا گاڑھا دودھیا دُھواں جس میں ایک خوشبو بھی شامل ہے، آج بھی میرے سینے میں بھرا ہوا ہے— لیکن سب سے پہلے میں تمھیں یہ بتا دوں کہ جو کچھ میں سنا رہا ہوں، یہ حرف بہ حرف سچا واقعہ ہے اور میں خود اس واقعے کا ایک کردار ہوں۔ اگرچہ اس واقعے میں میری حیثیت بہت معمولی ہے لیکن اس کے بڑے بڑے اور غیر معمولی کرداروں کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور میں اُن کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں اور بتا سکتا ہوں۔ یہ کردار عجیب ہیں اور ان کی واردات بھی— اور آج میں تم سے یہی واردات بیان کرنے بیٹھا ہوں۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا، یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ مجھے من گھڑت باتیں بنانے اور کہانیاں بنانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس کی وجہ بھی صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔ اصل میں میرے ساتھ ماجرا یہ گزرا کہ میں نے اپنا پورا بچپن کہانیاں سنتے اور جوانی کہانیاں پڑھتے اور اس سے آگے کی عمر کہانیاں دیکھتے ہوئے گزاری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کچھ کرداروں سے بہت مانوس ہوگیا، یہاں تک کہ اُن میں سے بعض کو اپنے بہت قریب محسوس کرنے لگا، اتنا کہ وہ کبھی کبھی مجھے اپنے بالکل آس پاس محسوس ہوتے اور یہ خیال گزرتا، جیسے وہ کسی بھی وقت میرے سامنے آجائیں گے اور مجھے وہ ساری باتیں بتانے لگیں گے، جن میں سے کچھ میں پہلے سے جانتا ہوں اور جو نہیں جانتا، اُن کو جاننے کی تڑپ دل میں لیے پھرتا ہوں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوسکا۔ اس انتظار میں

میرا بہت سا وقت خراب ہوگیا۔ بس اسی وجہ سے مجھے قصہ سازوں اور کہانی بازوں سے چڑ ہوگئی۔

خیر، اگر بات صرف اتنی ہوتی تو بھی کچھ دن بعد میں اس مسئلے کو ذہن سے جھٹک دیتا اور میرا غصہ ختم ہو جاتا، لیکن میں نے اچانک محسوس کرنا شروع کیا کہ یہ قصہ بازی کرنے والے بہت بکواسی اور نامعقول لوگ ہوتے ہیں۔ انھیں لت پڑی ہوتی ہے اس دنیا کو اور اس کے لوگوں کو اُلٹا سیدھا کر کے دیکھنے کی۔ اسی لیے یہ جیتے جاگتے لوگوں کو کردار بنا کر اُن کے ساتھ کھیل کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اکثر کہانیوں میں دیکھا کہ زندگی ہی کی طرح اُن میں بھی بڑی بے حسی کے ساتھ وہ لوگ عزت دار بن کر بڑے مقام پر آن بیٹھے یا پھر اُن کو لا کر بٹھا دیا گیا جو خود اپنے دلال تھے اور ضمیروں کا بیوپار کرتے تھے۔ اسی طرح بعض کہانیوں میں پوری سفاکی کے ساتھ وہ مرد مار دیے گئے جنھیں زندہ رہنا چاہیے تھا، اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ وہ عورتیں ستی ساوتری بن گئیں یا پھر بنا دی گئیں جو اندر سے گندگی میں سنی ہوئی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ہوا کہ ایسی ایسی عورتوں کو بازار کی رونق کر دیا گیا جن کے دل حقیقت میں پارسائی کی دولت سے مالا مال تھے اور وہ جنھیں اپنے جسم کی لذت سے اتنا بھی سروکار نہیں تھا جتنا پر جھٹکتے پرندے کو اپنے پروں سے جھڑنے والی گرد سے ہوتا ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بازار میں ہوتے ہوئے بھی وہ عورتیں بازاری ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ میں یہ بات مانتا ہوں، خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات میں اُس کے پیدا کیے ہوئے لوگوں کی تقدیر اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ اُن کے نصیب میں جو چاہتا ہے، وہی لکھتا ہے اور آئندہ بھی وہی لکھتا رہے گا۔ میں اُس کی مشیت کے رازوں کو نہیں جانتا، جان ہی نہیں سکتا مگر مانتا بہر حال ہوں۔

اس لیے میں خدا اور اُس کے بندوں اور اُن کی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ البتہ یہ سوال ضرور کرتا ہوں کہ جن کرداروں کی قسمت کسی قصہ گو کے ہاتھ میں ہوتی ہے، وہ آخر اُن کے ساتھ خدا جیسی بے نیازی کا معاملہ کیوں کرتا ہے؟ وہ خود انسان ہے تو پھر اُسے انسانوں کے دکھ درد کا احساس بھی ضرور ہونا چاہیے۔ اگر اسے احساس ہوتا ہے تو پھر وہ یہ کھلواڑ کیوں کرتا ہے؟ کیا واقعی طاقت اور اختیار انسان کو بھی بے نیازی سکھا دیتے ہیں؟ کاش میں کہانی کار ہوتا۔ اگر واقعی ہوتا تو خدا کی اس دکھ بھری بستی کے سامنے، اس کے پیچھے یا دائیں یا پھر بائیں خوش قسمت اور خوش حال لوگوں کی بہت سی نہ سہی، کم سے کم ایک ہنستی مسکراتی دنیا ضرور آباد کرتا۔ افسوس، کہانی کہنا مجھے نہیں آتا۔ کہانی کہنا تو دور کی بات ہے، مجھے تو ایک کردار تک سوچنا نہیں آتا، حتیٰ کہ خود اپنا کردار بھی نہیں۔ اگر وہی آ گیا ہوتا تو میں کم سے کم چھوٹی موٹی ہی سہی مگر ایک

اچھی دنیا ضرور بناتا اور ایک کردار کی کہانی ضرور لکھتا۔

اگر میں کہانی لکھتا تو وہ کہاں سے اور کیسے شروع ہوتی، اس کی بابت میں کچھ ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ جاڑوں کی اُسی رات سے شروع ہوتی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اس کہانی کو میں اس یخ رات کے ایک منجمد ہو جانے والے ٹکڑے کی طرح تم لوگوں کے آگے لا رکھتا۔ اس لیے کہ اُس پوری رات اور آگے چل کر اُس کی کوکھ سے پھوٹتے سارے بڑے بڑے واقعات کو ایک ہی قصے میں سمیٹنا شاید کسی ماہر قصہ گو کے بس میں بھی نہ ہوتا۔ اس لیے کہ مجھے آج تک یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو ایک یخ رات، بہت برس پہلے یا شاید ایک صدی پہلے یا شاید اس سے بھی کچھ اور پہلے اُس پھولوں والی کوٹھی میں اُتری تھی اور پھر ہمیشہ کے لیے وہیں ٹھہر گئی تھی، اُس کا وہ ایک ٹکڑا جو دھوئیں اور خوشبو میں لپٹا ہوا تھا، منجمد ہو کر پھولوں والی کوٹھی کی تقدیر بن گیا تھا۔ یہ رات وہاں کیوں اُتری تھی، میں نہیں جانتا۔ ہاں، میں نے اس کو وہاں ٹھہرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس وقت میری بینائی اچھی تھی، اتنی اچھی کہ میں اُس دھواں بھرے اندھیرے کمرے میں مشرقی دیوار کے ساتھ لگی چارپائی کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ چارپائی پر خالہ فہمی لیٹی ہوئی تھیں۔ خالہ فہمیدہ کو ڈیوڑھی کے سارے گھروں میں فہمی پکارا جاتا اور سارے بچے انھیں خالہ فہمی کہتے تھے۔ ایک صرف میرے نانا تھے جو ہمیشہ انھیں پورے نام سے پکارتے تھے۔

نانا اسکول ماسٹر تھے۔ میں نے تو خیر انھیں کبھی اسکول جاتے نہیں دیکھا، وہ بہت پہلے ریٹائر ہوگئے تھے۔ البتہ میری ماں اور نانی نے بتایا تھا کہ وہ اسکول ماسٹر تھے۔ وہ اکثر ان کی باتیں کرتیں اور بتایا کرتیں کہ انھوں نے بمبئی، بڑودہ اور کرنال کے مختلف سرکاری اسکولوں میں پڑھایا تھا۔ جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آگئے۔ یہاں انھیں شاہدرہ کے ایک اسکول میں لگا دیا گیا تھا جہاں کئی سال تک وہ ہیڈ ماسٹر رہے۔ شاہدرہ اب تو لاہور ہی کا حصہ بن چکا ہے۔ بمبئی، کراچی اور دلّی کی طرح شہر لاہور نے بھی خود کو دُور دُور تک پھیلا لیا ہے۔ ماں کہتی ہے، شاہدرہ اس وقت لاہور کی ایک مضافاتی بستی تھی، بہت کم آبادی والی ایک پُرسکون جگہ۔ نانی نے بتایا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد وہ لوگ کچھ عرصے مہاجر کیمپ میں رہے۔ اس کے بعد بھگوان پورہ جسے اب بہت لوگ اسلام پورہ کہتے ہیں، میں ایک چھوٹا سا مکان رہنے کو مل گیا۔ نانا وہاں سے روزانہ سائیکل پر شاہدرہ جاتے اور ڈھلتی شام کے ساتھ گھر واپس آجاتے۔

ایک دن آکر انھوں نے نانی سے کہا کہ گھر کا سامان سمیٹ لیں اور پھر دو دن بعد وہ سب شاہدرہ منتقل ہوگئے، جہاں انھیں ایک کشادہ مکان مل گیا تھا۔ میں بہت چھوٹا رہا ہوں گا،

جب اس مکان میں ماں کے ساتھ گیا تھا۔ اس کا نقشہ میرے حافظے میں آج بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ اس کا لکڑی کا دروازہ کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا اور اندر کی طرف ایک نیم تاریک گلی میں کھلتا تھا۔ گلی شاید پندرہ بیس گز کی رہی ہوگی۔ اُس سے آگے بہت کشادہ صحن تھا، جس کے جنوبی رُخ پر غسل خانہ تھا اور آگے دو کمرے تھے جن میں سے ایک بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور دوسرا شاید پہلے مہمانوں کے لیے تھا مگر بعد میں نانا اسی کمرے میں اُٹھ آئے تھے۔ شمالی رُخ پر دو بڑے بڑے کمرے تھے جو گھر والوں کے استعمال میں تھے۔ صحن کے مشرقی و مغربی دونوں کناروں پر چوڑی چوڑی کیاریاں تھیں۔ ان میں امرود اور مالٹے کے پیڑ، چنبیلی، سدا بہار، گلاب، گیندے اور رات کی رانی کے پودے تھے۔ مغربی کیاری کے اُس کونے پر جہاں کمرے بنے ہوئے تھے، کدو کی بیل تھی جو برآمدے میں بنے زینے کے ساتھ اوپر چھت تک چلی گئی تھی۔ مکان کے کمرے کشادہ اور اُن کی چھتیں بہت اونچی تھیں۔ شمالی رُخ کے کمروں کے برآمدے کے حاشیے سے زینہ اوپر جاتا تھا جو دونوں کمروں کی جڑواں چھت پر کھلتا تھا۔ چھت پر مردانہ قد سے ذرا اوپر اٹھی چار دیواری کھنچی ہوئی تھی جس میں صحن کے رُخ پر چوڑے پٹ کا دریچہ تھا۔ میں نے اس دریچے کو کبھی کھلا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اس کی کنڈی پر بھی گرد اور زنگ کی ملی جُلی سی تہ جمی ہوئی تھی جو بتاتی تھی کہ مکینوں کو اسے کھولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اسی لیے جب میں نے خالہ فہمی کے واقعے کا سنا تو مجھے بہت حیرانی ہوئی کہ آخر وہاں وہ واقعہ کیسے ہوا — لیکن کہنے والے تو یہی کہتے تھے کہ واقعہ وہیں ہوا تھا۔

خیر، یہ تو بعد کی بات ہے۔ میں بتا رہا تھا کہ اُس رات مشرقی دیوار کے ساتھ لگی چارپائی کو میں اس دھواں بھرے کمرے میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ چارپائی پر خالہ فہمی بالکل سیدھی لیٹی تھیں۔ وہ پاؤں سے کاندھوں تک نیلے سفید خانوں والا اُونی کھیس اوڑھے ہوئے تھیں۔ آنکھیں بند تھیں لیکن میں جب بھی ان کے چہرے پر نظر ڈالتا تو مجھے یوں لگتا جیسے اُن کی پلکیں ذرا کی ذرا لرزتی اور پھر ساکت ہو جاتی ہیں۔ اُن کی سانس کبھی کبھی کھنچ کے آنے لگتی لیکن پھر جلد ہی ہموار ہو جاتی۔ ویسے آج وہ بہت بہتر نظر آ رہی تھیں اور دو دن سے تو اُن کی آواز بھی نہیں بدلی تھی اور انھیں جھٹکے بھی نہیں لگ رہے تھے۔ اُس وقت اُن کی چارپائی کے پاس سرہانے کی طرف ابو اور پائینتی کی طرف جھولے ماموں بیٹھے تھے۔

جھولے ماموں خالہ فہمی کے سب سے چھوٹے بھائی یعنی میرے چھوٹے ماموں تھے۔ وہ اُس وقت کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ ہفتے کے ہفتے چھٹی کے دو دن وہ اپنی آپا یعنی میری ماں

کے پاس گزارنے آجایا کرتے۔ ان دنوں وہ ڈیوڑھی کے سارے بچوں کو ساتھ لے کر گھمانے اور جھولے ولانے جاتے تھے۔ گھر میں بھی بچوں کو ٹانگوں پر بٹھا کر اکثر جھولے ولاتے تھے۔ اس لیے سب بچے انھیں جھولے ماموں پکارتے تھے۔ جھولے ماموں اپنی دونوں بہنوں یعنی میری ماں اور خالہ فہمی سے بہت لاڈ کرتے تھے اور وہ دونوں بھی ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ جب سے فہمی خالہ علاج کے لیے پھولوں والی کوٹھی آئی تھیں، وہ بھی ساتھ ہی اُٹھ آئے تھے اور تب سے یہیں تھے۔ اُس وقت وہ خالہ فہمی کی پائینتی آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ابو نے ایک گھٹنا کھڑا کیا ہوا تھا اور اس پر ٹھوڑی ٹکائے دیر سے زمین پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ میں نے کئی بار اُن کی طرف دیکھا، وہ مسلسل اسی طرح بیٹھے تھے، شاید کسی گہری سوچ میں تھے۔ میں اُن کے دائیں طرف کچھ فاصلے پر تھا۔ میرے آگے بڑا سا تسلا رکھا تھا، تسلے میں وہی چھوٹی انگیٹھی روشن تھی جو پہلے جاڑے کے دنوں میں جب دادی اماں زندہ تھیں تو اُن کے کمرے میں رکھی رہتی تھی۔ انگیٹھی کے دوسری طرف عامل صاحب بیٹھے تھے۔ انھوں نے دونوں بازو سیدھے تان کر گھٹنوں پر دھرے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ کی مٹھی سختی سے بند تھی۔ دائیں ہاتھ کا انگوٹھا انگشتِ شہادت پر تھا اور باقی انگلیاں بند تھیں۔ وہ آنکھیں موندے تیز تیز کچھ پڑھ رہے تھے۔

میں نے ایک بار پھر کمرے میں نظر دوڑائی۔ روشنی گُل تھی، صرف انگیٹھی کمرے کی تاریکی کو سہار رہی تھی۔ کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا لیکن اس میں ایک خوشبو بھی تھی جس کی وجہ سے دم نہیں گھٹ رہا تھا۔ چھت کے قریب بنے روشن دان میں سے رِس رِس کے دھواں باہر جا رہا تھا۔ میری نگاہیں پلٹیں اور خالہ فہمی کے چہرے پر رُکیں۔ تب مجھے لگا اُن کی پلکیں مسلسل تیزی سے لرز رہی ہیں اور گردن میں تناؤ پیدا ہو رہا ہے اور جیسے وہ سر اٹھا رہی ہیں۔ میں نے انھیں دو ایک بار دورہ ہونے سے پہلے کی کیفیت میں دیکھا تھا۔ اُس وقت اُن پر کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے گھبرا کے ابو کی طرف دیکھا اور انھیں خالہ کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ وہ اُسی طرح ٹھوڑی گھٹنے پر ٹکائے زمین کو گھور رہے تھے۔ میری نظریں عامل صاحب کی طرف لپکیں عین اُسی لمحے عامل صاحب گونج دار آواز میں دھاڑے، ''آ پہنچے آنے والے!'' جواب میں غوں، غوں، خرا جیسی آواز خالہ فہمی کے گلے سے نکلی۔

عامل صاحب نے آنکھیں موندے موندے بایاں ہاتھ بلند کیا۔ میں سمجھ گیا، یہ اشارہ میرے لیے تھا۔ لہٰذا فوراً دی گئی ہدایت کے مطابق میں نے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بنا کر انگوٹھا سامنے کیا اور نظریں اُس پر جمالیں۔

''آجاؤ آجاؤ، تمھارا ہی انتظار تھا۔'' عامل صاحب نے کہا۔

''خرررر خوں خا خا خا۔'' خالہ فہمی پر آنے والوں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، بس اب فیصلے کی گھڑی آ گئی۔'' عامل صاحب بولے۔

میری نگاہیں انگوٹھے کے ناخن پر جمی ہوئی تھیں جو ٹی وی اسکرین کی طرح روشن ہو چکا تھا اور اب اُس پر مختلف مناظر گزر رہے تھے۔ کبھی لگتا رنگ برنگ بگولے رقص کر رہے ہیں، کبھی لگتا لق و دق صحرا ہے جو دور، آگے اپنے آخری سرے پر دُھواں بن کر اُٹھ رہا ہے اور آسمان سے ملتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی سمندر دکھائی دیتا اور لگتا کہ پہاڑ جیسی لہر دوڑتی چلی آ رہی ہے اور کبھی لگتا چٹیل میدان ہے جس میں دُھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی شے مجھے ڈرا نہیں رہی تھی، بلکہ میں پورے سکون سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ عمل شروع ہونے سے پہلے عامل صاحب نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کیا کیا ہوگا اور کس طرح ہوگا۔ انھوں نے کوٹھی کے سب بچوں میں سے میرا انتخاب یہ کہہ کر کیا تھا کہ یہ بچہ سمجھ دار بھی ہے اور بہادر بھی۔ اس معرکے میں یہی میرا ساتھ دے سکتا ہے۔ ویسے تو وہ پچھلی دو راتوں سے خالہ فہمی کا علاج کر رہے تھے اور اب سے پہلے اُن کے ساتھ صرف جھولے ماموں کمرے میں خالہ فہمی کے پاس ہوتے تھے، لیکن آج مجھے اور ابو کو بھی بٹھا لیا گیا تھا۔ عامل صاحب کا کہنا تھا کہ آج خالہ فہمی پر آنے والے آسیب سے اُن کا آخری معرکہ ہوگا۔ تو بس اب وہ مرحلہ آ چکا تھا۔

اُس وقت میرا بہت جی چاہ رہا تھا کہ میں خالہ فہمی کو دیکھوں کہ انھیں دورہ تو نہیں ہو رہا، لیکن عامل صاحب نے سختی سے تاکید کی ہوئی تھی کہ عمل شروع ہونے کے بعد مجھے اپنے انگوٹھے کے ناخن اور انگیٹھی کی آگ کے سوا کسی طرف نگاہ نہیں اٹھانی۔ اس لیے میری نظریں ایک جگہ رُکی ہوئی تھیں۔ ویسے تو مجھے بالکل خوف نہیں تھا لیکن اچانک یہ لگا جیسے میری پیٹھ پر کچھ سرسرایا ہے اور برف جیسی ٹھنڈی لہر تیزی سے میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں لگا ماتھے پر پسینا ہے۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے ماتھا پونچھا جو تر بہ تر تھا۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ پھر مجھے عامل صاحب کے الفاظ یاد آ گئے، ''یہ بچہ سمجھ دار بھی ہے اور بہادر بھی...'' میں نے دل ہی دل میں اپنی ہمت بندھائی اور انگوٹھے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہاں اب ایک بڑا سا شعلہ رقص کر رہا تھا جو دائیں بائیں ڈول رہا تھا اور کبھی رُک کر ایک دم گول گھومنے لگتا تھا، یہ بالکل وہی انداز تھا جیسے میں نے ایک بار داتا دربار پر ملنگوں کو رقص کرتے دیکھا تھا۔ وہ اسی طرح کبھی ایک جگہ کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے دائیں بائیں ڈولتے اور کبھی دائرہ وار

گھومنے لگتے تھے، بالکل اُسی طرح جیسے ہم مٹی کے لٹو بنا کر گھماتے تھے جو گول گول گھومتے ہوئے خود ہی دائیں بائیں ڈولنے لگتے اور پھر گر جاتے تھے۔

خالہ فہمی کی گہری گہری سانسوں کی آواز رہ رہ کر آ رہی تھی۔ عامل صاحب تیزی سے کچھ پڑھ رہے تھے لیکن اُن کی آواز اتنی کم تھی کہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں ایک لفظ 'ہُو' سنائی دیتا تھا جو بلند آواز میں وہ ایک جھٹکے سے کہتے تھے۔ میرے انگوٹھے کے ناخن پر شعلے کا رقص بدستور جاری تھا۔ یکا یک عامل صاحب کی 'ہُو' جلدی جلدی سنائی دینے لگی۔ پھر انھوں نے کچھ اٹھا کر انگیٹھی میں ڈالا جس سے ایک بار پھر تیزی سے دُھواں اٹھنے لگا اور کمرے میں خوشبو پھیل گئی۔ تب انھوں نے گونج دار نعرے کی آواز میں 'یا ہُو' کہا اور اس کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا جیسے چھوٹی چھوٹی کنکریاں میرے سر، ماتھے، چہرے، سینے اور ہاتھ پر آ کر لگیں۔ میں ایک لمحے کے لیے ہلا لیکن پھر سنبھل گیا۔

''بس اب تیرا کھیل ختم!'' عامل صاحب کی آواز آئی۔

جواباً خالہ فہمی نے گہری سانس لی۔

''بس میں نے کہہ دیا، اب تیرا کھیل ختم۔''

خالہ فہمی نے پھر گہری سانس لی۔

''میں تجھے پھونک ڈالوں گا، بھسم کر دوں گا'' عامل صاحب نے سخت غصے سے کہا۔

''ہا ہا ہا— ہا ہا ہا ہا— ہا ہا ہا ہا!'' اس بار خالہ فہمی نے عامل صاحب جیسی گونج دار مردانہ آواز میں قہقہہ لگایا۔

میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں نے دو بار اس سے پہلے بھی انھیں دورے کی حالت میں دیکھا تھا۔ اُس وقت اُن کی آنکھیں سختی سے مچی ہوتیں اور وہ اسی طرح رعب دار مردانہ آواز میں باتیں کرتی اور قہقہے لگاتی تھیں۔ ان کا چہرہ بالکل سفید پڑ جاتا، ہونٹ کاسنی ہو جاتے، گردن کبھی سختی سے تن جاتی اور سر تکیے سے اُٹھ کر ہوا میں معلق ہو جاتا۔ کبھی وہ تکیے پر رکھے سر کو تیزی سے دائیں بائیں زور زور سے پٹخنے لگتیں اور اُن کے بال چہرے پر بکھر جاتے۔ تب ایسا لگتا جیسے وہ عورت نہیں سچ مچ کوئی بلا ہیں، ویسی ہی جیسی پھوپھی اماں کی کہانیوں میں پہلوٹھی کے بچے کو اٹھا کر لے جانے کے لیے آتی تھی۔

اُس وقت میری آنکھیں تو اپنے انگوٹھے پر تھیں لیکن دھیان خالہ فہمی کی طرف لگا ہوا تھا اور میرے ذہن میں ان کی دورے والی شبیہیں بن رہی تھیں۔ اچانک میں نے انگوٹھے پر غور

کیا تو وہاں شعلہ اب کچھ اس طرح ناچ رہا تھا جیسے داتا دربار کے ملنگ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے سر کو آگے پیچھے جھٹکتے ہوئے ناچتے ہیں۔ عامل صاحب نے ایک بار پھر انگیٹھی میں دھواں اٹھانے والی کوئی چیز ڈالی اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُچھال دیں۔ اب میں سمجھ گیا کہ یہ ماش کی دال کے دانے تھے جو انھوں نے عمل شروع کرنے سے پہلے ایک سینی میں اپنے پاس رکھ لیے تھے۔

''جلا کر راکھ کر دوں گا، چھوڑوں گا نہیں تجھے۔'' انھوں نے جلالی آواز میں کہا۔

''یہ لڑکی ختم ہو جائے گی بس، اور کچھ نہیں ہوگا۔ ہاہاہا!'' خالہ فہمی نے اتنی ہی بلند آواز میں جواب دیا۔

''تو اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میں تجھے چٹکی میں مسل کے پھینک دوں گا۔''

''ہاہاہا— ہاہاہاہا، لے دیکھ ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' خالہ فہمی نے جھلا کے فوراً جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی بستر پر مچھلی کی طرح تڑپنے اور اُچھل اُچھل کر ایسے گرنے لگیں جیسے کوئی انھیں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا ہو۔ سرہانے کی طرف بیٹھے ہوئے ابو نے اُن کا ہاتھ تھام کر روکنا چاہا تو انھوں نے اتنی زور سے اُن کا ہاتھ جھٹکا کہ وہ خود ہل گئے۔ جھولے ماموں نے اُن کی ٹانگ پر ہاتھ رکھا تو اتنی زور سے انھیں ٹانگ پڑی کہ وہ عامل صاحب سے آ ٹکرائے۔

''ٹھہر خبیث، خنزیر! مزہ چکھاتا ہوں میں تجھے۔'' عامل صاحب دھاڑے اور تیز تیز کچھ پڑھنے لگے۔ اسی دوران انھوں نے ماش کی دال کی مٹھی بھر کے خالہ پر اُچھالی۔ خالہ کو ایک دم قرار آ گیا اور وہ بے سدھ بستر پر ڈھیر ہو گئیں اور تیز تیز سانسیں لینے لگیں۔

''ختم کر دوں گا میں تجھے، بھسم کر دوں گا۔'' عامل صاحب پھنکارے۔

یہ سنتے ہی خالہ کو جیسے ایک دفعہ پھر بجلی کا جھٹکا لگا اور وہ پہلے سے زیادہ شدت سے اُچھل اُچھل کر گرنے لگیں۔ میرا دل تو جیسے اب حلق میں آ گیا تھا۔ پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ تب میں نے پریشانی اور دُکھ کے ساتھ سوچا کہ عامل صاحب خالہ فہمی کو نہیں بچا پائیں گے۔ وہ لوگ انھیں واقعی ختم کر دیں گے۔ میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ جی چاہا اُٹھ کر خالہ سے لپٹ جاؤں لیکن ہمت نہ ہوئی۔ پاؤں جیسے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔

''تم کیوں اس غریب کی جان کے دشمن ہو گئے؟ جان بخشی کر دو اس کی۔ چھوڑ دو اس کا پیچھا، چھوڑ دو۔'' عامل صاحب نے کہا۔ اُن کی آواز میں اِس بار غصے کے بجائے مصالحت تھی۔

''نہیں، اس طرح نہیں۔'' خالہ فہمی نے اسی طرح تڑپتے ہوئے کہا۔

''پھر کس طرح؟ کیا چاہتے ہو تم؟'' عامل صاحب نے ایک بار پھر بلند آواز میں پوچھا۔

''ہمیں نذرانہ چاہیے اور آئندہ کی ضمانت۔'' خالہ فہمی نے جواب دیا۔

''کیا نذرانہ چاہتے ہو اور کیسی ضمانت؟'' عامل صاحب نے پوچھا۔

''دو کالے بکرے اُسی درخت کے تنے کے پاس ذبح کیے جائیں جہاں یہ ہمارے پاس آئی تھی— اور یہ آئندہ کبھی منہ اندھیرے اور دن چھپے اُس درخت کے نیچے نہ جائے۔'' خالہ فہمی کا لہجہ اور آواز مجھے اس وقت بالکل اپنے اسکول کے پی ٹی ماسٹر صاحب جیسا لگ رہا تھا۔

''نذرانہ دے دیا جائے گا اور یہ بھی اس درخت کے نیچے آئندہ نہیں جائے گی۔ بس ختم کرو بات۔''

''یہ چالیس دن تک کوئی خوش بو، مسّی، دنداسا اور کاجل استعمال نہیں کرے گی۔''

''منظور ہے، تم اب اس کی جان چھوڑ دو۔'' عامل صاحب پوری طرح مصالحت پر اُتر آئے تھے۔

''اس کی سُپرداری کون لے گا؟'' خالہ فہمی نے پوچھا۔ اب انھیں بہت حد تک قرار آ گیا تھا۔ جھولے ماموں نے اُٹھ کر اُن کے اوپر چادر ڈالی اور پھر اپنی جگہ پر اسی طرح آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔

''اس کا بھائی یہاں بیٹھا ہے، یہ ہے اس کا سُپردار۔'' عامل صاحب نے کہا اور جھولے ماموں کو آگے خالہ فہمی کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں، بھائی سپردار نہیں ہوسکتا، کسی اور کو لے کر آ۔'' خالہ فہمی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، یہ اس کا بہنوئی بھی ادھر ہی ہے۔''

''بھائی بہنوئی کے سوا کوئی نہیں ہے اس کا دنیا میں؟'' خالہ فہمی نے سختی سے ڈانٹا۔

عامل صاحب نے پہلے جھولے ماموں اور پھر ابو کی طرف دیکھا۔ ابو نے سر ہلایا اور دبے پاؤں اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

''ابھی آ رہا ہے سُپردار۔'' عامل صاحب نے بلند آواز میں کہا، ''تم وعدہ کرو کہ آئندہ اسے کبھی نہیں ستاؤ گے، پھر کبھی اس پر نہیں آؤ گے۔''

''ہم نے کہہ دیا ہے ناکہ جا رہے ہیں، تو بس سمجھ لے جا رہے ہیں۔ دوبارہ نہیں آئیں گے، اگر اس نے عہد نہ توڑا— اور تجھے بھی منہ نہیں لگائیں گے۔'' خالہ فہمی اسی طرح مردانہ آواز میں بول رہی تھیں، لیکن اب وہ غصے میں نہیں تھیں۔

دروازہ کھلا اور ابو کمرے میں داخل ہوئے، ان کے پیچھے پیچھے تایا جی بھی۔ میرا دھیان

اب انگوٹھے سے زیادہ کمرے کی پوری صورتِ حال پر تھا۔ تایاجی میرے برابر آکے بیٹھے تو عامل صاحب بولے، ''آگیا ہے سُپردار! یہ اس کی ضمانت لیتا ہے۔''

''کون ہے یہ؟'' خالہ فہمی نے ڈپٹ کے پوچھا۔

''جھولے ماموں نے آگے ہوکر عامل صاحب کے کان میں کچھ کہا تو وہ بولے، ''عزیز ہے اس کا مگر باپ، بھائی، بہنوئی نہیں ہے۔''

''نام پکار سُپردار کا۔'' خالہ فہمی نے تحکم سے کہا۔

جھولے ماموں نے عامل صاحب کو تایاجی کا نام بتایا تو انھوں نے پکارا، ''مجیب الدین...''

عامل صاحب کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ خالہ فہمی بولیں، ''مجیب الدین ولد حاجی کلیم الدین!''

مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ میں نے اپنے دادا کا نام گھر میں سنا تو تھا لیکن خالہ فہمی — میرا مطلب ہے کہ اُن پر آنے والے میرے دادا کا نام کیسے جانتے ہیں، وہ تو میرے ابو کی شادی سے بھی پہلے فوت ہوگئے تھے۔ میں حیرت سے خالہ کو دیکھ رہا تھا، جو اب سکون سے چادر اوڑھے لیٹی تھیں۔ میں نے دیکھا، ابو نے سر ہلا کر عامل صاحب کو دادا کے نام کی تصدیق کی۔

''ہاں مجیب الدین ولد حاجی کلیم الدین!'' عامل صاحب نے جواب دیا۔

''مجیب الدین ولد حاجی کلیم الدین! تمھیں اس لڑکی کی سُپرداری منظور ہے؟'' خالہ فہمی نے بلند آواز میں پوچھا۔

تایاجی نے پہلے عامل صاحب کی طرف دیکھا، پھر جھولے ماموں کی طرف۔ دونوں نے سر ہلا کے اشارہ کیا تو انھوں نے کہا، ''جی مجھے منظور ہے۔''

''ہم جانتے ہیں تم عہدار آدمی ہو۔ بازو تھامو اس لڑکی کا اور اس کے سُپردار بنو۔'' خالہ فہمی نے کہا اور پھر ان کا داہنا ہاتھ چادر سے باہر نکل کر ہوا میں بلند ہوگیا۔

تایاجی نے ایک بار پھر تذبذب سے عامل صاحب اور جھولے ماموں کی طرف دیکھا۔ دونوں نے پھر گردن ہلائی، لیکن تایاجی اسی طرح اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ ابو پہلے انھیں دیکھتے رہے، پھر انھوں نے قریب ہوکر اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو تایاجی جیسے چونکے۔ ابو نے انھیں چارپائی کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ تایاجی سرک کر چارپائی کے قریب ہوئے تو خالہ فہمی نے پھر بلند آواز میں کہا، ''مجیب الدین! اس لڑکی کے سُپردار ہو تو اس کا ہاتھ تھام لو۔''

تایاجی نے پھر سوالیہ نظروں سے جھولے ماموں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے سر ہلا کر

ہاں کہا تو تایاجی نے سر جھکا لیا مگر اگلے ہی لمحے انھوں نے سر اٹھایا، خالہ فہمی کی طرف دیکھا اور پھر داہنا ہاتھ بڑھا کر اُن کی کلائی پکڑ لی۔ خالہ فہمی کو جیسے ایک دم تیز کرنٹ لگا، وہ پورے وجود سے بل کر رہ گئیں۔ اُن کے ہڑبڑا کر ہلنے سے تایاجی کی ان کی کلائی پر گرفت کم زور پڑی ہوگی مگر انھوں نے پل کی پل میں سنبھلتے ہوئے گرفت مضبوط کرلی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ خالہ فہمی اُن سے کلائی چھڑانے کی کوشش کریں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خالہ اب بالکل پُرسکون ہوکر لیٹی تھیں، بس ان کی سانس ناہموار تھی۔ کبھی کھینچ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگتیں اور کبھی تیز تیز۔ عامل صاحب اس وقت بلند آواز سے کچھ ورد کر رہے تھے۔ پھر انھوں نے میری طرف دیکھا اور انگوٹھے پر نظریں جمانے کو کہا، جس سے میرا دھیان بالکل ہٹ چکا تھا۔

میں ایک بار پھر انگوٹھے کا ناخن دیکھنے لگا۔ وہاں تو اب چٹیل میدان کا منظر تھا اور دُور تک دھول اُڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ عامل صاحب کا ورد کچھ دیر جاری رہا، پھر انھوں نے تین بار نعرہ لگاتے ہوئے 'حق ہُو' کہا اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے تین بار پُھونک کر کے خالہ فہمی پر دم کیا۔ میری طرف دیکھ کر بولے، ''حال دے بچہ!'' مجھے سمجھ نہ آیا کہ کیا کہہ رہے ہیں، میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو بولے، ''تو کیا کہتا ہے؟ تیرے انگوٹھے کا پردہ کیا گواہی دیتا ہے؟''

میں نے انگوٹھے پر نظریں جمائیں اور جواب دیا، ''لگ رہا ہے جیسے دھول اُڑ رہی ہے۔''

''ہاں، دھول ہی تو اُڑنی ہے اب، قافلہ جو روانہ ہوگیا ہے۔ چلے گئے ہیں جانے والے۔'' پھر انھوں نے ایک نظر خالہ فہمی پر ڈالی، تایاجی کی طرف دیکھا، پھر چھوٹے ماموں کو اور آخر میں ابو کو دیکھ کر بولے، ''مبارک ہو، خلاصی ہوگئی۔ نئی زندگی مبارک ہو بچی کی۔'' عامل صاحب کے لہجے میں خوشی سے زیادہ فتح مندی کا اظہار تھا۔

چھوٹے ماموں جو گومگو کی کیفیت میں خالہ فہمی کو دیکھ رہے تھے، عامل صاحب کی طرف مڑے اور بولے، ''میری بجیا بالکل ٹھیک ہوگئی ہے عامل صاحب؟ اب اسے کبھی دورہ... میرا مطلب ہے یہ اب بالکل ٹھیک...'' یہ کہتے کہتے اُن کی آواز بھرّا گئی اور وہ بولتے بولتے چپ ہوگئے۔ اگلے ہی لمحے ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے موتی ڈھلنے لگے۔ میری آنکھیں بھی ایک دم بھر آئیں۔

ابو جو تھوڑے فاصلے پر بیٹھے تھے، کھسک کر اُن کے قریب ہوئے اور ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ چھوٹے ماموں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں پونچھیں اور بولے، ''دولھا بھائی! بجیا اب بالکل ٹھیک رہے گی نا۔'' پھر خود ہی انھوں نے دو بار اثبات میں سر ہلایا اور بولے، ''بڑی تکلیف اٹھائی ہے بچاری نے۔''

عامل صاحب جو خاموشی سے بیٹھے تھے یا شاید کچھ پڑھ رہے تھے، میری طرف متوجہ ہوئے، ''ہاں کاکا بول، گزر گیا قافلہ۔ گرد بیٹھ گئی ہے؟''

میں نے انگوٹھا دیکھا، وہاں تو اب کچھ تھا ہی نہیں۔ ''اب تو کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔'' میں نے انھیں بتایا۔

''جب کوئی ہے ہی نہیں تو نظر کیسے آئے گا۔ ختم ہوگیا سب کھیل۔ جا چکے ہیں جانے والے۔'' انھوں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ پھر انھوں نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور اُٹھ کر خالہ فہمی پر پھونکا اور پھر میرے پاس آئے اور مجھ پر پھونکا۔ انھوں نے تایاجی کی طرف دیکھ کر گردن سے اشارہ کیا تو انھوں نے خالہ فہمی کا بازو اتنے آرام سے چارپائی پر رکھا جیسے وہ بہت نازک کانچ کی کوئی شے ہو۔

عامل صاحب میرے رُو بہ رُو تھے۔ انھوں نے ہنس کر میری پیٹھ تھپتھپائی اور بولے، ''شیرو بچہ ہے، شیرو!'' مجھے اُس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی بہت بڑے معرکے کو سر کر کے لوٹا ہوں۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی، خوشی، حیرت اور بے یقینی سے مملو عجیب سی کیفیت۔ عامل صاحب نے پوچھا، ''کوئی بوجھ تو نہیں لگ رہا کسی کندھے پر؟''

یک بہ یک مجھے لگا جیسے سخت بوجھ سے میرے دونوں کاندھے ڈھلکے جاتے ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے پوچھا، ''کس کندھے پر بوجھ ہے؟''

''دونوں طرف ہے اور بہت زیادہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا'' کہہ کر انھوں نے دونوں کاندھوں پر اپنے ہاتھ جمائے اور پھر کچھ پڑھ کر پہلے دائیں طرف پھونکا اور شانہ ٹھونکا اور پھر بائیں طرف۔ یہ عمل انھوں نے تین بار دُہرایا۔ اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھ کے کچھ پڑھا اور سارے جسم پر دم کیا۔ پھر مجھ سے پوچھا، ''اب بتا، ہٹ گیا بوجھ؟''

میں نے کاندھے اُچکائے، لگا جیسے اب کچھ نہیں ہے۔ البتہ گردن میں پیچھے کی طرف درد کی ٹیس سی اٹھی۔ میں نے بتایا۔ انھوں نے داہنے ہاتھ کی انگلیوں پر کچھ پڑھ کے پھونکا اور ان انگلیوں کی پوریں نرمی سے میری گردن کے پچھلے حصے پر پھیریں۔ مجھے گدگدی سی ہوئی اور میں ہنس دیا، انھوں نے میرے ہنسنے پر کوئی دھیان نہ دیا، اپنا عمل کرتے رہے۔ پھر مجھ سے دائیں بائیں اور اوپر نیچے گردن گھمانے کو کہا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ تب انھوں نے درد کا پوچھا اور میں نے محسوس کیا کہ اب درد نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ ابو سے مخاطب ہوئے، ''بھائی غیاث الدین،

اس گھر سے اب ہر بلا نکال کے پھینک دی ہے میں نے، آپ کی دُعا ہے۔"

"آپ نے بڑی مہربانی کی۔" ابو نے جواب دیا اور میری طرف دیکھ کر بولے، "تم بالکل ٹھیک ہو؟ کچھ محسوس تو نہیں ہو رہا؟"

مجھ سے پہلے عامل صاحب بولے، "نہیں اب کچھ محسوس نہیں ہوگا اس بچے کو، جو اس پر ٹک گیا تھا، اُس کو بھی دیس نکالا دے دیا ہے میں نے۔" انھوں نے فاخرانہ انداز میں کہا اور پھر مجھ سے پوچھا، "بول کاکا، اب تو کہیں بوجھ یا تکلیف نہیں ہے؟"

میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، اس لیے فوراً نفی میں گردن ہلا دی۔ تایا جی نے مسکرا کے میری طرف دیکھا اور دونوں بازوؤں میں بھر کے سینے سے لگایا اور میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اُن کے اس لاڈ سے تو جیسے میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔

جس ڈیوڑھی میں ہم لوگ رہتے تھے، اس میں چار گھر تھے۔ ایک تایا جی کا، دوسرا ہمارا، تیسرے گھر میں پھوپھی شیدو اپنے پانچ بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کے میاں مشرقی پاکستان میں تھے۔ پھوپھی حالات کی خرابی کی وجہ سے بچوں کو لے کر آگئی تھیں۔ پھوپھا وہیں اپنا خاندانی کاروبار دیکھ رہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ حالات ٹھیک ہوگئے تو وہ بیوی بچوں کو واپس بلا لیں گے ورنہ کاروبار بیچ کر مغربی پاکستان چلے آئیں گے۔ چوتھے گھر میں پھوپھی آپا اکیلی رہتی تھیں۔ اُن کا گھر دوسرے گھروں سے چھوٹا تھا۔ میں نے ایک بار اپنی ماں کو کہتے سنا تھا کہ پاکستان آتے ہوئے اُن کے میاں شہید ہوگئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی۔ اُن کے اپنے بچے نہیں تھے، البتہ دو سگے بھائی تھے جو ہماری کوٹھی سے کچھ دُور ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ پھوپھی آپا، اُن کے بجائے ہمارے ساتھ رہتی تھیں۔ گھر کے سب بڑے انھیں آپا بلاتے تھے اور سارے بچے پھوپھی آپا۔ پھوپھی شیدو اور پھوپھی آپا دونوں تایا جی سے بڑی تھیں اور ان کے سر بھی سفید ہوگئے تھے، پر میں نے ان میں سے کسی کو تایا جی یا اپنے ابو کا نام لیتے نہیں دیکھا تھا۔ تایا جی کو وہ اور اُن کے ساتھ ساتھ میری ماں بھی بھائی صاحب پکارتیں اور میرے ابو کو وہ چھوٹے بھیا بلاتی تھیں۔ ابو بھی تایا جی کو بھائی صاحب ہی کہتے تھے، بلکہ دھیان پڑتا ہے کہ میں نے جسے بھی دیکھا، تایا جی کو بھائی صاحب ہی بلاتے دیکھا۔ تایا جی تھے بھی دبنگ قسم کے آدمی۔ میں نے انھیں غصّے میں تو کبھی نہیں دیکھا لیکن وہ لیے دیے رہنے والے آدمی تھے۔ جب وہ شام کو اپنے دفتر سے واپس آتے اور کوٹھی کے احاطے میں قدم رکھتے تو بس اُس کی فضا ہی بدل جاتی۔ وہ ہنستے، قہقہے بھی لگاتے اور ہم سب بچوں سے محبت سے پیش آتے تھے لیکن اُن کا رُعب

سب پر قائم تھا۔ اُس رات جب انھوں نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور گود میں بھر لیا تو مجھے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا اور اپنے آپ پر فخر ہونے لگا۔ تایا جی مجھے ذرا دیر گود میں لیے بیٹھے رہے، پھر انھوں نے ابو کی طرف دیکھا اور بولے، ''بہت وقت ہوگیا، اٹھو اب تم لوگ کچھ اپنے کھانے کا کرو۔''

''جی بھائی صاحب!'' ابو نے جواب دیا، پھر عامل صاحب کی طرف دیکھ کر بولے، ''کھانا لگوا لوں؟''

''ضرور لگوا لیں بھائی غیاث الدین، اب تو کھانا حلال ہوگیا ہے میدان مارنے کے بعد۔'' یہ کہہ کر عامل صاحب نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

مجھے گود میں لیے تایا جی اٹھے تو میں نے دیکھا کہ خالہ فہمی کی گردن کو ذرا سی جنبش ہوئی، پھر اُن کی پلکیں لرزیں۔ میرے دل سے بے چینی کی لہر گزری کہ کہیں پھر خدانخواستہ... لیکن وہ اسی طرح اطمینان سے لیٹی رہیں۔ ابو بھی ہمارے ساتھ ہی اُٹھ کر باہر آ رہے تھے کہ جھولے ماموں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھایا، ''آپ بیٹھیے، میں کھانا چنوا کے آپ لوگوں کو بلاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہمارے پیچھے کمرے سے باہر آ گئے۔

دالان سے گزر کے ہمارے گھر کے سامنے پہنچے تو تایا جی پہلے بلند آواز سے کھنکارے، یہ اُن کا مخصوص انداز تھا۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے بھی یوں ہی کھنکارتے اور پھر بچوں میں کسی کا نام پکارتے۔ اس وقت بھی انھوں نے آواز دی، ''بنو! کہاں ہو تم؟'' وہ میری ماں کو بنو بلاتے تھے۔ ماں ''جی بھائی صاحب'' کہتی اور سر پر آنچل درست کرتی ہوئی کمرے سے باہر آئیں۔

''بھئی تمھارے نواب نے تو آج کمال ہی کر دیا۔'' انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ایسا کیا کر آیا بھائی صاحب؟''

''ارے یہ پوچھو کیا نہیں کر آیا؟ بھئی اس نے بڑی بہادری سے اپنی خالہ کو عامل صاحب کے ساتھ مل کر ظالموں کے پنجے سے چھڑایا ہے۔''

''اچھا، ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ فہمی ٹھیک ہو جائے گی نا بھائی صاحب؟'' ماں یہ پوچھتے ہوئے روہانسی ہوگئیں۔

''ہو گیا جائے گی — ہوگئی خدا کے فضل سے۔ عامل صاحب کہہ رہے تھے، بس اب نجات مل گئی اُس لڑکی کو بلاؤں سے — اور اس میں تمھارے بیٹے کی بہادری اور محنت بھی شامل ہے۔''

ماں پھسک پھسک کے رونے لگیں۔

''اے بنو! تم تو بہادر بیٹی ہو اور بہادر بیٹے کی ماں بھی ہو تو پھر تم کیوں... اور اب تو اللہ کے کرم سے مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔'' انھوں نے آگے بڑھ کر ماں کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے، ''کرم کر دیا اللہ نے۔''

ماں نے دوپٹے سے آنکھیں اور ناک پونچھی اور بھرائی ہوئی آواز میں 'جی' کہا۔

''اچھی بیٹی!'' تایا جی نے ماں کا سر تھپکا اور بولے، ''تمھاری بھابی یہاں ہیں یا سامنے؟ بھئی اب دسترخوان پر کھانا چُن دو۔'' وہ جانے کو ہوئے لیکن پھر پلٹے، ''اچھا لو، اب اپنے نواب کو سنبھالو۔'' انھوں نے مجھے ماں کے پاس اُتارا اور اپنے گھر کی طرف چل دیے۔

اُس رات کے بعد تو گھر کی فضا ہی اور تھی۔ میں بچوں میں اپنی سیانپت بگھارتا اور رُعب گانٹھتا پھرتا تھا کہ اُس رات یہ ہوا اور یہ ہوا— بلکہ بچوں ہی میں کیا، بڑوں پہ بھی میری دھاک بیٹھ گئی تھی۔ ماں، خالہ فہمی، تائی جی، پھوپھی شیدو اور پھوپھی آپا— کون تھا جو مجھے دُلارتا پچکارتا اور اس رات کا قصہ بار بار نہ سنتا تھا۔ میں اُس رات ہونے والا سارا واقعہ پہلے لمحے سے، تایا جی کی ہاتھ پکڑ کر سُپرداری کرنے تک ایک ماہر قصہ گو کے انداز میں سناتا تھا۔ سب یہ قصہ سنتے اور جیسے دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتے۔ خالہ فہمی کا تو لاڈ ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو بس رہ رہ کر میری بلائیں لیتی اور مجھے اپنے سے لپٹاتی تھیں۔

کئی دن پوری کوٹھی اس داستانوی فضا میں رہی۔ ویسے تو یہ معمول ہی تھا کہ اپنے اپنے کام کاج سمیٹ کر کوٹھی کی خواتین ڈیوڑھی میں آ بیٹھتی تھیں لیکن اُن دنوں تو سب جیسے ایک ہی جگہ پر ہر وقت اکٹھے رہتے تھے۔ خالہ فہمی اور میں سب کی توجہ کا محور بنے ہوئے تھے۔ خالہ کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی۔ انھیں دورہ ہوتا، نہ آواز بدلتی اور نہ ہی جھٹکے لگتے۔ اب وہ مسلسل نہائی دھوئی، صاف ستھری اور کنگھی چوٹی کیے رہتیں۔ اُن کا رنگ میری ماں سے تو کم تھا، پر بنی ٹھنی رہنے سے وہ اب مجھے ایسی لگتیں جیسے میرے اسکول کی سائنس کی استانی تھیں۔ ویسے تو اب پوری کوٹھی اُن کا خیال رکھ رہی تھی لیکن ماں اور تائی جی تو جیسے پل پل اُن کی صورت دیکھتی تھیں۔ کیا کر رہی ہیں، کیا کھا رہی ہیں، کب سو رہی ہیں، کب ہنس رہی ہیں— غرض ایک ایک بات پر دھیان تھا ان دونوں کا۔ اِدھر دن ڈھلنے لگا اور اُدھر تائی جی نے یا ماں نے آواز لگائی، ''فہمی! کہاں ہو بچی؟ دونوں وقت مل رہے ہیں، چلو محمود کو لے کر کمرے میں چلی جاؤ۔'' بس یہ سنتے ہی خالہ نے مجھے آواز دی اور ہم دونوں کمرے میں جا پہنچے— اور ہمارے پیچھے پیچھے ایک ایک کر کے

ساری بچہ پارٹی۔ بس پھر وہیں منڈلی جم جاتی۔

جمعے کے روز سب نماز پڑھ کے لوٹے تو گھر میں حسبِ معمول دسترخوان پر کھانا چنا ہوا تھا۔ کھانا کھا کے ہماری بچہ پارٹی کھیلنے کا منصوبہ بنا رہی تھی کہ تایاجی نے مجھے آواز دی اور کہا، ''اپنی اماں کو بتا کر آؤ کہ تایاجی کے ساتھ بازار جا رہا ہوں۔'' میں نے ماں کو بتایا اور اُن کے ساتھ ہولیا۔ وہ پہلے منڈی گئے، وہاں سے پھل خریدے، پھر بازار میں ایک دُکان پر رُک کر بسکٹ اور ٹافیوں کے پیکٹ خریدے اور برابر کی دُکان سے جا کر کوئی اور چیز لائے۔ گھر واپس آ کر انھوں نے پھلوں کا ٹوکرا میری ماں کے پاس بھجوایا اور کہا کہ پھلوں کی چاٹ بنالیں۔ پھر بسکٹ اور ٹافیوں والا تھیلا مجھے تھماتے ہوئے کہا، ''اپنی تائی کو دو اور کہنا کہ سب بچوں کو بانٹ دیں۔'' میں تھیلا لے کر چلا تھا کہ انھوں نے واپس بلایا، ''یہ بعد میں دے کر آنا — لو، پہلے یہ اپنی خالہ کو دے آؤ۔'' انھوں نے جیب سے کاغذ کی تھیلی نکال کر مجھے تھمائی۔ وہ اپنا اسکوٹر اسٹینڈ پر کھڑا کرنے لگے اور میں خالہ کی طرف دوڑا۔

خالہ مسہری پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ میں نے تھیلی بڑھائی تو انھوں نے پوچھا، ''کیا ہے؟''

میں نے کاندھے اُچکائے تو بولیں، ''ارے تو کہاں سے اُٹھا لائے میرے گڈے؟''

''تایاجی نے دی ہے یہ تھیلی؟''

''تایاجی نے —؟'' خالہ کی آواز میں حیرت اور خوشی نمایاں تھی، ''اچھا — کیا ہے اس میں؟'' انھوں نے تھیلی کھولی تو اس میں چوٹی تھی جس کی لڑیوں میں سنہرے تار گوندھے تھے۔

''بہت اچھی ہے یہ تو — بہت پیاری۔''

انھوں نے چوٹی اپنے ہاتھ پر پھیلا کر دیکھی، ''بہت پیاری — تمھاری طرح۔'' انھوں نے لاڈ سے میرا گال سہلایا۔

اگلے روز جب میں اسکول سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ خالہ نے وہی چوٹی بالوں میں گوندھی ہوئی ہے۔ اُن کے سنہرے لمبے بال چوٹی میں گوندھے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ بات کرتے کرتے جب سر ہلاتیں تو اُن کی چوٹی لہرا کے اُچھلتی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت اچھا لگتا۔ خالہ کا سر اکثر دوپٹے سے ڈھکا رہتا تھا، لیکن اُس دن میں نے دیکھا کہ وہ جب سر گھماتیں یا گردن موڑتیں تو اُن کا دوپٹا ڈھلک جاتا اور چوٹی چمکتی لہراتی سامنے آجاتی۔

اس وقت ماں عصر کی نماز کے لیے غسل خانے میں وضو کو گئی تھیں جب تایا جی نے دروازے کے پاس آ کے کھنکارا اور اُنھیں پکارا۔ میں باہر لپکا اور بتایا کہ ماں وضو کرتی ہیں۔ وہ اندر آتے آتے رُک گئے، ''اچھا پھر آتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گئے۔

ابھی انھوں نے قدم بڑھایا ہی ہوگا کہ خالہ کی آواز آئی، ''آداب! آپ آجایئے اندر، آپا ابھی آتی ہیں۔''

تایا جی واپس مڑے، ''خوش رہو، کیسی ہو تم؟''

''ہم اچھے ہیں، اللہ کا شکر ہے، آپ آجایئے نا۔''

''ہاں چلو، ہم بنو کے پاس تمھاری خیریت ہی تو پوچھنے کو آئے تھے۔''

''جی بہت شکریہ۔ ہم بالکل ٹھیک ہیں اب۔''

اتنے میں ماں وضو کر کے آگئیں۔ تایا جی کو دیکھ کر آداب کیا اور چائے کا پوچھا۔

''نہیں بھئی، اسکوٹر سے اُتر کے سیدھے تمھاری طرف آگئے، ہاتھ منہ نہیں دھویا ابھی۔''

''بھائی صاحب! یہاں دھو لیجیے۔'' ماں نے کہا۔

''جیتی رہو، پھر آئیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خالہ کی طرف دیکھا، بولے، ''اب تم اپنا خیال رکھنا۔''

''جی ہم رکھ رہے ہیں۔'' خالہ نے کہا۔

''اچھا بنو! چل دیے ہم۔'' تایا جی نے ماں سے کہا۔

''میں تو کہہ رہی تھی بھائی صاحب بیٹھتے، یہ بھی آتے ہی ہوں گے۔''

''ہاں پھر آئیں گے۔ اچھا یوں کرو، غیاث آجائیں تو ہمیں کہلوا دینا، پھر اُسی کے ساتھ آ کے چائے پیتے ہیں۔''

''جی اچھا بھائی صاحب!'' ماں خوش ہوگئیں۔

تایا جی جانے کو مڑے ہی تھے کہ میرے دل کو جانے کیوں یہ خواہش ہوئی کہ تایا جی کسی طرح دیکھ لیں کہ خالہ نے اُن کی دی ہوئی چوٹی بالوں میں گوندھی ہوئی ہے۔ ٹھیک اسی لمحے خالہ نے سر جھکا کر انھیں آداب کہا اور ماں کی طرف یوں گھومیں کہ اُن کی چوٹی لہرائی، دوپٹا سر سے ڈھلا اور اور چوٹی لشکارے دینے لگی۔ میں نے دیکھا، تایا جی کی نظر پل بھر کو اُن کی چوٹی پر رُکی۔ مجھے لگا اُن کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی گزری، مگر یہ لہر اتنی ہلکی اور نرم تھی کہ اسے کوئی اور محسوس نہیں کر سکتا تھا، پر خالہ نے اسے ضرور دیکھ لیا تھا اور پھر یہی لہر مجھے اُن کے چہرے پر

کھلتی دکھائی دی۔ تایاجی اور خالہ فہمی ایک ہی لہر سے شرابور تھے، گویا— پر یہ بات مجھے بہت بعد کو معلوم ہوئی اور اُس وقت تک کتنے ہی طوفان گزر چکے تھے۔

خالہ کی طبیعت واقعی اب بالکل ٹھیک تھیں اور وہ ہر وقت خوش نظر آتیں، ہنستی بولتی رہتیں۔ گھر کے کام کاج میں وہ صرف میری ماں کا ہاتھ ہی نہ بٹاتیں بلکہ بڑی اماں کے ساتھ بھی کام میں لگ جاتیں اور اُن سے نمٹتیں تو کبھی پھوپھی شیدو اور کبھی پھوپھی آپا کے ساتھ سنگھوانے سمیٹنے میں مصروف نظر آتیں۔ وہ ہمیشہ کی ایسی ہی تھیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ تو بس اُن کے دوروں کے دن تھے جب میں نے انھیں بستر پر دیکھا، ورنہ وہ جب بھی ہمارے گھر آتیں، دوڑ دوڑ کے سارے کام کرتیں اور سب کا ہاتھ بٹاتیں۔ اب پھر وہی دن لوٹ آئے تھے۔

اسکول سے آنے کے بعد ہم بچے پہلے کھانا کھاتے اور پھر کھیلنے کے لیے دالان میں اکٹھے ہوجاتے۔ خالہ فہمی بھی ہمارے ساتھ کھیلتیں، بلکہ اُن دنوں تو چھوٹے ماموں بھی اپنے کالج سے سیدھے ہمارے یہاں چلے آتے۔ خوب خوب بلاّ گلاّ، رونق میلا رہتا۔ برف پانی، چور سپاہی، گیٹے اور ٹاپو— بس کھیلتے کھیلتے شام ہوجاتی۔ تب ہم سب بچے اپنا اپنا اسکول کا کام لے کر بیٹھتے اور خالہ فہمی کسی کو سبق پڑھاتیں، کسی کو یاد کراتیں، کسی کو املا کراتیں اور کسی کے پہاڑے چلتے۔ رات کے کھانے تک سب کے کام نمٹ جاتے۔ اس کے بعد وہ سارے بچوں کو کھانے کے لیے لے کر بیٹھ جاتیں۔ دسترخوان لگ جاتے۔ اب وہ مزے مزے کی باتیں کیے جارہی ہیں اور ہم سب بچے کھانا کھا رہے ہیں۔ کس کی رکابی میں ترکاری نہیں ہے، کون ٹھیک سے لقمے نہیں بنا رہا، کس نے ابھی آدھی روٹی بھی نہیں کھائی— باتیں کرتے اور ہنستے ہنساتے ان سب چیزوں کا بھی انھیں پورا دھیان رہتا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا، پر کیا مجال کہ اس میں خالہ فہمی سے کوئی کوتاہی ہو یا کسی روز ان سے تھکاوٹ یا اُکتاہٹ کا اظہار ہو۔ ہاں پھر ایک دن مجھے لگا کہ وہ اسکول سے آنے کے بعد ہمارے ساتھ کھیلی تو ہیں پر وہ بات نہیں جو روز ہوتی ہے۔ کھانا بھی انھوں نے سب بچوں کو کھلایا اور ہنستے بولتے ہوئے ہی کھلایا— پر کوئی بات ضرور تھی جو وہ روز جیسی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید اُن کی طبیعت بوجھل ہے۔ میرا دل ذرا کہیں خدانخواستہ دورے کی شکایت نہ ہو۔

عشا کی نماز کے بعد ماں ابھی مصلّے پر بیٹھی تسبیح کرتی تھیں کہ خالہ اُن کے پاس جا بیٹھیں۔

''آپا! میرا بالکل جی نہیں چاہ رہا ابھی واپس جانے کو۔'' انھوں نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

''میرا بھی دل نہیں کرتا ابھی تجھے واپس بھیجنے کو، پر بڑے بھیا نے کہلوایا ہے میرے گڈے!'' ماں نے لاڈ سے اُن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گال تھپتھپا کر بولیں، ''تو فکر نہ کر۔ اگلے

ہفتے میں خود اماں سے ملنے آؤں گی تو اُن سے کہہ کے تجھے پھر ساتھ لے آؤں گی۔"

''اگلے ہفتے!'' خالہ فہمی نے ماں کا چہرہ دیکھا جیسے تصدیق چاہتی ہوں۔

''ہاں، اگلے ہفتے، بالکل پکا۔'' ماں نے چمکارا۔

''پر آپا، اگلا ہفتہ تو ابھی بہت دور ہے؟''

اماں ہنس دیں اور انھیں گلے سے لگا لیا۔ خالہ نے بھی خود کو پورا ماں کی گود میں ڈال دیا۔ گھڑی بھر بعد الگ ہوئیں اور بولیں، ''آپا لے آئیں گی نا آپ مجھے واپس؟''

''ہاں میرے گڈے ضرور۔''

''دیر تو نہیں ہو جائے گی نا آپا!''

ماں نے نفی میں گردن ہلائی، پھر چمکارا، پیٹھ سہلائی۔

کوٹھی تو خالہ کے جاتے ہی بھائیں بھائیں کرنے لگی تھی، حالانکہ باقی سب لوگ وہیں تھے اور سارے کام اسی طرح ہو رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے ساری رونق اُن کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی تھی۔ اُس روز تو لیکن جیسے عجیب سا ہو رہا تھا سب کچھ۔ اسکول سے آتے ہوئے جب تانگے والے نے مزنگ چنگی سے جیل روڈ کی طرف تانگا موڑا تو مجھے ایکا ایکی اس قدر وحشت ہونے لگی اور دل ایسا گھبرایا کہ بس سب کچھ چھوڑ کر کہیں بھاگ ہی جاؤں۔ اپنی گلی کے آگے تانگے سے اُتر کے گھر تک آنا دوبھر ہوگیا۔ گھر میں داخل ہوا تو وحشت کچھ سوا ہوگئی۔ ایسی یبوست اس سے پہلے تو میں نے کبھی گھر میں نہ دیکھی تھی۔ پھوپھی شیدو اور پھوپھی آپا ڈیوڑھی میں بیٹھی تھیں۔ میری چھوٹی بہن اسکول سے آچکی تھی لیکن ابھی اسکول ہی کے کپڑوں میں تھی۔ ماں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے ابھی دالان آدھا ہی پار کیا ہوگا کہ تایا جی اپنے گھر سے باہر آئے اور اُن کے پیچھے پیچھے تائی جی۔ میں نے سلام کیا۔ تایا جی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ تھکن اور تکلیف کی ملی جلی کیفیت تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے سے لگایا، پیٹھ سہلائی اور کچھ کہے سنے بغیر باہر چلے گئے۔

چھوٹی بہن پھوپھی آپا کے پاس سے اُٹھ کر میری طرف آرہی تھی، ''تم نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے کیوں نہ بدلے؟ اماں کہاں ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

''وہ تمھاری نانی اماں کی طرف گئی ہیں۔ تم لوگ منہ ہاتھ دھو کے کپڑے بدلو، میں اتنے کھانا چنتی ہوں۔'' پھوپھی آپا نے کہا۔

"نانی اماں کے ہاں — پر اکیلی کیوں گئی ہیں؟" میں نے حیرت آمیز تشویش سے پوچھا۔
"اکیلی نہیں گئیں، تمھارے ابو بھی گئے ہیں ساتھ اور ابھی تم نے دیکھا تو ہے، تمھارے تایا جی بھی گئے ہیں۔"

"لیکن ہمیں کیوں نہیں لے کر گئیں وہ؟"

"آ جائیں گی وہ یا تم دونوں بعد میں چلے جانا۔ چلو بس اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤ اور کھانا کھالو۔ بھوک لگی ہوگی میرے بچوں کو۔" پھوپھی آپا نے کہا۔ اتنی دیر میں تائی جی بھی وہیں آ گئیں۔ اُن کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا۔ انھوں نے آ کر ہم دونوں بہن بھائی کو چمکارا لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔

مجھے کچھ سمجھ نہ آیا لیکن ایک دم بہت رونا آنے لگا۔

اماں رات کو واپس آئیں تو اُن کی آنکھیں سوجی اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔ میں نے اُنھیں دیکھا تو اُن کی طرف لپکا اور شکایت کی، "آپ ہمیں کیوں نہیں لے کر گئیں؟"

انھوں نے نرمی اور خاموشی سے مجھے اپنے سے لگا لیا۔ ذرا کی ذرا اُن کا پورا وجود لرزا۔ وہ دھیرے دھیرے چل کر چوکی پر جا بیٹھیں۔ چہرے سے لگتا تھا، بہت برداشت سے کام لے رہی تھیں، میں انھیں ایک ٹک تک رہا تھا۔

انھوں نے میری طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "تمھاری خالہ چلی گئیں۔" اتنے میں تائی جی کمرے میں داخل ہوئیں اور چوکی پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے ماں کو گلے سے لگا لیا۔ ماں اُن کے گلے لگیں تو یوں پھوٹ پھوٹ کر روئیں جیسے رونے کے لیے انھی کے کاندھے کی تو منتظر تھیں۔

خالہ کہاں چلی گئیں — کیا مر گئیں — لیکن کیوں؟ اچانک کیسے؟ کیا پھر اُن پر وہ آ گئے تھے؟ کیا انھوں نے عامل صاحب کی ہدایات پر عمل نہیں کیا تھا؟ کیا عامل صاحب کا عمل پورا نہیں ہوا تھا؟ کیا اُن کا عمل خالہ فہمی پر اُلٹ گیا اور اسی وجہ سے وہ مر گئیں؟ میں بھی تو اس عمل میں عامل صاحب کے ساتھ شریک تھا، تو کیا اسی طرح اب میں بھی جلد ہی مر جاؤں گا؟ اُس وقت میرے چھوٹے سے ذہن میں یہ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے سوالات بری طرح دھما چوکڑی مچائے رہتے تھے۔ میرے پاس ان میں سے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ خود کو میں جو بھی جواب دیتا، اُس سے دل کو اطمینان نہیں ہوتا تھا بلکہ اُلٹا اور دل بوجھل ہو جاتا اور وحشت بڑھ جاتی۔ اس بارے میں پوری کوٹھی میں اور تو کسی سے کچھ کہا سنا نہیں جا سکتا تھا سوائے ماں کے۔

ان سے میں نے کئی بار بات کرنی چاہی لیکن اب وہ مسلسل چپ رہنے لگی تھیں۔ ایک آدھ بار میرے پوچھنے پر انھوں نے بس اتنا کہا، "بس میرے لال، اُس کا وقت پورا ہوگیا، اتنی ہی لکھوا کے لائی تھی وہ بچاری۔"

"لیکن اماں! انھیں ہوا کیا تھا گھر جا کے؟ یہاں تو وہ بالکل ٹھیک ہوگئی تھیں۔"

"ہونا کیا تھا بچے! بس گھڑی آگئی تھی اُس کی۔"

"اماں! خالہ کو وہاں جا کے پھر دورے پڑنے لگے تھے کیا؟"

"ہاں، دورے ہی میں تو وہ نیچے گری تھی۔"

"کہاں سے گری تھیں؟" میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"اوپر چھت پر تھی۔ کھڑکی کھول کر صفائی کر رہی تھی۔ بس ہوگیا دورہ۔ وہاں سے سر کے بل..." یہ کہتے ہوئے اماں کی آواز بھرائی اور وہ دوپٹا منہ پہ رکھ کے رونے لگیں۔ میں بھی رونے لگا۔ ذرا دیر میں ماں نے آنکھیں پونچھ کر دوپٹا منہ سے ہٹایا۔ مجھے روتا دیکھ کر انھوں نے مجھے سینے سے لگایا 'ور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس گھڑی میری آنکھیں برستیں لیکن دل سوچتا تھا۔ اوپر چھت پر جا کر انھوں نے وہ کھڑکی آخر کھولی ہی کیوں تھی؟ میں نے تو کبھی اس کھڑکی کو کھلا ہوا نہیں دیکھا تھا، اُس وقت بھی نہیں جب چھوٹے ماموں اور ابو وہاں پتنگ اُڑا رہے تھے۔ ماں، خالہ اور ہم سب بچے ان کی پتنگ کو اوپر بڑھتا اور پیچ لگاتا دیکھ کر اُچھلتے اور اودھم مچاتے تھے۔ ہم سب اوپر تھے لیکن کھڑکی کسی نے نہیں کھولی تھی۔ اسے کھولنے کا تو کسی کو خیال ہی نہیں آتا تھا، پھر خالہ نے کیوں کھولی وہ کھڑکی؟ خالہ جب گری ہوں گی تو انھیں کیسا لگا ہوگا؟ کتنی تکلیف ہوئی ہوگی چوٹ لگنے سے۔

خالہ کو دورہ ہوا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا نا کہ عامل صاحب نے اُس رات جن سے انھیں چھٹکارا دلایا تھا، انھوں نے ہی واپس آکر اُن کی جان لے لی، لیکن ایسا کیوں ہوا؟ کیا خالہ نے اُن کی ہدایات پر عمل نہیں کیا؟ کہیں وہ کسی دن پھر اُسی درخت کے... یا انھوں نے مہندی تو نہیں لگالی تھی؟ میرے چھوٹے سے ذہن میں جیسے سوالوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

یہ سب سوال اُس دن ایک دم گرد کی طرح بیٹھ گئے جب میں نے پھوپھی رشیدو کو پھوپھی آپا سے کہتے سنا کہ فہمی کو اُس کے دونوں بڑے بھائیوں نے کرنٹ دے کر ختم کردیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ میں کیا سن رہا ہوں، واقعی سن رہا ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں— لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ پھوپھی رشیدو یہ بات سچ مچ پھوپھی آپا کو بتا رہی تھیں۔ شام کا وقت تھا، ماں

نے معمول بنالیا تھا کہ وہ عصر کی نماز کے بعد قرآن لے کر بیٹھ جاتیں اور پھر مغرب پڑھ کر مصلے سے اٹھتی تھیں۔ اُس وقت وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ ہم سب بچے ڈیوڑھی میں پھوپھی شیدو کے گھر کے آگے اپنا اپنا اسکول کا کام لیے بیٹھے تھے۔ اچانک میرے کانوں میں خالہ فہمی کا نام پڑا۔ پھوپھی شیدو کہہ رہی تھیں، ''فہمی کے دونوں بڑے بھائیوں نے اسی بات پر تاؤ کھایا اور کہا کہ پورے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی۔ چھوٹے والے نے بہن کی طرف داری کی اور اُس کے حق میں بولا بھی، پر آپا تم جانو، بڑے تو بڑے ہی ہوتے ہیں۔ انھی کی چلتی ہے، گھر گرہستی ہو چاہے بھائی برادری ہو۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فہمی کے منہ سے کچھ نکل گیا ہو۔ کہہ دیا ہو اُس نے کہ میں تو اب اسی نام پہ بیٹھی عمر گزار دوں گی، پر کسی اور کے نام کی ڈولی نہ اٹھے گی۔ یہ عمر بھی تو ایسی ہوتی ہے کہ بس ایک بار جی میں کچھ سما جائے تو آدمی مرنے کو تیار ہو جاتا ہے، پر بات سے نہیں ہٹتا۔ ہائے ہائے کیسی دو گھڑی کی آئی، توبہ ہے مالک!'' پھوپھی شیدو نے ہاتھ ملے، پھر کانوں کی لویں چھوئیں۔

''میرا تو کلیجا دھنسا جا رہا ہے شیدو تمھاری بات سن کر۔ کیسی ہنس مکھ بچی تھی۔ کیسے دوڑ دوڑ کے کام کرتی، کیسے خوشی خوشی سب کا ہاتھ بٹاتی۔ کچھ بھی نہ سوچا دیکھا ظالموں نے۔'' پھوپھی آپا نے ماتھے پہ ہاتھ رکھا جیسے چکر آگیا ہو انھیں۔

''ہاں آپا، سنا ہے ایک بھائی نے ہاتھ پاؤں باندھے، دوسرے نے کرنٹ دے دیا۔ گھڑی کی گھڑی میں ختم ہوگئی ہوگی بچی تو۔ نہ خون نے جوش مارا، نہ رشتے نے ہاتھ روکا۔ دل ہی پتھر ہوگئے ہوں گے بھائیوں کے۔'' پھوپھی شیدو نفی میں سر ہلا ہلا کر افسوس کرتی تھیں۔

پھوپھی آپا کو جھرجھری آگئی۔

میں بیٹھا تو وہیں تھا اُس وقت لیکن یک بہ یک دل و دماغ میں تو دوسری ہی کوئی دنیا بسی تھی۔ جیسے سینما ہال کے پردے پر آن کی آن میں منظر بدلتے ہیں اسی طرح میرے ذہن کے پردے پر بھی اُس وقت یوں پل کی پل میں نقشے بنتے اور بگڑتے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، میں کہاں ہوں، کیا ہو رہا ہے؟ خدا جانے کب اور کیسے وہاں سے اٹھ کر ماں کے پاس آیا۔ یہ خیال کسی تیر نیم کش کی طرح سینے میں اُتر گیا تھا کہ خالہ فہمی کو کرنٹ دے کر مار دیا گیا ہے — مگر کیوں؟ کوئی جواب ذہن میں آتا تھا اور نہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ کس سے پوچھوں، آخر ایسا کیوں کیا گیا؟

یوں تو میں اسکول بھی جاتا تھا، مولوی صاحب سے بھی پڑھتا تھا، گھر سے باہر بھی نکلتا تھا، ماں کسی کام کو کہتیں تو وہ بھی کرتا۔ منیا کو کھلاتا اور اس کے اسکول کا کام بھی دیکھتا، پر جیسے میں، میں نہیں رہا تھا۔ کسی کام میں جی لگتا، نہ کوئی چیز اچھی لگتی۔ ہر وقت خالہ فہمی یاد آتیں اور

ذہن میں نقشہ سا کھنچ جاتا کہ اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انھیں کرنٹ لگایا جا رہا ہے۔ کھانے پینے سے میرا جی بالکل اُچاٹ ہوگیا تھا۔ کچھ کھایا ہی نہ جاتا۔ ماں کو میری حالت پر تشویش ہونے لگی۔ انھوں نے ابو سے کہا کہ مجھے حکیم صاحب کو دکھا کے لائیں، سوکھتا جا رہا ہوں میں۔ ابو دکھا کر بھی لائے، پر مجھے کچھ خاص افاقہ نہ ہوا۔ ماں میری طرف سے پریشان تھیں۔ کبھی قرآن پڑھ کے پانی پر دم کر کے مجھے پلاتیں، کبھی پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتیں۔ میرے جی میں کئی بار آئی کہ اُن سے خالہ فہمی کا پوچھوں لیکن ہمت ہی نہیں ہوئی۔

اُس دن میں بخار میں بے سدھ پڑا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں غشی کے دورے ہو رہے تھے۔ ماں پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکے جاتیں اور ٹھنڈی پٹیاں میرے ماتھے اور ہاتھ پاؤں پر رکھ رہی تھیں۔ اسی کیفیت میں جانے کیسے میں نے اُن سے پوچھ لیا، ''اماں خالہ فہمی کو کرنٹ دے کر ماموں نے کیوں مار دیا؟'' اس سوال پر پہلے تو ماں کے منہ پر ہلدی سی کھنڈی اور پھر ذرا کی ذرا میں اُن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھتی رہیں اور پھر سہمی ہوئی آواز میں بولیں، ''تجھ سے یہ کس نے کہا بچے؟''

''میں نے سنا ہے اماں۔ پر کیوں مارا ماموں نے انھیں، ہیں اماں؟''

''کہاں سے سن لیا تو نے میرے بچے — مجھے بتا، یہ ہوا کہاں سے آگئی تجھ تک؟''

میں چپ رہا۔

''بول نا میرے چاند، کس نے کہا تجھ سے؟'' انھوں نے تڑپ کر میرا ہاتھ پکڑا۔ خدا جانے اُس وقت مجھے بخار زیادہ تھا یا پھر اس بات سے اُن کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے تھے، مجھے اُن کا ہاتھ بالکل برف کا ڈلا معلوم ہو رہا تھا۔ چپ پا کر انھوں نے دوسرا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا۔ وہ بھی اسی طرح برف ہو رہا تھا۔

میں نے اُن کی طرف دیکھا، اُن کا چہرہ بالکل پھیکا پڑ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا، جب تک میں بتاؤں گا نہیں، وہ تکلیف کے اس احساس سے نکل نہیں پائیں گی، سو میں نے انھیں پھوپھی شیدو اور پھوپھی آپا کی گفتگو کا بتا دیا۔ وہ ایک لمحے کو بالکل چپ ہوگئیں، لیکن اگلے ہی لمحے بلک کے رو دیں۔ مجھے بھی ایسے ہی رونا آنے لگا۔ ذرا سی دیر میں وہ سنبھلیں اور مجھے بھینچ کے سینے سے لگا لیا، پھر بولیں، ''بس، اُس کا وقت پورا ہوگیا تھا۔ کون کیا سمجھتا ہے اور کیا کہتا ہے، اس سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں۔ نہ کسی کی بات سننی ہے اور نہ آئندہ ایسی کوئی بات کسی سے کرنی ہے۔'' انھوں نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور پھر ہاتھ سے میرے سر میں کنگھی کرتے ہوئے

بولیں، ''بچے! یہ گھٹنا کھولوں تو یہ بھی میرا ہے، اور یہ کھولوں تو یہ بھی میرا۔ سو میرے لال، پردہ ہی بھلا، چپ رہنا ہی اچھا ہے۔ جانے والی تو واپس آنے سے رہی۔''

اِدھر بات طول کھینچے جاتی ہے مسلسل اور اُدھر یہ رات ڈھلان اُترتے اُترتے آخر اب صبحِ کاذب کی وادی تک آ پہنچی۔ وقت مٹھی کی ریت کی طرح پھسلے چلا جاتا ہے اور بات رہی جاتی ہے۔ سو، اب میں اس قصے کو مختصر کرتا اور اپنی بات سمیٹتا ہوں۔ نہیں، میرے عزیزو! یہ بات نہیں کہ میں یہ قصہ سناتے سناتے اُکتا گیا ہوں۔ سچ پوچھو تو میرے تو دل کی بر آئی کہ تم کو یہ ماجرا سناتا اور جانے کتنے زمانوں سے دل پہ دھرا بوجھ ہٹاتا ہوں — پر عزیزو! آج تک ساری بھلا کون کہہ سکا ہے اور ساری بھلا کب کوئی سن سکا ہے۔ ہم بھی یہاں اپنے اپنے حصے کی کہتے ہیں اور اپنے ہی اپنے حصے کی سن کر چلے جاتے ہیں۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

بہرحال تو میں تم کو بتا رہا تھا کہ بخار کی ہذیانی کیفیت میں ماں کے سامنے میرے منہ سے وہ بات نکل گئی جو میری جان کا روگ بنی ہوئی تھی۔ تس پر ماں نے مجھے سمجھایا کہ چپ ہی رہنا اچھا ہے۔ سو، اب خدا جانے ماں کی اُس پردہ رکھنے والی بات کا اثر تھا یا پھر وہ میری شرحِ صدر کا لمحہ تھا کہ میرے دل کو قرار آ گیا۔ ذہن جو غبار سے اٹ گیا تھا، صاف ہونے لگا، طبیعت بحال ہوتی چلی گئی۔ کوٹھی کی رونق تو خالہ فہمی کے جانے سے ہی ماند پڑ گئی تھی لیکن اکثر اُن کا ذکر ہوتا تھا۔ پھر ایک دم اُن کا ذکر بالکل ختم ہو گیا، جیسے وہ کوٹھی میں کبھی آئی ہی نہیں تھیں۔ اب میں سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ خالہ فہمی نے آ کر پوری کوٹھی کے رگ و پے میں ایک الگ ہی طرح سے زندگی کی برقی رو سی دوڑا دی تھی۔ پھر جب وہ گئیں تو کوٹھی ٹھٹھر کے رہ گئی اور اُن کی موت کی خبر نے تو جیسے کوٹھی کو سن سا کر دیا تھا، لیکن کچھ عرصے بعد جیسے اب پھر کوٹھی جاگنے لگی تھی۔ دن رات ویسے تو نہیں رہے تھے، پر زندگی کا چلن کوٹھی میں دھیرے دھیرے لوٹ آیا تھا۔

ایک رات جب ماں نے مجھے اور منیا کو ابھی کھانے پر بٹھایا ہی تھا اور ابو اپنے کام سے نہیں لوٹے تھے، دروازے پر تایا جی کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ میں ابھی چونک کر یہی سوچ رہا تھا کہ یہ واقعی تایا جی کی آواز ہے اور وہ سچ سچ ہمارے گھر آئے ہیں کہ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ''بنو'' کہہ کر ماں کو آواز دی۔ خالہ فہمی کے فوت ہونے کے بعد سے کوٹھی میں عجیب سا تناؤ آ گیا تھا۔ لوگوں کا آپس میں اٹھنا بیٹھنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ماں تو اب بالکل کسی دوسرے گھر نہیں جا رہی تھی۔ کبھی کبھار ڈیوڑھی میں پھوپھی آپا اور پھوپھی شیدو سے کھڑی ہو کر

بات کر لیتی تھی، وہ بھی بس گھڑی دو گھڑی۔ ہاں تائی جی برابر ماں کے پاس آتی رہتی تھیں، لیکن تایا جی اس واقعے کے بعد پہلی بار ہمارے یہاں آئے تھے۔ اُس وقت ماں چنگیری میں سے روٹی نکال کر مجھے دے رہی تھی۔ تایا جی کی آواز پر چونکی اور چنگیری جوں کی توں چھوڑ، وہ سر پہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ اتنی دیر میں تایا جی اندر آچکے تھے۔ ابو بھی ان کے ساتھ تھے۔ ماں نے سلام کیا۔ تایا جی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اتنی دیر میں منیا اور میں بھی اُٹھ کر آگے بڑھے اور سلام کیا۔ انھوں نے ہم دونوں کو دائیں بائیں اپنے سے لگا لیا، پھر ماں سے بولے، ''اچھا بنو، ہم سعودیہ جا رہے ہیں۔ اب وہیں رہیں گے۔ قسمت میں ہوا تو پھر ملیں گے۔ خدا تمھیں بچوں کی خوشیاں دکھائے۔''

ماں تایا جی کے آگے گھونگھٹ تو نہیں کاڑھتی تھیں، پھر بھی اُن کا دوپٹا کچھ آگے چہرے تک آیا رہتا تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے بھی ان سے نظریں نہیں ملاتی تھیں، لیکن یہ بات سن کر وہ ایسے ہڑبڑائیں کہ پہلے انھوں نے تایا جی کی طرف دیکھا اور پھر اُن کے پیچھے کھڑے اپنے شوہر کی طرف۔

ابو اُن کی نظروں کا سوال سمجھتے ہوئے بولے، ''بھائی صاحب رات کی گاڑی سے کراچی جا رہے ہیں اور وہاں سے پرسوں سعودی عرب چلے جائیں گے، وہیں کام کریں گے۔''

ماں کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ اس نے خالی خالی نظروں سے ایک بار پھر تایا جی کی طرف دیکھا اور بولی، ''مگر کیوں بھائی صاحب؟''

''بھئی اللہ اپنے گھر رہنے کو بلا رہا ہے، اس لیے جا رہے ہیں بس۔'' پھر انھوں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور بولے، ''اچھا اب وقت ہو گیا ہے، ہم چل دیے۔'' جاتے جاتے وہ مڑے ماں کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا، ''تم سمجھ دار ہو، اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ مالک تمھاری خوشیوں کی حفاظت فرمائے۔''

ماں نے 'جی' کہا اور ایک دم چپکو پھکو رونے لگیں۔

''نہ، جی چھوٹا نہیں کرتے۔ خدا خیر رکھے، جیے تو پھر ملیں گے۔'' تایا جی نے دلاسا دیا۔

ماں سنبھلنے کے بجائے اور رونے لگی۔ اتنے میں تائی جی بھی وہیں آگئیں۔ انھوں نے بڑھ کر ماں کو بازو میں بھر کر کاندھے سے لگا لیا۔

تایا جی کے جانے کے بعد تو کوٹھی جیسے بالکل خالی ہو گئی۔ ماں تو ویسے ہی پھوپھی آپا،

پھوپھی شیدو کے یہاں نہیں جا رہی تھیں۔ وہ دونوں تو پہلے بھی کم آتی تھیں ہمارے یہاں، اور اب تو بالکل ہی نہیں آ رہی تھیں۔ ماں کا آنا جانا تو تائی جی کے یہاں بھی نہیں تھا، پر وہ متواتر دوسرے چوتھے ماں کے پاس آ کر بیٹھتیں اور ان کی خبر گیری کرتیں۔ حق یہ ہے کہ تایا جی کے جانے کے بعد وہ سب کی خبر گیری کر رہی تھیں۔ یہ بھی مگر سچی بات ہے کہ تایا جی کے جانے کے بعد کوٹھی تو کوٹھی نہیں رہ گئی تھی، حالانکہ تائی جی سب کو اسی طرح جوڑے رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں، پر صاف لگ رہا تھا کہ کوٹھی اب کچھ اور ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایک دن میں اسکول سے آنے کے بعد ڈیوڑھی میں مُنیا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ گھر کے اندر سے ماں کے تیز تیز بولنے کی آواز آنے لگی۔ میں اُٹھ کے لپکا۔ ماں اور تائی جی چوکی پر آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ ماں کے چہرے پر سخت تناؤ تھا۔ رنگ اُڑا اُڑا سا اور ہونٹ کاسنی ہو رہے تھے۔ جب میں پہنچا تو تائی جی ان سے کہہ رہی تھیں، ”پر اس میں کوئی گناہ تو نہیں تھا۔“ مجھے آتا دیکھ کر وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔ ماں نے بھی مجھے دیکھا لیکن وہ تو جیسے کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ البتہ تائی جی نے مجھے دیکھا، اپنے پاس بلایا، بولیں، ”چھوٹی بہن کہاں ہے بیٹے؟“

”مُنیا باہر ڈیوڑھی میں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

انھوں نے چمکارتے ہوئے میری کمر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں، ”ہم تمھاری اماں سے بات کر رہے ہیں۔ تم بھی باہر بہن کے ساتھ کھیلو۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور من من بھر کے پاؤں اٹھاتا باہر چلا آیا۔ میرا دھیان لیکن ماں اور تائی جی کی طرف ہی لگا ہوا تھا اور میں جاننا چاہتا تھا کہ اُن کے درمیان کیا بات ہو رہی ہے۔ باہر آ کر میں نے مُنیا کو لیا اور بالکل اپنے دروازے کے سامنے آن بیٹھا۔ اب میں ذرا دھیان لگا کر اندر کی باتیں سن سکتا تھا۔ ماں کی غصیلی آواز آ رہی تھی، ”بھابی فہمی تو بچی تھی مگر بھائی صاحب تو سمجھ دار تھے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ سارا قصور اُن کا ہے۔“

”قصور کیسا بنو؟ انھوں نے کچھ برا تھوڑی چاہا تھا۔ انھوں نے تو ہاتھ تھامنے کی ہی کوشش کی تھی نا؟ تم خدا لگتی کہو، کیا اس میں کوئی برائی ہے؟ بنو، اس بات سے تو اللہ بھی راضی اور اس کا رسول بھی راضی۔ فساد تو، برا مت ماننا، تمھارے بھائیوں نے کیا۔ جان لے لی انھوں نے بچی کی۔ بدی پر تو وہ اُتر آئے نا۔“ تائی جی نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا۔

”بھابی، میں نہ بھائیوں کی طرف داری کرنا چاہتی ہوں، نہ میں اُن سے خوش ہوں۔ میں تو اُن منحوسوں کی شکل بھی اب نہیں دیکھنا چاہتی۔ مر گئے میرے لیے تو وہ جیتے جی۔ اُن

کم بختوں کی تو غیرت نے جان لے لی اُس معصوم بچی کی — پر بھابی، بھائی صاحب نے بھی بڑا ظلم کیا۔ نہ وہ قدم بڑھاتے، نہ فہمی کی جان جاتی۔"

"بنو، یقین کرو، انھوں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ وہ تو ظلم کرنے والے آدمی ہی نہیں ہیں۔"

"بھابی، میں آپ کی عظمت کو سلام کرتی ہوں، آپ بڑی شوہر پرست بیوی ہیں۔" ماں نے جیسے چیخ کر کہا، "آفرین ہے آپ پر، شوہر بیس سال چھوٹی لڑکی پر ڈورے ڈال رہا ہے، اس سے نکاح کا منصوبہ بنا رہا ہے اور آپ ہیں کہ اُسے قصوروار سمجھنے کو تیار ہی نہیں۔ بڑی عظیم ہیں بھابی آپ واقعی۔" ماں کے لہجے کی تلخی کو صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"تمھیں غصہ ہے ابھی، اس لیے تم مسئلہ نہیں سمجھ رہیں۔ ٹھیک ہے ابھی نہیں، کچھ وقت بعد ذرا ٹھنڈے دل سے اس مسئلے پر سوچنا، تمھاری سمجھ میں آجائے گا کہ تمھارے بھائی صاحب کچھ غلط نہیں کر رہے تھے۔ یہ میں ان کی طرف داری نہیں کر رہی، تمھیں سچائی بتا رہی ہوں۔ اس میں ان کا رتی ماشہ قصور نہیں ہے، میری بہن، میری گڑیا، میں سچ کہتی ہوں تم سے۔"

"نہیں، یہ کبھی میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں ہمیشہ بھائی صاحب کو قصوروار سمجھتی رہوں گی۔" ماں نے تنک کر کہا۔

"دیکھو بنو! میں تمھیں آخری بات اور بتا دیتی ہوں، اس کے بعد جو تمھارا ایمان کہے، تم وہ مانو۔ اُسی رات جب عامل صاحب نے فہمی کے جن اُتارے تھے اور تمھارے بھائی صاحب کو فہمی کا ٹیرودار بنایا گیا تھا تو رات ہی کو انھوں نے پورا واقعہ مجھے بتا دیا تھا۔ پھر بعد میں بھی وہ فہمی کے بارے میں مجھے سب کچھ بتاتے رہے۔ فہمی نے انھیں اپنا آئیڈیل کرلیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ان سے عمر میں بیس برس سے زیادہ چھوٹی ہے۔ وہ اُس کے سلسلے میں پریشان تھے۔ میں تمھیں سچ بتاؤں، وہ اس بارے میں سے تم بات بھی کرنا چاہتے تھے، پر میں نے منع کیا کہ ابھی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ فہمی واپس اپنے ماں باپ کے پاس جائے گی تو میں خود تم سے ساری بات کرلوں گی۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ مجھے فہمی سے اُن کے نکاح پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ بھئی جب اللہ نے اور اُس کے رسول نے ایک کام کی اجازت دی تو میں کون ہوتی ہوں منع کرنے والی۔" بڑی اماں نے ذرا توقف کیا پھر نرمی سے بولیں، "بنو! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ فہمی باپ کے گھر جا کر اناؤں کی بھینٹ چڑھ جائے گی تو میں اُسے کبھی نہ جانے دیتی، چاہے کچھ بھی ہو جاتا، میں اُسے اپنے پیچھے کرتی اور سب کے آگے آ کر کھڑی ہو جاتی۔"

تائی جی کی اس بات کے بعد اندر سے دیر تک کوئی آواز نہیں آئی، نہ تائی جی کی اور نہ

ہی ماں کی۔ سناٹے کی تکلیف سے گھبرا کے میں تھوڑی دیر بعد مُنیا کو لے کر جب گھر میں داخل ہوا تو ماں پھوٹ پھوٹ کے روتی تھیں۔ تائی جی نے اُنھیں دونوں بازوؤں میں بھرا ہوا تھا۔ اُن کی اپنی آنکھیں بھی برستی تھیں۔

تایا جی واپس آنے کے لیے نہیں گئے تھے۔ ممکن ہے کہ پہلے اُن کا ارادہ ہو کہ کچھ عرصے بعد وہ واپس آجائیں گے لیکن پھر وقت نے، حالات نے یا کسی اور شے نے واپسی کے خیال کو اُن کے ذہن سے نکال دیا ہو۔ بیس برس گزر گئے، وہ ایک بار بھی نہیں آئے اور شاید اب کبھی آئیں گے بھی نہیں۔ جانے کے پانچ برس بعد انھوں نے پہلی بار تائی جی اور اپنے تینوں بچوں کو حج کے موقعے پر بلایا تھا۔ تین ساڑھے تین مہینے بعد یہ لوگ واپس آگئے۔ پھر دو سال بعد انھوں نے دوبارہ بلایا۔ اس طرح یہ معمول بن گیا۔ وہ ڈیڑھ دو سال بعد اپنی فیملی کو بلا لیتے۔ یہ لوگ کچھ عرصے اُن کے پاس رہ کر واپس آجاتے۔ اسی دوران اُن کی دونوں بیٹیوں کے رشتے آئے۔ دونوں کی شادی انھوں نے اپنے پاس بلا کر کی۔ ایسا انھوں نے کیوں کیا، یہ ایک الگ قصہ ہے جو پھر کبھی سناؤں گا کہ اس قصے میں بھی بڑے پھیر ہیں۔ بہرحال، ایک بیاہ کر آسٹریلیا چلی گئی اور دوسری دبئی۔ بیٹے کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد اسے سعودی عرب ہی میں نوکری مل گئی۔ چار برس پہلے تائی جی اُن کے پاس عمرے کے لیے گئی ہوئی تھیں جب روضۂ رسول پر سلام کر کے باہر آتے ہوئے انھیں چکر آیا اور وہ گر پڑیں۔ ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا لیکن اُن کی روح پرواز کر چکی تھی۔

ماں، تائی جی کو اور تایا جی کو اکثر یاد کرتی ہیں، یاد کرتے کرتے رونے لگتی ہے۔ کبھی ابو اور کبھی میں اُن کی تایا جی سے فون پر بات کرا دیتے ہیں تو وہ سلام کے بعد بس دو جملے اُن سے کہتی ہیں، ''بھائی صاحب! بھابی اور آپ بہت یاد آتے ہیں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔'' اس کے سوا میں نے انھیں کبھی کچھ کہتے نہیں سنا، لیکن جس دن اُن کی تایا جی سے فون پر بات ہو جاتی ہے، اُس کے بعد کئی روز تک جانے کیوں بات بے بات اُن کی پلکیں بھیگتی رہتی ہیں۔

○○○

کُوک بھرا کھلونا

محمد حمید شاہد

کتنی عجیب بات ہے یہ، کہ وہ، جو کئی کرداروں کی زندگی جیتا تھا، اچانک مر گیا۔

وہ اپنے کرداروں کو چھوتا تھا، یوں کہ وہ جی اٹھتے تھے۔ اس جی اٹھنے کا راز اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ ان کی کھال میں گھس کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔

یوں لگتا ہے اس نے بوڑھی عیار موت کو بھی جی اٹھنے والا کردار بنانا چاہا تھا، اپنی کہانی کا کردار۔ اور ابھی دن پوری طرح معدوم نہیں ہوا تھا کہ اس سیاہ چشم کے ڈھیلے ماس کے جھریوں بھرے جال میں گھس کر وہ راستہ بھول گیا۔

اس نے عجب عجب کرداروں کی کہانیاں لکھی تھیں۔ ''تیرھواں کھمبا'' نامی محبت کی کسک کو جھیل جانے والی انجی کی کہانی، جو ایک تہذیبی رشتے کے تقدس میں بندھ کر دولخت ہو گئی تھی۔ اور پیچھے کی سمت بھاگتے کھمبے گننے والے اس کے عاشق کی کہانی بھی، جس نے اپنی محبوبہ کو اپنے شوہر کے ساتھ دیکھا تھا تو اسے لگا تھا جیسے تیز رفتار ریل کار کا انجن اس کے اوپر سے گزر گیا ہو اور اس کی بوٹیاں ہوا میں اڑ رہی ہوں۔ اپنے اندر کی گھٹن کے تعفن اور باسی پن سے بھاگ نکلنے والی ''بند مٹھی میں جگنو'' کی اس شہری لڑکی کی کہانی، جس نے پہلی بار ننگی گالیاں سنی تھیں تو اس کے بدن سے چمٹی ہوئی جونکیں ایک ایک کر کے جھڑ گئی تھیں اور لچی لفنگی مشٹنڈی ہونے کے طعنے سننے اور سنانے والی مچھپے کٹنیوں سے پوشیدہ رکھے جانے والے انسانی اعضا کے ناموں کو فراوانی سے سنا تھا تو اپنے بدن میں باسی ہو جانے والی زندگی کو تازہ ہوتے اور ایک لذت کو پھوٹتے پایا تھا۔ میلہ دیکھنے آنے والے اس شخص کی کہانی جس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ''راستے بند ہیں''،

جیسی اس انوکھی کہانی کا یہ عجب کردار لکھتے ہوئے اس نے اپنے اندر کی ساری لذت اس کے اندر اتار دی تھی۔ حتیٰ کہ ٹرک کے نیچے آ کر کچلا جانے والا کوئی اور تھا مگر موت کی لذت اس کے اندر اتری جو خالی جیب میلا دیکھنے آیا تھا، لہٰذا وہ مر گیا تھا۔

کچی پکی قبریں، پانی میں گھرا پانی، رکی ہوئی آوازیں، ہوکا، تماشا، راتب، جیکو پچھے، بیک مرر، وقت سمندر، سارنگی، پولی تھین، نظر کا دھوکا، بنج کلیان، سزا اور بڑھا دی، درخت آدمی، کٹم کاٹا۔

کٹم کاٹے کا کھیل چلتا رہا۔ وقت لمحہ لمحہ کر کے تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتا رہا اور وہ کرداروں کی لکیریں بناتا اور انھیں کاٹتا رہا۔

اس نے عجب عجب ذائقے لکھے اور ان کا چکھنا لکھا۔

نئے نئے مناظر لکھے اور ان کا دیکھا جانا لکھا۔

انوکھی انوکھی خوشبوئیں لکھیں اور ان کا مشامِ جاں میں اترنا لکھا۔

لذت بھرے لمس کو محسوس کیا اور اسے زندگی بنا کر لکھا۔

اس نے جس طرح اپنے کرداروں کو شدت سے سوچنے پر اُکسایا، اتنے ہی بھولپن سے انھیں دانش بھرے سوالات کے مقابل کر دیا۔

بے پناہ محبت کی طویل نہر کھودی اور ساری آدمیت کو اس کے کنارے بسانا چاہا۔

محترم ہو جانے والے رشتوں کو لکھا اور اپنے محبوب کرداروں کو اس ریشمی ڈور میں پرونا چاہا۔

کرداروں کے اندر ایک عجب طرح کی حمیت جگائی اور ان کے لہو میں اپنی رجتل، کی خوشبو کو اتار دیا۔

عجب عجب کہانیاں، عجب عجب کردار۔ کہیں موت کے کھلیان سے اگتی ہوئی زندگی۔ کہیں زندگی کی نس نس میں اترتی ہوئی موت۔

یوں نہیں ہے کہ موت اس کے لیے کوئی اجنبی کردار تھا، اس نے اسے محبت سے لکھا ہے اور سفاکی سے بھی۔ یہ موت کبھی تو انجن کی چیخ کے بعد اس کے تھر تھر کانپے چلے جانے پر اس عاشق کی سی ہو گئی تھی جو ریل کار کے نیچے کچلا نہیں گیا تھا بلکہ اس کے دروازے میں کھڑا ہوا کے جھونکوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور کبھی علی احمد پر قسطوں میں اترنے والے اس عذاب جیسی، جو مرنا چاہتا تھا مگر مر نہیں سکتا تھا حتیٰ کہ اس کی اپنی بیوی نے جھنجھلا کر پوچھا تھا، ''کیا ہم سب کو مار کر

مرنے کا ارادہ ہے؟" اسی کہانی میں موت نے آکر موت کو آوازیں دینے والی اسی عورت کی "سزا اور بڑھا دی" تھی۔

ادبدا کر کھسک جانے والی موت سے لے کر ترسا ترسا کر مارنے والی موت تک، ایک ہی ہلے میں بہت سارے انسانوں کو مار ڈالنے والی موت سے لے کر اس شخص کی موت تک جسے "پولی تھین" کھا کر مرنا تھا مگر جو موی لفافے کے تعاقب میں بجلی کے کھمبے پر چڑھا اور کرنٹ لگنے سے مر گیا تھا۔

سب طرح کی موتیں اس نے لکھ ڈالی تھیں۔

مگر یوں لگتا تھا کہ جیسے جو موت اسے لکھنا تھی، وہ ابھی باقی تھی لہذا وہ خود اس کے ڈھیلے ماس کے جال میں اتر گیا۔

اچھا یوں نہیں ہے کہ اچانک وہ اپنے نصیبے میں لکھی ہوئی موت کے مقابل ہوا تھا۔ اور یہ بھی بجا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے ادراک میں کہیں پہلے سے تھا تاہم یوں ہے کہ میرے لیے یہ مرحلہ ٹوٹ پڑنے والی قیامت کا سا تھا۔

مجھے یاد ہے، کچھ عرصہ پہلے جب اس کے دل کی دھڑکنیں اپنا آہنگ چھوڑنے لگی تھیں اور اس نے اپنی چھاتی کا ماس کٹوا کر اس میں پیس میکر رکھوا لیا تھا، اس نے ایک کہانی لکھی تھی، "کوک بھرے کھلونے۔"

تب اس نے بتایا تھا کہ موت اسے چھو کر نکل گئی تھی۔

وہ ساری عمر عجب اور انوکھے خیال سوچتا اور لکھتا رہا۔ موت اسے چھو کر گزری تو اس نے اپنے آپ کو ایک کوک بھرا کھلونا کہا۔ کہانی مکمل ہو گئی تو مجھے بلایا اور مزے لے لے کر ساری کہانی مجھے سنا دی۔

کہانی سنا چکا تو اس نے سوچے ہوئے کئی عنوان میرے سامنے رکھ دیے۔

ایک...دو...تین...چار...

میں نے کہا، "کوک بھرا کھلونا"

کہانی میں کوک بھرے کھلونے کا حوالہ آیا تھا، ایسا کھلونا جس میں چابی بھرتے ہیں اور وہ زندہ ہو جاتا ہے، مگر یہ عنوان اس فہرست میں نہ تھا جو اس نے سوچ رکھے تھے۔

وہ الجھن میں پڑ گیا کہ اس عنوان سے وہ سب الجھن میں پڑ سکتے تھے جو فوری طور پر "کوک" جیسے لفظ سے معنی اخذ نہ کر سکتے تھے۔

کہانی کو الجھاوا بنانے والوں پر وہ خوب برستا تھا۔ ترسیل اسے عزیز تھی تاہم اسے محض واقعہ بنا ڈالنے کے حق میں بھی نہ تھا۔

اچھا جملہ کہنا، تہذیبی تناظر اچھالتا ہوا، دیہی دانش سے لبالب بھرا ہوا، مٹی کی خوشبو میں گندھا ہوا مگر کہانی کے اندر پوری طرح پیوست، ہاں یہ بھی اسے عزیز تھا۔

اور کہانی کا ایسا عنوان، جو پوری توجہ کھینچ لے اور پڑھنے والے کو کہانی کی طرف مائل کر دے۔ کہانی کی طرف اور اس تخلیقی حصار کی جانب بھی جو وہ اپنے جادو بھرے بیانیے سے کھینچا کرتا تھا۔

خیر میرا اصرار بڑھا تو اس نے کہانی کے اوپر یہ عنوان جما کر اسے کئی بار ڈہرایا۔ پھر چپ ہو گیا اور اپنی چھاتی پر وہاں ہاتھ رکھا جہاں اس نے پیس میکر لگوا رکھا تھا۔

اس نے بتایا تھا:

''جب میں نے ڈاکٹروں سے یہ پوچھا تھا کہ اس مشین کی کوئی گارنٹی ہے، جو آپ نے میری چھاتی میں گاڑ دی ہے تو انھوں نے کہا تھا ہاں، مگر آدمی کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔''

پھر وہ خود ہی ہنسنے لگا تھا۔ وہ ہنستا رہا۔ نہیں، شاید وہ ہنسنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ تب ہی تو میں بوکھلا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ جھینپ کر چپ ہو گیا اور میرا دل رکھنے کو وہ کہانی سنانے لگا جو ڈاکٹروں نے اسے کچھ سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے سنائی تھی۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جو مر گیا تھا مگر اس کا پیس میکر اس کے مرنے کے بعد بھی کام کرتا رہا۔ یہ پیس میکر بعدازاں مرنے والے کی وصیت پر ایک اور ضرورت مند کو لگا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس مشین کی قیمت بتائی تھی جس کی کارکردگی کو کمپیوٹر سے آنکا جا سکتا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ پیس میکر ابھی تک اس ضرورت مند کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔

''کوک بھرا کھلونا۔'' میں نے ڈہرایا۔

یوں لگتا تھا اسے میری تجویز اب اچھی لگنے لگی تھی۔ اس نے اسے تھوڑا سا بدل کر لکھا، ''کوک بھرے کھلونے۔''

پھر میری طرف دیکھا، کہا:

''یہ ٹھیک رہے گا کہ ہم سب تقدیر کے ہاتھوں میں کوک بھرے کھلونے ہی تو ہیں۔ پتا نہیں کب اور کہاں کوک ختم ہو جائے۔''

مقدر کو بدل لینے کا اس میں حوصلہ تھا، ساری عمر اس نے یہی تو کیا تھا۔ یوں لگتا ہے، وہ مسلسل اپنے قلم سے اپنی تقدیر میں کمی بیشی کرتا آیا تھا، مگر کچھ برسوں سے مجھے محسوس ہونے لگا تھا

کہ موت جس سے وہ کنی کاٹ کر گزرنا چاہتا تھا اس کی محبوبہ ہوگئی تھی، سیاہ چشم محبوبہ۔ موت کو سیاہ چشم اس نے تب کہا تھا جب وہ گلابوں کی مہک کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہی تھی اور جب اس کی یہ محبوبہ اس کے مقابل آئی تو اس کی کہانی کو اس نے شام پڑنے سے پہلے پہلے لکھنا چاہا۔

عصر کا وقت ڈھل رہا تھا۔

شام پڑنے اور رات کے آلینے میں ابھی کئی سے باقی تھے، اس کی کہانی مکمل ہوگئی اور سارا خسارہ ہماری جھولی میں آگرا تھا کہ موت کی کہانی لکھتے ہوئے وہ اپنے بدن میں لوٹ کر کوک بھرنا بھول گیا تھا۔

○○○

فیوژن

مشرف عالم ذوقی

''تو کیا سوچا ہے تم نے؟''

''ابھی تک میں نے کچھ نہیں سوچا...''

باپ نے بیٹے کی طرف غور سے دیکھا— بیٹا بغور اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''لیکن کچھ تو سوچا ہوگا؟''

''ہاں۔'' بیٹے نے گہری سانس لی۔

''مجھے بتاؤ گے؟''

''میں بتانا ضروری نہیں سمجھتا...''

بیٹا اب بھی باپ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ باپ کو اس طرح دیکھنے سے الجھن ہو رہی تھی۔ شاید اسی لیے باپ نے نظریں جھکا لیں۔ ایسا کرتے ہوئے بیٹے سے مکالمہ کرنا باپ کے لیے آسان ہو گیا تھا۔

''تو تم مانتے ہو کہ میں ایک اچھا باپ نہیں ہوں۔''

''ہاں۔'' بیٹے کے اندر کوئی جھجک نہیں تھی۔ ''ایسے باپ میرے دوستوں کے بھی ہیں۔ اور دوست اپنے باپ کی کہانیاں سناتے ہوئے ذرا بھی پریشان نہیں ہوتے۔''

''تو تم بھی پریشان نہیں ہو۔''

بیٹے نے ایک لمحے کے لیے باپ کو دیکھا۔ اس کا لہجہ سخت تھا— ''لیکن میں پریشان

ہوں۔ کیوں کہ میں اپنے دوستوں کی طرح نہیں ہوں۔ اور میں نے کبھی آپ کو اس طرح نہیں سوچا، جیسے آپ نظر آتے ہیں۔''

''تو یہ تمھاری غلطی تھی نا، کہ تم نے باپ کو فرشتہ سمجھا— جب کہ باپ بھی انسان ہوتے ہیں۔ باپ سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ باپ سے بھی گناہ اور جرم سرزد ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود باپ اپنے بیٹوں کو پیار کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس کی اپنی ذات، اور بیوی بیٹے کے لیے اس کی موجودگی ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہوتی ہے۔ تو تمھارے خیال سے...؟''

باپ نے اس بار نظر اٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا—

بیٹا اب بھی اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا—

''تو تمھارے خیال سے ایک باپ کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہیے...''

''کیوں نہیں چاہیے۔''

''باپ کو فیشن نہیں کرنا چاہیے۔ باپ کو اڑنا نہیں چاہیے— باپ کو ایک بزرگ کی طرح رہنا چاہیے۔ باپ کو عشق نہیں کرنا چاہیے۔''

بیٹے کی آنکھوں میں اچانک چمک پیدا ہوئی تھی۔ اس بار باپ کا چہرہ ہر طرح کے تاثرات سے عاری تھا۔

''تم کیوں سمجھتے ہو کہ تم میرے بیٹے ہو تو میری اپنی ذات کی چمک ختم ہوگئی ؟ ایک انسانی جسم تمھارے پاس بھی ہے اور میرے پاس بھی۔ اور اس انسانی جسم کا فاصلہ ۲۵ سال سے زیادہ کا نہیں ہے۔ تم مجھ سے پچیس سال چھوٹے ہو بس...''

''پچیس سال کم نہیں ہوتے۔''

''زیادہ بھی نہیں ہوتے—'' باپ نے مسکرانے کی کوشش کی— ''اس عمر میں تمھارے سلمان، عامر اور شاہ رخ فلموں میں کمر مٹکاتے اور رومانس کرتے نظر آتے ہیں۔''

بیٹے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی— ''آپ نہ شاہ رخ ہیں نہ سلمان۔''

''جانتا ہوں۔ عامر خان بھی نہیں ہوں۔''

''اور آپ ان کی طرح فٹ بھی نہیں ہیں۔''

''یہ بھی جانتا ہوں— کیوں کہ ان کی زندگی فٹ نس کے آگے پیچھے ہی گھومتی ہے۔''

''آپ ان سے جلتے ہیں؟''

''یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، نہیں— کیوں کہ میری زندگی میری اپنی ہے، جیسے

تمھاری زندگی تمھاری، لیکن ابھی جن ہیروز کے نام تم نے لیے، ان کے بھی بیوی بچے ہیں، گھر ہے۔ خاندان ہے اور ذاتی زندگی سے الگ ان کے رومانس کی کہانیاں بھی ہیں۔''

''گاسپس۔''

''ممکن ہے، لیکن تم بھی ان لڑکوں میں سے ایک ہو جو اس طرح کے گاسپس کے مزے لیتے ہیں۔''

''شاید۔''

''ایسا کوئی قصہ باپ کی زندگی میں پیدا ہو تو؟''

اس بار بیٹے کا لہجہ کڑوا تھا۔ اس کی زبان لڑکھڑائی۔ وہ صرف اتنا ہی بول سکا۔

''میں آپ کو بھی جانتا ہوں۔''

اس بار باپ کے چونکنے کی باری تھی... ''کیا؟''

''کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ میں آپ کو بھی جانتا ہوں—'' بیٹا اس بار غصے سے باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب باپ کی آنکھوں میں دھواں سا لہرایا تھا...

''تم کیا جانتے ہو۔ یا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' باپ کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

بیٹا اس درمیان سنبھل چکا تھا۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں مجبوری کی تڑپ تھی۔

''آپ باپ ہیں۔ اس لیے آپ کو قبول کرنا ہی ہے۔ آپ کے جرم اور گناہوں کے ساتھ—'' اور اسی کے ساتھ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

باپ سناٹے میں تھا۔ بیٹے کے لفظ دھماکے کر گئے تھے... یادوں کی ریل چھک چھک کرتی ہوئی آنکھوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ باپ کو اس رشتے میں محبت اور توازن بحال کرنا تھا۔ باپ مطمئن تھا اور طمانیت کے لیے یہ سوچنا کافی تھا کہ وہ فرشتہ نہیں انسان ہے۔ اس لیے اس سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بیٹا کیا جانتا ہے؟ یا بیٹے نے کیا دیکھا ہے؟ وہ ایسا کیا ہے جس نے بیٹے کو باپ کے لیے ایک باغی بیٹے میں تبدیل کر دیا ہے۔

باپ کی آنکھوں کے آگے کتنی ہی پرچھائیاں سمٹ آئی تھیں۔

باپ کے لیے اس اچانک مکالمے سے باہر نکلنا مشکل تھا، لیکن باپ ان باپوں کی طرح نہیں تھا جو ایسی باتوں پر جذباتی بن کر بیٹھ جاتے ہوں، اور پھر دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیتے ہوں کہ وہ بیٹے کے لیے ایک ایمان دار باپ میں خود کو تبدیل کر کے دکھائیں گے۔ باپ ایسی ایمان

داریوں کو پسند نہیں کرتا تھا اور باپ کے پاس ان باتوں کے لیے مناسب جواب بھی تھا کہ وہ انسان ہے اور بار بار غلطی کرنے کے لیے مجبور بھی — بیوی اور بیٹے سے بے پناہ پیار کے باوجود بھی باپ کو محبت کا نشہ تھا۔ اور باپ ایسی کسی بھی محبت کو اپنے لیے جائز بھی سمجھتا تھا۔ باپ بیٹے کی طرح نہ سہی، لیکن خود کو ایک بھرپور جوان مرد کے طور پر ہی دیکھتا تھا، جو جھلمل کرتی آنکھوں میں خواب سجا سکتا ہے—اڑ سکتا ہے— کسی کافی ہاؤس میں اپنی کسی نئی محبوبہ کے ساتھ کافی کی چسکیاں لے سکتا ہے۔ اور باپ کو اس میں کوئی برائی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

مگر اس وقت باپ کے لیے مشکل یہ تھی کہ اس کے بیٹے نے کچھ نہ کچھ دیکھا ضرور تھا، مگر... بیٹے نے کیا دیکھا تھا۔ الجھنوں سے بھرے چہرے کے ساتھ وہ آئینے کے سامنے تھا۔

''تم پریشان ہو...؟''

''نہیں تو...''

''پریشان ہو...'' عکس مسکرا رہا تھا۔

باپ نے حامی بھری— ''ہاں پریشان ہوں۔''

''اس لیے کہ بیٹے نے بغاوت کردی ہے؟''

''نہیں۔ اس لیے کہ اس نے کچھ دیکھا ہے۔''

''اچھا مان لو اس نے کچھ دیکھا ہے۔ اور اس کا لہجہ بتاتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا...''

''ہاں۔''

''اچھا۔ تمھارے بھی باپ تھے۔ مان لو، تم نے ابھی اپنے باپ کو ایسے ویسے کسی رنگ میں دیکھا ہوتا تو...؟''

''نہیں جانتا۔ لیکن باپ کے سامنے میری زبان نہیں کھلتی۔''

''اس لیے کہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم بیٹے کی طرح مکالمہ ادا نہیں کر سکتے تھے—؟''

''ہاں۔''

''تو بیٹے کی تعریف کرتے ہو یا اس کے انداز سے غصہ ہو—؟''

''غصہ نہیں۔ اس عمر کے نوجوانوں کی خوداعتمادی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنے کی ادا سے متاثر ہوں۔ وہ خیال ہی نہیں کرتے کہ سامنے کون ہے، دوست یا ڈیڈی؟ وہ بے باک

ہیں۔ جیسا سوچتے ہیں، منہ پر کہہ دیتے ہیں۔''

''لیکن تم... یہ بے باکی تمھارے اندر نہیں ہے؟''

''ہاں۔''

''مان لو۔ بیٹے نے اگر ایسا کچھ دیکھا ہے تو...؟ کیا تمھیں شرمندگی ہوگی؟''

''نہیں—'' باپ کے پاس اس کا جواب تیار تھا— ''جسم ہے تو مانگ بھی ہوگی۔ بیٹا نئے زمانے میں جیتا ہوا بھی ماڈرن نہیں ہے۔ ماڈرن ہونے کا مطلب صرف آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا نہیں ہے۔ یہ سمجھنا بھی ہے کہ جیسا جسم بیٹے کے پاس ہے، ویسا ہی جسم اس کے ماں، باپ کے پاس بھی ہے۔ اور اس کے ماں باپ اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ ان کے جسم کے پاس مانگیں نہ ہوں...''

باپ نے عکس کو اس بار لرزتے ہوئے محسوس کیا۔

''تمھاری مانگ تمھاری بیوی سے الگ بھی ہے؟''

''ممکن ہے۔''

''تو ایک مانگ تمھاری بیوی کے اندر بھی ہو سکتی ہے؟''

''ہونی چاہیے۔''

''اگر وہ اپنی مانگ کو لے کر باہر جاتی ہے تو...؟''

''یہ اس کی اپنی اخلاقیات ہوگی۔''

عکس ٹھٹھا کا مار کر ہنسا— ''اور تمھاری اخلاقیات...؟''

''میں خوب صورت تسلیوں سے اس اخلاقیات کو مطمئن کر دیتا ہوں۔ مثال کے لیے صرف مذہب ہے جو جسم کے تقاضوں کو آگے بڑھنے سے روک سکتا ہے۔''

''تو مذہب کو مانتے ہو نا...''

باپ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی— ''ہاں بھی اور نہیں بھی۔''

''ایسا کیوں؟'' عکس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''مذہب مانتا ہوں۔ پیروی نہیں کرتا۔ جسم کی مانگوں کو مذہب سے الگ مانتا ہوں۔''

''مذہب میں جسم نہیں آتا...؟''

''مذہب جسم میں کچھ زیادہ ہی دخل دیتا ہے— اور جسم کی اڑان ساری حدوں کو توڑتی ہوئی ہوتی ہے۔''

''اسی لیے یہ اڑان تمھیں کم زور کردیتی ہے۔''

''ہاں۔''

اور اسی لیے مانتے ہو کہ بیٹے نے کچھ دیکھا ہے...''

''ہاں...''

''اور... مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم کچھ باتیں چھپانے کی کوشش کررہے ہو...''

''شاید...'' باپ کا لہجہ اس بار سہا ہوا تھا— ''بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اس عمر میں میرے باپ ایک بوڑھے آدمی تھے۔ سماج سے خوف زدہ، جیسا کہ اس وقت کے سارے باپ ہوتے تھے۔ جن کے پاس غلط اور ناجائز کی کوئی تعریف ہوتی ہی نہیں تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں کہیں تو اس عمر میں وہ ایک بے حد شریف اور بزرگ مرد میں تبدیل ہو چکے ہوتے تھے، جن سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا— لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اور کم از کم میں ایسا نہیں ہوں۔ میں ابھی آگے کے دس پندرہ برسوں تک خود کو بزرگ سمجھنے کی بھول نہیں کرسکتا...'' باپ نے کندھے اچکائے— ''ایک ماڈرن ماں اس عمر میں جینس اور ٹی شرٹ پہن کر اپنی بیٹی کے ساتھ چلتی ہے تو وہ اس کی بڑی بہن لگتی ہے۔ کل اس عمر میں ماؤں کے چہروں پر بزرگ جھریوں کے نقش ونگار پیدا ہوچکے ہوتے تھے...''

''ہاں۔'' عکس غور سے سن رہا تھا— ''آج مرد عورتیں دونوں ہی ہیلتھ کانشس ہیں۔ پھر جم ہے، یوگا ہے اور باہر کی دنیا ہے...''

''اور اسی لیے اڑان ہے''— باپ اب مطمئن تھا— ''لیکن اس اڑان کو میں سمجھتا ہوں، بیٹا نہیں۔ بیٹا ماڈرن ہوتے ہوئے بھی اپنی ماں اور باپ کے لیے ماڈرن نہیں ہے...''

''مثال کے لیے...''

''مثال کے لیے...'' باپ کہتے کہتے ہنسا... ''زمانہ الٹا ہوگیا ہے۔ کل تک ہم بیٹے پر نگاہیں رکھتے تھے کہ وہ کیا کررہا ہے، کہاں جارہا ہے، لیکن آج بیٹا باپ پر نگاہیں رکھتا ہے۔ مثال کے لیے کہ اس کا باپ کس سے باتیں کررہا ہے۔ کہاں جارہا ہے... کس سے چیٹ کررہا ہے۔ فیس بک پر کس سے باتیں ہورہی ہیں۔ جب کہ ایک باپ مطمئن ہے کہ اس کا بیٹا اگر جوان ہے تو وہ کسی سے بھی اپنی رومانٹک باتیں شیئر کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ پورن سائٹ بھی دیکھ سکتا ہے۔ آپ اس پر بندش لگائیں گے تو یہ کام وہ باہر جاکر یا چھپ کر کرے گا...''

''ہونہہ۔'' عکس نے گہرا سانس لیا— ''تو تم بیٹے سے ڈر رہے ہو...''

''ہاں۔''

''کیوں کہ بیٹا تم پر نظر رکھتا ہے۔''

''شاید...''

''اور اس کے باوجود تم اڑنا چاہتے ہو۔''

''ہاں۔ کیوں کہ یہ زندگی میری اور اڑان میری ہے۔ اور میرے لیے یہ فلسفہ بہت ہے کہ خاندان کے علاوہ میری اپنی ایک نجی زندگی بھی ہے۔ اور اس زندگی میں مجھے ہنسنے مسکرانے اور رومانس کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا بیٹے یا دوسروں کو حاصل ہے۔''

باپ مطمئن ہے۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا ہے۔ یہاں دیوار پر دو تین خوب صورت پینٹنگس کے درمیان ایک اس کی بھی تصویر ہے، بلیک اینڈ وہائٹ، کوئی پچیس سال پرانی۔ اس تصویر میں باپ کے چہرے پر پورے پورے بال ہیں۔ سفید شیشے کے فریم سے جھانکتی آنکھیں ہیں۔ مسکراتی ہوئی— اب ان آنکھوں کی مسکراہٹ کہیں کھو گئی لگتی ہے۔ مسکراتے ہوئے اس کے سفید چہرے جیسے دانت بھی جھانک رہے ہیں۔ باپ کو احساس ہے، اس کے آگے کے دانت بہت جلد ٹوٹ گئے۔ اب نقلی دانتوں کے سہارے باتیں کرتے ہوئے اسے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے— پچیس برسوں میں زندگی کی موسیقی کہیں کھو گئی۔ اب یہ فیوژن کا وقت ہے۔ پچیس برس پہلے کا باپ ایک خوب صورت جوان مرد تھا۔ آج اس کا بیٹا جوان ہو چکا ہے...

باپ غور سے تصویر کو دیکھتا ہے۔ مسکرانے، چہکنے کی کوشش میں بیٹے کے مکالمے راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''اب بھی مان لو، تم بوڑھے ہو گئے ہو ڈیڈ۔''

باپ ہنسنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس بار اس کی ہنسی کہیں کھو گئی لگتی ہے۔

○○○

ہست نیست

نیلم احمد بشیر

میرے بیٹے علی نے ہمیشہ کی طرح اپنا اسکول بیگ میری شاپ کے ایک کونے میں پٹخا، اوراسٹول کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اپنا معمول کا سوال دُہرایا، ''کھانا کھالیا تھا؟''

یہ حقیقت ہے کہ ہر ماں اپنے بچے کے کھانے پینے کے بارے میں ہمیشہ متجسس اور فکرمند ہی رہتی ہے، چاہے بچہ جتنا مرضی صحت مند اور ہٹا کٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اب بچہ بھی نہ رہا ہو، مگر اسے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ اُس کے بچے نے ٹھیک سے کھایا نہیں ہوگا۔ وہ یقیناً بھوکا ہی ہوگا۔

''ڈونٹ وری مام! میں نے اسکول میں لنچ کرلیا تھا اور اچھی طرح خوب پیٹ بھر کے کھایا تھا۔'' علی بیٹا روز مجھے مسکرا کر یہی جواب دیتا تو میں مطمئن ہوکر اپنی شاپ کے کسٹمرز کو اٹینڈ کرنے میں مصروف ہوجاتی۔ جب تک میں شاپ میں رہتی، علی اس بڑے سے وہائٹ مارش شاپنگ مال میں ہی گھومتا پھرتا رہتا۔ کبھی کبھار اپنا اسکول کا ہوم ورک بھی کسی بنچ پر بیٹھ کر ہی مکمل کرلیتا۔ کبھی اس اسٹور کبھی اس اسٹور گھومتا، سکورٹی گارڈز سے ہیلو ہائے کرتا، اسٹور مالکان اور ملازمین سے گپیں لڑاتا، وقت گزار لیتا تھا۔ سب اس سے بہت مانوس ہوگئے تھے اور اس کی موجودگی کے عادی بھی۔ اگر کبھی ایک آدھ دن وہ ان کی طرف نہ جا پاتا تو مجھ سے پوچھنے چلے آتے کہ علی کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے؟ نظر کیوں نہیں آ رہا؟ کوئی کہتا میں نے اس کے لیے چاکلیٹ کیک کا ایک پیس بچایا ہوا ہے، کوئی کہتا، اسے کہنا آ کر فریش لیمونیڈ پی لے، تو کوئی اس کے لیے یوں ہی کوئی گفٹ چھوڑ جاتا۔

شاپنگ مال اسٹورز والے گورے، کالے، چینی، انڈین، پاکستانی، امریکن اب کتنے ہی

برسوں سے ہماری فیملی کی طرح بن گئے تھے اور علی سے تو خاص طور پر بہت ہی شفقت سے پیش آتے تھے۔ علی اسکول میں بہت اچھے گریڈز لیتا تھا جس کی وجہ سے سب علی سے بہت خوش ہوتے۔ اُسے تھپکی دیتے اور اس کی اسکول کارکردگی کو سراہتے رہتے تھے۔

گوڈائیوا چاکلیٹ اسٹور پہ کام کرنے والا بوڑھا نیلسن تو خاص طور پر علی سے بہت پیار کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب میں اور علی کے ابو اُسے ہنس کر کہتے، ''لگتا ہے تم تو علی کے نانا اور دادا کی جگہ لے چکے ہو''، تو وہ بڑا خوش ہوتا۔ علی بھی اسے گرینڈ پا کہہ کر بلاتا تو مجھے اپنے دل کی گہرائی میں افسوس کی ایک لہر کروٹ لیتی محسوس ہوتی کہ علی کے نانا اور دادا اس سے اتنی دور تھے۔ وہ اسے یوں بڑھتے، پھلتے پھولتے، زندگی میں آگے کی طرف روانہ ہوتے دیکھ نہ سکتے تھے مگر وطن سے دور رہنے والوں کے ساتھ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔

ہم لوگ قریباً پندرہ سال سے امریکا میں رہائش پذیر ہیں اور ہر لحاظ سے سیٹ ہیں۔ یہاں کے اچھے نظام اور سکھ چین دیکھ کر کئی بار دل میں حسرت جاگتی ہے کہ کاش ہمارے اپنے پیارے پاکستان میں بھی اسی طرز سے لوگ زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔ ہمارا وطن بھی اتنا ہی پرابلم فری ہوجائے مگر جس طرح ہمارے حکمران ایک کے بعد ایک آتے ہیں اور ملک کے وسائل اور دولت، اختیارات کو لوٹتے ہیں، اس کے بعد ان سے کسی بہتر نتیجے کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔

امریکا میں رہنے والے بچوں کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ اور منافقت کے گُر سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ہمارا علی بھی ایسا ہی ہے۔ میں اور اس کے ابو دو تین سال بعد وطنِ عزیز کا ایک چکر لگاتے ہیں تو وہ بھی ہمراہ ہوتا ہے، مگر پاکستان کو زوال پذیر دیکھ کر بہت حیران پریشان ہوجاتا ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ملک آخر ایسا کیوں ہے، جیسا کہ ہے، اور امریکا کی طرح کیوں نہیں ہے۔ علی سچ کہنے سے بالکل بھی نہیں ڈرتا اور جہاں موقع ملے، تنقید شروع کردیتا ہے۔

ابھی دو سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔ ہم لوگ پاکستان گئے ہوئے تھے، رشتے داروں، دوستوں سے میل ملاقات میں مصروف اور خوش تھے۔ بڑے بھیا نے، جن کا تعلق ایک پرانی سیاسی پارٹی سے ہے، ہمیں اپنے ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ پارٹی ایک زمانے میں اپنے انقلابی منشور اور متحرک قائدین کی وجہ سے بہت مقبول تھی مگر اب گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کے لالچی، خودغرض عہدے داروں نے ایسی خباثت بھری کرپشن کی، کہ عوام کا ان پر سے اعتماد جاتا رہا۔ الیکشن کے قریب آتے ہی پارٹی پھر برسرِ اقتدار رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور یہ جلسہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ہم سب تو اس پارٹی کی نیک نیتی کے بارے میں کافی مشکوک

تھے مگر بھیا کو شاید اب بھی ان سے کچھ امید تھی جو مسلسل ان کے بجھے ہوئے چراغوں کے دھوئیں کو روشنی کی پرچھائیں سمجھنے کی غلط فہمی میں گرفتار رہتے تھے۔

بہرحال ان کے جلسے کی ہی بات ہے، خوب زور شور سے تقریریں ہو رہی تھیں۔ پاکستان کو ایک بہتر ملک بنانے کے لیے منصوبے بنائے جا رہے تھے کہ یک دم کسی نے کہا، ''ینگ بلڈ کو آگے آنا چاہیے۔ نئی جنریشن کی رائے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ اس ملک کے لیے کیا اور کیسا سوچتے ہیں''، وغیرہ وغیرہ۔

چند نوجوان بچے اسٹیج پر آئے اور پُرجوش تقریروں اور جذباتی مذہبی نعروں سے پنڈال کو گرمانے لگے۔ ہر طرف تالیاں بجنے لگیں اور نوجوان مقررین پر تحسین کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔ یکایک بھیا کو کچھ خیال آیا۔ انھوں نے علی کی طرف دیکھ کر اعلان کیا، ''اتفاق سے میرا نوجوان اور فیورٹ بھانجا علی اس وقت یہاں موجود ہے۔ یہ امریکا میں رہتا ہے مگر آج کل پاکستان کا مہمان ہے اور آخر کیوں نا ہو، بھئی پاکستان میں اس کے باپ دادا کی جڑیں ہیں۔ میں علی کو اظہارِ خیال کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ آئے اور ہمیں بتائے کہ آج ہمارا ملک کہاں کھڑا ہے اور ہمیں کس سمت جانا چاہیے۔'' یہ سنتے ہی علی نے فوراً میری طرف دیکھا اور پھر مثبت اشارہ دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسٹیج پر جا کر مائک تھام لیا۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے گھاگ سیاست دان، اس میدان کے پرانے کھلاڑی مزید چوڑے ہو کر کرسیوں پر پھیلنے لگے۔

''ہیلو اینڈ السلام علیکم!'' علی نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا، ''میں ایک امریکن پاکستانی ہوں اور میری لینڈ اسٹیٹ میں ایک سرکاری اسکول میں زیرِ تعلیم ہوں۔ اس کے علاوہ میں اپنی پاکستانی کمیونٹی کی پاکستان ایسوی ایشن کا بھی اہم رکن ہوں۔ میں نے آپ سب کی تقریریں سنی ہیں۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ سب لوگ منافق اور جھوٹے ہیں، آپ صرف اپنے فائدے کی ہی بات کرتے ہیں۔ ملک کے وسیع تر مفاد سے آپ کو قطعاً کوئی دل چسپی نہیں ہے۔''

علی کے منہ سے یہ باتیں سنتے ہی مجمعے کو سانپ سونگھ گیا۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ایک لمحے کو تو میں بھی دل ہی دل میں کانپ کے رہ گئی، ''یاالٰہی خیر۔ یہ امریکن بچہ کہیں کچھ اور اول فول نہ بک دے۔'' میں نے گھبرا کر سوچا۔ علی مکمل اعتماد سے بولتا چلا گیا۔

''ہم امریکا میں رہتے ہیں جہاں معاشرے کی بنیاد ہی دیانت داری اور نظم و ضبط پہ ہے۔ لوگ اپنے ملک کے ساتھ مخلص ہیں جب کہ پاکستان میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں حکمرانوں

کو محض اپنی جھولیاں بھرنے کی پڑی رہتی ہے اور عوام بھوکے، ننگے، کام چور اور آسانیاں تلاش کرنے والی قوم بن چکے ہیں، قانون کی کوئی بالادستی نہیں اور ہر ادارہ زمیں بوس ہو چکا ہے۔ آئی، ایم سوری مگر آپ لوگوں کو پہلے امریکا کی طرح اصول پرستی، فراخ دلی اور تعمیری سوچ اپنانا ہوگی۔ وہاں ہر ایک کو اپنا حق ملتا ہے۔ کوئی کسی کا حق نہیں مارتا۔ فیصلے سفارشوں پہ نہیں، میرٹ پر ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں کو پہلے اپنا ذاتی اور قومی کردار ٹھیک کرنا ہوگا۔ یہ ملک تبھی ترقی کرے گا اور دنیا کی مہذب قوموں کے شانہ بشانہ چل سکے گا۔ ان خالی خولی تقریروں کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ لوگ تکلیف نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔'' علی یہ سب کہہ کر چپکے سے نپے تلے قدم اٹھاتا اسٹیج سے نیچے اُتر آیا اور مجمعے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا، میں خوش تھی یا شرمندہ؟ پھر چند ہی لمحوں بعد بھیا نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ علی کی کمر تھپتھپاتے ہوئے بولے:

''یہ نوجوان بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرا امریکا سے آیا ہوا نوجوان بھانجا سچ بولنے کی صلاحیت اور جرأت رکھتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے ملک کا ہر نوجوان ایسی سوچ اپنائے، تبھی اس ملک کے مقدر کا ستارہ سنور سکتا ہے۔''

بھائی جان کی یہ بات سن کر میں نے سکھ کا سانس لیا اور ہولے سے مسکرا دی۔ میں جانتی تھی کہ میرا بیٹا کہتا تو سچ تھا مگر پھر سچ سننے کا حوصلہ پاکستان کی سیاسی پارٹیوں یا حکمرانوں میں ہوتا ہی کہاں ہے؟

''ڈیئر کزن! شکر کر تجھے ابّو کی باتوں نے بچا لیا، ورنہ یہاں تو ایسی کوئی بات کرے تو اسے جوتے اور ٹماٹر کھانے پڑ جاتے ہیں۔'' بھائی جان کے ٹین ایج بیٹے ارسلان نے علی کے کندھے کو ہولے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ میں اور علی کھلکھلا کر ہنس دیے۔

وہائٹ مارش شاپنگ مال میں ہمارے اسٹور کو چلتے اب بہت سے سال بیت گئے ہیں۔ ہم معاشی طور پر کافی حد تک مستحکم ہو چکے ہیں۔ علی بھی تعلیم کے میدان میں منزلیں مارتا ماشاء اللہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اب تو اس نے اسکول کے ایف ایم ریڈیو اسٹیشن پر بھی بطور اینکر پرسن کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کو اعتماد سے گفتگو کرتے اور میوزک پلے کرتے سن کر ہم بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا بچہ امریکا میں ہر طرح سے اپنی تخلیقی اور تعلیمی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے مواقع حاصل کر رہا ہے اور اُسے کسی بھی طرح سے پیچھے نہیں رہنا پڑتا۔ وہ جو جی چاہے، کرتا ہے اور ماں باپ کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بھلا کیا بات ہو سکتی ہے؟

سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا کہ حال ہی میں ایک واقعہ ہوا۔ پوری دنیا یہ خبر سن

کر دنگ رہ گئی کہ امریکی فوجیوں نے رات کی خاموشی میں چپکے سے ایک سیکرٹ آپریشن کیا اور ایبٹ آباد میں مقیم اسامہ بن لادن اور اس کے اہلِ خانہ کو ٹارگٹ کرکے مار دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ امریکی میڈیا نے اسامہ، اس کی بیویوں، بچوں، ملازمین، کسی کو بھی ٹی وی پر دکھایا نہ ان کے بیانات سنوائے۔ آج کے میڈیا awareness دور میں یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ آج تو دنیا کے کسی کونے میں کوئی مکھی یا مچھر بھی مر جائے تو فوراً کیمرے کی آنکھ اسے محفوظ کرلیتی ہے اور میڈیا پہ نشر کردیتی ہے۔ امریکا کا دشمن جاں مارا جائے اور کیمرا کچھ بھی نہ دکھائے، اس سے شکوک و شبہات اور ابہام تو پیدا ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ امریکیوں کو تو جاب ویل ڈن ہونے کا اطمینان اور سکون چاہیے تھا، لہٰذا وہ اسامہ کی ہلاکت اور سمندر بوس ہونے کی خبر سنتے ہی خوشی سے جھوم اٹھے اور ناچتے ناچتے سڑکوں پہ نکل آئے۔ شیطان کے خاتمے کا رقص مناتے، وہ ایک دوسرے کو مبارک بادیں دے رہے تھے اور جیسے امریکا کی ٹی شرٹس پہنے خوب اترا رہے تھے۔ علی بھی بہت خوش تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا، ''دیکھا مام، ڈیڈ۔ آخر امریکا نے دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد کا خاتمہ کر ہی دیا نا... واٹ اے گریٹ کنٹری... امریکا کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اب ساری دنیا میں امن چین ہوجائے گا۔ شکر ہے آپ لوگ امریکا چلے آئے اور میں یہاں پیدا ہوا...'' وہ ہنستا مسکراتا اٹھا اور ٹی وی پہ سی این این کی خبریں دیکھنے لگا۔

اگلا دن امریکیوں کے لیے، کرسمس سے بڑھ کے خوشی کا دن تھا۔ ہر طرف سیلی بریشن جاری تھی۔ اسکول کے بعد میں اس روز علی کا ایف ایم ریڈیو پروگرام تھا جس پہ علی نے تازہ ترین صورتِ حال اور خبروں کو موضوعِ سخن بنایا اور بار بار خوش ہوکر اعلان کیا، "We got him" (ہم نے اسے پکڑ لیا) ایکسائٹمنٹ کے مارے اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے کتنے ہی خوشی کے نغمے چلائے اور جوکس سنائے۔ پروگرام بہت خوش گوار ماحول میں چلتا رہا۔ اتنی کالز آئیں کہ ٹیلی فون کی لائنیں جام ہوکر رہ گئیں۔ کوئی امریکی فوجیوں کی شجاعت، کوئی ملٹری اسٹریٹجی، کوئی پاکستانی حکومت کی نالائقی بیان کر رہا تھا اور کوئی کہہ رہا تھا کہ پاکستان ایک جھوٹا ملک ہے، اتنے بڑے دہشت گرد کو چھپا رکھا تھا اور ہم سے امداد بھی بٹورے جا رہا تھا۔

رات کھانے کی میز پر علی ہمیں یہ سب بتا رہا تھا مگر میں اور علی کے ابو کچھ چپ چپ سے تھے۔ ہمیں اس روز پہلی بار احساس ہوا کہ ہمارے گھر میں تو ایک امریکن رہتا ہے، ایسا جس کی سوچ ہماری سوچ سے جدا ہے اور جس کے نظریات انھی حقائق پہ مبنی ہیں جنھیں امریکی میڈیا اپنے عوام کو اسپون فیڈ (spoon feed) کرتا ہے۔ ہم تیسری دنیا کے تارکینِ وطن، ہماری کیا مجال کہ ہم آقاؤں کی پالیسیوں، ترجیحات اور حتمی فیصلوں کے آگے کچھ کہہ سکیں۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے آلو گوشت اور چپاتی کو سامنے رکھے اجنبی نظروں سے علی کی طرف دیکھتے رہے اور علی اپنی اسٹیک اور

بیک پوٹیٹو (Steak and Bake Potato) کی پلیٹ ہاتھ میں لیے خبریں دیکھنے میں مصروف رہا۔
فاکس چینل پہ ان کی مشہور ٹاک شو اینکر Greta Van اپنا ٹیڑھا منہ گول گول گھما کر ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کو لعن طعن اور گوروں کو دنیا کی مہذب ترین اقوام قرار دے کر اپنے دلائل پیش کر رہی تھی۔ بار بار بش کی وہ نیوز کلپنگ (clipping) بھی دکھائی جا رہی تھی جس میں اس نے کہا تھا ہم پاکستان کو پتھر کے دور میں پہنچا دیں گے وغیرہ وغیرہ...عجب سرکس لگا ہوا تھا۔
''مگر امریکا تو دنیا کا خود سب سے بڑا دہشت گرد ہے۔ تیل اور طاقت کے لیے پوری دنیا پہ قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ یہ آج کے دور کی کالونائزیشن ہے۔'' علی کے ابو رہ نہ سکے اور بے قابو ہو کر بولے۔
نوجوان امریکی کے پاس اپنے ہی دلائل تھے۔ میں نے گھبرا کر چینل ہی بدل دیا، کسی انڈین چینل پہ ''مائی نیم از خان'' چل رہی تھی۔ ''تو یہ اب انٹرٹینمنٹ کی دنیا کے بھی یہی موضوع ہو گئے ہیں۔'' میں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا اور کھانے کی میز سے برتن سمیٹنے لگی۔
''دنیا بدل چکی ہے۔ اب عشق و محبت کے بجائے دہشت گردی اور عالمی صورت حال کو موضوع بنائے بغیر انٹرٹینمنٹ کی دنیا بھی کامیابی حاصل نہیں کر پاتی۔'' انھوں نے سمجھانے کے انداز میں مجھے جواب دیا۔
اگلے روز میں شاپنگ مال میں اپنے اسٹور پہ ہی کام کر رہی تھی کہ جب معمول کے تین بجے علی مجھے دروازے سے آتا دکھائی دیا۔ وہ کچھ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا مگر میں نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ آتے ہی اس نے حسبِ معمول بستہ ایک کونے میں رکھا مگر نہیں، اسے رکھنا نہیں، پھینکنا ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اور منہ بسور کے بیٹھ گیا۔
''کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟ اتنا موڈ کیوں خراب ہے؟ کھانا کھا لیا تھا؟'' میں نے حسبِ معمول اس سے مادرانہ سوالات کرنے شروع کر دیے۔
''آپ کو پتا ہے آج اسکول میں کیا ہوا؟'' علی نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا۔
''کیا؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا اور پیار سے اُسے چھوا۔
''جیسے ہی اسکول پہنچا، اسکول کے ساتھیوں نے مجھے کہا، ہمیں مبارک باد دو۔''
''اچھا! وہ کس بات پر؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
''کہنے لگے، ہم نے تمھارا باپ پکڑ لیا، اسے مار دیا اور پھر سمندر میں دفنا دیا اور تم کچھ نہ کر سکے۔'' وہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ وہ غصے سے بولا۔
''اوہ!'' موقعے کی نزاکت سمجھ کر میں خاموش ہو گئی۔ میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔
''ہائے میرا بچہ...'' میرے لبوں سے نکلا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اپنا بچہ بہت معصوم، بے خبر اور بے ضرر سا لگا۔ اسے تو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ ان میں سے نہیں ہے جن میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہے۔

اسے تلخ حقیقتوں کا ادراک ہو رہا تھا اور میرا دل ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا۔

''بس بیٹا! اب احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ ہم یہاں رہتے ہیں۔ یہ ہماری چوائس تھی کہ ہم یہاں آئیں، رہیں، ان کے نظام اور برتر معیشت میں سے اپنا حصہ ڈھونڈیں، ہمیں خاموش رہنا ہوگا۔'' میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''مگر مام میں تو امریکن بارن ہوں۔ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے؟'' علی اب بھی لاجک کی بات کرتا چلا جا رہا تھا۔

''مام یہ ڈیم امریکن اتنے متعصب، تنگ نظر اور تھرڈ کلے ہوتے ہیں؟ اتنی محدود سوچ ہے ان کی۔ انھیں تو دنیا کی سیاسی، معاشی، جغرافیائی پوزیشن کا کچھ بھی پتا نہیں ہے۔ بس یہ لوگ صرف اپنے آپ کو ہی صحیح سمجھتے ہیں۔ آخر ہم سب مسلمان تو دہشت گرد نہیں ہیں۔ ہم امن پسند ہیں، کیا USA میرا ملک نہیں ہے؟ مام آپ لوگوں نے مجھے یہاں کیوں پیدا کیا؟ بڑا کیا؟ Where do I belong Mom?۔''

علی کے سوالوں نے مجھے ہمیشہ کی طرح لاجواب کر دیا تھا۔

''میرا رنگ گوروں کی طرح سفید ہے، نہ کالوں کی طرح سیاہ...'' وہ اٹھا اور اپنے چہرے کو سامنے لگے شیشے میں بغور دیکھنے لگا۔

''میں جا رہا ہوں مام!'' وہ یکا یک اٹھا اور اپنی جیکٹ پہننے لگا۔

''کہاں؟'' میں نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

''آج میں اس شاپنگ مال کے سب اسٹور والوں کو جو اب تک میری دوستی کا دم بھرتے تھے، جا کے سناؤں گا کہ تم امریکن کس قدر متعصب اور مطلب پرست ہو، تم لوگ تنگ نظر ہو، کوئی یہاں میرا نہیں، نہ ہی میرا دوست ہے، وہ گرینڈ پا بھی جھوٹ موٹ کا نانا، دادا بنا ہوا ہے۔ یہ سب لوگ ہم کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، دشمن سمجھتے ہیں۔ میں ان کو خوب سناؤں گا مام۔''

میرے آوازیں دینے کے باوجود علی پیر پٹختا ہوا باہر چل دیا۔ اس نے میری ایک نہ سنی۔ امریکن بھلا کہاں رکتے، یہ کب کسی کی سنتے ہیں۔

○○○

دلدل

رئیس فاطمہ

آج صاعقہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ لنچ ٹائم میں اس نے چھٹی لی اور بس اسٹاپ پر آن کھڑی ہوئی۔ ابھی اسے بس کا انتظار کرتے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ٹویوٹا کرولا پاس آکر رُکی، کسی نے گاڑی کا شیشہ اُتار کر اسے پکارا، ''صاعقہ...!'' اس نے آواز کا تعاقب کیا، کسی نے اسے اشارے سے قریب بلایا اور کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا، ''آؤ...'' آواز دوبارہ اُبھری۔ وہ زبیدہ تھی — اس کی عزیز سہیلی، جو نجانے کہاں کھو گئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر جلدی سے اندر بیٹھ گئی۔ سگنل کھل چکا تھا۔ گاڑی میں خوش گوار ٹھنڈک تھی۔ جون کی تپتی دوپہر میں گاڑی کی ٹھنڈک جنت سے کم نہ تھی۔

''بس میرے ساتھ گھر چلو، وہیں باتیں ہوں گی۔'' اس نے سیاہ چشمہ اتار کر کہا،
''لیکن میں تو گھر جانے کے لیے آج ہاف ڈے کر کے جلدی نکل آئی تھی۔ میری طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے۔'' صاعقہ نے کہا، دراصل وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ دو کمروں کے کوارٹر میں رہنے والی ایسی شان دار گاڑی میں کیسے بیٹھی ہے، جب کہ گاڑی باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا۔

''نہیں میں کچھ نہیں سنوں گی، اتنے عرصے بعد تو تم ملی ہو، میں تمھیں خود شام کو چھوڑ آؤں گی۔'' زبیدہ نے محبت سے کہا۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی وہ بری طرح احساسِ کم تری کا شکار ہوگئی۔ قیمتی پینٹنگ، خوب صورت صوفے، دمکتا فانوس جو چمکتے سورج کی طرح کرنیں بکھیر رہا تھا۔ بے حد

خوب صورت اور قیمتی پردے، اعلیٰ درجے کے ڈیکوریشن پیس۔ ایک طرف میرؔ، غالبؔ اور فیضؔ کا مجلد کلام اور دوسری طرف دیوار پر ٹنگی آیت الکرسی۔ بیش قیمت قالین، جن کی نرمی سے یوں لگ رہا تھا جیسے بلی کے بچے پیروں سے لپٹ گئے ہوں۔ اس نے اپنے کپڑوں کا موازنہ صوفوں سے کیا تو خود بہ خود آنسو نکل آئے۔

اچانک زبیدہ نے آکر اس سے کہا کہ وہ بھی منہ ہاتھ دھوکر ذرا فریش ہوجائے۔ وہ کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ غسل خانے میں گھس کر اسے یوں لگا جیسے کسی اور عجائب خانے میں آگئی۔ اتنا بڑا اور لمبا غسل خانہ— بڑے بڑے آئینوں سے مزین ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ، نہانے کی چوڑی سی کرسی الگ، بے حد خوب صورت باتھ ٹب— اور نہ جانے کیا کیا، جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کا جی چاہا ساری زندگی یہیں گزار دے۔ اس کے چھوٹے سے گھر کے مقابلے میں یہ غسل خانہ کتنا خوب صورت اور کتنا بڑا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ جلدی سے منہ پر چھپاکے مار کے باہر آگئی۔ زبیدہ اسے لے کر کھانے کی میز پر آگئی۔ کھانوں کی مہک نے اس کی اشتہا بڑھا دی۔ زبیدہ نے بڑے پیار سے اسے کھانا کھلایا۔ پھر دونوں سہیلیاں بیڈ روم میں آگئیں۔ جہازی سائز کے ڈبل بیڈ پہ قیمتی بیڈشیٹ بچھی تھی، خواب ناک سے ماحول میں وہ صوفے پر بیٹھ گئی— اور غیر ارادی طور پر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کیا تمھاری شادی ہوگئی؟''

زبیدہ کے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرایا۔ ''نہیں تو... البتہ حامدہ کی شادی ہوگئی ہے۔ وہ فیصل آباد میں رہتی ہے۔ اس کا میاں انجینئر ہے۔''

وہ کوشش کے باوجود یہ نہ پوچھ سکی کہ یہ ٹھاٹ باٹ کیسے ہوگئے— شام کو جب وہ واپس جانے کے لیے اٹھی تو زبیدہ نے اسے ایک پیکٹ پکڑا دیا۔

''خالہ جان نظر نہیں آرہیں؟'' چلتے چلتے صاعقہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال پوچھ ہی لیا، جو بہت دیر سے اس کے گلے میں اٹکا ہوا تھا۔

''امی حامدہ کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ اگلے مہینے اس کی ڈلیوری ہے۔''

گھر آکر اس نے بے تابی سے پیکٹ کھولا۔ اندر دو عدد لان کے سوٹ پیس تھے اور کچھ میک اپ کا سامان— وہ نڈھال سی ہوکر بستر پہ گرگئی۔ اور سوچنے لگی کہ اتنے مہنگے سوٹ خریدنا اس کی تو اوقات سے باہر تھا، مگر زبیدہ کو کسی خزانے کی کنجی کیوں کر ملی— جب کہ چند سال پہلے وہ

بھی انھی دو کمروں کے سرکاری کوارٹر میں رہتی تھی۔ اور اس کی طرح ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ چار بہنوں میں ایک چھوٹا بھائی، والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں سلائی کرتی تھی اور حامدہ گھر پہ ٹیوشن پڑھاتی تھی... پھر— یہ سب کیونکر اور کیسے...؟ اس کا دماغ چکرا گیا۔ اسے اپنا بوسیدہ گھر آج بہت برا لگ رہا تھا، شدید ڈپریشن نے اسے جکڑ لیا اور وہ روتے روتے سو گئی۔ خواب میں بھی وہ خود کو زبیدہ کے ساتھ دیکھ رہی تھی، عشا کی اذان پہ ماں نے آکر اٹھایا تو اس کا پنڈا پھنک رہا تھا اور بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ماں نے اسے پیناڈول اور ڈسپرین دی، اور بتی بجھا کر کمرے سے چلی گئیں۔

صبح جب فیکٹری کی گاڑی اسے لینے آئی تو اس نے تہیہ کرلیا کہ اب وہ کبھی اس سے نہیں ملے گی۔ اسے ایک طرح سے اس سے جلن اور حسد محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ بہت آگے نکل گئی تھی۔ اب اسے اور اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ غربت کی کوکھ میں پلی ہے اور چند سال پہلے تک ایک پس ماندہ بستی میں رہتی تھی۔

دو دن بعد اچانک ایک شام اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف زبیدہ تھی، جو اس سے دوبارہ فون نہ کرنے کا شکوہ کر رہی تھی۔ اور پھر چند منٹ بعد ہی دروازے پہ دستک ہوئی۔ چھوٹے بھائی نے دروازہ کھولا تو زبیدہ وہاں کھڑی تھی۔ سلمان کو ٹکٹکا دیکھ کر وہ خود اندر چلی آئی۔

''ارے چھٹکو... مجھے پہچانے نہیں... میں تمھاری زبیدہ باجی ہوں۔''

سلمان نے آنکھیں ملتے ہوئے اسے یوں دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ وہ زبیدہ ہے۔ صاعقہ اس کی آواز سن کر کمرے سے باہر آ گئی۔

''بس میں نے سوچا تمھیں آج سرپرائز دوں... اس لیے بغیر اطلاع کے چلی آئی۔'' زبیدہ نے صاعقہ کے گلے لگ کر کہا۔

وہی زبیدہ جس کے ساتھ صاعقہ زمین پر بیٹھ کے گٹے کھیلتی تھی، کھانا کھاتی تھی۔ دونوں برابر والے کوارٹر میں لگے املی کے درخت سے کتارے توڑ کر چوری چھپے کھاتی تھیں... آج اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زبیدہ کو کہاں بٹھائے۔ کمرے میں ایک طرف زمین پر پلاسٹک بچھا تھا اور دوسری طرف تخت، جس پر صرف ایک دری پڑی تھی، لیکن زبیدہ بغیر کسی تکلف کے تخت پہ بیٹھ گئی... باتوں باتوں میں صاعقہ نے اسے بتایا کہ ابا ریٹائر ہو گئے ہیں، بڑے بھیا کی بیوی نے ماہانہ خرچہ دینے پہ اتنا جھگڑا کیا کہ امی نے انھیں منع کر دیا ہے کہ جو دو ہزار وہ ہر ماہ دیتے تھے، وہ نہ دیں۔

''ارے! تو کیا عادل بھائی الگ ہو گئے۔'' زبیدہ نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں! انھیں الگ ہوئے تو سال بھر ہو گیا۔ شادی کے تیسرے دن ہی سے بھابی نے الگ گھر کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ بھائی کا رویہ بھی بہت بدل گیا تھا۔ وہ بھی کیا کرتے۔ بیوی کی بات مان کر چپکے سے الگ گھر لے لیا اور اچانک ہمیں بتایا کہ وہ جا رہے ہیں۔ بھابی دو دن قبل ہی میکے چلی گئی تھیں۔''

''کیا ماں باپ اسی دن کے لیے بیٹوں کی تمنا کرتے ہیں؟'' زبیدہ نے کہا۔

''اس کلچر اور سوچ کو میں اور تم نہیں بدل سکتے۔ بیٹے شاید جنم ہی اس لیے لیتے ہیں کہ ماں باپ کو دکھ دیں— جب انھیں سہارے کی ضرورت ہو تو تنہا چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسا لیں جس میں صرف اُن کی بیوی اور سسرال والوں کی جگہ ہو۔'' صاعقہ رو پڑی۔

''اور حمیرا کیا کر رہی ہے؟''

''وہ سیکنڈ ایئر کی تیاری کر رہی ہے۔ ساتھ ساتھ گھر پہ بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی ہے۔ اماں سلائی کرتی ہیں اور اچار چٹنیاں بنا کر فروخت کرتی ہیں۔ ہمارے وہی روز و شب ہیں— جیسے تم چھوڑ کر گئی تھیں۔ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔''

زبیدہ نے اسے گلے سے لگا لیا، پتا نہیں کب سے رُکے ہوئے آنسو ہمدردی پا کر صاعقہ کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

''یہ بھی کوئی زندگی ہے زبیدہ کہ سارا سارا دن فیکٹری میں کام کرنے کے بعد جو رقم ہاتھ آئے، اس سے مہینے بھر کا راشن بھی نہ آسکے۔''

''تم یہ نوکری چھوڑ دو۔ میں تمھارے لیے کوئی بہتر نوکری تلاش کرتی ہوں— تم کل میرے پاس آنا۔ آرام سے بیٹھ کے بات کریں گے... ان شاء اللہ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔'' زبیدہ نے کہا۔

''صاعقہ! تمھیں تھوڑا سا اپنا حلیہ بدلنا ہوگا... تب ہی کوئی معقول نوکری مل سکتی ہے۔'' زبیدہ نے چائے کا کپ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟ کیا میرا حلیہ برا ہے... لیکن جہاں میں کام کر رہی ہوں، وہاں تو کبھی کسی نے میرے حلیے پہ اعتراض نہیں کیا۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''یار برا نہ مان— سوری— میرا مطلب ہے کہ جہاں میں تمھارے لیے بات کروں

گی... وہ تو تمھارا حلیہ دیکھ کر ہی No کہہ دیں گے، کیوں کہ انھیں ایک اسمارٹ اور جدید فیشن کی لڑکی چاہیے۔ وہ کوئی گارمنٹ فیکٹری تو ہے نہیں کہ جس اوٹ پٹانگ حلیے میں بھی چلی جاؤ، کوئی فرق نہ پڑے۔"

"آخر ایسی کون سی نوکری ہے، جس میں حلیہ بدلنا ضروری ہے؟" صاعقہ نے پوچھا۔

"بھئی میں تمھارے لیے ایک ٹی وی چینل میں بات کر رہی ہوں۔" زبیدہ نے مسکرا کر کہا۔

"کیا؟... واقعی..." صاعقہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی، "مگر میں وہاں کیا کروں گی؟" وہ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

"بھئی ایک چینل کو اسمارٹ سی، خوش شکل، پڑھی لکھی ٹیلی فون آپریٹر چاہیے جو کسی حد تک سیکریٹری کا کام بھی سنبھال لے... اور اگر ذہانت سے اس نے کام سمجھ لیا... تو... تو سمجھو کہ وہ کسی پروگرام کی اینکر پرسن بھی بن سکتی ہے۔" زبیدہ نے صاعقہ کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"سچ... !تم سچ کہہ رہی ہو...؟"

"ہاں— بالکل سچ— تم ذہین ہو، خوش شکل ہو، اسمارٹ ہو، بس اپنی یہ چٹیا کاٹ پھینکو... شانوں پہ لہراتے بال زیادہ اچھے لگتے ہیں... کل ہی چلو میرے ساتھ پارلر... تاکہ تمھارا حلیہ بدلا جاسکے..." زبیدہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"مگر زبیدہ... ابا راضی ہوجائیں گے؟ میرا خیال ہے کہ وہ کہیں منع نہ کردیں... فیصل آباد سے یہاں آنے کے بعد جب اماں نے برقعہ اتارا تھا تو وہ بہت ناراض ہوئے تھے۔" صاعقہ نے خدشے کا اظہار کیا۔ زبیدہ کے چہرے پہ ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھری، "تم ایسا کرنا، پہلے اماں سے بات کرنا، وہ ابا کو راضی کرلیں گی۔"

وہ جب اماں کو تمام تفصیل بتا چکی تو وہ جھٹ سے اُٹھیں اور دوسرے کمرے میں جا کر میاں کو آہستہ آہستہ تفصیل بتانے لگیں۔ پوری بات سن کر انھوں نے صاعقہ کو بلایا۔ تو وہ ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔" وہ نحیف سی آواز میں بولے۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انھوں نے سر اٹھایا اور بولے، "تنخواہ کیا ملے گی؟"

"فی الحال پندرہ ہزار، پک اینڈ ڈراپ مفت، دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے فری... چھ ماہ بعد جب نوکری پکی ہوجائے گی تو ترقی بھی ہوگی۔" صاعقہ نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

''ہوں۔'' انھوں نے ہنکارا بھرا۔

اگلے دن جب وہ زبیدہ کے ساتھ پارلر گئی تو وہاں ایک چٹک مٹک والی عورت نے آگے بڑھ کے زبیدہ سے ہاتھ ملایا اور بولی، ''مس تانیا اس بار بہت دن بعد تازہ گلاب لائی ہیں۔''

صاعقہ کو حیرت ہوئی کہ وہ زبیدہ کو تانیہ کیوں کہہ رہی ہے۔

''بس مسز جعفری، آپ ان کا حلیہ ایسا بدل دیں کہ یہ واقعی گلاب کی کلی لگیں۔'' زبیدہ نے شوخی سے کہا۔

''کلی یا پھول...'' مسز جعفری نے آنکھ دبا کر پوچھا۔

''پھول بننے میں ابھی دیر ہے۔'' زبیدہ ہنس کر بولی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ خود کو نہ پہچان پا رہی تھی۔ مسز جعفری ہی نے اس کے لیے ایک ماڈرن طرز کا پے جامہ اور لمبی سی فراک منتخب کی۔ واقعی گہرا سبز اور جامنی رنگ کا سوٹ اس پہ بہت جچ رہا تھا۔ تیاری کے بعد زبیدہ اور صاعقہ جب پارلر سے باہر نکلیں تو اچانک اس نے پوچھا۔

''تمھارا نام تو زبیدہ ہے... یہ تمھیں تانیا کیوں کہہ رہی تھیں؟''

''حلیے کے ساتھ کبھی کبھی نام بھی بدلنا پڑتا ہے۔'' زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک بلڈنگ میں داخل ہوئیں۔ لفٹ مین نے زبیدہ کو دیکھ کر سلام کیا۔ لفٹ رُکی تو دونوں ایک ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہوئیں۔ زبیدہ نے صاعقہ کو صوفے پہ بٹھایا اور خود یہ کہہ کر باہر نکل گئی کہ وہ ابھی آتی ہے۔ چند منٹ بعد ہی ایک لمبا سا بھاری بھرکم شخص زبیدہ کے ساتھ داخل ہوا اور صاعقہ کو دل چسپی سے دیکھنے لگا۔

''یہ ہیں صاعقہ... جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔'' زبیدہ نے اس شخص سے کہا۔

''اوہ... آئی سی... آپ کب سے ڈیوٹی جوائن کریں گی؟'' اس نے خوش دلی سے صاعقہ سے پوچھا۔

صاعقہ نے زبیدہ کی طرف دیکھا...

''فرید صاحب... یہ کل سے آپ کو جوائن کریں گی۔ آج تو ہم دونوں سہیلیاں تفریح کے موڈ میں ہیں۔'' زبیدہ نے ہنس کر کہا۔

''او کے۔'' وہ بولا۔ پھر صاعقہ کو مخاطب کر کے کہا، ''معاف کیجیے، کیا نام بتایا آپ نے اپنا؟''

''جی— صاعقہ!'' وہ آہستہ سے بولی۔

''صاعقہ... یعنی بجلی۔'' وہ مسکرایا اور پھر فون پہ کسی کو کچھ ہدایات دیں۔ تھوڑی دیر میں دو ٹھنڈی بوتلیں لے کر ایک آدمی اندر آیا۔ ساتھ ہی اس نے کچھ کاغذ فرید کی میز پہ رکھ دیے۔ اس نے زبیدہ سے کہا کہ وہ ان کاغذات پہ صاعقہ سے دستخط کروالے۔ زبیدہ نے جب کاغذات اس کے سامنے رکھے تو فرید نے کہا، ''مس صاعقہ! تمام کاغذات کو اچھی طرح پڑھ لیجیے۔ ہم آپ کو فی الحال پندرہ ہزار دیں گے، پک اینڈ ڈراپ مفت، سال میں بارہ اتفاقی چھٹیاں۔ گھر بنانے یا خریدنے کے لیے نہایت معمولی انٹرسٹ کے ساتھ مطلوبہ رقم۔ ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس بطور بونس وغیرہ— باقی شرائط بھی آپ توجہ سے پڑھ لیں۔''

صاعقہ نے کاغذ پہ دستخط کرنے کے لیے جوں ہی قلم ہاتھ میں پکڑا، زبیدہ نے کہا، ''صاعقہ بہتر ہے کہ پہلے کنٹریکٹ پڑھ لو۔ یہ کنٹریکٹ دو سال کا ہے۔ اس کے بعد ادارے اور تمھارے درمیان اگر انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تو اس کنٹریکٹ کو بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔''

صاعقہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ وہ آہستہ سے بولی، ''سب کچھ تو تم نے اور فرید صاحب نے بتایا ہے— میں مطمئن ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کنٹریکٹ کی چاروں کاپیوں پہ دستخط کردیے۔ جیسے ہی اس نے کاغذات فرید کی طرف بڑھائے۔ اس نے پندرہ ہزار کا چیک اس کی طرف بڑھا دیا۔

اسے جاب کرتے چار دن ہوگئے تھے۔ روزانہ صبح ایک گاڑی آتی جس میں دو تین اور بھی لوگ ہوتے اور صاعقہ سلیقے سے تیار ہوکر چلی جاتی۔ وہ اب پہلے کے مقابلے میں بہت اچھی اور اسمارٹ لگتی تھی۔ جدید تراش خراش کے چند جوڑے خود زبیدہ نے اسے یہ کہہ کر دلوائے تھے کہ وہ صاحبِ حیثیت تھی اور صاعقہ کی سہیلی تھی۔ پہلے دن جب وہ میک اپ کرکے اور دوپٹے کی پٹی کندھے پر ڈال کے جاب پہ جانے لگی تو اچانک ابا سامنے آگئے۔ وہ ڈر گئی کہ اب ان کی پھٹکار سننے کو ملے گی— لیکن اسے حیرت ہوئی کہ وہ نظریں چرا کر واپس کمرے میں چلے گئے، جیسے انھوں نے اپنی بیٹی کو دیکھا ہی نہ ہو۔

اس کا کام فی الحال ٹیلی فون کال ریسیو کرنا اور فرید صاحب کے احکامات پر عمل کرنا تھا۔ یہاں آکر وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی تھی۔ پانچویں دن فرید نے اسے اپنے چیمبر میں بلایا اور کہا کہ چونکہ وہ بہت دور رہتی ہے، اس کے گھر کی تنگ اور گندی گلی میں گاڑی بعض اوقات پھنس جاتی ہے، اس لیے وہ اور اس کے گھر والے پسند کریں تو اس کے لیے کہیں اور ایک اچھا سا

گھر دیکھا جا سکتا ہے، جو چینل سے بھی قریب ہو۔

فرید صاحب شائستہ آدمی تھے، صاعقہ ان کا بہت احترام کرتی تھی۔ ان کی بات سن کر اس نے آہستہ سے کہا، ''لیکن سر ہم ایک اچھا سا گھر کیسے خرید سکتے ہیں؟ ہمارے پاس تو کرایے کی رقم کا بندوبست بھی نہیں ہے۔ پھر ایڈوانس اور ڈپازٹ الگ۔''

فرید صاحب نے موبائل ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا، ''بی بی اس کے لیے تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو کمپنی کے معاہدے میں شامل ہے۔ آپ لون لے سکتی ہیں۔ ہمارے دوسرے بھی پراجیکٹس ہیں اور تمام ورکرز کو ہم یہ سہولت دیتے ہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے ہم قسطوں میں کاٹ لیں گے۔''

''لیکن سر! ابھی تو میں permanent بھی نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔

فرید صاحب ہنسے،''وہ سب کاغذی باتیں ہیں... آپ ہمارے لیے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں، کیوں کہ مس تانیا کا ہماری organisation سے بہت پرانا تعلق ہے۔ انھوں نے خصوصی طور پر آپ کے لیے نہ صرف جگہ نکلوائی، بلکہ خیال رکھنے کو بھی کہا ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں— صرف علاقہ بتا دیجیے اور گھر والوں سے اجازت لے لیجیے۔'' انھوں نے بات ختم کر کے صاعقہ کی طرف دیکھا۔

پہلے مہینے کی تنخواہ ملنے سے پہلے ہی صاعقہ گھر والوں کے ساتھ ایک صاف ستھرے علاقے میں اُٹھ آئی تھی۔ ابا اب چین کی نیند سوتے تھے۔ اماں برملا اعتراف کرتی تھیں کہ بیٹا انھیں چھوڑ گیا تو کیا، اللہ نے اُن کی بیٹی کو آسرا بنا دیا۔ اماں نے سلائی چھوڑ دی تھی۔ زبیدہ کے تعاون سے ان کا چھوٹا سا گھر بک گیا تھا۔ ابا نے وہ رقم فکس ڈپازٹ میں رکھ دی تھی تاکہ صاعقہ کی شادی میں کام آسکے۔ سلمان ایک انگلش میڈیم اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ بھاوج کو جیسے ہی ساس سسر کے حالات اچھے ہونے کی اطلاع ملی، وہ فوراً میاں کے ساتھ ان سے معافی مانگنے چلی آئی۔ میاں بھی کاٹھ کے الّو کی طرح بیوی کے ساتھ سر جھکائے چلے آئے۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ اب ماں باپ کو جیب سے کچھ دینا نہیں پڑے گا۔

صاعقہ اپنے کام سے بہت مطمئن تھی کیوں کہ یہاں زیادہ تر لڑکیاں ہی تھیں۔ نیوز ریڈر، اینکر پرسن سے لے کر دیگر شعبوں میں لڑکیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ مرد حضرات صرف انجینئرنگ کے شعبوں میں تھے یا وہ چپراسی تھے۔ اسے جب موقع ملتا، وہ میک اپ روم میں جا کر روبی سے کچھ نہ کچھ سیکھ لیتی۔ چار، پانچ پروگرام پروڈیوسر اور پروگرام انچارج اس سے کئی بار کہہ

چکے تھے کہ اسے ڈراموں میں آنا چاہیے کیوں کہ اس کا فگر اور نقوش ایسے ہیں جو اسے راتوں رات شہرت دلوا سکتے ہیں۔ وہ جب اپنا چہرہ کبھی کبھی اسکرین پہ دیکھتی تو اسے حیرت ہوتی کہ گارمنٹ فیکٹری کی سیدھی سادی صاعقہ کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس نے گھر میں چھوٹی بہن کا حلیہ بھی بالکل بدل دیا تھا اور اب وہ ایک ماڈرن لڑکی نظر آتی تھی۔

صاعقہ کو اکثر ایک خاتون اینکر پرسن کا رعونت بھرا رویہ بڑا عجیب لگتا۔ وہ پروگرام کرنے آتی تو سیدھی میک اپ روم میں گھس جاتی۔ جب تک اس کا میک اپ ہوتا، کوئی وہاں داخل نہ ہوسکتا تھا۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی۔ فرید صاحب بھی اس کا بہت خیال کرتے تھے اور بہت سے بڑے بڑے سیاست دان اس کے پروگرام میں شرکت کے خواہاں رہتے تھے۔ ایک دن اس کی طبیعت خراب ہوگئی، وہ آفس نہ جاسکی، ڈائریا کا اٹیک تھا۔ دوسرے دن بھی جب وہ نہ گئی تو شام کو فرید صاحب اپنی بیگم کے ساتھ اس کی مزاج پرسی کو چلے آئے۔ صاعقہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اور ماں باپ احسان مندی سے چپ... ایسا بھلا مانس باس کہ ملازم بیمار ہو تو دیکھنے اور مزاج پوچھنے چلے آئے۔

تین دن بعد جب وہ ڈیوٹی پہ پہنچی تو کچھ کچھ نڈھال تھی۔ فرید صاحب نے کہلوایا کہ وہ آرام کرے اور جلد گھر چلی جائے۔ اس کی جگہ سعدیہ ڈیوٹی دے رہی تھی۔ صاعقہ نے کچھ دیر میک اپ روم میں گزارا۔ آج روبی کے پاس بھی کام زیادہ نہیں تھا۔ دونوں کاؤچ پہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ باتوں باتوں میں اس نے جب اس نک چڑھی اینکر پرسن کا نام لیا تو روبی یک دم بولی، ''وہ بہت اونچی چیز ہے اور اس کے پیچھے ایک سیاست دان ہے جس نے اسے یہاں لگوایا ہے۔ بدلے میں چینل کو اشتہارات ملتے ہیں۔ اسی لیے وہ اتنی اکڑ میں رہتی ہے۔''

صاعقہ کو حیرت میں ڈوبا دیکھ کر روبی ہنس کر بولی، ''تمھیں اتنا تعجب کیوں ہو رہا ہے... یہاں یا کسی اور چینل پہ میرٹ پہ بھلا کون آسکتا ہے۔ کسی کے پیچھے ایجنسیاں ہیں، کوئی خود ہی اپنی سفارش ہے، کسی کو اسمبلی کے ارکان بٹھاتے ہیں اور کچھ کو اشتہاری کمپنیاں۔''

''اچھا...!'' صاعقہ نے بھرپور تعجب سے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ... تمھارے پیچھے کون ہے؟ میرا مطلب ہے تمھیں یہاں کون لایا...؟ یا پھر فرید صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے خود تمھارا انتخاب کیا؟'' روبی نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں... میں تو فرید صاحب کو بالکل بھی نہیں جانتی تھی۔ مجھے تو میری بچپن کی ٹیچر مس تانیا نے یہاں لگوایا ہے۔ کیوں کہ ہمارے حالات بہت خراب تھے۔'' اس نے سادگی سے بتایا۔

پھر اچانک بولی، ''اچھا! اگر یہ بات ہے تو بتاؤ تمھارے پیچھے کون ہے؟''

روبی ہنس پڑی، ''واہ! میرا ہی سوال مجھ پہ داغ دیا۔ اچھا تو سنو، مجھے یہاں اس کمپنی نے رکھوایا ہے جو میک اپ کا سامان تیار کرتی ہے۔ مجھے بس یہ کرنا ہوتا ہے کہ صرف اسی کمپنی کی مصنوعات بازار سے منگوائی ہوتی ہیں۔ میک اپ کمپنی چونکہ چینل کو اشتہار دیتی ہے، اس لیے مجھے آسانی سے نوکری مل گئی۔''

''تو کیا تمام چینلز ایسا ہی کرتے ہیں۔'' صاعقہ نے تعجب سے پوچھا۔

''تقریباً— نوے فی صد سے زیادہ یہی ہو رہا ہے۔ کیا مرد، کیا عورت، ہر ایک کے پیچھے کوئی نہ کوئی گاڈ فادر یا گاڈ مدر ہے۔ برائے نام اگر کوئی میرٹ پہ کوئی پروگرام کر رہا ہے، اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اپنا مقام بنا رہا ہے، تو اسے کسی نہ کسی بات کا بہانہ بنا کر ہٹا دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پچھلے دنوں عائشہ بختیار کے ساتھ ہوا۔ وہ اچھا خاصا ایک ادبی پروگرام کرتی تھی۔ خاصی مقبول بھی تھی اور شائستہ بھی۔ لیکن کچھ دوسری قوتوں کو وہ گوارا نہ تھی۔ اس لیے ایک معمولی سی بات پہ ناراض ہوکر اس کی جگہ کسی اور کو رکھ لیا گیا، جو کسی اور کی منظور نظر تھیں۔ یہاں یہ ہوتا رہتا ہے۔''

ابھی یہ دونوں باتیں کر ہی رہی تھیں کہ ڈرائیور نے آکر کہا کہ فرید صاحب کہہ رہے ہیں آپ گھر جاکر آرام کیجیے۔ صاعقہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو روبی کے چہرے پہ اک تعجب تھا... وہ گھر پہنچی تو پرانے محلے کی فرحانہ باجی اس کا انتظار کر رہی تھیں... کچھ دیر بعد باتوں باتوں میں انھوں نے صاعقہ سے کہا کہ وہ اس کی مدد چاہتی ہیں۔

''کیا کرسکتی ہوں میں آپ کے لیے؟'' صاعقہ نے ادب سے پوچھا، کیوں کہ وہ ان کا بہت احترام کرتی تھی۔ فرحانہ ایک رائٹر تھیں اور ان کے تین ناول شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ ایک کالج میں پڑھاتی بھی تھیں۔

''میں چاہتی ہوں تم اپنے چینل والوں سے بات کرو کہ وہ میرے ناول کی ڈرامائی تشکیل کروائیں... میں نے اپنے طور پر کئی جگہ قسمت آزمائی کی، مسودے بھیجے لیکن کوئی جواب نہیں ملتا، کیوں کہ میں جینوئن اور مقبول رائٹر ہونے کے باوجود اپنی انا اور خودداری کے خول میں بند ہوں، لیکن یہ بھول گئی تھی کہ یہاں سفارش کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں۔''

صاعقہ کو روبی کی بات یاد آگئی۔ اسے افسوس ہوا یہ جان کر کہ ایک باصلاحیت ادیبہ کو بھی سفارش کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا۔

''ٹھیک ہے فرحانہ باجی! آپ اپنا مسودہ مجھے دے دیں، میں خود تو ابھی نئی ہوں لیکن

زبیدہ کے تعلقات بہت وسیع ہیں، میں اس سے بات کروں گی۔"

اگلے دن اس نے زبیدہ کو فون کر کے فرحانہ کے بارے میں بتایا تو وہ ہنس کر بولی، "ارے بھئی تم خود پہلے فرید صاحب سے بات کرو۔ یا پھر عشرت بھٹی سے کہو، تمھارا کام ہوجائے گا— لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ پہلے فرید صاحب سے بات کرو۔"

لنچ ٹائم میں صاعقہ فرید کے چیمبر میں اجازت لے کر گئی اور انھیں صورتِ حال بتائی تو وہ خوش دلی سے بولے، "بس آپ نے کہہ دیا نا... کافی ہے، کام ہوجائے گا۔ بی بی میں ان خاتون کے نام سے واقف ہوں، شاید انھوں نے ہمیں بھیجا بھی تھا۔" اتنا کہہ کر فرید صاحب نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور عشرت بھٹی کو بلانے کا کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ چیمبر میں موجود تھا۔ عشرت بھٹی کا نام ڈرامے کے حوالے سے ایک معتبر نام تھا۔ فرید صاحب نے فرحانہ کے ڈرامے کا مسودہ اسے پکڑاتے ہوئے کہا، "یہ کام آپ کو کرنا ہے... جلد از جلد۔"

ایک ہفتے بعد فرید صاحب کی شادی کی چوبیسویں سال گرہ تھی۔ ان کی وسیع و عریض کوٹھی میں مہمان جمع تھے۔ چینل کے تمام ملازمین مع اپنے گھر والوں کے مدعو تھے۔ زبیدہ بھی تھی لیکن ایک چھوٹے قد کے گورے رنگ کے آدمی کے ساتھ۔ صاعقہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ آئی تھی— بہت قیمتی تحفے کے ساتھ۔ حمیرا پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی۔

"آپا... لوگوں کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آتا ہے کہ سالگرہ پر لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں۔ ہمارے ابا نے تو کبھی ایک وقت کی نماز نہ چھوڑی، رشوت نہ لی... لیکن کیا ملا...؟ ہمارے گھر میں تو کسی نے بھی کبھی سالگرہ نہ منائی۔"

اتنی دیر میں زبیدہ ٹہلتی ہوئی ان دونوں کے قریب آنکلی، "ارے تم حمیرا ہو..." اس نے تعجب سے پوچھا، "یار اس دن تو تم بالکل بھتنی لگ رہی تھیں، آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔ یقیناً تمھارا حلیہ صاعقہ نے بدلا ہے۔ کیوں، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

فرید صاحب اور اُن کی بیگم ہنستے مسکراتے سب سے مل رہے تھے۔ دونوں بہت خوش تھے۔ دونوں بچے ماں باپ کے ہمراہ ہی تھے۔ وہ بھی مہمانوں کو ریسیو کر رہے تھے۔ فرید صاحب جب صاعقہ کے قریب پہنچے تو حمیرا کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ اس نے میاں بیوی کو سلام کیا تو صاعقہ نے بہن کا تعارف کرایا۔ بیگم فرید نے سر پہ ہاتھ رکھا اور اپنے دونوں بچوں کا بھی تعارف کرایا۔

فیضان اور فائزہ۔

''کتنی خوش و خرم فیملی ہے۔'' صاعقہ نے زبیدہ سے کہا۔

''ہاں، وہ تو ہے بھئی — دراصل پیسا ہو تو خوشیاں خود ہی آس پاس ناچنے لگتی ہیں۔'' زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔ پھر حمیرا کی طرف دیکھ کر بولی، ''تم ماڈلنگ میں کیوں نہیں آجاتیں۔ ہماری کمپنی یہی کام کرتی ہے۔ وہ باصلاحیت اور خوش شکل لڑکیوں کو کامیاب ماڈل بناتی ہے۔ اس میں پیسا بہت ہے۔ لاکھوں میں کھیلتی ہیں ماڈلز۔'' اس نے حمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سچ آپا! پھر تو میں ضرور ماڈلنگ کروں گی۔'' حمیرا خوشی سے بولی۔

زبیدہ نے فوراً اپنے ساتھ کھڑے شخص سے اس کا تعارف کرایا، ''مسٹر ریاض سومرو — ہمارے باس۔''

ریاض سومرو نے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر حمیرا کو دیا اور بولے، ''ہماری ترجیح ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ نئے لوگوں کو انڈسٹری میں متعارف کرائیں۔ آپ کسی دن میرے دفتر آجایئے اپنی بہن کے ساتھ۔ تھوڑی سی محنت سے آپ اچھی ماڈل بن سکتی ہیں۔''

تین چار دن کے بعد صاعقہ نے فرید صاحب سے پوچھا کہ اس کی تنخواہ سے لون کی قسطیں کب سے کتنا شروع ہوں گی تو انھوں نے کہا کہ اگلے ماہ سے ہر ماہ تین ہزار منہا ہوں گے۔ لیکن انھوں نے ایک بندوبست اور بھی کیا ہے تاکہ اسے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اس بارے میں وہ جلد ہی بتائیں گے۔ چند دن بعد اُن کا فون آیا کہ وہ اسے ایک ٹی وی پروگرام دینا چاہتے ہیں جن میں شہر کے معروف لوگوں کے انٹرویو ہوں گے۔ یہ سب لوگ اپنی اپنی فیلڈ میں بہت مشہور ہیں۔ اس لیے وہ صبح آفس جانے کے بعد لنچ سے پہلے ان کے پاس پہنچ جائے۔ ڈرائیور اسے ان کے پاس پہنچا دے گا... صاعقہ کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ کتنا خیال کرتے ہیں فرید صاحب... اس کے دل سے زبیدہ کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ اس نے اماں کو بتایا تو انھوں نے بھی ہاتھ پھیلا کر زبیدہ کو دعائیں دیں۔

اتنی دیر میں حمیرا سلمان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی اور آتے ہی بہن کے گلے لگ گئی، ''باجی میں نے سومرو صاحب کا کنٹریکٹ سائن کر دیا۔ انھوں نے مجھے ٹریننگ کے لیے کل سے بلایا ہے۔ میں کالج سے آکر وہاں چلی جاؤں گی۔ میری سہیلی آمنہ بھی ساتھ ہوگی۔ میں نے اس کو راضی کرلیا ہے... کیوں کہ سلمان آج بہت بور ہوا۔'' اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

اگلے دن لنچ سے ذرا پہلے ڈرائیور اسے لے کر ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے رُکا۔ صاعقہ کے لیے یہ پہلا موقع تھا کسی شان دار ہوٹل میں جانے کا۔ وہ حیرانی سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ اوپر سیڑھیاں چڑھ کر ڈرائیور نے ایک دروازے پہ دستک دی۔ دروازہ کھلا، فرید صاحب کا شناسا چہرہ نظر آنے پہ وہ اجازت لے کر واپس چلا گیا۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ ایک خواب ناک سے ماحول نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ''پیسا کتنا ضروری ہے، ہر شے کے لیے۔'' اس نے حسرت سے سوچا۔ فرید صاحب نے انٹرکام پہ کچھ ہدایات دیں... اور پھر پروگرام کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ صاعقہ یہ سوچ سوچ کے پاگل ہوئی جارہی تھی کہ اب وہ بھی ٹی وی اسکرین پہ نمودار ہوگی۔ چند منٹ بعد بیرا کولڈ ڈرنک اس کے سامنے رکھ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا مشروب حلق میں اتارتی رہی اور خوش ہوتی رہی کہ... اچانک فرید صاحب کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے لپک کر موبائل اٹھایا، ''اوہو... یہ تو اچھا نہیں کیا آپ نے۔'' انھوں نے کسی سے کہا۔ پھر دوسری طرف کی باتیں سن کر بولے، ''چلیے کوئی بات نہیں۔ صاعقہ یہاں موجود ہیں۔ ہم کھانا کھا لیتے ہیں آپ کے بغیر۔ آپ آرام سے آجائیے۔'' فون بند کر کے انھوں نے انٹرکام پہ کھانے کا آرڈر دیا۔ پھر صاعقہ سے کہنے لگے۔

''غفران صاحب کا پروگرام تو ہمارے ساتھ ہی لنچ کرنے کا تھا لیکن وہ کسی ضروری کام میں پھنس گئے ہیں۔ اب کھانا کھا کر آئیں گے۔'' اتنی دیر میں بیرا کھانا لے آیا۔ کھانے پر فرید صاحب اس کے گھریلو حالات ڈسکس کرتے رہے... کھانے کے بعد وہ صوفے پہ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ فرید صاحب واش روم میں تھے کہ اچانک کمرے کی بجلی چلی گئی۔ ایک دم اندھیرا ہوگیا۔ فرید صاحب نے ٹارچ جلائی۔

''شاید جنریٹر میں کوئی خرابی ہوگئی ہے جو فوراً لائٹ آن نہیں ہوئی۔'' کہتے ہوئے وہ اندھیرے میں اس کے قریب بیٹھ گئے۔ صاعقہ کو ایسا لگا جیسے وہ کسی آہنی شکنجے میں آگئی ہو...!

ویران آنکھوں اور ادھورے وجود کے ساتھ وہ گھر پہنچی تو گھر پہ تالا دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس نے ڈرائیور کو روکا اور حمیرا کے موبائل پہ فون کیا تو وہ برس پڑی، ''حد ہوگئی... تم کب سے موبائل آف کر کے بیٹھی ہو... ہم فون کرتے کرتے تھک گئے... ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ہم اسپتال میں ہیں۔'' حمیرا نے اسپتال کا نام اور کمرہ نمبر بتا کر جلدی سے فون بند کر دیا۔ وہ آنسو جو سب کچھ لٹنے کے بعد بہہ جانے چاہییں تھے، اب اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

''کیا ہوا مس صاعقہ؟'' ڈرائیور نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ابا کو اٹیک ہوا ہے...تم گاڑی اسپتال لے لو۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ گاڑی اسپتال کے گیٹ پہ رُکی۔ وہ جلدی جلدی اندر داخل ہوئی...سامنے ہی حمیرا نظر آ گئی۔

"کیا ہوا... کیسے ہوا یہ سب؟" اس نے گھبرا کر حمیرا سے پوچھا۔

"پتا نہیں... بس میں سومرو صاحب کے کمرے میں بیٹھی اس ایڈ کے متعلق معلومات لے رہی تھی جو مجھے پرسوں شوٹ کروانا ہے کہ میرے موبائل پہ اماں کا فون آیا کہ ابا کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے اور تمھارا موبائل آف ہے۔ تب میں سومرو صاحب سے معذرت کرکے آنے لگی تو انھوں نے نہ صرف اپنی گاڑی میں گھر تک چھڑوایا بلکہ پچاس ہزار ایڈوانس بھی دیے اور ایمبولینس کو بھی فون کردیا۔ ہم یہاں پہنچے تو ڈاکٹر نے بتایا کہ انھیں زبردست ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ابھی ان کے انجکشن لگا ہے، وہ اب سو رہے ہیں۔ اوہ میرے خدا...اگر اس وقت سومرو صاحب مدد نہ کرتے تو پتا نہیں ابا کا کیا حال ہوتا۔" وہ رونے لگی۔

ابا کو کمرے میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ اماں اور سلمان بھی وہیں تھے۔ ڈاکٹر نے انھیں تسلی دی لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا۔ اس ناگہانی افتاد سے وہ اس حادثے کو تھوڑی دیر کے لیے بھول گئی جس نے اسے پاتال میں اتار دیا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا...اس نے جلدی سے حمیرا کو بلایا، اسے ایک طرف لے گئی اور بولی، "تم ماڈلنگ مت کرنا...سومرو صاحب کو منع کردو۔"

"واہ! کیسے منع کردوں... میں کل کنٹریکٹ سائن کرچکی ہوں۔ ایڈوانس بھی لے چکی ہوں اور ابھی اور بھی ضرورت پڑے گی۔ تم اکیلی کب تک بوجھ اٹھاؤ گی۔" صاعقہ کی نظروں میں ایک ہیولیٰ اُبھرا— سومرو صاحب کا، دوسرا سایہ...؟

رات کے نو بجے تھے کہ فرید صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ اسپتال پہنچ گئے۔ وہ بڑا سا گل دستہ بھی ساتھ لائے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک تھیلی بھی تھی جس میں وہ دوائیں تھیں جو ابا کے لیے ضروری تھیں۔

"جب تک آپ کے والد اسپتال میں ہیں، آپ دفتر نہ آئیے۔" فرید صاحب نے کہا، ان کی بیگم نے صاعقہ اور امی کو تسلی دی اور کچھ دیر بعد واپس چلے گئے۔

"دنیا ایسے ہی نیک لوگوں سے قائم ہے— خدا انھیں خوش رکھے۔" امی نے انھیں دعائیں دیں۔

پانچ دن تک ابا اسپتال میں رہے۔ ان کی مزاج پرسی کو سومرو صاحب اور فرید صاحب برابر آتے رہے۔ اس عرصے میں حمیرا نے اپنا پہلا ایڈ ریکارڈ کروا دیا۔ تین دن تک وہ شوٹنگ پہ جاتی رہی کیوں کہ وہ خود چاہتی تھی کہ جلد از جلد وہ بھی ماڈل کی حیثیت سے ٹی وی پر آجائے۔ چھپنے

روز جب حمیرا کا ایڈ آن ایئر جانا تھا، ابا خاموشی سے دنیا چھوڑ گئے۔

''تم نے صاعقہ ابراہیم کا ٹاک شو دیکھا... یار کیا کمال کا بولتی ہے اور سیاست دانوں کی کیسی ایسی کی تیسی کرتی ہے... کہ بس مزہ آجاتا ہے۔'' خالد رحمان نے اپنے دوست سے کہا۔

''ہاں... ایک دو پروگرام دیکھے ہیں... لیکن صرف صاعقہ کو دیکھنے کے لیے... کیا فگر ہے کم بخت کا۔'' مبشر نے ہنس کر کہا۔

''سنا ہے اسے بریک فرید نے دیا ہے۔'' خالد رحمان بولے۔

''ہاں وہی— بڑا پارکھ ہے اس معاملے میں وہ۔'' مبشر نے جواب دیا۔

''میڈم آپ سے کچھ لڑکیاں ملنے آئی ہیں۔'' چپراسی نے صاعقہ سے کہا۔

''ہاں ہاں... انھیں اندر بھیج دو۔'' اس نے اجازت دی۔

چند لمحوں بعد تین کم عمر اور خوش شکل لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ تینوں کالج اسٹوڈنٹ تھیں... اور کسی حد تک نروس بھی۔

''بیٹھ جائیے۔'' صاعقہ نے نرمی سے کہا۔

''میم! ہم آپ کا اشتہار پڑھ کر آئے ہیں۔ ہمیں ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔'' تینوں میں سے ایک نے کہا۔

''ٹھیک ہے... ہم آپ تینوں کا شوق بھی پورا کریں گے اور اس میں آپ کو پیسے بھی بہت ملیں گے۔'' اس نے انھیں امید بندھائی اور گھنٹی بجا کر چپراسی سے کہا کہ وہ صاحب کو بُلا لائے، وہ خود آڈیشن لیں گے۔

چند لمحوں بعد فرید صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ تروتازہ لڑکیوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی اور ساتھ ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ جیسے وہ کئی دن کے بھوکے ہوں۔

''یہ ہمارے ایم ڈی ہیں فرید حسین صاحب، یہی آپ کا انٹرویو لیں گے۔ اور یہی آڈیشن بھی لیں گے۔ اگر یہ مطمئن ہوگئے تو آپ کی کامیابی یقینی ہے۔'' صاعقہ نے کہا اور پرس اٹھا کر باہر نکل گئی۔

○○○

گنّے کا زہر

محمد حامد سراج

گنّے کی فصل تیار تھی۔

اس نے ایک گنا توڑا، اسے اپنے مضبوط دانتوں سے چھیلا، رس کا مزہ لیتے ہوئے اسے اس ٹمیار کا خیال آیا جسے آج رات تسخیر کرنے کا وہ حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ ایک عرصہ سے اس کی دسترس میں نہیں آ رہی تھی اور روز بہ روز وہ اس کے حواس پر کالی گھٹا کی طرح اُمڈتی اور برستی، لیکن اسے کوئی ایسا راستہ نہیں مل رہا تھا کہ وہ اسے گنّے کی طرح چھیل کر اس کا سارا رس چوس جائے۔ وہ سارا دن عجیب و غریب پروگرام اپنے ذہن کی بھٹّی میں ابالتا رہتا لیکن پھر وہ سوچ کی ہنڈیا اتار کر رکھ دیتا۔ وہ رات اس پر بہت بھاری پڑ رہی تھی، وہ اس ٹمیار کے گھر کی کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ آدھا چاند اپنے سفر میں تھا۔ جھینگر کی آواز کے ساتھ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

اس کے بعد کہانی خاموش ہے۔ راوی چپ ہے کہ کیا وہ رات کچی دیوار پھاند کر اپنے ہدف تک پہنچا، یا کچی دیوار کی اوٹ سے نکل کر گلیوں کی دھول پھانکتا اپنے گھر لوٹ آیا۔ کئی برس کا وقفہ ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے۔ پرانے ریکارڈ کی چھان پھٹک بھی کر ڈالی ہے۔ وقت کے بوسیدہ اوراق بھی الٹ دیکھے ہیں لیکن اس واقعے کا کہیں اندراج نہیں ملا۔ وقت کے تھانے میں اس کی ایف آئی آر درج نہیں ہے۔ شاید وہ ورق کہیں ہوا برد ہو گیا ہو۔ یہ ایک بالکل نیا منظر ہے، دسمبر کی دھوپ میں ٹھٹھرتا ہوا منظر، خوف سے لرزتا خزاں رسیدہ پتے کی طرح ترساں و لرزاں لمحہ، جس نے ایک شخص کے چہرے سے رونق چھین لی ہے۔ یہ ایک نئی کہانی ہے۔

انار کے ساتھ لکڑی کے بنچ پر وہ بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہوا تو سامنے کلثوم کو دیکھ کر رک گیا۔ اس نے سوچا چلو چند لمحے اس کے ساتھ گزار لوں۔ وہ اس گھر میں اجنبی نہیں تھا۔ تعلقات کی جڑیں گہری اور پرانی تھیں، گاؤں کے اس پیپل کی مانند جس کی چھاؤں چھتنار ہو چکی تھی۔ سب بے تکلف تھے، لیکن وہ بہت سال بعد شہر سے لوٹا تھا۔ گاؤں کے منظر وہی تھے۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ لوگوں کی وہی چال اور رفتار تھی۔ وہ دو دن پہلے اپنی خالہ کے گھر آیا تو اتفاقاً کلثوم گھر پر نہیں تھی۔

''خالہ کلثوم کی شادی ہو گئی...؟''

''نہیں بیٹا وہ تو باغی ہو گئی۔ شادی کا نام سنتے ہی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ تم اسے سمجھا دیکھو۔''

دو دن بعد وہ خالہ کے گھر داخل ہوا تو کلثوم سامنے انار تلے بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ وہ جیسے ہی کلثوم کی چارپائی کی پائینتی بیٹھا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور کمرے کی جانب بھاگ گی۔ اس کا یہ حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اسے اپنی برسوں کی عزت مٹی میں رُلتی نظر آئی۔ وہاں سے اٹھ بھاگنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نے تو کوئی جملہ کہا نہ کوئی حرکت ایسی کی جو معیوب ٹھہرتی۔ اس کی زبان لکڑی کی ہو گئی۔ سانس سینے میں مر گئی۔ چیخ سن کر کلثوم کی ماں کمرے سے نکلی تو اس کا چہرہ خوف اور پسینے سے تر بتر تھا۔ اللہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ وہ چارپائی کی پائینتی پر پتھر ہو گیا۔

کلثوم کی ماں کی مسکراہٹ سے اس کے خوف میں بس یوں جانو، رتّی بھر کمی ہوئی کیوں کہ وہ مر چکا تھا۔ وہ یک ٹک سامنے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے دیوار اسے اپنے اندر سمیٹ لے گی۔ چھپا لے گی۔

''بیٹا — پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس کی نفسیاتی کم زوری ہے کہ کوئی مرد اس کی چارپائی پر بیٹھ جائے تو یہ چیخ مار کر اندر بھاگ جاتی ہے۔''

وہ یک ٹک اس کی ماں کو دیکھ رہا تھا۔

''خالہ...'' آواز اس کے حلق میں دم توڑ گئی

''اچھا چھوڑو، بھول جاؤ۔ آئندہ خیال رکھنا۔''

وہ کمرے میں آیا تو وہ سامنے چارپائی پر ٹانگیں ہلاتی مسکین سی صورت بنائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے...؟''

''میں مجبور ہوں... بے بس۔''

''کوئی وجہ بھی تو ہو...؟''

''ماہرِ نفسیات تو کھوج لگا چکے۔ آپ بھی اپنا شوق پورا کر لیں...'' اس کا لہجہ برہم تھا۔

''ضروری ہے، بہت ضروری، تم نے تو سب گھر والوں کی زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ کوئی مہمان، کوئی رشتہ دار تمھاری چارپائی پر بیٹھ سکتا ہے اور تم... تم... تم...؟''

''اچھا چھوڑو اس بات کو، یہ کہو کہ کیا لو گے؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

اتنے میں کلثوم کی ماں کھانا لے آئی اور کھانا رکھتے ہوئے کہا:

''ہمسائی تکلیف میں ہے۔ میں اسے پوچھ کر ابھی آئی۔''

اس کی بھوک مر چکی تھی۔ وہ الجھا ہوا تھا۔ کھانا اس کے سامنے دھرا تھا لیکن وہ موجود نہیں تھا۔ وہ اصرار کرتی رہی لیکن اس نے ایک لقمہ بھی نہ توڑا۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور سوال کیا:

''وہ ایک ہولناک رات تھی نا...؟''

''کون سی رات...'' کلثوم کے چہرے پر ایک لہر سی گزری۔

''جس رات وہ اچانک آ گیا... اور... اور...''

''میری زندگی میں کوئی ایسی رات نہیں ہے۔''

''لیکن میں کیا کروں وہ رات تمھاری آنکھوں میں مکمل نظر آ رہی ہے۔''

''ہنہ... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کھانا کھائیں۔''

''میری بھوک مر چکی... جب بھوک جاگے گی، جس چیز کو دل کرے گا کھا لوں گا۔''

''آپ کو کس نے کہا...؟''

''میرے وجدان نے خبر دی ہے۔''

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ فضا میں سناٹا پھیل گیا۔ ان کی سانسوں کی آواز کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ گہری چپ...!

''چیخ تو تمھیں اس رات مارنا چاہیے تھی۔ اب چیخیں مارتی سب کی زندگی عذاب کر رہی ہو۔''

''میں بے بس ہو گئی تھی۔''

''کس سے...؟''

''خوف سے...''

''اور اس خوف نے برسوں سے تمھیں بے بس کر رکھا ہے۔''

''اس رات میں دالان میں اپنی بہنوں، بھائی اور ماں کے ساتھ سو رہی تھی۔ موسم بدل رہا تھا۔ سردیوں کی آمد تھی۔ وہ کس وقت، کیسے دالان میں داخل ہو کر میرے بستر تک پہنچا، مجھے نہیں معلوم۔ میرے منہ پر ہاتھ دھر کر اس نے مجھے بے بس کر دیا۔ خوف سے مجھے سکتہ ہو گیا۔ میرا بدن اس کی دسترس میں تھا۔ جانے رات کے کس پہر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ صبح تاریک تھی، ہر طرف اندھیرا تھا۔ عزت کے خوف سے میں نے زبان سی لی۔ مجھے مردوں سے نفرت ہو گئی۔''

''تم نے اسے پہچانا...''

''نہیں اس نے منہ پر چادر لپیٹ رکھی تھی۔''

''پھر...''

''میں شادی سے انکاری ہو گئی۔ مجھے اپنی تعلیم کے رائگاں جانے کا بھی دکھ ہے۔ کاش ایک جماعت بھی نہ پڑھی ہوتی۔ گریجویشن نے کیا دیا۔ کیا عزت بچ گئی میری۔ اُپلے تھاپتی اور ایک روز کسی اَن پڑھ کے پلے باندھ دی جاتی۔ میں بھی گائے اور بکری کی طرح زندگی جی جاتی۔ میرے اندر یہ بات جڑ پکڑ گئی کہ عورت کو تسخیر کرنا مرد کی فطرت ہے۔ اس میں وہ کمینگی کی آخری حد کو بھی چھو سکتا ہے۔ عورت صرف سب طرح کے ظلم سہنے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ اور ظلم سہتے سہتے ایک روز تیل کا چولھا پھٹ جاتا ہے اور وہ مر جاتی ہے۔ واشنگ مشین شارٹ ہو جاتی ہے اور وہ سانسیں ہار جاتی ہے۔ رات کی تاریکی میں ایک زور آور آتا ہے اور، اور سب لوٹ لے جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں پاکستان ہوں، جسے برسوں سے زور آور لوٹ رہے ہیں۔ ہم جیسی عورتوں کی عزت کا اندراج کہیں نہیں ہوتا۔ ایک طاقت ور ہماری تعلیم، عزت، وقار سب مٹی میں ملا دیتا ہے۔ قصور وار ہم ہی ٹھہرائی جاتی ہیں۔''

اس کی گفتگو ابھی جاری تھی۔

اس نے غور سے کلثوم کے گلابی دہکتے گال دیکھے تو اس کے اندر وہ رات انگڑائی لے کر جاگی۔ گھر میں وہ اکیلے تھے۔

گنے کی فصل تیار تھی۔

اس سے پہلے کہ گنا چھیل کے اس کی پھانک چوستا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''ماں اتنی جلد نہیں آئے گی۔ تم بے فکر رہو۔''

وہ جیسے ہی کلثوم کے ہونٹوں پر جھکا، کلثوم سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں چونک کر پیچھے ہٹی۔ لرزتے ہوئے کاٹ دار آواز میں بولی:

''یاد رکھنا عورت اپنے جسم پر پہلے مرد کا لمس اور اس کے سانس کی بو کبھی نہیں بھولتی۔ تو اس رات تم تھے۔''

''میں میں ں ں ں — نہیں ں ں ں نہیں تو...''

اتنے میں وہ اپنے مضبوط ہاتھوں میں گھاس کاٹنے والا ٹوکا اٹھا چکی تھی۔

اس کے بعد کہانی خاموش ہے۔ راوی چپ ہے کہ کیا وہ رات پکی دیوار پھاند کر اپنے ہدف تک پہنچا، یا پکی دیوار کی اوٹ سے نکل کر گلیوں کی دھول پھانکتا اپنے گھر لوٹ آیا۔ کئی برس کا وقفہ ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے۔ پرانے ریکارڈ کی چھان پھٹک بھی کر ڈالی ہے۔ وقت کے بوسیدہ اوراق بھی الٹ دیکھے ہیں، لیکن اس واقعے کا کہیں اندراج نہیں ملا۔ وقت کے تھانے میں اس کی ایف آئی آر درج نہیں ہے۔

سینہ بہ سینہ ایک روایت ہے جو آج بھی سنائی دیتی ہے کہ اس بستی کی عورتیں اب صرف ٹوکے بنانے کا ہنر جانتی ہیں۔

OOO

کروٹ

سمیرا نقوی

چاروں اور پھیلی دُھند نے دیہات کی زندگی کو مفلوج کر رکھا تھا۔ کھیتوں، کھلیانوں میں بھی کُہر کا بسیرا تھا۔ گلی محلوں پر بھی دُھند ہی دوڑ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا بادل آسمان سے اُتر کر زمین پر آ بسے ہیں۔ آدھا دِن گزر جاتا تب جا کر گھروں سے اُٹھتا دھواں زندگی کا سفیر بنتا۔

دُھند میں لپٹا گاؤں دُور سے دیکھنے پر کسی کوہ قاف کا پرستان لگتا۔ سارے کام گھر کے بند دروازوں کے پیچھے ہو رہے تھے، جیسے ہی دُھند چھٹی، چھوٹے سے گاؤں کے کھیت اور گلیاں زندگی سے بھر گئے۔ دھوپ رونق بن کر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ ساکت زندگی پھر سے رواں دواں ہو گئی۔

تارکول سے بنی نئی نکور سڑک۔ اُس سڑک سے بھی نیا نکور تانگا۔ پیلے چمڑے کی چھت بانس کے ڈنڈوں پر چاندی کی طرح چمکتے پترے، رنگ برنگ دھاگوں کے پھندنے اور تانگے میں جوتا، تازہ دم گھوڑا۔

غلام رسول ترکھان نے مکمل مہارت تانگا بنانے میں اور ساری جمع پونجی گھوڑا خریدنے میں صرف کر دی۔ چمکتا بھورا رنگ، چھریرا بدن، ماتھے پر بڑا سا سفید نشان، جو مہندی سے بھرا ہوا تھا۔ چمڑے کی مضبوط تیل میں رچی لبی سوہنی لگامیں۔

غلام رسول نے اکلوتے بیٹے کو تانگے پر بٹھا کر، لگامیں ہاتھ میں تھما کر کہا! ''جا بیٹا، اب یہ تیری روزی روٹی کا وسیلہ ہے۔''

ترکھان کے بیٹے نے چمکتے پائیدان پر قدم رکھا۔ چمڑے کی مضبوط چابک کو تھاما اور دوسرے ہاتھ سے لگامیں کھینچیں۔ گھوڑے نے پہلے تو زور سے دو چار بار سارا بدن ہلایا پھر قدم

اُٹھائے۔ تانگا تارکول کی سڑک پر رواں دواں ہو گیا۔

آس پاس گندم کی سرسبز بالیاں، کچی کچی مہک، کیکروں کے پیلے پھول، میٹھی میٹھی دھوپ۔

فطرت کی ساری مستی گھوڑے کی چال میں سمٹ آئی۔ اُس نے چابک تانگے کے پہیے پر رکھا، فضا میں نئے سُر تال بکھرنے لگے۔

کیکروں سے گرے پیلے پھول گھوڑے کے قدموں تلے بکھرنے لگے۔ وہ بڑے غور سے گھوڑے کی چال، اُس کے قدموں کے اُٹھنے، گرنے کے ساتھ، بدن کی بدلتی کیفیات دیکھ رہا تھا۔

آج اُس کا بس یہی کام تھا۔ کئی سواریوں نے ہاتھ دیا، اُسے روکا، پر وہ سر کو نفی میں ہلاتا آگے بڑھتا رہا۔

خوشبو سے لدے ہوا کے جھونکے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ دُور تک زمین پر بچھی ہریالی ایک عجیب سا سکون عطا کر رہی تھی۔

کوئی گھنٹا بھر کا سفر طے کرنے کے بعد اڈے پر پہنچے، جہاں اور بھی بہت سے تانگے تھے۔ چائے کا کھوکھا تھا، جس کے پاس رکھی چارپائیوں پر وجود بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ چائے سے تھکن اُتار رہے تھے۔

ٹیپ ریکارڈر پر فلمی گانے بج رہے تھے۔ چائے والے کی خوب بکری تھی۔ ساتھ ہی پکوڑے اور جلیبیوں کے تھال سجے تھے۔ وہ بھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

تھکن تھی نہ چائے کی طلب۔ اُس کے بیٹھنے پر کوچوان چونکے، پھر سوالوں کا میلہ لگ گیا۔ وہ رنگ برنگے سوالوں کے ٹھیلوں کے درمیان گھومنے لگا۔

''کس گاؤں کے ہو؟''

''باپ کیا کرتا ہے؟''

''ذات کیا ہے؟''

''گھوڑا کتنے میں لیا؟''

''تانگا کس نے تیار کر کے دیا؟''

وہ دھیرے دھیرے سب سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ سوالوں کا سیلاب تھما تو اُس نے بھی کاندھے سے ناتجربہ کاری کی چادر اُتار کر اُن کے درمیان رکھی۔ ہر ایک اپنی جگہ سیانا۔ اپنے کام میں ماہر۔ اُس کی چادر میں اچھا خاصا مال جمع ہو گیا۔

''فی سواری بھاؤ کیا ہے؟''

''سواری کس وقت زیادہ ملتی ہے؟''

''کتنی بسیں یہاں سے گزرتی اور کتنے مسافر روز اُترتے ہیں؟''

''سالم لے کے جانا ہوتو کرایہ کیا ہوگا؟''

''اسٹیشن یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''کتنی ٹرینیں دن میں آتی ہیں اور اُن کے اوقات کیا ہیں؟''

وہ اڈے پر ایک گھنٹے سے زیادہ دیر بیٹھا رہا۔ آج چائے اُسے اڈے کے دوسرے کوچوانوں نے پلوائی ساتھ پکوڑے اور جلیبیاں بھی۔

وہ نہ، نہ کرتا رہا۔ وہ سب اصرار کرتے رہے۔

اُس کا تانگا بند۔ گھوڑا صحت مند، اور وہ خود — سوہنا گبھرو جوان، جسے دیکھ کر گاؤں کی مٹیاروں کی چال مستانی ہو جاتی۔ اُن کے جسم زاویے بدلنے لگتے، آنکھیں زبان بن جاتیں۔ پر غلام رسول ترکھان کا بیٹا سیدھا سادا، اللہ میاں کی گائے، سر جھکا کر یوں چلتا کہ بے شرموں، بے حیاؤں کو بھی حیا آنے لگتی۔

چائے پی کر وہ بھی تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ آنکھیں موسم کے سرور سے خود ہی نیند سے بوجھل ہو گئیں۔

کچھ دیر سویا پھر اڈے پر بیٹھے کوچوان سے اسٹیشن کا پتا پوچھنے لگا۔

اسٹیشن کافی دُور تھا۔ جائے یا نہ جائے؟

گھوڑا بدک نہ جائے۔ یہ خوف اُسے آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔ گھوڑے کو واپسی کے راستے پر ڈال دیا۔

دو چار کوچوان اور بھی تانگا بھر کے واپس جا رہے تھے۔ ذرا فاصلہ رکھ کر وہ بھی اُن کے پیچھے چلنے لگا۔ اب ہوا کی شوخی قدرے کم تھی۔ شاخوں کی سرسراہٹ بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

جب کوچوان اُس سے کافی فاصلے پر چلے گئے تو اُس کے لب دھیرے دھیرے ہلے۔ گلے کا سوز، پکی سڑک پر پڑتے گھوڑے کے قدم، قدموں سے اُٹھتی آواز، گھوڑے کے جسم سے بندھے گھنگھروؤں کا ساز۔ سب یک جان ہو کر فضا کے سکوت کو توڑنے لگے۔

بازار وکیندیاں چھریاں، بازار وکیندیاں چھریاں
عشقے دیاں چوٹاں بُریاں
نی اک پل موہے دا مار کے جگا سوہنیے

بازار و کیندی آری، بازار و کیندی آری
تیرے مکھڑے توں جنڈری واری
نی اک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنیے

تخیل اُس سراپے کو تراشنے لگا جس کے مکھڑے پہ جنڈری واری جا سکے۔ وہ دِل کشی کے سارے اسباب ذہن میں یک جا کر کے حسین سراپے تخلیق کرنے لگا۔ گھوڑا اپنی رفتار سے چلتا رہا۔

خالی سڑک پر گرد کے بگولے تانگے کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ کسی جوگن کی طرح بے حال تھے۔

وہ دِل کش خدوخال یک جا کر رہا تھا مگر تخیل کی لگامیں بار بار ہاتھ سے چھوٹ جاتیں۔ کبھی سیاہ لمبی زُلفیں لہراتیں، مگر چہرے کا کوئی نقش دکھائی نہ دیتا، کبھی چٹے گورے، نرم گداز، بھیگے بھیگے ہاتھ دکھائی دیتے۔

اُس نے گھبرا کر ٹپے کے بول بدل دیے:

بازار و کیندے پاوے، بازار و کیندے پاوے
رب سجناں نال ملاوے
اِک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنیے

سفر تمام ہوا۔ دن بھر کی مشقت بدن میں ہلکی سی تھکن بن کر نمودار ہو رہی تھی۔ یہ اُس کی زندگی کی پہلی مشقت تھی، ورنہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا— ماں خدمت کرتے نہ تھکتی۔ پر کمائے بنا گزارا نہیں۔ گھر نہیں بنتے۔ چولھا نہیں جلتا۔

ماں باپ دونوں شدت سے منتظر تھے۔ ماں نے اُٹھ کر ماتھا چوما۔ باپ اُٹھ کر گھوڑے کو تانگے سے جدا کرنے لگا۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر چارپائی پر گر سا گیا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ ایک کمرہ، چھوٹا سا صحن، ایک کونے میں نلکا جس کی چھوٹی چھوٹی چاردیواری ایک طرف چولھا چوکی۔ اُس پر رکھا سامان۔ دروازے کے ساتھ چھوٹی سی بیٹھک، جہاں غلام رسول ترکھان کا سارا سامان پڑا تھا۔

گھر کے ساتھ بڑا سا خالی میدان تھا۔ وہیں گھوڑا باندھ کر، چارہ اُس کے سامنے رکھ کر غلام رسول لوٹ آیا۔

ماں کھانا لائی۔ ساتھ ساتھ باتیں۔ دن بھر کی رپورٹ اڈّے کے حالات۔ نئے تجربے میں گزشتہ تجربوں کی ملاوٹ۔ آج اُس کی زبان سے نکلنے والے لفظ مشاہدے اور تجربے سے اٹے پڑے تھے۔

وہ ایک دِن میں معصوم سے لڑکے سے پختہ کار مرد بن گیا جو ہنر سیکھ کر دُنیا کو اپنے انداز سے برتنے جا رہا تھا۔

باپ خوش تھا۔ ماں صدقے واری جا رہی تھی۔ صحن میں بچھی چارپائی پر جہاں دھوپ کی بچی کھچی کرنیں مدھم سی حرارت کا احساس پیدا کر رہی تھیں، وہ چادر تان کر لیٹ گیا۔ آنکھ تب کھلی جب اُس کی ماں تنور میں آگ جلانے کے لیے خشک لکڑیاں ڈال رہی تھی۔

جب تڑتڑ لکڑیاں جلنے لگیں۔ چٹاخ چٹاخ کی آوازیں سارے صحن میں شور مچانے لگیں۔ تنور سے نکلتے شعلوں نے سارے آنگن کو روشن کر دیا تو وہ بھی چادر سمیٹ کر اُٹھ بیٹھا۔

منہ ہاتھ دھو کر بال سنوارے اور گاؤں کی گلیوں سے گزرتا چوپال میں جا بیٹھا، جہاں آگ کے الاؤ کے گرد سارے دوست اکٹھے تھے۔

کہانیاں، ماہیے، ٹپّے، لوک گیت... کیا تھا جو آگ کے اس الاؤ میں نہیں جل رہا تھا۔ لوک گیتوں میں جب ہجر و وصال کے منظر آتے تو اُس کا دِل گداز سے بھر جاتا۔ جب لوک گیتوں، کہانیوں کا زور تھما تو سب کو اِس کا خیال آیا۔

وہ بھی بڑے دلچسپ پیرایے میں آج کے دِن کی مصروفیت بیان کرنے لگا۔ گھوڑے کی تعریف، اڈّے پر موجود لوگوں کا خلوص، تانگا چلانے کا خوش گوار تجربہ — گیتوں کے بول سے زیادہ خوب صورت تو یہ نیا تجربہ تھا۔ سب ڈوب کے سن رہے تھے۔

الاؤ بجھنے لگا تو باتوں کی حدت بھی کم ہونے لگی۔ گیتوں کے بول لبوں پر اور گداز کا بوجھ دِل پہ لیے وہ گھر لوٹ آیا۔

سینے پہ ہلکا سا بوجھ لیے وہ چارپائی پہ آ لیٹا۔ کب نیند آئی، کب کسی کا دستِ مہربان اُس کے گداز کو پگھلا گیا، کچھ پتا نہ چلا۔

باپ نے کندھا ہلا کے کہا! ''احمد علی جاگ، کام پر نہیں جانا؟''

بے فکری کی نیند سوتے احمد علی کو احساس ہوا کہ اب فراغت کا زمانہ بیت گیا۔ گھر کے ساتھ کھلے میدان میں بندھا گھوڑا اب اُس کی ذمہ داری ہے جسے چارہ، بھوسا دے گا تو ہی اُس کی روزی روٹی کا سلسلہ چلے گا۔

تازہ چارہ کاٹ کر گھوڑے کے آگے رکھا۔ پانی پلا کے جب گھر لوٹا تو ناشتا تیار تھا۔ ناشتا کر کے تانگا جوتا۔

گاؤں کے چھوٹے چھوٹے میلے کچیلے کپڑے پہنے بچے۔ کسی کے ہاتھ میں، تو کسی کے منہ

میں نوالہ، کسی کے کُرتے کے بٹن ٹوٹے تو کسی کی آستین کے۔ سارے بچے تانگے پر آگے پیچھے چڑھ کر بیٹھ گئے۔ جب گاؤں سے نکل کر وہ پکی سڑک پر آیا تو اُس نے سارے بچوں کو اُتار کر گاؤں کے رستے پر ڈال دیا اور تب تک انھیں جاتا دیکھتا رہا جب تک وہ گاؤں کی گلیوں میں بکھر نہیں گئے۔

آج فطرت کے منظروں میں وہ نیا پن محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کھیتوں میں دُور تک پھیلا ہوا سبزہ۔ پوری فضا نئے پن کے احساس سے خالی تھی۔

گھوڑا اپنی رفتار سے چل رہا تھا۔ آج بھی تانگا سواریوں سے خالی تھا۔ وہ آنکھیں کسی نئے منظر کی متلاشی تھیں۔ آج وہ اسٹیشن ضرور جائے گا۔ گاڑیوں کے اوقاتِ آمدورفت یاد کرے گا۔ اسٹیشن کو جاتا رستہ یاد کرے گا۔ گاڑیاں دیکھے گا۔

لگامیں ذرا زور سے کھینچیں گھوڑے کی رفتار بڑھی۔ سیاہ تارکول کی سڑک پیچھے کی طرف بھاگنے لگی۔

اڈّے کی رونق، چائے کا کھوکھا، وہی گانے، وہی ہلچل۔ گاؤں سے آتی سڑک کے دونوں اطراف کھیت تھے، جوں ہی سڑک ختم ہوئی تو اُس کے متوازی ایک اور سڑک، دونوں سڑکیں ملتیں تو شہر اور گاؤں کے فاصلے بھی مٹ جاتے۔ شہر کو جانے والی سڑک زیادہ چوڑی تھی۔ دن میں چار پانچ بسیں رُکتیں۔ روز کے پچیس، تیس مسافر، اس اڈّے پر اُترتے۔

سڑک کے پار دوسری طرف قصبہ تھا۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔ نہ ملے تو لاری پر بیٹھ کر بڑے شہر جاؤ اور وہاں کی بھیڑ میں گم ہو کر جو چاہو خرید لاؤ۔

اڈّے پر رُک کر ایک کپ چائے پی۔

آج کوچوانوں کی بھیڑ نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ دیر پہلے شہر سے بس آئی تھی۔ کچھ کوچوان سواریاں لے کر گاؤں کی طرف چلے گئے اور کچھ قصبے کی طرف۔

دو چار ہی تھے جو چارپائیوں پر بیٹھے اِدھر اُدھر کی ہانک رہے تھے۔ ایک کوچوان ذرا پریشان تھا۔

احمد علی کے پوچھنے پر بولا، ''میرا گھوڑا بیمار ہے۔ گھر چلنے کی اور کوئی صورت نہیں۔''

احمد علی نے کہا،'' بھائی تم میرے تانگے پہ بیٹھو اور مجھے چلانا بھی سکھاؤ۔ قصبے کے راستے سمجھا دو۔ اسٹیشن تک لے جاؤ۔ سواری ملے تو بٹھا لینا میں تو ابھی سواری نہیں بٹھا رہا۔''

کوچوان کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ نیا نکور گھوڑا، سوہنی لگامیں۔ ابھی تک اناڑی کے ہاتھ میں تھیں جب تجربہ کار کے ہاتھ میں لگام اور چابک آیا تو گھوڑے کی چال ہی بدل گئی۔

سڑک پار کر کے وہ قصبے کی طرف چل پڑے۔ کوچوان نے آواز لگانی شروع کی۔
''اسٹیشن، اسٹیشن۔''
سواریاں ہاتھ بڑھانے لگیں۔ تانگا جگہ جگہ رُکنے لگا۔ وہ اتنے پیار سے لگامیں کھینچتا کہ گھوڑا بدکے بنا آرام سے رُک جاتا۔ پچھلی سیٹ پر عورتیں۔ قصبے کی عورتیں گاؤں کی عورتوں سے بہت مختلف تھیں۔ شلوار قمیص چادر میں لپٹیں، صاف ستھری۔

گاؤں کی عورتیں، دھوتیاں باندھے چھوٹی چھوٹی اوڑھنیاں سر پر رکھے سارا دن گھر اور کھیتوں کے درمیان چکراتی رہتیں۔ لسی، مکھن کی بو دُور سے ہی اُن کی آمد کی خبر دے دیتی۔
جو تین عورتیں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں، تینوں نے کالے برقعے پہن رکھے تھے۔ ہلکی ہلکی سی خوشبو، ولایتی صابن کی یا پھر پاوڈر کی، اُسے اتنی پہچان کہاں تھی، وہ بس سونگھ رہا تھا۔
تانگا رُکا ہوا تھا۔ دو سواریوں کی کمی تھی۔ تھوڑی دیر گزری، دو مرد آ گئے۔ تانگا تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔
لمبی سی سڑک جہاں بار بار مڑنا پڑتا۔ کوچوان بڑی مہارت سے کبھی داہنی لگام کھینچتا، کبھی بائیں۔ گھوڑا اُسی انداز سے گردن موڑ کے سڑک کے حساب سے چلنے لگتا۔
اُسے تو بس سیدھا چلنا آتا تھا۔ اچھا ہوا۔ آج یہ فن بھی سیکھ گیا۔
چاچا ساتھ ساتھ اُسے بھی گُر کی باتیں بتاتا رہا۔ کسی کھنڈر کا منظر پیش کرتی اسٹیشن کی عمارت نظر آ ہی گئی۔ اُس کے تصور کو ایک جھٹکا لگا۔ پرائمری کی کتاب پر اسٹیشن کی عمارت سرخ اینٹوں سے بنی صاف ستھری تھی پر یہاں تو ایک کھنڈر سی عمارت تھی۔
سواریاں اُتر گئیں۔ کوچوان نے پیسے لے کر احمد علی کو دیے۔
احمد علی بولا، ''نہیں چاچا تانگا تو نے چلایا، سواریاں تو نے بٹھائیں۔ پیسے بھی تو رکھ۔''
کوچوان کی آنکھیں خوشی سے جگمگا اٹھیں۔ گھر کا چولھا جلنے کا سامان ہو گیا۔
''چاچا ابھی ٹرین آنے میں کتنا وقت ہے؟''
''اسٹیشن ماسٹر سے پتا کرتا ہوں۔''
چاچا جلد ہی لوٹ آیا۔
''تھوڑا ہی ٹائم ہے۔ آ گھوڑے کو سائے میں لے چلتے ہیں۔''
''چاچا تو لے کے چل میں ذرا اسٹیشن کی عمارت دیکھ آؤں۔''
لوہے کا جنگلا نما دروازہ کھول کر وہ بڑے سے کمرے میں داخل ہوا جس کے دونوں

اطراف سیمنٹ کے بنچ بنے تھے۔ زیادہ تر عورتیں اور بچے بیٹھے تھے۔

گندگی کمرے کے فرش پر بکھری ہوئی تھی۔ لاوارث گھروں جیسا حال تھا۔ مونگ پھلی کے چھلکے، سگریٹ کے خالی پیکٹ، جلے ہوئے ٹکڑے، مالٹوں کے چھلکے، بساند، وہ ناک دباتا دوسرے سرے پر بنے لوہے کے جنگلے کو کھولتا پلیٹ فارم پر آ گیا۔

یہ جگہ صاف ستھری تھی۔ پلیٹ فارم پر لوہے کی ٹرالیاں، گیروے رنگ کے کپڑے پہنے قلی، سفید یونی فارم میں گھومتا اسٹیشن ماسٹر، ناک کے اگلے حصے پر عینک ٹکائے ٹکٹوں پر ٹھک ٹھک مہریں لگاتا ٹکٹ بابو...

یہ سب احمد علی کے لیے نئے کردار تھے جو آج تک اُس نے کسی داستان میں نہ سنے تھے۔ جنگلی کیکروں کے سایے میں پڑے بنچ۔ پاس پانی کی ٹونٹی لگی تھی۔ اُس کے ٹوٹے حصے سے پانی خود بخود جھر جھر بہہ رہا تھا۔ وہ بنچ سے اُٹھا، پانی پیا، منہ ہاتھ دھویا۔

تازگی کے احساس کے ساتھ تھکن اُترتی محسوس ہوئی۔ نہ کسی نے آنا تھا... نہ کسی کا انتظار تھا، پر وہ شدت سے ٹرین کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر گزری کہ اسٹیشن پر ہلچل مچ گئی۔ قلی، مسافر، اسٹیشن ماسٹر... سب حرکت میں آ گئے۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر پہنچنے سے پہلے ہی فرش کا جو حصہ اُس کے قدموں کے نیچے تھا لرزنے لگا۔

انجن کی کوک، دور سے اُٹھتا دھواں، اسٹیشن ماسٹر کے ہاتھ میں پکڑی جھنڈی کا حرکت میں آنا۔ سب ٹرین کے آنے کی علامتیں تھیں۔

گاڑی پلیٹ فارم پر آ رکی۔

نہ اُترنے والے مسافر زیادہ تھے، نہ چڑھنے والے۔

آٹھ دس مسافر اُترے، آٹھ دس چڑھے، پانچ منٹ گاڑی رُکی پھر دھواں چھوڑتی۔ اگلے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔

ٹکٹ چیکر لوہے کے جنگلے والے گیٹ پہ آ کھڑا ہوا۔ مسافروں کے ٹکٹ تھام کر اُن پر پنسل سے نشان لگاتا اور مسافروں کو پلیٹ فارم کی حدود سے باہر نکلنے کی اجازت دے دیتا۔

ٹرین کے جاتے ہی ویرانی اسٹیشن پر پھیل گئی۔ عجیب سا سکوت عجیب سی چپ، دہشت زدہ کرتی — اندر کو چیرتی۔ وہ گھبرا کر باہر نکلا۔ تانگہ سواریوں سے بھر چکا تھا۔ وہ تانگے پر آ بیٹھا۔

سرپٹ دوڑتا گھوڑا قصبے کی رونق کو پیچھے چھوڑ گیا۔ مختلف شہروں سے آتی سواریاں، مختلف لہجے، مختلف انداز اور اُن کے ساتھ جڑی مختلف کہانیاں، پچھلی سیٹ پر تینوں مرد تھے اور آپس میں

شناخت کے سرے تلاش کر رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر عورت اور مرد اور تیسرا احمد علی۔
ہر جھٹکے پر مرد، عورت کو یوں سمیٹتا جیسے کانچ کی بنی گڑیا۔ وہ اُسے اردگرد اُگی فصلوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھوں کو کھولتی بند کرتی بالکل شوکیس میں رکھی گڑیا لگ رہی تھی۔
کچھ مسافر راستے میں اُتر گئے۔ اُن دونوں نے احمد علی کے گاؤں سے بھی آگے تِبے والے گاؤں جانا تھا۔
تِبے والے گاؤں کی بھی اپنی ایک کہانی تھی۔ یہ گاؤں بہت اُونچائی پر تھا۔ سب لوگ کہتے اس گاؤں کے نیچے بھی ایک بستی تھی۔ پرانے وقتوں میں بڑی آباد — بڑی بارونق — پھر پتا نہیں کیا ہوا...؟
کوئی کہتا سیلاب آیا — پر کہاں سے؟ دریا تو بہت دُور تھا۔ کیسے رستہ بدلا؟
پانی سب کچھ بہا لے گیا۔ کئی دن کھڑا رہا، پھر خود ہی نیچے اُتر کر زمین میں پھیل گیا۔
سارے گھر سیلابی مٹی کے نیچے دب گئے، پھر پتا نہیں صدیاں گزریں کہ سال، اُنھی دبے ہوئے گھروں کے اُوپر نئی بستی بنی، گاؤں اُونچا تھا، کھیت نیچے تھے۔
کوئی کہتا زلزلہ آیا، شدید، دیواریں دیواروں میں جا گھسیں۔ مکانوں کے متھے ایک دوسرے میں دھنس گئے۔ زمین پھٹ گئی۔ آدھے مکان زمین کے اندر — آدھے باہر۔ پھر وقت نے مٹی کی گرد ڈالی، اُنھی مکانوں پر نئے مکان بنے۔
اکثر لوگوں نے دیکھا کہ آدھی رات کے وقت جب اندھیرا گاؤں کے درودیوار کو چاٹتا تب لمبے لمبے آدمی سفید کپڑوں میں ہاتھوں میں لالٹین پکڑے چلتے۔
احمد علی نے خوف سے جھرجھری لی۔
سردی میں پسینا مساموں سے پھوٹ نکلا۔
ویسے ایک بات تھی کہ جب بارش ہوتی تو تِبے والے گاؤں کی زمین یوں سرخ ہوتی جیسے پسی ہوئی اینٹیں مٹی میں شامل ہوں۔
سارے منظر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔
شام ڈھلے درختوں کی خاموشی بڑی عجیب تھی۔ گھوڑے کے قدموں کی آواز اور ان میاں بیوی کی سرگوشیاں فضا کو گدگدا رہی تھیں۔
احمد علی سارا دھیان تانگا چلانے پر لگاتا۔ پر اُس کا دھیان بھٹک بھٹک جاتا۔ کبھی سرگوشیوں کی طرف اور کبھی تِبے والے گاؤں کی طرف۔ جہاں پہنچتے پہنچتے شام ہونے والی تھی۔

سردیوں کی شاموں اور راتوں میں فاصلہ ہی کتنا ہوتا ہے۔ اگر رات پڑ گئی اور لمبے لمبے آدمی لالٹینیں اُٹھا کر اُس کے تانگے کے پیچھے چل پڑے تو...

ہاتھوں سے پھسلتی لگاموں کو سنبھالتا، بالآخر وہ تیے والے گاؤں پہنچا۔ سواریوں کو اُتار کر جلدی سے گھوڑا موڑا۔

گاؤں کے درودیوار پر اندھیرا پھیلنے سے پہلے وہ گاؤں لوٹ آیا۔

وہی میٹھی میٹھی سی تھکن، وہی آگ کا الاؤ، وہی کہانیاں۔ اِن پرانی کہانیوں میں احمد علی کی نئی کہانیاں... وہی گداز بھرا دل... اُسی بوجھ تلے ایک مکمل نیند۔

احمد علی کو اسٹیشن کی سواریاں اُٹھانے میں ہر روز ایک نئے تجربے کا احساس ہوتا۔ گاؤں کے رستوں میں وہی جانی پہچانی سواریاں ملتی تھیں۔

دو چار دن وہ چاچے کے ساتھ اُسی طرح جاتا رہا، چاچے کا چولھا جلتا رہا۔ احمد علی کا ہنر پختہ ہوتا رہا۔

وہ روز صبح سویرے گاؤں سے نکلتا۔ گاؤں کے بچے تانگا جوتنے سے پہلے کُھلے میدان میں جمع ہوتے، بچوں کو ساتھ لے وہ پکی سڑک پر آتا تو کوئی نہ کوئی سواری منتظر ہوتی۔

گاؤں سے سواریاں لے کر وہ اڈے پر آتا تو پھر گاؤں کی طرف واپس نہ مڑتا۔

اڈے سے سڑک پار کر کے وہ قصبے کے اندر سے سواریاں اُتارتا، چڑھاتا، کوئی بازار، کوئی ہسپتال، کوئی ڈاک خانے، بس سلسلہ چلتا رہتا۔ جیسے ہی ٹرین کے آنے کا وقت قریب ہوتا۔ احمد علی اسٹیشن، اسٹیشن کی صدا لگانا شروع کر دیتا۔

پلیٹ فارم، اُس کے ساتھ بچھی ٹرین کی پٹریاں، لوہے کی ٹرالیاں، ان سب سے اُس کی آشنائی ہو گئی تھی۔ وہ ان سب کو یوں دیکھتا جیسے مل رہا ہو۔ وہ نگاہیں جما کے بیٹھ جاتا، پٹریوں کے ملنے اور جدا ہونے کے سلسلے کو بڑے غور سے دیکھتا، ٹرین کی آمد پر زمین کے ارتعاش کو کانوں سے نہیں دل سے سنتا اور اس ارتعاش کو دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ کرتا۔

ٹرین آ کے رُکتی، خود رُک جاتی، ایک ہنگامے کو جگا دیتی، جب تیز قدم پلیٹ فارم پر حرکت کرنے لگتے وہ خاموشی سے لوہے کا گیٹ کھولتا باہر آ کر اپنا تانگا تیار کرتا۔

سواریاں آ کے رُکتیں، کرایے کا بھاؤ تاؤ وہ منٹوں میں طے کرتا۔ پھر وہ ہوتا اور اس کا ناپو ناپ دوڑتا گھوڑا۔

تارکول کی سیاہ سڑک پر اُڑتے گرد کے بگولے اور اس کی ٹرین سے اُتری سواریاں۔

جتنی سواریاں، اُتنے شہر، اُتنی کہانیاں۔ وہ بڑے دھیان سے سواریوں کا لباس، گفتگو کے انداز کا جائزہ لیتا۔ اُن کے وجود سے جڑی ہر نئی شے کو دھیان سے دیکھتا اور یاد رکھتا۔ پھر اُنھی کرداروں کے گرد وہ نت نئی کہانیاں بُنتا۔

سردیاں رخصت ہوئیں۔ اپریل کی دھوپ نے جیسے گندم کو آگ لگادی۔

اب رات کو الاؤ نہ جلتا پر کہانیوں کا بھانبڑ اب بھی جلتا۔

وہ اِتنی مہارت سے کہانی بُنتا، نئی چیزوں کا ذکر یوں کرتا کہ اُس کے سامنے کوہ قاف اور طلسم ہوش ربا کے قصے بھی ماند پڑ جاتے۔

وہ پرانے قصہ گویوں کی طرح کہانی کو درمیان کے کسی واقعے سے اُٹھاتا، پھر شروع اور زوال کی طرف لے جاتے ہوئے جب اُس مقام پر آجاتا جہاں سامعین کی آنکھیں اور منہ حیرت سے کھلے ہوتے تب وہ اُس لمحے اُن کی حیرت کا لطف لیتا اور لب سی لیتا۔

جب کہانی اگلے موڑ کی جانب نہ بڑھتی تو ہر کوئی چیخ اُٹھتا، ''آگے''—

وہ مسکرا کر کہتا، ''کل''—

محفل بکھر جاتی۔ سارے جوان، بوڑھے اب کیا ہوگا؟ کا سوال ذہن میں لیے گھروں کو لوٹ جاتے۔ جہاں بچھے بستر نیند کو خوش آمدید کہتے، رات ہر کروٹ پر کہانی کا الجھا ہوا سرا چرخے کی نوک کی طرح چبھتا۔

اور احمد علی ہر کروٹ پر کہانی کے نئے تانے بانے بُنتا۔

روز روز کی میٹھی تھکن رنگ لائی۔ پورے پندرہ دِن احمد علی بستر پر پڑا رہا۔ بخار نے ہر شے بھلا دی۔

سارا گاؤں احمد علی کی بیمار پرسی کو آیا۔ کہانی احمد علی کے بخار میں جل رہی تھی۔

جب طبیعت ذرا بہتر ہوئی اور تانگا لے کر پکی سڑک پر آیا تو سارے کھیت خالی تھے، زمین کا سارا سنہری پن جیسے کوئی راتوں رات چاٹ گیا۔

اُجڑے اُجڑے خالی کھیت، اُس کے دِل کو کچھ ہونے لگا۔

بس پندرہ دِن میں سارا منظر بدل گیا۔ پُل کے نیچے بہتا سارا پانی مٹی کے اندر جذب ہوگیا، درختوں کی شاخیں جو پانی پہ جھکی رہتی تھیں، اب خالی ہوا میں ڈول رہی تھیں۔

امربیل کے زرد گچھے جو لوٹ لوٹ کے پانی پر تیرتے رہتے تھے، وہ آج نہر میں گرے ہوئے تھے۔

اڈے کی رونق البتہ ویسی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ چائے پی کر کچھ دیر کے لیے وہیں لیٹ گیا۔ سب اُس کا حال پوچھنے لگے۔ جب ٹرین کے آنے کا وقت ہوا تو وہ اسٹیشن، اسٹیشن کی صدا لگاتا تانگا قصبے کی سڑکوں پر دوڑانے لگا۔

آج اُس کے تانگے پر بس دو نوجوان تھے۔ جنھیں بڑے والے گاؤں سے بھی آگے جانا تھا۔ اُن کا لباس، گفتگو، بالوں کے اسٹائل، جسم سے اُٹھتی خوشبو سب بہت انوکھا اور دلکش تھا۔ وہ انھیں بار بار دیکھتا، اُن کی ایک ایک ادا کو حافظے میں سمو لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُن کی گفتگو بھی بہت مختلف تھی، نئے نکور لفظوں سے بھی۔

دونوں اپنی ہی باتوں میں گم تھے۔ آس پاس گزرتے منظروں سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔

''کسی بھی ملک کی ترقی کے لیے فوجی حکومت نہیں جمہوریت ہی بہترین ہے۔'' ایک نے زور دے کر کہا۔

دوسرا ہنس پڑا۔

''ٹھیک ہے مگر ہمارے عوام اتنے سمجھ دار نہیں کہ وہ جمہوریت کے عمل کو سمجھ سکیں، یہاں تو اندھا قانون ہے۔''

''جناب ہمارے ملک میں کون سی حکومت ہے؟''

سوال بے اختیار ہی اُس کے لبوں سے پھسلا۔

''تم کو نہیں پتا؟'' حیرت سے دونوں بے حال ہو رہے تھے۔

''نہیں صاحب!''

''تمھارے گاؤں میں بجلی نہیں؟''

''ہے صاحب!''

''ٹی وی؟''

''نہیں صاحب! پورے گاؤں میں بس چودھریوں کے گھر ٹی وی ہے۔ وہاں کبھی کبھار لڑکے کوئی فلم ڈراما دیکھ آتے ہیں بس۔''

''اوہ۔''

''اگر جمہوریت ہو تو خوش حالی ہو۔''

''کہاں سے؟ جمہوریت کے لیے جو شعور درکار ہے وہ یہاں کہاں ہے؟''

اُس کا سوال درمیان میں لٹک رہا تھا۔ اُن کی بحث نئے سرے سے شروع تھی۔
تھوڑی دیر کے بعد اُنھیں احساس ہوا کہ کوئی سوال پوچھ کر جواب کا منتظر ہے۔
''فوجی حکومت ہے یار۔''
وہ مزید سوال پوچھ کے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا، اُس کے اپنے اندر سوالوں کی فصل اُگ آئی۔
فوجی حکومت کیسے کرتے ہوں گے؟
حکمران کا لفظ بھی اُس کی لغت میں نیا تھا، قصہ کہانیوں کی زبان میں اب تک ''بادشاہ'' کے کردار سے واقف تھا۔ کسی قصے کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی۔
''ایک سی بادشاہ... تہاڈا ساڈا خدا بادشاہ۔''
پھر قصہ نت نئے کرداروں سے سج جاتا۔
پھر آج شام سنانے کے لیے اُس کے پاس بڑے انوکھے کردار تھے اور بڑی نئی خبریں بھی۔ وہ اپنی داستان میں بڑی ہنرمندی سے نت نئی خبروں کا تڑکا لگاتا۔
تانگے کے ساتھ وقت کا پہیہ بھی گھومتا رہا۔ شادی ہوئی کچھ عرصہ کے لیے قصہ کہانیوں کا سلسلہ رُک گیا۔ وہ خود ایک داستانی کردار بن گیا۔
اُس کی ماں کسی دور کے گاؤں سے بڑی سوہنی ووہٹی ڈھونڈ کے لائی تھی۔ اب لوک گیتوں پر اس کا دل گداز سے نہیں بلکہ سرور سے بھر جاتا۔
کچھ دن لوگوں نے کہانی کے بنا گزارا کیا، پھر شام میں کوئی نہ کوئی اُسے بلانے چلا آتا۔
وہ چلا تو جاتا پر اب وہ پہلی سی داستان طرازی نہ رہی تھی، اُسے گھر جانے کی جلدی رہتی۔
بیوی کا گداز لمس اُسے اپنی طرف کھینچتا، وجود میں بے قراری لیے گھر لوٹ آتا۔
اُس کی جلد آمد پر اُس کی ماں زیرِ لب مسکراتی، وہ قوسِ قزح کے رنگ دیکھتا، آنکھوں میں چمکتے جگنو، ہونٹوں پر بکھرتی مٹھاس، سرور ہی سرور، اُسے کائنات کے سارے رنگ اسی تعلق میں نظر آتے۔
ایک ہی انداز سے چلتی زندگی اُس کے لیے ست رنگی ہوگئی، کیف کے جھولوں میں جھولتے وہ سارے کام کرتا۔
ترقی کی لہر بڑے شہروں میں تیزی سے اُٹھتی مگر چھوٹے شہروں تک آتے بہت سست ہوجاتی۔ بجلی آنے کے بعد کئی سال لگے گھروں میں فریج، ٹی وی، کولر مشینیں آنے میں۔ ٹی وی آیا تو اس کی کہانیوں کی ضرورت یک دم ختم ہوگئی، ڈراما اکثر اُس کی یاد دلاتا۔

وہ بھی گھر کے چھوٹے سے آنگن میں بیوی کے ساتھ بیٹھا خبریں سنتا اور اُن دنوں کو یاد کرتا جب اُس کی جیب میں کتنی ہی خبروں کے تراشے ہوا کرتے تھے۔

کچا صحن پکا ہوا، گھر کے ساتھ والا خالی میدان آدھا اُس نے خرید لیا۔ غلام رسول ترکھان کی بیٹھک اب خالی میدان میں جا بسی۔ وہ کمرہ اب احمد علی اور اُس کی بیوی کا تھا۔ جو چم چم کرتے سامان سے بھرا ہوا تھا۔

کمرہ چھوٹا تھا اور سامان زیادہ تھا۔ کچھ سامان اماں کے پرانے کمرے میں پڑا تھا، پر کمرہ پھر بھی سامان سے اٹا پڑا تھا، اُوپر نیچے رکھی رنگین پایوں والی بارہ چارپائیاں، پیٹیاں، بکسے، کرسیاں، میز، پلنگ، سنگھار میز اور اَن گنت چیزیں۔ یہ لڑکیاں ماں باپ کے بینت بینت کر رکھے سارے جذبے بھی اُٹھا کر جہیز میں لے آتی ہیں۔

اب کچھ پیسے جمع کر کے ابا کی بیٹھک کے ساتھ ایک اور کمرہ بنائے گا، جہاں کمرے کا آدھا سامان رکھے گا تا کہ وہ بھی اپنے کمرے میں چل پھر سکے، ٹی۔ وی دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا۔

زندگی کے خوب صورت لمحات کا تاوان دینا پڑتا ہے۔ سکھ کے ساتھ دُکھ بھی بندھے ہوتے ہیں، یہ باتیں احمد علی نے سنی دیکھی ضرور تھیں، پر اُس کے ساتھ بھی ایسا ہوگا یہ اُس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

یک دم دیکھتے ہی دیکھتے دوا دارو کے وسیلے کرنے سے پہلے ہی غلام رسول ترکھان بیٹھے بیٹھے خاموش ہوگیا۔ اوزاروں پہ جمے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، ٹھک ٹھک کی آواز یک لخت سناٹے میں بدل گئی۔

جب ماں پانی دینے گئی تو وہ گھٹنوں میں سر دیے اُسی طرح بیٹھا تھا جیسے کام کرتے کرتے تھک جائے تو سر زانو پر رکھ کر بیٹھ جاتا، ماں نے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ آرام سے نیچے لیٹ گیا۔

اوزار ہاتھ سے گر گئے، موت کا فرشتہ کب وار کر گیا، نہ اماں کو پتا چلا نہ کسی اور کو، اتنی خاموش موت۔

باپ کے جنازے کو کندھا دے کر آیا تو اپنے کندھے جھک گئے۔ قبر پر مٹی ڈالی تو اپنا وجود مٹی مٹی ہوگیا۔

اُس کے وجود میں عجیب سی کرلاٹ مچ گئی، موت کی اُداسی، یتیمی کا دُکھ، ماں کا سوگ بھرا وجود، عورتوں کے بین در و دیوار سے لپٹے رہے۔ سکھ تو جیسے بہت دور تھا۔

باپ کے بعد تو جیسے وہ خوشی کو ترس گیا، ماں کی چپ بڑھتی گئی، زندگی سے بیزاری نے اُسے

تنہا کردیا۔ نہ کسی سے ملنے جاتی، نہ ہنستی بولتی، اپنے آپ سے باتیں کرتی، دے دیا تو کھالیا ورنہ پہروں بیت جاتے نہ کچھ مانگتی نہ کھاتی۔

زیادہ عرصہ تو نہ گزرا تھا۔ وہی خاموش موت پھر اُس آنگن میں آٹھہری۔ موت کا فرشتہ ایک بار پھر دبے قدموں آیا اور اُسے بالکل خالی کرگیا۔

کتنے ہی ماہ لگے اُن میاں بیوی کو اُس دکھ سے نکلنے میں۔ پھر روزی روٹی کے چکر، اولاد کی ذمہ داریاں۔

دو بیٹیاں زیادہ تو نہ تھیں پر گاؤں کی عورتوں کے افسوس بھرے لہجے، اُسے پل پل پریشان کرتے، جب بھی کوئی چاچی، ماسی ملتی اور کہتی:

''کڑیاں احمد علی نوں گھیرا پالیا۔ رب سوہنا ہُن میرے احمد علی نوں پتر دیوے۔''

تو وہ ہنس کر کہتا، ''چاچی کڑیاں کوئی رات کو اُٹھ کر کھاتی ہیں، اپنا نصیب تو ہر کوئی کھاتا ہے، یہ بھی کھالیں تو کیا جاتا ہے۔''

پر سوچیں بننے کا عمل صدیوں پر محیط ہوتا ہے، اُنھیں بدلنے کے لیے بھی صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

سوچوں نے احمد علی کو وقت سے پہلے بوڑھا کردیا۔

کندھے جھک گئے، چہرے پر تفکر نے لکیروں کا جال سا تن دیا تھا، اب وہ منظروں کو دیکھے بنا ہی گزر جاتا تھا، نئے مسافروں کا لباس، گفتگو کچھ بھی اُسے نہ چونکاتا، نہ کسی کہانی کا مواد تلاش کرتا۔

بس سارا دن سواریاں اُٹھاتا، روزی روٹی کا بندوبست کرتا، شام ڈھلے گھر آجاتا۔

نہ گھوڑا پہلے جیسا تازہ دم رہا، نہ تانگے کی وہ آب و تاب رہی اور نہ ہی احمد علی جوان رہا، نہ کمائی کی پہلے جیسی صورت رہی، تانگے روز بہ روز کم ہونے لگے، ویگنیں، آٹو رکشا، انھوں نے تانگے کی مانگ کم کردی۔ سواری کم وقت میں زیادہ فاصلہ طے کرنے کی تمنا میں تانگے کو چھوڑ کر ویگن یا رکشا میں بیٹھ جاتی۔ احمد علی سواریوں کا منہ تکتا، سارا سارا دن قصبے کی گلیوں میں اسٹیشن اسٹیشن کی صدائیں لگاتا تھک جاتا۔ کبھی دو، کبھی چار سواریاں ملتیں جنھیں لے کر اسٹیشن چلا جاتا۔ شہر سے آنے والے لوگ تیز رفتار زندگی سے تھکے ہوتے، وہ وقت کے تیز رفتار جن کو قابو کرتے۔

گھڑی کی سوئیوں کو دیکھنا بند کر کے تانگے میں بیٹھ جاتے اور آنکھیں آس پاس کے منظروں پہ ٹکا دیتے، وہ آنکھیں جو عمارتیں دیکھ دیکھ کر تھک چکی ہوتیں، سبزہ، کھیت، اُن کی

آنکھوں کی دُنیا بدل دیتے۔ یہی چند سواریاں احمد علی کا کُل سرمایہ تھیں، انھی کی مدد سے اس کا گھر اور گھوڑا چل رہا تھا۔

قصبے کی حالت بھی روز بہ روز بدل رہی تھی، روز ایک عمارت گرتی، روز ایک نئی عمارت تعمیر ہوتی۔ پر اس کے گھر کی دیواریں دن بدن چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں یا پھر اُس کی بیٹیوں کے قد اتنے لمبے ہوگئے تھے کہ دیواریں اُن کے خط و خال چھپانے سے معذور تھیں، یا پھر غربت سارے راز کھول رہی تھی، گلی کوچوں میں چلتی پھرتی سرگوشیاں وہ بھی سنتا، پر اُس کے پاس دو کوٹھے بھرنے کے لیے سرمایہ نہ تھا۔

شام ڈھلے جب وہ گھر آتا تو سوائے چند سو کے کچھ بھی اُس کے پاس نہ ہوتا، بیوی اُس کا بھیگا مرجھایا چہرہ دیکھتی اور سوچتی، ان سے وہ کوئی چیز بنائے، دال روٹی چلائے یا بیٹیوں کے سر بدن ڈھانپنے کے اسباب کرے۔

روز احمد علی فکروں کی چادر اوڑھ کے سوجاتا۔ وہ چپ کی بکل میں سارے غم چھپاتی۔ بیٹیوں کے پاس جا سوتی۔

ہر نیا دن اندیشوں اور پریشانیوں کے سورج کے ساتھ طلوع ہوتا اور اِنھی واہموں میں غروب ہو جاتا۔

سارا دن تانگا دوڑانے پر بھی بس چند سو روپے۔ ایک روز احمد علی کو اسٹیشن پر کھڑے کھڑے شام ڈھلنے لگی۔ دو ٹرینیں رُکیں، پر سواریاں چند ایک، اُن کو بھی اُن کے میزبان لینے آئے تھے۔ اب احمد علی کو آخری ٹرین کا انتظار تھا، جس سے اُس کا رزق بندھا تھا۔

گھوڑے کو تھان سے باندھ کر وہ اندر اسٹیشن پر چلا گیا۔ سواری جیسے ہی ٹرین سے اُترے وہ اُسے جانے پر آمادہ کرے، بے چینی سے ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

ڈھلتی شام کی اُداسی، درختوں پر چڑیوں کا بے تحاشا شور، ٹرین کی آواز ہر شے پر حاوی ہوگئی۔ بھاں بھاں کرتے خالی ڈبے، اِکا دکا مسافر، اُس کی آنکھوں میں اُمید کے دیے بجھنے لگے۔

وِسل بجی، جھنڈی کھڑی ہوئی، اُس کا دل ڈوبنے لگا، ٹرین کے دھوئیں سے زیادہ اُس کے چہرے پر دھواں پھیل گیا، ایک ڈبے سے ایک مسافر اُترا احمد علی آگے بڑھا۔

"صاحب کہاں جانا ہے؟ تانگا بالکل تیار ہے۔" اُس سوٹڈ بوٹڈ شخص نے احمد علی کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا اکلوتا بریف کیس احمد علی کو تھما دیا۔

احمد علی نے فرمانبرداری سے بریف کیس تھاما، کپڑے سے سیٹ صاف کی، اور پھر سوال

دُہرایا، ''صاحب کہاں جانا ہے؟''

''پہلے قصبے چلو۔ ایک عمارت دیکھنی ہے، پھر مٹے والے گاؤں۔'' آج احمد علی ہر خوف سے آزاد تھا۔

''بہتر صاحب۔''

''کتنے پیسے لوگے؟''

''صاحب آپ جتنے چاہو دے دینا۔''

''پھر بھی تم اپنا بتاؤ۔''

''صاحب! یہاں سے قصبے کا ۱۰۰ روپیا اور قصبے سے گاؤں کے ۳۰۰ روپے۔''

''ٹھیک ہے۔''

وہ بنا کوئی بحث کیے خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اطمینان احمد علی کے رگ و پے میں اُتر گیا، تانگا ویران سڑکوں پر دوڑنے لگا۔

قصبے پہنچ کر اُس نے ایک نئی تعمیر شدہ عمارت دیکھی، ایک شخص جو شاید اس عمارت کا مالک تھا، وہ پہلے سے منتظر تھا۔ اُس نے ساری عمارت گھوم پھر کے دکھائی، احمد علی اُتنی دیر تک تانگے پر بیٹھا اُس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہ دونوں عمارت سے باہر آئے۔ ہاتھ ملا کر وہ پھر سے تانگے پر آبیٹھا، اب احمد علی گھوڑے کو زیادہ تیزی سے بھگا رہا تھا۔

باتوں کا شوقین نہ وہ صاحب تھا اور نہ ہی جاننے کھوجنے کی حس احمد علی کی باقی رہی تھی۔ دو افراد کی خاموشی بعض اوقات سفر کی طوالت کو اور بڑھا دیتی ہے، آج بھی مٹے والا گاؤں آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اندھیرا پھیل گیا، خوف کی سرسراہٹیں اردگرد ہر شے سے سنائی دے رہی تھیں۔ بالآخر گاؤں آیا۔ صاحب نے پانچ سو کا نوٹ احمد علی کو دیا۔

''صاحب میرے پاس کُھلے نہیں ہیں۔''

''رکھ لو۔ سارے تمھارے ہیں اور بات سنو صبح نو بجے مجھے یہاں سے لے سکتے ہو؟''

''کس کے گھر سے؟''

''کسی کے گھر سے نہیں، میں نو بجے یہاں ہوں گا۔''

''ٹھیک صاحب۔''

رات تو جیسے آنکھوں میں کٹی، کم از کم آج کی رات نیند میں صبح کی فکر نہیں تھی۔ ٹھیک ۹ بجے

وہ اڈّے پر تھا۔

صاحب بھی صاف ستھرا تیار کھڑا تھا۔

''سناؤ احمد علی کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں صاحب۔''

تانگا چل پڑا اور باتوں کا سلسلہ بھی۔

''احمد علی کتنا کما لیتے ہو روز کا؟''

''صاحب! ایک زمانہ تھا جب کمائی تھی۔ اب تو بس دال روٹی چلتی ہے۔''

''پھر بھی۔''

''صاحب کبھی ۳۰۰۔ ۴۰۰ کبھی اس سے بھی کم۔''

''اچھا احمد علی اگر تم کو سواریاں بھی نہ اُٹھانی پڑیں اور روز کے پیسے بھی مل جائیں؟''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے صاحب؟''

''اگر تم راضی ہو جاؤ۔''

''صاحب کرنا کیا ہوگا؟''

''احمد علی جو رات عمارت دیکھی وہ میں نے خرید لی، میں یہاں سینما بنا رہا ہوں، یہاں فلمیں چلا کریں گی۔ تم اُن فلموں کے پوسٹر اپنے تانگے پر باندھنا اور جو علاقہ تم سے کہا جائے اُس میں سارا دِن تانگا چلانا۔ لوگ اشتہار دیکھ کر فلم دیکھنے آئیں گے۔''

''بس اتنا سا کام؟''

''اور تم کو اس کام کا ایک ہزار روزانہ ملا کرے گا۔''

سواریوں کے پیچھے بھاگنے ان کی منت کرنے سے بہت بہتر تھا۔ پیسے روز کے پکے۔ احمد علی نے فوراً ہامی بھر لی۔

صاحب کو اُس عمارت کے باہر اُتار کے احمد علی اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

اُس نے تین سو روپیا احمد علی کی ہتھیلی پر رکھا اور کہا، ''جاؤ آج سواریاں اُٹھاؤ، کل سے ۹ بجے آجانا، تمھیں پوسٹرز مل جائیں گے۔''

احمد علی قصبے کی سڑکوں پر اشتہار کی صدائیں لگانے لگا، اشتہار نے اُس کی قسمت بدل دی۔

اگلے دن ٹھیک ۹ بجے وہ اُس عمارت کے باہر تھا، ایک دن میں عمارت کا رنگ رُوپ بدل چکا تھا، رقص کے انداز میں عورتوں کی بڑی بڑی تصویریں ننگی پنڈلیاں، کھلے گلے اور اُن

گلوں سے جھانکتی...

احمد علی کی نظریں شرم سے جھک گئیں۔

اُسی انداز کے بڑے بڑے پوسٹرز لا کے احمد علی کو پکڑا دیے گئے، ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا احمد علی کی مدد کرنے لگا، لکڑی کی چوکھٹوں پر کپڑے کے بنے پوسٹرز، وہی رقص کرتی لڑکی۔ پوسٹر اُٹھاتے ہوئے احمد علی کے ہاتھ اُس کی برہنہ پنڈلیوں پر جا پڑے، جسم میں یہ ارتعاش تو تب بھی نہ پیدا ہوا تھا، جب اُس نے اپنی بیوی کے لش لش کرتے بدن کو چھوا تھا۔

یہ لرزہ تو تب بھی نہ تھا جب پہلی دفعہ...

کانپتے ہاتھوں سے پوسٹر تانگے کی تینوں اطراف میں باندھ دیے۔

ہوا کے سارے رستے بند ہو گئے اردگرد سے گزرتے مناظر آنکھوں سے اوجھل، زبان بند... آنکھیں بند، سر شرم سے جھکا پڑا، بے حیائی کے اشتہار باندھے وہ سارے شہر میں گھوم رہا تھا۔

آج اُسے قصبے میں سارا دن تانگا چلانا تھا، ایک دن میں ہی احمد علی مرجھا گیا، تھکن اس کے رگ و پے میں اُتر گئی۔

کپڑے کے پوسٹر میں جیسے وہ قید ہو کے رہ گیا۔ اُسے اردگرد کھڑے لوگ دکھائی نہ دیتے۔

اُس کی سانسیں جیسے اردگرد کے مناظر سے بندھی تھیں، جیسے ہی مناظر آنکھوں سے اوجھل ہوئے اُس کی سانس بند ہونے لگی، دل پر بوجھ سا پڑ گیا، وہی پرانا ہلکا سا گداز۔

احمد علی کی آنکھوں میں ساون بھادوں کا موسم اُتر آیا۔

جب شام قصبے کی درو دیوار پر اُترنے لگی تو احمد علی سینما ہاؤس کے باہر آ کھڑا ہوا، پوسٹرز اُتارے گئے، ہزار روپے کا نوٹ احمد علی کے ہاتھ پر رکھا گیا، جسے لے کر احمد علی گھر لوٹ آیا۔

دھیرے دھیرے خوش حالی گھر کی دہلیز پھاندنے لگی، پھر احمد علی کی آنکھوں سے نیند ختم ہو گئی۔

وہ برہنہ تصویریں ساری ساری رات اُس کی آنکھوں کے آگے ناچتیں، وہ کروٹ پہ کروٹ بدلتا پر وقت کی اس کروٹ کو نہ روک سکا۔ فضا، مناظر، سواریاں سب سے رشتہ توڑ کر وہ خوش حالی خرید لایا۔

ایک روز شام ڈھلے وہ سینما ہاؤس پہنچا تو شام کا show شروع ہو چکا تھا، سارے لڑکے اندر ٹکٹیں دینے، لائنیں بنوانے میں مصروف تھے، ایک کو آواز بھی دی۔ اُس نے کہا:

''احمد علی گھر لے جاؤ۔ کل اسی فلم کا اشتہار چلنا ہے، اسی طرح باندھ کر لے آنا۔''

شام ڈھل رہی تھی۔ وہ گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گھوڑا باہر باندھ کر پوسٹر اُٹھا کر جب

گھر کی دہلیز سے آگے بڑھا تو اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، صحن کے اندھیرے نے اُس کا بڑا بھرم رکھا، پوسٹرز اُلٹے کر کے رکھے تاکہ بیٹیاں یہ منظر نہ دیکھ سکیں، خاموشی سے کمرے میں گیا۔ بیوی نے کھانا دیا، کھانا کھا کے وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو پوسٹرز سیدھے رکھے تھے۔

کس نے دیکھے؟

اُس کی بیوی نے... وہ شرم سے مرنے لگا۔ ناشتا مانگے بنا ہی وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

کپڑے کی چار دیواری اور اُسی چار دیواری کے باہر ناچتی تصویریں۔

احمد علی کو یوں لگتا جیسے رات کے اندھیرے میں چڑیلوں کا وحشت ناک رقص۔

پر اُس کی آنکھیں، زبان، سب بِک چکا تھا۔

وہ چیخ کے رو بھی نہیں سکتا، اسے اسی طور چلنا تھا۔ دو کوٹھے جہیز سے بھرنے تھے۔

ایک شام گھر لوٹا تو ماں بیٹیوں کی تکرار کی آوازیں گھر کی دہلیز سے نکل کر گلی میں گونج رہی تھیں۔ وہ پریشان ہوا کہ یہ جھگڑا کیسا؟

اندر جانے کی بجائے اُلجھی آوازوں سے وہ جھگڑے کا سرا ڈھونڈنے لگا۔

''نہیں پہنوں گی؟'' یہ آوازیں اُس کی بڑی بیٹی کی تھی۔

''کیوں؟'' اُس کی بیوی کی تھکی ہوئی آواز آئی۔

''میں نے کہا تھا کہ میری قمیص کا گلا اُتنا ہی کھلا ہو جتنا اُس فلم والی عورت کا تھا، اس کو کاٹ کر ٹھیک کریں۔''

پوسٹرز اُڑ اُڑ کر احمد علی کے بازوؤں سے ٹکرانے لگے۔

گلی کی زمین نیچے دھنسنے لگی اور وہ دیواروں کے درمیان پھنس گیا، سانسیں سینما ہال کی چمنی سے اٹک گئیں۔

○○○

بے دخلی

سیّد سعید نقوی

کسی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ یقیناً میری آنکھ اس کی موجودگی سے ہی کھلی تھی۔ پہلے تو میں اسے پہچان نہیں سکا۔ آنکھ کھلتے ہی ہر چیز ایک سی نظر آتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ذہن کے کسی گوشے میں شناسائی کے خلیے بیدار ہوتے ہیں تو شکل کے ساتھ ذہن میں ایک نام ابھر آتا ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو جیبوں میں ہاتھ ڈالے برآمدے میں کھڑا ہے۔ بہت سارے سوال بیک وقت ہی ذہن میں ابھرے۔ یہ کیسے گھر کے اندر گھس آیا، بیچ رات میں کیوں آیا ہے اور سب سے اہم یہ کہ اب میں اس کو ٹالوں کیسے؟

''یہ کیا طریقہ ہے جناب؟ آپ گھر میں کیسے گھس آئے؟ مجھے یاد ہے سونے سے پہلے میں نے صدر دروازہ تو بند کردیا تھا۔'' میں نے ناگواری سے سوال کیا۔

''صدر دروازہ بند کرنے سے گھر محفوظ ہوجاتا ہے کیا؟ ہلکے سے دباؤ سے پچھلا دروازہ کھل گیا اور میں اندر آگیا۔'' اس نے ایسی لاپروائی سے کہا جیسے یہ ایک فطری عمل ہے جو اس کو کرنا ہی چاہیے تھا۔

''اب آہی گئے ہیں تو فرمایئے کیسے زحمت کی؟ دن کی روشنی شاید آپ کی آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہے۔'' میں نے ذرا طنز سے کہا۔ نیک بخت جو اس کی آواز سن کر لحاف میں کچھ اور نیچے دبک گئی تھی، اس نے ہلکے سے میری ران پر چٹکی بھری، گویا انتباہ کررہی ہو۔

''نہیں میاں دن کی روشنی مجھے تو نہیں کھلتی، لیکن آپ ضرور مجھے پہچان کر دروازہ بند کر

لیتے یا آپ کو کوئی ضروری کام یاد آجاتا۔ رات کی تاریکی میں آپ کی مدافعت پر بھی ذرا غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے، پھر یہ کہ ملنا بھی ضروری تھا۔ آپ سے آخر ہمارے بہت دیرینہ تعلقات ہیں، بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟''

''اب آپ اندر آ ہی گئے ہیں، چور دروازے سے اور وہ بھی رات کی تاریکی میں تو ذرا بتائیے، میں اس وقت آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس کو بیٹھنے کی دعوت دینا ایسا ہی تھا، گویا کوئی عرب اونٹ کو خیمے میں گردن گھسانے کی اجازت دے دے۔ وہ وہیں برآمدے میں کھڑا رہا اور میں کمرے کی کھڑکی کے اس پار۔

''آپ کو بخوبی علم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔''

''مجھے واقعی نہیں معلوم، سب خیریت تو ہے آپ کے گھر میں؟'' میں ان جان بنا رہا۔

''جی میرے گھر میں تو سب خیریت ہے، یوں کہیے آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔'' لگتا تھا اشاروں کنایوں میں یہ بھی پی ایچ ڈی کر کے آیا ہے۔

''میں سمجھا نہیں؟'' میں بھی ڈھیٹ بنا رہا۔

''میں اپنا قرضہ واپس لینے آیا ہوں۔''

اس کے منہ سے وہی نکلا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بیچ رات میں بن بلائے کوئی اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑا ملتا تو بقول پطرس بخاری، میں بھی عدم تشدد کو خدا حافظ کہہ دیتا، مگر یہاں دو مسائل ذرا گمبھیر تھے، ایک تو یہ کہ جسمانی طور پر وہ مجھ سے بہت زیادہ طاقت ور تھا، دوسرے میں اس کا مقروض تھا۔ لفظ ''مقروض'' شاید اس دلدل کو بیان نہ کر سکے جس میں، میں گھرا تھا۔ میرا بال بال نہیں بلکہ یوں کہیے میرا رُواں رُواں قرض میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ کیا ہوا، کیوں ہوا، معاملہ اس حد تک کیسے پہنچا، فی الوقت یہ بحث فضول ہے۔ میں نے لفظ فی الوقت بہت سوچ سمجھ کر اور ارادتاً استعمال کیا ہے۔ دیکھیے جب کہیں آگ لگی ہو، فوری مسئلہ آگ بجھانے کا ہے۔ آگ کیوں لگی، یہ تحقیق بعد کی بات ہے۔ اس تحقیق کی اہمیت سے انکار نہیں کہ بہتری ابتری سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ تو فوری مسئلہ آگ پر قابو پانے کا ہے۔ یہ قرضہ بیوی کی شاہ خرچی کی وجہ سے ہوا ہے یا میری جمع تفریق میں نالائقی کی وجہ سے، فی الوقت یہ بحث خارج از بحث ہے۔ دوسرے یہ کہ اس بحث سے میرے اور اس نیک بخت کے درمیان گھمسان کا رن پڑنے کا اندیشہ ہے۔ سب سے آسان حل یہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کو الزام دیں، تم یہ نہ کرتیں تو آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا، وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ ہم دونوں مل کر اس بری گھڑی کو ٹالیں۔

''لیکن سیٹھ صاحب یہ تو بیچ رات ہے اور اس وقت تو میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں، ابھی فوراً کہاں سے دوں، کچھ وقت کی مہلت اور دے دیں۔''

''کچھ روز کی مہلت، یہ جملہ تو مجھے پارلیمانی لہجے سے باہر ہوگیا ہے۔ اس نکتے پر مذاکرات اب نہیں ہوں گے۔'' سیٹھ کی اپنی ایک الگ بھاشا تھی۔ اتنے برسوں اس سے معاملہ کرنے کے بعد میں یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ نکتہ اب مزید کام نہیں آئے گا۔

''اگر مہلت ممکن نہیں اور میرے پاس پیسے بھی نہیں تو پھر کیا ہوسکتا ہے؟'' عجیب سادیت پسند طبیعت تھی میری۔

''ایک صورت ضرور ممکن ہے اور وہ ہے قرقی۔'' وہ پھر اپنے سرمایہ دارانہ لہجے میں بولا۔ اس کی زبان سے وہ الفاظ نکل رہے تھے جن سے میرے کان یا تو ناآشنا تھے یا اس وقت ایسے بن گئے تھے جیسے کسی اسکیمو کے کان میں عبرانی انڈیلی جارہی ہو۔

''قرقی؟'' میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

''جی قرقی، کوئی نیا قانون تو نہیں ہے۔ صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ جب لوگ اپنی اوقات سے زیادہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو اکثر ان کی جائیداد اور وراثت قرق ہوجاتی ہے۔''

''آپ کون ہوتے ہیں مجھے اوقات یاد دلانے والے۔'' میں نے ایک بے تیغ سپاہی کی طرح جوابی حملہ کیا۔

''اگر آدمی خود اپنی اوقات نہ بھولے تو دوسروں کو اسے اوقات یاد دلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' طاقت اور دولت نے اس کے لہجے میں خوداعتمادی، طنز، کنایہ، ٹھہراؤ سب ہی تو بھر دیا تھا۔ کیا کوئی طاقت ور، امیر آدمی حلیم الطبع ہوسکتا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شکر ہے رات کی تاریکی میں وہ انھیں دیکھنے سے قاصر تھا۔ یا صرف یہ کم زور کی زود رنجی ہوتی ہے کہ طاقت کا لہجہ کھل جاتا ہے۔ گفت وشنید یا مذاکرات تب ہی متوازن ہوسکتے ہیں جب برابری کی بنیاد پر ہوں۔ اگر ایک فریق بہت زیادہ طاقت ور ہو یا دولت مند ہو تو توازن نہ بگڑنا باعث حیرت ہوگا۔

''کیا آپ مجھے بے گھر کردیں گے؟'' مجھے لگا جیسے نیک بخت نے لحاف کے اندر کروٹ لی ہو۔

''اس کے سوا کیا چارہ ہے۔ اگر اس وقت مجھے پیسوں کی اشد ضرورت نہ ہوتی تو میں یہ انتہائی قدم کبھی نہ اٹھاتا۔ آپ خود ہی سوچیے، سارے دروازے تو آپ نے خود ہی بند کردیے۔ اب میں خود اپنے مفادات کو تباہ کرلوں یا آپ کے مکان کی فروخت سے ان کا تحفظ کرسکوں۔ آپ

کسی چھوٹی جگہ منتقل ہو جائیے۔'' اس نے ہم دردی سے کہا۔ مجھے پتا تھا، وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ برآمدے تک آنے والی چاندنی میں اس کے سامنے کے دو دانت اچانک لمبے ہو کر اس کے بند منہ سے باہر نکل آئے تھے۔ خون آشام نے تازہ شکار کی بُو سونگھ لی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی اپنی جائیداد ایک وسیع اراضی پر پھیلی ہے۔ میرے مکان پر اس کی نظر صرف اس کی توسیع پسندی کے پیٹ کا ایندھن ہے۔ شکاری کا پیٹ بھرا ہوا بھی ہو تو بھی وہ عادتاً ہر اس ہرنی پر تیر چلانے سے باز نہیں آتا۔ لیکن اس سے کیا بحث کروں، قصور میرا اپنا ہے۔ اپنے آپ کو اس گرداب میں پھنسانے کا ذمے دار میں خود ہی تو ہوں۔ عدالت کا رُخ کروں تو کس برتے پر۔ میرا مقدمہ اتنا کم زور ہے کہ کچھ ہے ہی نہیں۔ جگ ہنسائی کا سبب بنوں گا۔ بچت کا صرف یہی طریقہ تھا کہ اس کی نیک خصلت کو ابھاروں۔ اس کو جذباتی ہیجان اور پشیمانی میں مبتلا کروں، شاید مہلت دے دے۔

''آپ میرا گھر قرق کر کے کیا حاصل کریں گے۔ کوئی اور راستہ سوچتے ہیں، ادائیگی کی قسطوں میں اضافہ کر دیجیے۔ شرح سود بڑھا لیں، میں ہر صورت میں راضی ہوں، خدارا ہم کو بے گھر تو نہ کیجیے۔'' میری آواز میں بے چارگی تھی۔ مجھے لگا، لحاف میں گھسی نیک بخت نے بھی ایک سسکی بھری ہے۔ شاید یہ سسکی اس نے بھی سن لی تھی۔ اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے ایک توقف کے بعد جواب دیا۔

''ایک صورت اور ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا صورت ہے؟'' اُمید کی کرن پھوٹ پڑی۔ انسانیت اور شرافت پر پھر میرا اعتماد بحال ہونے لگا۔ وہ دوسرا حل بتانے سے ہچکچا رہا تھا۔

''بتائیں تو جناب، وہ دوسرا حل کیا ہے؟''

''دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنے بچے مجھے دے دیں، میں انھیں پال لوں گا۔ لکھاؤں گا، پڑھاؤں گا، میرے کام آئیں گے، میرے بھروسے کے آدمی بنیں گے۔'' میری امیدوں پر پانی پڑ گیا۔ جہاں معاملہ ہوس اور توسیع پسندی سے ہو، وہاں شرافت اور انسانیت کی اُمید کرنا، شرافت اور انسانیت کی توہین ہے۔

''نہیں۔'' اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، نیک بخت نے لحاف پھینک کر دوسری پلنگ پر لیٹے دونوں بچوں کو سینے سے لپٹا لیا۔ ''نہیں آپ یہ بچے ہم سے نہیں لے سکتے، یہی تو ہمارا مستقبل، یہی تو سہارا ہیں۔''

''بھابی جان، قرضہ اتنا بڑھ چکا ہے کہ یہ بچے بڑے ہو کر بھی میرے مقروض رہیں

گے۔ انھیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ ابھی سے میرے حوالے کردیں تو میں قرض معاف کرنے کو تیار ہوں۔ ذرا دور اندیشی سے کام لیجیے۔'' اس نے نہایت سلاست سے سمجھایا۔

''بھابی جان!'' کم بخت کیسی شرافت اور اپنائیت سے مخاطب تھا۔ میں بالکل نہیں چاہتا کہ یہ میری بیوی کو بھابی جان کہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے اس کے نام سے پکارے۔ اپنے خون آشام لہجے میں، بڑے بڑے دانتوں، لمبی سی ناک اور ڈراؤنے چہرے کے ساتھ۔ کم از کم پتا تو ہوگا کہ ہم کس سے معاملہ کر رہے ہیں، چھری کس سمت سے آ رہی ہے۔ 'بھابی جان' سے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مغل دربار میں کوئی فرنگی تاجر بادشاہ سلامت کو مخمل میں لپٹا خنجر پیش کر رہا ہے۔ شیطان اصلی شکل میں ہو تو پہچان کر اس سے بچا جا سکتا ہے۔ یہاں معاملہ ایسے موذی سے تھا جس کے چہرے پر معصومیت اور زبان میں شیرینی تھی۔

''نہیں میں اپنے بچے کسی قیمت پر نہیں دوں گی۔ مر جاؤں گی مگر نہیں دوں گی۔'' نیک بخت شیرنی کی طرح دونوں بچوں پر سایہ کیے تھی۔

''آپ کی اولاد ہے، آپ کو پورا حق ہے جو چاہے فیصلہ کریں۔ میں تو صرف زمینی حقائق کی نشان دہی کر رہا ہوں۔ ساری عمر مقروض رہنے والی اولاد میری غلام نہیں رہے گی تو اور کیا ہوگی۔ اور اگر میرا حساب اتنا کمزور نہیں ہے تو یہ تو کیا، آپ کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی ان شاء اللہ میرے بچوں اور پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کو بٹھا کر کھلائیں گے۔ میں تو آپ کو گلو خلاصی کا راستہ دکھا رہا ہوں۔ یہ حل قبول نہیں ہے تو قرقی کا راستہ کھلا ہی ہے۔''

نیک بخت کچھ کہتی یا نہیں، یہ راستہ خود مجھے بھی قبول نہیں تھا۔ ذہن بالکل ماؤف تھا۔ اب مجھے سمجھ آ رہا تھا لوگ خودکشی کیوں کر لیتے ہیں۔ لیکن میرے خودکشی کر لینے سے نیک بخت اور بچے پھر بھی سکون نہ پاتے، یہ مسئلہ جوں کا توں رہتا، کوئی اور حل نکالنا پڑے گا۔

''کوئی اور حل سوچیے، کوئی اور طریقہ ضرور ہوگا۔ آپ جو کہیں گے، وہ میں کرنے کو تیار ہوں۔'' میں نے کہہ تو دیا مگر ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں تو کیا، گھنٹا گھر پورے زور سے بج رہے تھے، گویا کسی ہونے والی فوتگی کا اعلان کر رہے ہوں۔

''جو میں کہوں گا، وہ تو آپ کریں گے ہی لیکن اس سے میرا قرض تو ادا نہیں ہوگا۔ اب اس قرض کی ادائیگی کس طرح تو آپ کریں گے یا نہیں؟'' اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ ''یوں سمجھیے کہ یہ مکان قرق کر کے بھی مجھے گھاٹے کا سودا ہی رہے گا۔''

''وہ کیسے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ ایسے کہ اب اس مکان میں بچا کیا ہے، کوئی اس کی کیا قیمت دے گا؟'' میری آنکھوں میں بے یقینی دیکھی تو اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی زور سے کھڑکی پر ماری تو اس کا پٹ نیچے آگرا۔

''دیکھا، کس قدر سال خوردہ ہے، آپ میری بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔''

''معاف کیجیے گا، کم بخت دیمک چاٹ گئی اس کو، بس میں بدلوانے ہی والا تھا کھڑکیاں۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

''اور بدلوانے کے پیسے کہاں سے آتے، مجھ سے ہی مزید ادھار مانگتے۔''

اس کا یقیناً مذہب مختلف ہے کہ گرے ہوئے کو اس وقت تک مارتے رہو جب تک کہ وہ دم نہ دے دے۔ وہ پورے پندرہ راؤنڈ کا قائل نہیں تھا، غالباً کہیں اور بھی جانا تھا وصولی کے لیے۔

''آپ کہیں تو مزید نمونے پیش کروں؟'' اس کی منحوس آواز کانوں میں گونجی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کر سکتا، اس نے چھڑی دیوار میں گھسا دی۔ چھڑی دیوار کے آر پار ہوگئی۔ میری آنکھیں تقریباً باہر نکل آئیں۔ میری دیواریں اتنی بوسیدہ ہو چکی ہیں، ابھی کچھ زیادہ دن تو نہیں ہوئے اس گھر کو بنے۔ معمار بھی بہت دیکھے بھالے، بہت خون پسینے کا گارا لگا تھا، پھر یہ حال کیسے ہوگیا۔ کیا موسم بہت ناموافق تھا، میں نے متوحش نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ فاتحانہ نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا جیسے چیلنج کر رہا ہو، اب بھی یقین نہ آیا ہو تو اور مثالیں پیش کروں۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

''مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو، اپنے آپ سے پوچھو۔ یہ سب ایک دن میں تو نہیں ہوگیا۔ لگتا ہے بہت محنت کی ہے تم نے اسے بگاڑنے میں۔ یقین جانو تو مجھے بھی اس قدر بری حالت کی امید نہیں تھی۔ لگتا ہے میرا تو سارا پیسا ڈوب گیا۔''

''نہیں، نہیں میں نے تو بہت خیال رکھا تھا۔'' مجھے خود اپنی بات جھوٹ لگی۔

''کیا خیال رکھا تھا بتاؤ، ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو، سوچو، بتاؤ کیا خیال رکھا تھا؟''

''ہم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے، کیا رکھا ہے اس میں۔ ہم آگے بھی نہیں دیکھتے۔ بھئی حال میں زندہ رہنے میں جو مزہ ہے، وہ کہیں اور ممکن نہیں۔'' میں نے اسے فخر سے سمجھایا۔

''صحیح کہہ رہے ہو، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے لیکن اگلا پچھلا حساب تو رکھنا چاہیے۔ کبھی مرمت بھی کی تھی اس کی؟ کہیں کا پلستر ادھڑ جائے تو اسے فوراً رفو کرنا پڑتا ہے، نیا پلستر لگانا

پڑتا ہے، ورنہ بارش رس رس کر ساری دیوار خراب کر دیتی ہے۔ تمھارے پاس کوئی کاپی، کوئی رجسٹر، کوئی رسیدیں ہیں کہ تم نے کہاں کہاں درستگی کرائی تھی؟''

''نہیں، میں نے حساب تو نہیں رکھا، زیادہ ضرورت پڑی ہی نہیں۔'' میں نے ذرا شرمندگی سے کہا۔

''ضرورت نہیں پڑی، تو وقتاً فوقتاً جو تم مکان کے نام پر قرض لیتے رہے ہو مجھ سے، اس کا کیا کیا؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ میں نے اور نیک بخت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور شرمندگی سے ہماری آنکھیں ایک ساتھ جھک گئیں۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور دیتا بھی تو کیا۔ پیسے لیے تو ضرور تھے لیکن کبھی کہیں سیاحت کے لیے نکل گئے، کچھ نیک بخت کو زیور کا شوق بھی زیادہ ہے۔ پھر یہ کہ میں بھی ذرا نئی گاڑی اور ٹیپ ٹاپ کا خیال رکھتا ہوں۔ آدمی اپنی ظاہری حیثیت سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ بہت خیال رکھنا پڑتا ہے اپنی ظاہری حالت کا۔ کچھ پیسا پرانے قرضے اتارنے میں خرچ ہو گیا۔ ہزار خرچے ہوتے ہیں لیکن کوئی ایک خرچ ہو تو بتاؤں۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ بجٹ کے وقت اخراجات منہ پھاڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب میں اسے کیا سمجھاؤں، مجھ پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی۔

''تم نہیں سمجھو گے، کبھی ان حالات سے گزرے ہی نہیں، منہ میں چاندی کا چمچا لے کر پیدا ہوئے ہو گے۔'' میں نے اپنی بے بسی کا انتقام گویا لہجے کی کاٹ سے لیا۔

''نہیں، ایسا تو نہیں۔ ہمارا گھر بھی ایک بار دُھویں سے بھر گیا تھا۔ مگر ہم گھر کو چھوڑ کر بھاگے نہیں، سب نے مل کر آگ بجھائی، پھر جہاں جہاں آگ سے نقصان ہوا تھا، اس جگہ کو دوبارہ تعمیر کیا۔ بس ذرا خیال رکھا تھا کہ چولھا اور باورچی خانہ ذرا دور ایک کونے میں تعمیر کریں کہ اگر آگ لگے بھی تو پھیلے نہیں۔ مقامی آگ پر نسبتاً آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے، پھر یہ بھی کوشش کی کہ چولھے کو ہوا کے رُخ سے ذرا دور رکھیں۔ بھئی چولھا تو ہر گھر میں ہوتا ہے، اس سے تو مفر نہیں لیکن ہوا کے رُخ سے اسے الگ کر دیا تو یہ آگ دوبارہ پھیلی نہیں۔'' وہ اپنی سوچ میں بہت دور نکل گیا تھا۔

''نقصان تو بہت ہوا ہوگا؟''

''ہاں نقصان تو بہت ہوا تھا۔ جانیں بھی بہت ضائع ہوئی تھیں لیکن اس سے ہمیں سبق ملا۔ مکان کے نقشے کا دوبارہ جائزہ لیا۔ چہار دیواری دوبارہ مضبوط کی، دیواریں کھڑکیاں ٹھوک بجا کر دیکھیں۔ اب حالات یہ ہیں کہ اپنا گھر مضبوط کر لیا ہے۔ اب ہم دوسری سال خوردہ یا خطرے

یں گھری عمارتیں خرید کر انھیں تو مسمار کر دیتے ہیں۔ اگر زمین اچھی جگہ اور مہنگی ہو تو اس پر نیا ڈھانچا کھڑا کر لیتے ہیں۔ ورنہ پرانا فرنیچر، لکڑی وغیرہ بیچ کر اچھے پیسے بن جاتے ہیں۔ اکثر تو اس کباڑ سے ایسی ایسی نادر چیزیں ملتی ہیں کہ ساری محنت وصول ہو جائے۔'' وہ اپنے جذب کے عالم میں مجھے اتنا کچھ بتا گیا جو شاید ویسے نہ بتاتا، اسے شاید خود بھی اس بات کا احساس ہو گیا۔

''اس وقت بات میری نہیں، آپ کی ہو رہی ہے۔'' اس نے لہجے میں تلخی کے باوجود طرز تخاطب شائستہ ہی رکھا۔

''بھئی کچھ کوشش تو میں نے بھی اپنے مکان کو اچھا رکھنے کی کی تھی لیکن یہاں شب خون اتنی بار پڑا کہ دیواریں ہمیشہ کے لیے شکستہ ہو گئیں۔ یہ جو تم نے اپنی چھڑی دیوار میں گھسائی تھی، یہیں ایک بار نقب لگ چکی ہے۔ ایک بار نقب لگ جائے تو پھر دیوار میں وہ مضبوطی کہاں سے آئے؟''

''لیکن تمھارے محلے میں تو اتنی چوریاں نہیں ہوتیں۔ تمھارے پڑوسی بھی میرے مقروض ہیں، ان کے احوال سے میں واقف ہوں، کبھی نقب زنی کی اطلاع تو نہیں آئی۔''

''بس اب کیا بتاؤں۔'' میں شرمندگی سے اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

''نہیں، بتاؤ بتاؤ، میرے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔ جان کاری اور معلومات میرے کاروبار میں سمجھو کامیابی کی کلید ہیں۔'' اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

''بھئی اندر سے ہی نقب لگتی رہی۔ میرے کچھ سسرالی رشتے دار ایسے نکلے کہ یہاں رہتے اور نقب لگاتے رہے۔ ہم نے تنگ آ کر کئی دفعہ چوکی دار بھی رکھا۔ قسمت کی خوبی دیکھیے کہ وہ ان سب سے بڑے چور نکلے۔'' وہ میری داستان بہت دل چسپی سے سن رہا تھا۔

''اب جو بھی ہے، قرضے کی واپسی کی طرف آؤ۔ مجھے پیسے کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ میں دو حل تجویز کر چکا ہوں، لگتا ہے قرقی ہی ہوگی۔ یہ نقب کی کہانی میں کئی گھرانوں میں سن چکا ہوں، تم لوگوں کو سبق سیکھنا چاہیے تھا۔ اب اس مکان کو دیکھ کر اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں میرے آدمی نے اس جائیداد کے عوض اتنی رقم کیسے دے دی۔ بھئی یہاں تو بنیادی ڈھانچے میں بھی مسائل ہیں۔''

''نہیں ڈھانچا بہت مضبوط ہے، اس میں کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے ذرا ناگواری سے کہا۔

''یہ چھت اتنی نیچی کیوں ہے، آج کل تو اونچی چھتوں کا فیشن ہے۔''

''بھئی کیا بتاؤں، اونچی چھتوں میں آواز گونجتی ہے۔ میری بیوی کے کچھ رشتے دار یہاں

رہتے ہیں، وہ اپنی آواز سننا نہیں چاہتے۔ آپ صحیح کہہ رہے ہیں، چھت اونچی ہی رکھوانی چاہیے تھی۔ اب نیچی چھت ہونے کی وجہ سے سیدھا کھڑا ہونے میں دشواری ہوتی ہے، فوراً سر ٹکرا جاتا ہے۔''

''اور خرابیاں گنواؤں ڈھانچے کی؟''

''بھئی جیسا بھی ہے، میرا گھر ہے۔ تمھیں کچھ پتا ہے نہیں، بلاوجہ خرابیاں گنوا رہے ہو۔ دراصل ابا میاں کو ان کے خالو نے پالا تھا۔ جب خالو کا انتقال ہوا تو ابا میاں کو وہ گھر مجبوراً چھوڑنا پڑا، بیوی بچوں کے ساتھ۔ سر پر چھت تھی نہیں، جلدی میں جو نقشہ بن سکا، بن گیا، اس پر فوراً تعمیر شروع ہوگئی۔ میری غلطی یہ ہے کہ میں اس کی مرمت اور مضبوطی پر توجہ نہیں دے سکا۔ بس بیرونی آرائش اور رنگ روغن سے کام چلا لیا۔ لگتا ہے اندر سے یہ کھوکھلا ہوتا رہا اور باہر سے دیکھنے والے اسے مضبوط سمجھتے رہے، قصور میرا اپنا ہے۔''

''مجھے انگلیاں اٹھانے اور الزام تراشی کی نہ فرصت ہے، نہ عادت۔ تم میاں بیوی یہ کام کرتے رہو۔ قصور کس کس کا ہے، یہ سب کیوں ہوا، اب عذر تراشنے بند کرو — مجھے اپنا قرضہ واپس چاہیے۔ اتنی لمبی بحث اور کہانی سے کیا فائدہ۔ میں نے حجت تمام کرلی، میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میرا قرض واپس کردو، تم اپنے گھر خوش، میں اپنے گھر خوش۔ نہیں واپس کرسکتے تو اپنی نسل مجھے دے دو۔ یہ بھی نہیں کرنا چاہتے تو مکان قرق تو ہوگا اور ہوگا بھی آج ہی کی تاریخ میں۔ شکر ہے تم مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔ قانون میرا ساتھ دے گا، یہ تو تمھیں بھی علم ہے۔ اگر تم نے قانون سے آنکھ بند کرلی ہے تو قانون تو تمھاری طرف سے اندھا نہیں ہوگیا۔'' اس نے گویا بات تمام کردی۔

''جب تم نے ٹھان ہی لی ہے تو پھر جو چاہو کرو، لیکن اب یہاں سے دفعان ہو۔'' شکست خوردہ لہجہ جارحانہ ہونے میں دیر نہیں لگاتا۔ صبح سے پہلے تو یہ کچھ کر نہیں سکتا، صبح ہوگی، عدالت کھلے گی، یہ قرق نامہ حاصل کرے گا، پھر آئے گا۔ ان چھ آٹھ گھنٹوں میں کوئی ترکیب ذہن میں آجائے گی۔ مجھے اپنی ہشیاری پر پورا بھروسا تھا، یہ نوبت اس سے پہلے بھی کئی بار آچکی تھی۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا تھا۔

''چلو اب نکلو یہاں سے۔'' میں نے اسے باہر نکال کر اندر سے چٹخنی لگالی۔

حالات نے ثابت کیا کہ میں اپنے آپ کو جتنا عقل مند سمجھتا تھا، اتنا میں تھا نہیں۔ صبح سے شام ہوگئی، کوئی صورت نہیں بنی۔ دوسرے ساہوکاروں نے بھی قرضہ دینے سے انکار کردیا۔ کچھ میرے حالات سے واقف تھے اور کچھ بڑے سیٹھ سے خوف زدہ۔ میں مرتے قدموں گھر واپس لوٹا

کہ پھر اس سے خوشامد کروں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جہاں میرا گھر تھا، وہاں اب صرف ملبے کا ڈھیر ہے۔ ایک بلڈوزر بچے کھچے گھر کو مسمار کر رہا ہے۔ وہ بدبخت اس ملبے پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ ملبے پر ایک بورڈ لگا دیا ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہے 'نئی ملکیت'

''یہ میرا گھر تھا، یہ تم نے کیا کیا؟'' میرے منہ سے بین کی سی آواز نکلی۔

''گھر اس کا ہوتا ہے جو اس کی حفاظت کر سکے، ورنہ ملکیت بدل جاتی ہے۔ اب میں یہاں جو نیا مکان بناؤں گا، تم چاہو تو بحیثیت کرائے دار اس میں رہ لینا۔'' اس نے بہت رسانیت سے مجھے سمجھایا، میرا بریف کیس ہاتھ سے لے کر رکھا اور مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

○○○

سفرنامہ

نوحۂ عراق☆

بغداد یونی ورسٹی کے اساتذہ سے ملاقات

سلمیٰ اعوان

ہمارے لیے زبیدہ ہمیشہ سے تاریخ میں نور جہاں کی ٹکر کی رہی۔ نور جہاں کی کہانیوں نے اگر مسحور کیا تو ہارون کی چہیتی زبیدہ بھی کسی سے پیچھے نہیں تھی۔ اُس انجینئر کی آنکھوں کی چمک اور لہجے سے چھلکتا اشتیاق مجھے اکثر یاد آتا ہے جو میرے سکول میں پڑھنے والی بچی کا باپ تھا اور جس کی خدمات سعودی عرب نے نہر زبیدہ کے سلسلے میں حاصل کی تھیں۔

کیا عورت تھی— جی دار، پُرعزم، شعر و ادب کی دل دادہ اور اُس کی سرپرست، سخی، سماجی بھلائی کے کاموں میں پیش پیش۔ ہارون الرشید کے ساتھ جب حج کے لیے گئی تو راستے کی مشکلات سے ذاتی طور پر آگاہ ہوئی۔ حکم دیا کہ جن راستوں سے حج کے لیے زائرین کے قافلے آتے ہیں وہاں مناسب فاصلوں پر سرائیں بنائی جائیں اور کنویں کھودے جائیں۔

دوسرا حکم زائرین کے ٹھہرنے کے لیے ایک بے حد وسیع و کشادہ عمارت کی تعمیر کا تھا۔

اور تیسرا اُس نہر کے لیے جو مدینہ منورہ کے چشمے سے مکہ تک پانی لے جائے کہ اہل مکہ کو پانی کی شدید تنگی تھی۔ گورنر مکہ دم بخود تھا۔ ایسا مہنگا پروجیکٹ۔ عرض کیا، ملکۂ عالیہ فاصلہ بہت زیادہ ہے اور خرچہ بھی بہت۔

''جو میں نے کہا کرو۔ خرچ لاکھوں چھوڑ کروڑوں میں بھی ہو تو پروا مت کر۔''

تو اس وقت میں اُسی عظیم خاتون کو خراج پیش کرنے جارہی تھی۔

☆ سفرنامے کا ایک باب

یہ امت العزیز تاریخ میں زبیدہ، ہارون کی چچا زاد بیوی کی حیثیت میں بڑی زبردست اور تاریخ ساز ملکہ تھی۔ ازدواجی زندگی کا ایک پہلو کتابوں سے نکل کر اُڑتا میرے سامنے آگیا تھا۔

دونوں میں اگر محبت مثالی تھی تو اختلاف رائے میں زبیدہ کے ہاں لحاظ یا مروت میں چُپ رہنے والی کسی حکمت کا کوئی تصور تک نہ تھا۔

بات تو معمولی سی تھی۔ زبیدہ درست تھی۔ اس کی بات میں وزن بھی تھا اور دلیل بھی۔ ہارون البتہ کج بحثی پر اُتر آیا تھا۔ مردوں والی جھوٹی انا اور حاکمانہ رعب داب کا عنصر بھی بیچ میں شامل ہوگیا تھا۔ اسی لیے زچ کرنے پر تُل گیا تھا۔

وہ شوہر پرست ضرور تھی، پر فضول اور غلط بات برداشت سے بھی باہر تھی۔ غصے میں پیچ وتاب کھاتے ہوئے اٹھی اور بولی، ''جہنمی ہو تم۔ دوزخی ہو۔''

مردانہ انا کو شدید زک پہنچی تھی۔ اعصاب قابو میں ہی نہ رہتے تھے۔ غصے کی انتہا پر سے دھاڑا، ''اگر میں دوزخی ہوں تو تجھے طلاق دیتا ہوں۔''

ایک کرب ناک چیخ زبیدہ کے اندر سے نکلی اور وہ چھاتی پیٹتی اپنے حصے کی طرف بھاگ گئی۔

غصہ اُترا تو اُسے احساس ہوا کہ زبیدہ تو سانسوں کی آمدورفت کی طرح اُس کے اندر اُتری بیٹھی ہے وہ جیے گا کیسے۔ بات محل سے دربار اور دربار سے بغداد کے گلی کوچوں میں اُتر گئی تھی۔ ہر خاص و عام انگشت بدنداں تھا کہ یہ ہوا کیا؟

بغداد کے علما اکٹھے ہوئے۔ ہر ہر پہلو سے غور وخوض ہوا۔ کامیابی کا کہیں کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ حضرت امام محمد کو بلایا گیا۔ وہ بھی ناکام رہے۔ اِسی دوران امام محمد شافعی کے کانوں میں بھی اُڑتے اُڑتے یہ خبر پہنچی۔ انھوں نے اپنے استاد امام محمد کو کہلا بھیجا، میرے پاس اس مسئلے کا حل ہے۔

درباروں میں حاضری دینا امام محمد شافعی کا طریق نہ تھا۔ امام محمد نے کہا کہ اس وقت خلیفۂ وقت سے کہیں زیادہ یہ انسانی مسئلہ ہے۔ آپ کا میرے ہمراہ چلنا ضروری ہے۔ اُستاد کا احترام کرتے ہوئے دربار میں حاضر ہوئے۔ سوال کیا:

''کیا آپ کی زندگی میں کبھی ایسے لمحے آئے جب آپ گناہ کرنے پر قادر تھے لیکن صرف خوف خدا کے باعث گناہ سے باز رہے؟''

ہارون الرشید کی آواز میں اضطراب تھا، جوش تھا۔ وہ بے حد جذباتی تھا۔

''میں خدا کو حاضر جان کر قسمیہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بہت بار ایسا ہوا کہ میں گناہ پر قادر تھا مگر خدا کے ڈر سے باز رہا۔''

''تو پھر سُن لیجیے کہ میں فتویٰ دیتا ہوں۔ آپ ہرگز دوزخی نہیں۔ اہل جنت میں سے

ہیں۔'' امام شافعی کی آواز متانت اور عالمانہ وقار سے بوجھل تھی۔

دربار میں جو علما بیٹھے تھے وہ کون سا کم تھے۔ بول اُٹھے تھے۔

''دعویٰ دلیل سے خالی ہے۔ بے وزن ہے۔''

آپ مسکرائے۔ قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت کی۔ مطلب تھا۔

جو گناہ کا ارادہ کرے اور خوفِ خدا سے باز رہے، اس کا مقام جنت ہے۔ علما دنگ تھے۔ ہارون الرشید کا چہرہ مسرت سے سُرخ تھا اور امام کی آواز گونجتی تھی۔

''جب امیر المومنین دوزخی نہیں تو پھر طلاق بھی واقع نہیں ہوئی۔''

ٹیکسی اسٹینڈ پر افلاق موجود تھا۔ بتاتا تھا کہ اُسے کوئی تین گھنٹوں کے لیے اپنے عزیز کے کسی کام کے لیے بغداد یونی ورسٹی جانا ہے۔

پاس کھڑے دو نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔ آپ کا پروگرام حریہ اور کرخ کا ہے۔ آپ سے میں رابطے میں رہوں گا۔ اگر کچھ اساتذہ وہاں ہوئے تو پھر سعدی آپ کو وہاں لے آئے گا۔''

افلاق کی مجھے عادت ہوگئی تھی۔ گو بغداد میں دن تو ابھی تین ہوئے تھے پر تقریباً دس بارہ گھنٹے کا ساتھ، مجھے تو لگتا تھا میں زمانوں سے اُسے جانتی اور اُس کے ساتھ رہتی چلی آ رہی ہوں۔

گاڑی نے رفتار پکڑی اور ٹیپ بھی آن ہوگئی۔ مجھے موسیقی کے سازوں کی تھوڑی سی شدبد ہوگئی تھی۔ اُس وقت عراق کا مشہور گائیک جوڑا سلیمہ مراد اور ناظم الغزالی، مکام (Makam) جیسی نغمگی والی موسیقی کے ہمراہ نہ سمجھ آنے والی شاعری کو کس دل نشین انداز میں گا رہا تھا کہ بے اختیار ہی میں ایک سرور والی کیفیت میں ڈوب رہی تھی۔

شاہراہِ حیفہ جس کے ایک طرف سوق الجدید (جدید بازار) ہے وہیں سے طلا اسکوائر میں داخل ہوئے۔ چھوٹی سڑک پر پڑے۔ علاقہ غربت کے دھول دھبوں سے نمایاں تھا۔ ریت مٹی ملے کچے راستے اور میدان میں کاغذ اور جا بجا اُڑتے پھرتے شاپر ایک عجیب سی کسمپرسی کے احساسات کو جنم دیتے تھے۔ چھوٹے بچے تھالیوں میں رکھی کھجوریں بیچ رہے تھے۔ ایک تو صحرائی علاقے کا دُھوپ میں اُداسی کی جھلکیاں مارتا تاثر، اوپر سے غربت کا تڑکا، دل پریشان کیوں نہ ہوتا۔

بغداد تو اُن وقتوں کا پیرس تھا جب اُس ہارون کا ڈنکا بجتا تھا۔ اس کے عالی شان محلوں میں رہنے والی وہ ملکہ کہ نام جس کا زبیدہ تھا اس وقت کیسے اُجڑے پُجڑے شہر کی زینت بنی ہوئی ہے۔

کبھی یہاں کے دن اور راتیں جاہ و حشمت والی ہوں گی۔ خلیفہ منصور کے بیٹے کے نام پر یہ جگہ جب زبیدہ کے نام الاٹ ہوئی تو اس نے یہاں محل بنایا تھا۔ جس میں اُس کے ملازم رہتے

تھے۔ زبیدیہ بہت بارونق علاقہ تھا۔

سیاہ برقعہ نما عباؤں میں ملبوس تین عورتیں اور چند بچے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت ایک عجیب سی بات ہوئی۔ دو پڑھے لکھے لڑکے بھی وہاں آ گئے تھے، جنھوں نے انگریزی میں بتایا تھا کہ یہ تو زمرد خاتون کا مقبرہ ہے۔

زمرد خاتون کون تھی، میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ ایک نے تو ہنستے ہوئے دانت دکھا دیے دوسرے نے تھوڑا سا بتایا کہ خلیفہ المستعدی بہ امر اللہ کی بیوی تھی۔

یہ نقش و نگار سے سجی ہشت پہلو عمارت کے عین وسط میں بنے مینار کے ساتھ منفرد سی نظر آئی تھی۔ بعد میں افلاق سے معلوم ہوا کہ سلجوقی اسٹائل ہے۔ اب میں وہاں کھڑی پوچھتی ہوں کہ پھر وہ بغداد کی نور جہاں کہاں ہے؟ کاظمیہ کے قریش قبرستان میں۔

تو بھئی اب وہ کہیں بھی ہو وہاں جانا تو لازمی تھا۔ پر جانے سے قبل میں نے زمرد خاتون کے اس مقبرے کو بغور دیکھا۔ مقبرہ بند تھا۔ کھجور کے درخت بھی کیسے بے نیاز سے ہیں۔ اپنی چھاؤں سے کسی کو مستفید نہیں ہونے دیتے۔

تپتا میدان اور اس میں ٹپکتی ویرانی اپنے عروج پر تھی۔ پاس گنبد کے بغیر ایک چوکور عمارت اور تھی، اس کے سامنے زیتون کے چھدرے سے درخت کے پاس کھڑے ہو کر میں نے فاتحہ پڑھی اور بھاگی۔

اور جب وہ مجھے حریہ کے قدیم راؤنڈ سٹی میں گھما رہا تھا، میں کھڑکی سے باہر منظروں کو دیکھتی لطف اٹھاتے کہے چلی جا رہی تھی۔

''ارے یہ تو بالکل اپنے دیس جیسا ہے۔'' دستی چوبی سیڑھیاں اور گدھا گاڑیاں سامان کی ڈھویا ڈھائی میں مصروف سڑک کو تنگ کرتی تھیں۔ بچ بچا کر راستہ بنتا تھا۔

سعدی افلاق کا ساتھی نرا بونگا تھا۔ موبائل پر افلاق سے بات کی تو اُس نے ڈانٹ پلائی، ارے احمق وہیں پاس ہی اہلِ قریش کا قبرستان ہے۔ قریب ہی مقبرہ شہدا امام حنبل اور جناب معروف کرخی ہیں۔

''چلو چھوڑو تم سیدھے بغداد یونی ورسٹی آ جاؤ۔ میں شام کو ساری زیارتیں خود کروا دوں گا۔''

میں مزے سے بیٹھی گھونٹ گھونٹ دودھ پیتی باہر منظروں کو دیکھتی تھی۔ گاڑی اُسی راستے پر بھاگی جاتی تھی جس پر گزشتہ دو دنوں سے بار بار گھوم رہی تھی۔ اب تو مجھے خود راستوں کی خاصی پہچان ہو گئی تھی۔ دجلہ شہ رگ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

''سعدی امریکی حملے کے وقت تم کہاں تھے؟''

''میں نے کہاں ہونا تھا۔ اسی تپتے جلتے بغداد میں ہی تھا۔''

''کچھ بتاؤ گے نہیں اُن شب و روز کا احوال۔''

وہ زہر خندسی ہنسی ہنسا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا:

''میں بہت حساس اور جذباتی لڑکا ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے جنگوں میں ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔ امن، سکون اور خوش حالی کو ترسے ہوئے۔

ایک صدام ذلیل، اوپر سے یہ لعنتی امریکی، جن کے ٹینک توپیں بغداد کی چھوٹی موٹی سڑکوں پر بھی یوں بھاگی پھرتی تھیں جیسے ہلکائی ہوئی کتیاں کتے گلیوں میں بدحواسے پھرتے ہیں۔ ہیلی کاپٹروں کے اُتار چڑھاؤ نے فضاؤں کو دھواں دھار بنا رکھا تھا۔ وہ گرد اُڑتی تھی کہ بغداد دھول مٹی میں غوطے مارتا نظر آتا تھا۔ بغداد ایئر پورٹ پر تو ان کی مٹر گشت کچھ یوں جاری تھی جیسے یہ اُن کے باپ کا ہو۔''

''لوگوں کا ردِعمل کیا تھا؟''

''بے چارے سہمے ہوئے گھروں میں دُبکے بیٹھے تھے۔ ظاہر ہے صدام سے کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو، یہ تو کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ یوں اُن کا وطن تاراج ہو جائے۔''

میرے اس سوال پر کہ آیا امریکی سپاہیوں نے عام گھروں کے اندر مداخلت کی۔

سعدی کہتا تھا، انھیں تاکید تو تھی لیکن اس کا انحصار ان کی مرضی پر ہوتا تھا۔ کسی بھی گھر میں جانے کے لیے یہی دلیل کافی تھی کہ صدام کے حامی چھپے بیٹھے تھے۔

''معاف کیجیے گا۔ میرے اِس ساتھی نے خلیفہ اسٹریٹ میں کسی کو کچھ کاغذات دینے ہیں۔ تھوڑی سی دیر کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔''

''ارے نہیں بچے جو کرنا ہے کرو۔ میں بھی تو سیر پر ہی نکلی ہوئی ہوں۔''

خلیفہ اسٹریٹ کس قدر خوب صورت تھی۔ کشادہ شان دار سرکاری عمارات اور خوب صورت مسجدوں سے گھری ہوئی۔

سعدی نے ہی بتایا تھا کہ اسی علاقے میں عباسیوں کے مدرسے اور محلات ہیں۔ ''اچھا یہاں آئی تو تھی مگر یہ حصہ نہیں دیکھا تھا۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

کبھی ان شاہراہوں پر بڑے بڑے پوسٹروں پر صدام چمکتا تھا۔ آج صدام کہاں تھا؟

پھر میں نے باہر سے ہی الرشید ہوٹل کا دیدار کیا۔ مجسموں، فواروں، بوٹوں، درختوں، پھولوں سے سجا جدید طرزِ تعمیر کا حامل۔ جنگ کے دنوں میں دُنیا بھر کے صحافیوں کی جائے پناہ۔

سعدی کی آواز مجھے باہر سے اندر کھینچ لائی تھی۔ ''افلاق کے ساتھ آیئے کسی وقت یہاں۔ مرکزی گزرگاہ میں صدام کے پورٹریٹ کو پاؤں سے روندتے ہوئے آگے بڑھیں۔''

''کیا؟''

میری آواز میں حد درجہ حیرت تھی۔

کس قدر طنز سے بھری ہوئی ہنسی تھی جب وہ بولا۔

''منافق لوگ ہیں۔ ایک دوسرے کو استعمال بھی کرتے ہیں اور انھیں ذلیل بھی کرتے ہیں۔ صدام نے اپنے وقتوں میں داخلی دروازے کے فرش پر جارج بُش کی تصویر کندہ کروائی تھی۔ پہلے لوگوں کے جوتے بُش کو روندتے تھے۔ بغداد کو فتح کرنے کے بعد فاتح افواج کے لیے پہلا اہم کام بُش سینئر کو اُکھاڑ کر صدام کے پورٹریٹ کو بچھانا تھا۔''

بڑے لوگوں کی عامیانہ حرکتوں کا اتنا چیپڑا انداز۔ میں تو دم بخود تھی۔ ''کسی شام یہاں آیئے، بلکہ کوئی میوزک کنسرٹ اگر ہو رہا ہو تو اُسے دیکھیے۔ میں پتا کرتا ہوں— ہمارے خوب صورت ہوٹل، ہمارے شان دار دفتر سب جل رہے تھے۔ المنصور جیسے شان دار ہوٹلوں کو آگ لگائی گئی۔ گلی کوچوں میں موت ناچتی تھی یا چور ڈاکو ناچتے پھرتے تھے۔ ہمارے بینک لُٹ رہے تھے۔ بمباری سے ہلاک ہونے والی لاشوں کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ چھوٹے خستہ حال گھر تو پلک جھپکنے میں زمین بوس ہو گئے تھے۔ افلاق کا گھر وہیں راؤنڈ سٹی میں ہی تھا جو ایک جھٹکا برداشت نہ کر سکا۔ تینوں بہنیں اور ماں تین دن اُس ملبے کے نیچے دبیں رہیں۔ نہ کفن نہ قبر۔ ہماری نسوں میں زہر بھر دیا ہے۔ اسپتال تک اُن سے محفوظ نہ تھے اور وہ جو صدام کی قید میں جکڑے ہوئے عراقیوں کو آزاد کروانے آئے تھے، بغداد کے در و دیوار پر چھوٹی پھلجھڑیوں سے کھڑے محظوظ ہو رہے تھے۔''

دجلہ کے کنارے، خوب صورت ترین عمارتوں کے ساتھ آباد ہیں۔ صدام کا صدارتی محل میں نے سعدی کی نشان دہی پر دیکھا۔ یہ دجلہ کی دوسری سمت تھا۔ کس قدر شان دار ایک انتہائی خوب صورت ٹاؤن کا تاثر اُبھرتا تھا۔ میں حیرت سے گنگ بظاہر نظر آنے والے پھیلاؤ کو ہی دیکھ کر گم صم تھی جو دجلہ کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا تھا۔ تو یہ گرین زون ہے اور یہاں وہ رہتا تھا ایکڑوں میں پھیلی ان پُرتعیش جگہوں پر جسے وقت نے چیونٹی کی طرح مَسل دیا ہے۔ رہے نام اللہ تیرا۔ باقی سارا رولا رولا۔

سعدی کا کہنا تھا کہ صدام نے قارون دور کی کھدائیوں سے حاصل کردہ محلاتی نمونوں کی طرز پر اسے بنایا تھا۔ اس محل کے نیچے ایسی خندقیں اور بنکر ہیں کہ جن کی مضبوطی کے بارے میں

جتنا جھوٹ بولا جائے اتنا سچ ہے۔

کچھ حاصل ہوا؟ میں نے بے اختیار اپنے آپ سے کہا۔ امریکی جب اپنے ٹینکوں کے ساتھ محل میں داخل ہوئے تھے اُس کی شان وشوکت دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔

"اتنا بڑا ہے، اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اندر شٹل سروس چلتی ہے۔

آج کل امریکیوں کا ہیڈ کواٹر ہے۔ وہ کمرے جن میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی وہ عام امریکیوں کے بوٹوں نے روند ڈالے۔

عام لوگوں نے اندر جا کر اُسے لوٹا بھی بہتیرا۔"

گاڑی میں بیٹھے مجھے کیا نظر آنا تھا۔ بس سنتی رہی۔

Chadiria برج سے ذرا آگے عظیم الشان بغداد یونی ورسٹی ہے۔ جدید طرز تعمیر کی حامل۔ سعدی مجھے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔ ڈپارٹمنٹ میں اُن دنوں سیمینار ہو رہا تھا۔ چھٹیاں ہونے کے باوجود طلبہ و طالبات کی خاصی بڑی تعداد حاضر تھی۔ ڈرائیو وے پر بسیں کھڑی تھیں۔ ایک میں اسٹوڈنٹس بیٹھ رہے تھے۔ عباؤں کے ساتھ ساتھ لونگ اسکرٹ پہننے والی لڑکیاں بھی تھیں۔ شارٹ اسکرٹ میں صرف ایک لڑکی میں نے اُوپر چڑھتے دیکھی تھی۔ بیشتر لڑکیاں سکارفوں سے سر ڈھانپے ہوئے تھیں۔ جنگ سے پہلے یہ ماحول نہیں تھا۔ آزادی اور کُھل ڈُل خاصی تھی۔

"اب کیا لوگ مذہبی ہو گئے ہیں؟"

"نہیں۔ القاعدہ اور انتہا پسندوں کی طرف سے ملنے والی دھمکیوں کا اثر ہے۔"

میں ہنس پڑی تھی۔

ڈپارٹمنٹ بہت خوب صورت نظر آیا تھا۔ پھولوں اور گھاس کے تختوں سے سجا اُس کا فرنٹ نظروں کو یک دم لُبھاتا تھا۔ اُس وقت بلند و بالا چوکور ستونوں پر سجی گھڑی بارہ بجا رہی تھی اور سچی بات ہے کہ دھرتی اور فضا پر بکھرا دھوپ کا جوبن شکر دوپہر کا بھرپور تاثر دے رہا تھا۔

یہاں میری ملاقات فیکلٹی کے چند ممبران سے ہوئی۔ تعلیم عراق کی اوّلین ترجیح تھی۔ ملک بھر میں پھیلے ٹیکنیکل ٹریننگ اسکول اور کالج بغداد یونی ورسٹی سے منسلک ہیں۔ بصرہ، موصل اور المستنصریہ یونی ورسٹی عراق کی بہترین یونی ورسٹیوں میں شمار ہوتی ہیں۔

وہ مجھے تعلیمی مراحل سے آگاہ کر رہے تھے جب کہ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ اُن لوگوں کے ردِعمل موجودہ حالات میں کیا ہیں۔

یہ حساس اور ذہین لوگ تھے جنھیں اپنے وسائل کے لٹنے کا احساس تھا۔

پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں سے بات چیت کا یہ دل چسپ تجربہ تھا۔ فیکلٹی کے کشادہ کمرے میں صوفے کم اور کرسیاں زیادہ تھیں۔ یہاں گیارہ لوگ تھے۔ کچھ اُدھیڑ عمر اور جوان۔ مگر جب گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے احساس ہوا تھا کہ اُن میں سے ایک دو کے سوا کوئی بھی نہ صدام کا حامی اور نہ امریکا کا۔

ذرا کونے میں بیٹھے قدرے گندمی رنگ کے نوجوان کو جس کا نام ابوالمعیب الرازی تھا، کو جنگ سے بھی زیادہ اقتصادی پابندیوں پر غصہ تھا۔ گلف وار سے قبل ملک کا فی کس جی این پی (Gross National Product) تین ہزار ڈالر تھا جو ۲۰۰۱ء میں گھٹتے گھٹتے صرف پانچ سو ڈالر پر آ گیا تھا۔ بے غیرت لوگ — سیال سونے کی دولت سے مالا مال ملک جسے دُنیا کا غریب ترین ملک بنا دیا گیا۔ اُس کی آواز میں مجھے اب زیادہ بھراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

سوال ذہن میں کنکری کی طرح چبھ رہا تھا کہ چلو صدام تو اقتدار میں تھا۔ غریب لوگوں کی کیا خطا۔ وہ بے چارے تین میں نہ تیرہ میں۔ انھیں کس بات کی سزا دی گئی۔ کہاں ہیں ان کے انسانی حقوق۔

کوئی چالیس کے پیٹے میں بڑی سنجیدہ اور مدبّر سی شخصیت نام جن کا مقتدیٰ الصدر، آبائی شہر موصل تھا، نے متانت سے کہا، ”امریکا کے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ صدام کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ امریکا کی یہ کم زوری حکمرانوں کو بھی سمجھ آ گئی تھی۔ بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لیے غریب عوام حکومت کے اور محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔ اور یوں اُس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جنوبی عراق میں حکومت کے خلاف ہونے والی سازشوں کا جس بے دردی سے گلا گھونٹا گیا، اُس کے بارے میں تفصیلات رونگٹے کھڑے کرنے والی ہیں۔“

میں نے لمبی سانس کھینچ کر اپنے آپ سے کہا تھا، ”ارے بیبا میرے کیا رونگٹے کھڑے ہونے ہیں۔ میرے ملک میں کرسی بچانے کے لیے جو طوفان اُٹھائے جاتے ہیں اُن کی تفصیل سناؤں تو تمھارے بھی ہوش اُڑ جائیں شاید۔

”آپ لوگ سمجھتے ہیں صدام امریکی ایجنٹ تھا؟“

دو نے کہا امریکا سپر پاور ہے۔ دُنیا کے حکمران اس کے ایجنٹ ہیں۔ بقیہ کا کہنا تھا سو فی صد تھا۔ کویت پر حملہ امریکا کی مرضی کے مطابق ہوا۔

اور ایران عراق کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہاں اختلاف رائے تھا۔ میں شیعہ اور سنی کی تفصیل میں جائے بغیر جان گئی تھی کہ اس محفل میں کون شیعہ ہے اور کون سنی۔

یہاں موجود حضرات ایران کے بارے میں جذباتی تھے اور اُسے اس طرح تنقیدی کسوٹی

پر نہیں پرکھ رہے تھے جس کی بے لاگ تجزیہ کرتے وقت ضرورت ہوتی ہے۔

ایران پر حملہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ ایران کی انقلابی حکومت کچھ زیادہ ترنگ میں تھی۔ سرحدوں کی مسلسل خلاف ورزیاں اُن کا معمول تھا۔ صدام کی حکومت کو ختم کرنے کی بھی کوشش ہوئی۔ اس پر شور ہوا۔ حقائق کو مروڑ و مت زلے۔ صدام کو عرب دُنیا کا لیڈر بننے کا جنون تھا۔ پھر مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ پاکستان ہندوستان پر بحث ہوئی۔ یہاں مغرب کے لوگوں کی انسان دوستی، اُن کا احتجاج اور ان کے رویے سامنے آئے۔ مشرقِ وسطیٰ اور مشرق بعید انڈونیشیا اور ملائشیا حتیٰ کہ آسٹریلیا کے لوگوں پر بحث ہوئی۔

یہ لوگ احتجاج کے لیے سڑکوں پر کیوں نکلے تھے کہ تیل کی دولت سے مالا مال عرب دُنیا پر سامراجیوں کو مزید دولت سمیٹنے کا موقع نہ ملے۔

سعودی عرب، اُردن اور مصر کے سربراہوں کے بدترین کرداروں اور رویوں پر بحث ہوئی۔

دُنیا کی سپر پاور، بے غیرت اور جھوٹ کی پنڈ، حملے کے لیے بہانے کیسے جھوٹے گھڑے۔

موجودہ حکومت کے بارے میں پوچھا۔

''دلال ہیں اُن کے۔'' کسی نے بیچ میں سے لقمہ دیا، ''جو چلا گیا وہ بڑا تھا۔ یہ ذرا چھوٹے ہیں۔'' ''عراق کا مستقبل کیا ہوگا؟'' یہ سوال میں نے کیا تھا اور ڈرتے ڈرتے کیا تھا کہ اگر انھوں نے جواباً مجھ سے پوچھ لیا کہ پاکستان کے بارے میں کیا کہتی ہیں، تو کیا کہوں گی۔ میرے سامنے تو اندھیرے تھے۔ اُمید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ اور یہاں بھی مجھے تاریکی ہی نظر آتی تھی۔

جنگ کے بعد ہمیں ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید امریکا عراق کو جاپان جیسی حیثیت دے دے۔ یقیناً ایسی صورت میں اُس کے سارے خون معاف ہو سکتے تھے۔ فوج کے چند سینئر افسران کو اگر خریدا گیا تو وہیں ایک عنصر نے اسی سوچ کے تحت کچھ زیادہ مزاحمت بھی نہیں کی تھی وگرنہ قبضہ اتنا آسان بھی نہ ہوتا۔ مگر اس وقت تک حالات مایوس کن ہیں۔ شیعہ سنی عنصر ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے میں مصروف ہے، اور سامراج کے سارے راستے آسان ہوتے گئے۔

قہوہ بڑا کسیلا سا تھا۔ ایک گفتگو کا کسیلا پن اور تلخی، اُوپر سے گرمی موسم اور ستم بالائے ستم قہوے کی کڑواہٹ جو دو چینی کے چمچوں کے بعد بھی قائم تھی۔

دوپہر کا کھانا کینٹین سے کھایا۔ اُبلے چاول اور پتلا سا شوربا۔

○○○

اردو کے اہم ادبی رسائل و جرائد

ذہنِ جدید	مدیر: زبیر رضوی
سمبل	مدیر: علی محمد فرشی
نیا ورق	مدیر: ساجد رشید
زرنگار	مدیر: ضیا حسین ضیا
آج	ترتیب: اجمل کمال
ارتقا	ادارت: واحد بشیر
آئندہ	مدیر: محمود واجد
دنیا زاد	ترتیب: آصف فرخی
روشنائی	مدیر: احمد زین الدین
اجرا	مدیر: احسن سلیم
پہچان	مرتب: کرن سنگھ
مونتاج	مدیرہ: منصورہ احمد
زیست	مدیر: ڈاکٹر انصار احمد
ادبیات	مدیر: محمد عاصم بٹ
اقبالیات	مدیر: محمد سہیل عمر
بازیافت	مدیر: ڈاکٹر تحسین فراقی
دریافت	مدیر: ڈاکٹر رشید امجد
بنیاد	مدیران: یاسمین حمید، معین نظامی
دنیائے ادب	مدیر: اوجِ کمال

شاعری

رسا چغتائی

ایک ہے دریا پانی کا
وہ بھی پیاسا پانی کا

ناپ رہا ہے دُوری کیا
خشک کنارہ پانی کا

جمع کیا ہے دریا نے
قطرہ قطرہ پانی کا

جھیل برابر لگتا ہے
گھر میں کلسا پانی کا

آیا ہے تُو پیتا جا
تھام سکورا پانی کا

یاد کرے گا تو بھی کیا
کیا تھا نشّہ پانی کا

پیچھے پیچھے چل کر دیکھ
آگے چلنا پانی کا

ڈھانپ لیا منہ سوہنی نے
دیکھ کے مٹکا پانی کا

کس بستی سے گزرے گا
اب یہ ریلا پانی کا
پانی ہے یا آنکھوں میں
کوئی پرندہ پانی کا
ڈول رہا ہے دریا میں
خالی مٹکا پانی کا
جانے کس کو کیا سُر دے
یہ الغوزہ پانی کا
دیکھ بلندی پربت کی
دیکھ ہنڈولا پانی کا
دیکھ نگارش لہروں کی
دیکھ صحیفہ پانی کا
خواب سے باہر لگتا ہے
خواب میں آنا پانی کا
ایک کنارہ میرا ہے
ایک کنارہ پانی کا
آگ لگی ہے پانی میں
کیا ہے قصہ پانی کا
ڈوب گیا کیا پانی میں
شور شرابا پانی کا

آج نہیں تو کل ہوگا
ہوگا قضیہ پانی کا

فصل ابھارن مٹی کی
سر پہ قرضہ پانی کا

لاد رہا ہے کشتی میں
کیا بنجارا پانی کا

ایک تو شدّت موسم کی
اُس پہ ٹھکا پانی کا

جاگ رہا ہے پانی میں
کوئی فتنہ پانی کا

دیکھ خزاں کی عریانی
دیکھ جھروکا پانی کا

پاؤں میں سرگم پائل کی
دھیان میں مکھڑا پانی کا

چھوڑ کہانی دریا کی
سُن آوازہ پانی کا

پہلے گھر کا رستہ دیکھ
پھر یہ بھنگڑا پانی کا

خواب سنہرے پنگھٹ کے
چہرہ اُجلا پانی کا

دریا دریا آیا ہوں
کاٹ کے رستہ پانی کا

شام کھڑی ہے باہر دیکھ
چھوڑ یہ ہالا پانی کا

میرا دیکھا بھالا ہے
گوشہ گوشہ پانی کا

شیش محل سے دیکھا ہے
میں نے قلعہ پانی کا

جل دھانی میں بیٹھا ہوں
ڈال کے چھپرا پانی کا

یہ لہرائن میری ہے
میں ہوں سپنا پانی کا

کس مٹی سے کتنا ہے
گہرا رشتہ پانی کا

آئیں دیکھیں جل پریاں
اُڑن کھٹولا پانی کا

ان پودوں کے چہرے دیکھ
دیکھ حوالہ پانی کا

دیکھ رہا ہے پانی سے
دیکھنے والا پانی کا

راگ تو کوئی ایسا ہو
چھیڑنے والا پانی کا
اپنے گھنگرو، اپنی دھن
اپنا رستہ پانی کا
ذہنِ رسا تھا یا ایسا
حسن جدا تھا پانی کا

○○○

سرشار صدیقی

کوئی بھی میری طرح سے اگر دعا مانگے
خدا سے صرف دلِ درد آشنا مانگے
حریصِ شوق توجہ کی انتہا مانگے
یہ مشتِ خاک تو تاثیرِ کیمیا مانگے
یہاں جو زخم نیا دے وہ چارہ گر، وہ طبیب
مریضِ غم سے مسیحائی کا صلہ مانگے
خطاب و خلعت و اعزاز بانٹنے والو!
زباں تو جرأتِ اظہارِ مدعا مانگے
غریبِ شہر کی بے چارگی کا حوصلہ دیکھ
شناخت مانگنے والوں سے آئنہ مانگے
عذابِ ہجر گزرنا تھا جو گزر بھی چکا
تو کوئی کس لیے پھر صبر کا صلہ مانگے
یہ مدعی بھی عجب، اس کا مدعا بھی عجیب
کہ پتھروں سے تکلم کا معجزہ مانگے
عجیب رسم چلی ہے یہ کوئے قاتل میں
جو خوں بہائے، وہی شخص خوں بہا مانگے
مرا سوال تری چشمِ التفات سے ہے
سوال یہ ہے کہ سرشار تجھ سے کیا مانگے

سرشار صدیقی

چہرے کو بحال کر رہا ہوں
دنیا کا خیال کر رہا ہوں

اک کارِ محال کر رہا ہوں
زندہ ہوں، کمال کر رہا ہوں

وہ غم جو ابھی ملے نہیں ہیں
میں ان کا ملال کر رہا ہوں

اشعار بھی دعوتِ عمل ہیں
تقلیدِ بلال کر رہا ہوں

تصویر کو آئنہ بنا کر
تشریحِ جمال کر رہا ہوں

چہرے پہ جواب چاہتا ہوں
آنکھوں سے سوال کر رہا ہوں

کچھ بھی نہیں دسترس میں سرشارؔ
کیوں فکرِ مآل کر رہا ہوں

طُفیلی سیارہ

سرشار صدیقی

وہ اک لمحہ
جس کی تلاش میں
میں نے اپنے ارض و سما کی
پُراسرار کشش سے نکل کر
ایک خیال افروز خلا میں جست لگا دی
اور اپنے محور سے بچھڑ کر
اس بے چہرہ کاہکشاں کے
دوسرے سیاروں کے اثر میں
گردش کرنے اور بھٹکتے رہنے میں
اک عمر گنوا دی

وہ لمحہ
اک جگنو بن کر
جلتا بجھتا
اب بھی مری امیدوں کی

خوش فہم نگاہوں کی زد پر ہے
روشنی کی رفتار سے میں مصروفِ سفر ہوں
پھر بھی مری روشن آنکھوں سے
اس سیماب صفت جگنو کا
فاصلہ ایک ہی حد پر ہے
اور اب شاید
وقت تو ساکت ہونے کی سرحد پر ہے
میرے وجود پہ
اک بے نام تھکن طاری ہے
لیکن پھر بھی
میرا تعاقب جاری ہے

○○○

محاسبہ

ساقی فاروقی

وہ لمحہ خوب صورت تھا

اچھا خاصا گھر تھا لیکن اُجڑ گیا
والدین کے انتقال کے بعد
دونوں بھائی اپنی لاڈلی اور اکلوتی
بہن کی شادی کر کے
ملک سے باہر چلے گئے

لاہوری آبائی مکان میں
صرف چچا سلطان اکیلے رہتے تھے
جن کی گھنی نورانی داڑھی
خوفِ خدا سے ہلتی رہتی تھی

پرویز اٹلی میں
دانتوں کے امراض کا ماہر بن کے رہا

اب اس کی قسمت کا ستارہ
برجِ سکون میں
جگ مگ جگ مگ چمک رہا تھا

ممتاز اسپین میں
جائز اور ناجائز چیزیں
درآمد برآمد کر کے
رزقِ حلال اور اَکلِ حرام کماتا تھا
(اس کے جاننے والوں میں
کچھ ایسے ویسے لوگ بھی شامل تھے)
مگر اپنی اپنی پردیسی دنیاؤں میں
دونوں آرام سے تھے

چھوٹے کے پیہم اِصرار
اور قرطبہ، غرناطہ کے اَسرار
سے ہار کے
بڑا کشاں کشاں چلا آیا تھا
سات برس میں پہلی بار
وہ ساتھ ساتھ چھٹیاں گزار رہے تھے

ناراض اور مواج

پانیوں کے پڑوس میں
شور شرابے والی
گنجان آبادی سے
ذرا ہٹ کر
ایک خوش نما پہاڑی پر
دس بیس مکانات ہوں گے
سب سے اچھا ممتاز کا تھا

ایک روز وہ سیاحی سے
تھکے تھکائے
رات گئے گھر آئے
اپنے لان میں
نیکر پہنے ٹانگ پسارے
پاس پڑے موبائل پر
نظر جمائے کان لگائے
وسکی پیتے رہے

چاند نشے میں تھا
اور سمندر سے
پگھلی چاندی چھلک رہی تھی
ایسا طلسمی منظر اور اتنا آسمان

انھوں نے کبھی نہ دیکھا تھا

لیکن پرویز کے دورے کی
ایک اور وجہ بھی تھی

تیس برس تک
دو روحوں کے شب خانوں میں
عجب طرح کی پاگل نفرت پکتی رہی
اپنا زہر اُگلتی رہی
وہ بدلے کی آگ میں جلتے
انگاروں پر چلتے رہے
اسی لیے کوئی دس دن پہلے
اس سازش نے جنم لیا تھا
اور ممتاز نے کسی پرانے
کاروباری ''ساتھی'' سے
خون کا سودا کر ڈالا تھا
آج اُسی کا سندیسا آنے والا تھا

اوس اُترتی رات گزرتی رہی
اچانک موبائل نے سرگوشی کی:
''بھیڑیا حلال کر دیا گیا''

صبح سویرے ٹیلی فون پر
بہنوئی کی بھرائی آواز سنائی دی:
"راتوں رات، نامعلوم افراد
چچا جان کا گلا کاٹ کے
بھاگ گئے ہیں
اور پولس تفتیش وغیرہ..."

یہ ماں جائے خوش ہو کے
بیتابی سے گلے ملے
بڑی دیر تک گُتھے ہوئے
اپنے دلوں کی دھک دھک سنتے رہے...

اک ناپاک درندے نے
اپنے معصوم بھتیجوں سے
بدکاری کا اِرتکاب کر کے
اُن کی سائیکی بدل دی تھی...

○○○

افتخار عارف

محافظِ روشِ رفتگاں کوئی نہیں ہے
جہاں کا میں ہوں، مرا اب وہاں کوئی نہیں ہے

گزشتگانِ محبت کے خواب لکھنے کو
ابھی تو میں ہوں مگر بعد ازاں کوئی نہیں ہے

محاذِ زیست کے ہر معرکے میں فتح کے بعد
کھلا کہ حاصلِ عمرِ رواں کوئی نہیں ہے

ستارگاں سے جو پوچھا کہ اُس طرف کیا ہے
چمک کے بولے کہ اے جانِ جاں کوئی نہیں ہے

کچھ اعتبار اگر ہے تو حرفِ خیر کا ہے
جُز اس کے اور سخن جاوداں کوئی نہیں ہے

نگاہِ یار نہ آب و ہوا نہ دوست نہ دل
یہ ملکِ عشق ہے یاں مہرباں کوئی نہیں ہے

فلک پہ چاند ستارے زمیں پہ سبزہ و گُل
بس ایک میں ہوں کہ نام و نشاں کوئی نہیں ہے

اسلم انصاری

عین ممکن ہے کسی طرزِ ادا میں آئے
قصۂ دردِ وفا صوت و صدا میں آئے

رُت بدلتے ہی نئے رنگ کے منظر اُبھرے
کچھ پرندے بھی نئی موجِ ہوا میں آئے

ہم تو آئینہ نما تھے ہی صفا کیشی میں
نام کچھ اور بھی اربابِ صفا میں آئے

عشق تا حال تو متروک نہیں ہو پایا
انقلابات بھی گو راہِ وفا میں آئے

کچھ گلِ نیلوفری جھیل کی تاریکی سے
اپنی دانست میں اقلیمِ بقا میں آئے

کیا کہیں اس کو تضاداتِ زمانہ کے سوا
کتنے درویش تھے جو شاہی قبا میں آئے

خواب آنکھوں میں لیے، ہم بھی بہ تائیدِ جنوں
کیسے اک جلوہ گہِ خواب نما میں آئے

شورشِ عہد میں یہ تذکرۂ عشق و وفا
جیسے نغمہ سا کوئی بانگِ درا میں آئے

خود کو گم کر کے کسی اور کے پا لینے تک
مرحلے اور بھی تکمیلِ انا میں آئے

اسلم انصاری

بیاں میں آ تو گیا اضطرابِ تیرہ شبی
کسی نے ایسی حکایت مگر کبھی نہ سنی
فقط نہ ملنا نہیں ترکِ دوستی کا نشاں
وہ دل سے جا کے دِکھاتا تو کوئی بات بھی تھی
نہ جانے کون نکھارے گا اس کا ذوقِ نشاط
زمانہ درد کی تاریخ لکھ رہا ہے ابھی!
ادھوری بات تھی، لیکن کوئی یہ کہتا تھا
کہ اُس کو بھی کسی موسم مری تلاش رہی
رہینِ حرف نہ تھا تیرا التفاتِ نظر
بجا کہ تو نے زباں سے بھی کوئی بات کہی
کِھلا ہوا تھا چمن سا وہ چہرۂ روشن
گُھلی ہوئی تھی فضا میں ادائے خوش نظری
جنوں کی اوٹ سے دیکھیں تو ہنس رہی ہے خرد
عجیب کھیل ہے یہ، آگہی و بے خبری!
چھلک رہی ہے جو تیرے لبوں کی سُرخی سے
وہی ہے آتشِ سیّال و بادۂ عنبی
بحرفِ سادہ ہیں خوش، حال ہی کچھ ایسا ہے
ہوائے نغمہ اُڑائے پھری تھی ہم کو بھی!

فقط حرفِ تمنّا کیا ہے

اسلم انصاری

شام روشن تھی، سنہری تھی،
مگر اُتری چلی آتی تھی
زینہ زینہ
آ کے پھر رک سی گئی
شب کی منڈیروں کے قریں
اک ستارہ بھی کہیں ساتھ ہی جھک آیا تھا
جیسے وہ چھونے کو تھا کانوں کے بالے اس کے
گیسوؤں کو بھی کہ تھے رخ کے حوالے اس کے!
کہنیاں ٹیکے ہوئے ایک دھڑکتی ہوئی دیوار پہ وہ
کھلکھلاتے ہوئے کچھ مجھ سے کہے جاتی تھی
اس کا آہنگِ سخن — منفرد لحنِ کلام
زمزمے پھوٹتے تھے جس سے شگوفوں کی طرح
جھیل پہ پنچھی کوئی پنکھ سنوارے جیسے
سُر کی لہروں پہ کوئی دل کو پکارے جیسے!
سانولے چہرے پہ وہ کانوں کے بالے کی دمک

نازِ بے جا بھی نہ تھا رخ پہ تفاخر کی جھلک
اتنی روشن تھیں وہ آنکھیں کہ گماں ہوتا تھا
جیسے خورشید ابھی ڈوب کے ابھرے گا انھیں آنکھوں سے!
لیکن اس شام ان آنکھوں سے اچانک ٹوٹے
دو ستارے جو لرزتے رہے تا دیر، لرزتے ہی رہے
جیسے کہتے ہوں کہ اس شامِ گریزاں کا بھروسا کیا ہے
دل نہ چاہے تو فقط حرفِ تمنا کیا ہے!؟

○○○

کبھی ایسا تموّج تم نے دیکھا ہے

اسلم انصاری

کبھی ایسا تموّج تم نے دیکھا ہے؟
کبھی جذبات کا ایسا تموّج تم نے دیکھا ہے؟
کہ سینے میں بھنور پڑتے ہوں تشنہ آرزوؤں کے،
مگر ان کو میانِ موج رستہ بھی نہ ملتا ہو،
کنارے تک رسائی کا اشارہ بھی نہ ملتا ہو!

جب ایسا ہو تو ہر چشمے سے دھارے پھوٹ بہتے ہیں،
وہ سنگ و گِل کے پشتے ہوں کہ دریا کے کنارے
پھوٹ بہتے ہیں!
وہی دھارے مگر ان سائبانوں کو ڈبوتے ہیں
کہ جن کے نیچے بیٹھ کر کچھ چاک داماں لوگ
اشکوں — اور طوفانوں — کے موتی بھی پروتے ہیں!

○○○

سحر انصاری

دریدہ دامان و آستیں کے نئے تماشائی آگئے ہیں
جنوں کو بھی رفتہ رفتہ آدابِ محفل آرائی آگئے ہیں

کسی کا چہرہ گلاب جیسا، کسی کا ماتھا شراب جیسا
تمھاری یادوں کے رنگ لے کر ندیمِ تنہائی آگئے ہیں

جو اجنبی تھے اُنھیں تذبذب رہا عدالت کے روبرو بھی
گواہیوں کا ثواب اُٹھانے سبھی شناسائی آگئے ہیں

کہیں چلا ہے حسد کا جادو، کہیں اُٹھی ہے ہوس کی خوشبو
ہماری خودداریوں کے قصے قریبِ رسوائی آگئے ہیں

جو نذرِ آسیب ہوگئی تھیں وہ رونقیں پھر بحال ہوں گی
چہار جانب یہ غُل مچا ہے تمھارے سودائی آگئے ہیں

سحر انصاری

اک خواب کے موہوم نشاں ڈھونڈ رہا تھا
میں حدِ یقیں پر بھی گماں ڈھونڈ رہا تھا

سائے کی طرح بھاگتے ماحول کے اندر
میں اپنے خیالوں کا جہاں ڈھونڈ رہا تھا

جو راز ہے وہ کُھل کے بھی اک راز ہی رہ جائے
اظہار کو میں ایسی زباں ڈھونڈ رہا تھا

مرہم کی تمنّا تھی مجھے زخم سے باہر
درماں تھا کہاں اور کہاں ڈھونڈ رہا تھا

شاید کہ وہ واقف نہیں آدابِ سفر سے
پانی میں جو قدموں کے نشاں ڈھونڈ رہا تھا

کب تھا اُسے اندازہ سحرؔ سنگِ فلک کا
شیشے کے مکاں میں جو اماں ڈھونڈ رہا تھا

نوحؑ کے بعد

سحر انصاری

نقطۂ صفر پر وقت کا پاؤں تھا
زد میں سیلاب کی جب ہر اک گاؤں تھا

نوحؑ نے اپنی کشتی کو تخلیق کی
جملہ انواع سے بھرلیا
رُبع مسکوں کے سیلاب پر اپنی کشتی لیے
کوہِ جودی کی چوٹی کو سر کرلیا
نوحؑ کے واسطے جس پرندے کی منقار میں
برگِ زیتون تھا

وہ امیدِ مسلسل کا قانون تھا
ہم جو کشتی سے اور برگِ زیتون سے
کوہِ جودی سے محروم ہیں
مبتلا ہم کو اس امتحاں میں کیا کس لیے
اتنی لاشوں، مکانوں کے ملبوں
اکھڑتے درختوں، سسکتے پرندوں

شکستہ بدن ریوڑوں کو
کہاں لے کے جائیں
ہم تو سیلاب سے قبل بھی
مستقل ایک سیلاب کی زد میں ہیں
بھوک، افلاس، بیماریاں
ظلم، ناداریاں
بد دیانت شبوں کی سیہ کاریاں
ایک پُرہول سیلاب سے کم نہیں

گردشِ روز و شب سے نکلتے ہوئے
نوحؑ نے راہ پالی تھی جینے کی خاطر
اور طوفان بھی رُک گیا تھا سفینے کی خاطر
اب ہمارے لیے کوئی مرکب نہیں
کوئی کشتی نہیں
جس کے بل پر کہیں پار اُتر جائیں ہم
نقطۂ صفر پر وقت کے پاؤں کی طرح
اک پل ٹھہر جائیں ہم
جب یہ کچھ بھی میسّر نہیں ہے تو پھر
ہم کو فطرت کے قانون اب آزماتے ہیں کیوں
نوحؑ کے بعد طوفان آتے ہیں کیوں؟

○○○

زبیر رضوی

تمام راستہ پھولوں بھرا تمھارا تھا
ہماری راہ میں بس نقشِ پا ہمارا تھا

اُس ایک ساعتِ شب کا خمار یاد کریں
بدن کے لمس کو جب ہم نے مل کے بانٹا تھا

وہ ایک لمحہ جسے تم نے چھو کے چھوڑ دیا
اُس ایک لمحے میں کیفِ وصال سارا تھا

پھر اُس کے بعد نگاہوں نے کچھ نہیں دیکھا
نہ جانے کون تھا جو سامنے سے گزرا تھا

اب اُس کے نام پہ دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا
وہ جس کو ہم نے کبھی بے حساب چاہا تھا

وہ جس کو دیکھا تھا اکثر ہجومِ یاراں میں
وہ ایک شخص بہت ان دنوں اکیلا تھا

تمام صوت و صدا چپ سے ہوگئے تھے زبیر
وہ جب سکوت کے پتھر پہ گر کے ٹوٹا تھا

زبیر رضوی

مجھے تم شہرتوں کے درمیاں گم نام لکھ دینا
جہاں دریا ملے بے آب میرا نام لکھ دینا

یہ سارا ہجر کا موسم یہ ساری خانہ ویرانی
اسے اے زندگی میرے جنوں کے نام لکھ دینا

تم اپنے چاند تارے، کہکشاں چاہے جسے دینا
مری آنکھوں پہ اپنی دید کی اک شام لکھ دینا

مرے اندر پناہیں ڈھونڈتی پھرتی ہے خاموشی
لبِ گویا مرے اندر بھی اک کہرام لکھ دینا

میں اپنی داستاں کو آخرِ شب تک تو لے آیا
تم اس کا خوب صورت سا کوئی انجام لکھ دینا

وہ موسم جا چکا جس میں پرندے چہچہاتے تھے
اب ان پیڑوں کی شاخوں پر سکوتِ شام لکھ دینا

شبستانوں میں لو دیتے ہوئے کندن سے جسموں پر
ہوا کی انگلیوں سے وصل کا پیام لکھ دینا

کشور ناہید

ہم نے کہنے کو تمھیں دل سے بُھلایا ہوا ہے
بس یہی داغ ہے، سینے میں چُھپایا ہوا ہے

اب گرے گی بھی تو کیسے کہ بہت صبر کے بعد
ہم نے دیوار کو ہاتھوں سے بنایا ہوا ہے

بات کرنے کو بہت دیر سے سوچا، اس سے
جس کی تحریر کو آنکھوں میں بسایا ہوا ہے

چشمِ بے عیب میں اس کا ہی سراپا کیوں تھا
جس کا غم، حدِ تمنّا میں سمایا ہوا ہے

خواہشِ قرب کے پیوند ہیں ہاتھوں میں مرے
اے جنوں زاد مجھے کتنے ستایا ہوا ہے

کوئی کہتا ہے رفاقت نہیں ملنے والی
کوئی کہتا ہے وہ دہلیز پہ آیا ہوا ہے

وصل کی شام کا اندازہ بہت مشکل تھا
ہم نے پوچھا تھا مگر اس نے چھپایا ہوا ہے

کشور ناہید

جذب کرلیتے ہیں ہر دکھ کو سمندر کی طرح
اے مرے خواب ٹھہر جا کسی گوہر کی طرح
اپنی دیوانگی سونپی نہیں دیواروں کو
خلوتِ جاں میں رہے شہرِ معطر کی طرح
گردشیں اپنا مقدر تھیں تو ملتیں کس کو
زندگی تجھ کو گزارا بھی ہے پتھر کی طرح
آئنہ ہے کہ جو باور نہیں کرنے دیتا
اس کی قربت کو کسی گل، کسی عنبر کی طرح
اک دیا ہاتھ میں ٹھہرا رہا، جلتا بھی رہا
ہم نے اپنایا ترا زخم صنوبر کی طرح
ہم نے مایوسیاں پہنی نہیں پھر بھی دل میں
وہ ٹھہرتا ہی نہیں آ کے مسافر کی طرح
موج کی طرح کبھی مجھ سے لپٹ جاتا ہے
اور گریزاں ہے کبھی قطرۂ محشر کی طرح
مجھ کو اندازہ نہ تھا تیری طلب کا ورنہ
میں اتر جاتی ترے دل میں بھی آزر کی طرح

محمود شام

خود فریبی سے اگر اپنی سیاست نکلے
بدنصیبی کی سیہ رات سے خلقت نکلے

آگ ہر گام بھڑکتی تھی - لہو بہتا تھا
کتنے آشوب تھے ہم جن سے سلامت نکلے

کہو تاریخ سے گھل جائے مری سانسوں میں
تاکہ اس عہد کی اک زندہ شہادت نکلے

رات دن کام - تگ و دو کا تمدن ہم ہیں
دورِ خودکار میں کیا اپنی ضرورت نکلے

یوں حقیقت سے کبھی ربط نہ کٹنے پاتا
وقت کی دھوپ میں کب اہلِ شریعت نکلے

اچھے موسم ترے آنگن میں ہی رُک جاتے ہیں
میرے کمروں سے بھلا کیسے تمازت نکلے

چاند نے راستے چمکائے، ہوا ساتھ چلی
تم سے ملنے کی کبھی کرکے جو نیت نکلے

محمود شام

فصیلِ شہرِ تمنا کی پختگی ہوں میں
گلابِ جنتِ امکاں کی تازگی ہوں میں

محبتوں میں پرانا ہوں، فیصلوں میں نیا
روایتوں سے جڑی اک نئی صدی ہوں میں

ہیں مجھ میں زندہ، گیا وقت، حال، مستقبل
نہ جانے کتنے زمانوں کا آدمی ہوں میں

ہر ایک موڑ پہ جغرافیہ تڑپتا ہے
وفورِ گریۂ تاریخ کی گلی ہوں میں

نظر مجھی پہ ٹھہرتی ہے جاتے موسم کی
اداس ہوتی ہوئی آنکھ کی نمی ہوں میں

تمام شہر مری حیرتوں سے واقف ہے
بس ایک اپنے محلّے میں اجنبی ہوں میں

گدازِ باہوؔ و غالبؔ، تحیرِ شبلیؔ
سُرِ لطیفؔ ہوں، اقبالؔ کی خودی ہوں میں

محمود شام

زبان و حرف کی حرمت ہمارے دم سے تھی
کہانیوں میں صداقت ہمارے دم سے تھی

پھر اس کے باب میں رُسوائیاں ہی لکھی تھیں
دیارِ یار کی عزت ہمارے دم سے تھی

سرود و رقص و غنا کو وقار ہم سے ملا
سبو و جام کی وقعت ہمارے دم سے تھی

ہم ایسے صاحبِ کردار و پارسا بھی نہ تھے
مگر دلوں میں محبت ہمارے دم سے تھی

ہر ایک سطر توازن — ہر ایک لفظ یقیں
لکھے ہوئے میں حقیقت ہمارے دم سے تھی

ہر ایک صبح نئی مے کشید کرتے تھے
کہ روزمرہ میں ندرت ہمارے دم سے تھی

جو ہم نہیں ہیں تو انگڑائی بھی نہیں ہوگی
ترے بدن میں نزاکت ہمارے دم سے تھی

انور سدید

اُس کی انا کے بت کو بڑا کرکے دیکھتے
مٹّی کے آدمی کو خدا کرکے دیکھتے

مایوسیوں میں یوں ہی تمنّا اُجاڑ دی
اٹھّے ہوئے تھے ہاتھ — دعا کرکے دیکھتے

دشمن کی چاپ سن کے نہ خاموش بیٹھتے
جو فرض تم پہ تھا، وہ ادا کرکے دیکھتے

بے مہریِ زمانہ کا شکوہ فضول ہے
نکلے تھے گھر سے گر، تو صدا کرکے دیکھتے

اُس کے بغیر زندگی کتنی فضول ہے
تصویر اس کی دل سے جدا کرکے دیکھتے

گردن جھکا کے چلنے میں کتنا وقار ہے
اپنی انا سے خود کو رہا کرکے دیکھتے

تازہ ہوا میں اُڑنے کی خواہش تھی گر سدیدؔ
تم اپنا جسم وقفِ فضا کرکے دیکھتے

انور سدید

آرزو تھی یہ بکھیریں اپنی کرنیں صبح تک
روتے روتے بجھ گئی ہیں ساری شمعیں صبح تک

شب کی مٹھی میں پرندوں کی طرح وہ سو گئیں
ہو گئیں زندہ ہتھیلی پر لکیریں صبح تک

وقت کی گزری عبارت کی تلاوت کے لیے
رات کی تنہائیوں میں آؤ گھومیں صبح تک

دن کا سورج ان پہ لکھے گا انوکھے تبصرے
ہم نے جو تالیف کیں دل پر کتابیں صبح تک

زندگی کے راستوں میں جو کہیں گم ہو گئے
ڈھونڈتی اب ان کو ہیں خوابوں میں آنکھیں صبح تک

آشیانوں میں نہ جب لوٹے پرندے تو سدید
دُور تک تکتی رہیں شاخوں میں آنکھیں صبح تک

انور شعور

یادوں کے باغ سے وہ ہرا پن نہیں گیا
ساون کے دن چلے گئے، ساون نہیں گیا

ٹھہرا تھا اتفاق سے وہ دل میں ایک دن
پھر چھوڑ کر کبھی یہ نشیمن نہیں گیا

ہر گل میں دیکھتا رُخِ لیلیٰ وہ آنکھ سے
تھا قیس کم نصیب کہ گلشن نہیں گیا

چھوڑا نہیں مصوّرِ فطرت نے مُوقلم
شہ پارہ بن رہا ہے ابھی بن نہیں گیا

مرضی سے کی ہے میں نے یہ تنہائی اختیار
مجھ پر لگا کے وہ کوئی قدغن نہیں گیا

آئے تھے کل وہ رات گئے، شام کے بجائے
میں بھی کواڑ کھولنے فوراً نہیں گیا

دشمن کو میں نے پیار سے راضی کیا شعورؔ
اُس کے مقابلے کے لیے تن نہیں گیا

انور شعور

گو آسماں بھی سر پر، ظالم سماج بھی ہے
اچھی ہماری حالت کل بھی تھی، آج بھی ہے

ہنستے ہیں ہنسنے والے اقبال مندیوں پر
یہ طنز، یہ تمسخر شاید خراج بھی ہے

مانوس ہو گئے ہیں ہم دردِ دل سے ورنہ
دنیا میں جو مرض ہے، اُس کا علاج بھی ہے

فرماں رواؤں سے وہ مردِ فقیر بہتر
جو حکمراں دلوں پر بے تخت و تاج بھی ہے

کچھ دُور ساتھ چل کر یہ دیکھنا پڑے گا
وہ صرف ہم سفر ہے یا ہم مزاج بھی ہے

ہم ایک جسم بھی ہیں اور ایک روح بھی ہیں
یہ احتیاج بھی ہے، وہ احتیاج بھی ہے

آج اے شعورؔ آنا ممکن نہیں ہمارا
کچھ لوگ آ رہے ہیں، کچھ کام کاج بھی ہے

بلند ہو تو کُھلے تجھ پہ راز پستی کا

امجد اسلام امجد

دیر سے، دیکھ رہے ہیں، رستہ
اگلی گاڑی، ذرا سر کے، تو چلیں!
دور تا حدِ نظر
بھیڑ سی بھیڑ ہے جس کے اُس پار
کچھ نہیں آنکھ پہ کُھلتا، یعنی
کتنی لمبی ہے قطار!

دیر سے راہ میں ٹھہرے ہوئے لوگ
ہارن پہ ہارن دیے جاتے ہیں
بند دروازے پہ جیسے یوں ہی
ایک دستک سی دیے جاتے ہیں
ایسے لگتا ہے کہ جیسے ہم کو
عمر بھر اب تو یہیں رہنا ہے

سخت گمبھیر ہے منظر، لیکن

کچھ بلندی سے اگر دیکھ سکیں
ایک لمحے میں پتا چل جائے
گاڑیاں چند ہیں ہم سے آگے
جن کی اب دید تلک، آنکھ محدود نہیں
رہ گزر تنگ سہی، راستہ مسدود نہیں

ایک چھوٹی سی رکاوٹ کے سوا
کوئی اُلجھاوَ ہے آگے نہ پریشانی ہے
یوں ہی ہر چیز کو ہم آپ اگر دیکھ سکیں
اپنی پستی پہ نظر ڈالیں جو اوپر اُٹھ کر
مشکلیں جتنی نظر آتی ہیں
اُن کی دہلیز پہ رکھی ہوئی آسانی ہے

○○○

امجد اسلام امجد

یوں گھر میں رہیں جیسے ہوں مہمان، یہی لوگ!
ہوتے ہیں کسی دور کی پہچان، یہ لوگ!
بیگانہ ہر اک بات سے، ہر بزم میں تنہا
ہر بات پہ ہوتے ہیں جو حیران، یہی لوگ
دیکھے جو انھیں، دار کی لکڑی پہ کِھلیں پھول
کاندھوں پہ لیے پھرتے ہیں زندان، یہی لوگ
ہوتا ہے جہاں فائدہ اربابِ وفا کا
کرتے ہیں وہاں اپنا ہی نقصان، یہی لوگ
جو ہاتھ میں ہو بانٹ کے اُٹھتے ہیں سرِ شام
اُس قادرِ مطلق کا ہیں احسان، یہی لوگ
اندر سے رہیں خرم و آباد سراسر
باہر سے نظر آئیں جو ویران، یہی لوگ
انعام بٹے جب تو رہیں پچھلی صفوں میں
دینی ہو جہاں جان تو عنوان یہی لوگ
لوگوں کے سبھی درد، بسیں اُن کے دلوں میں
اِس رات میں ہیں صبح کا امکان، یہی لوگ
جینے کے لیے موت سے لیتے ہیں گواہی
دیکھو تو حقیقت میں ہیں انسان، یہی لوگ

سلیم کوثر

چراغِ وعدہ سرِ انجمن اُٹھا لائے
پرانے لوگ نیا پیرہن اٹھا لائے

گئے تھے شہرِ تعلق میں ترے ہجر نژاد
کسی کی یاد، کسی کی تھکن اُٹھا لائے

کہاں یہ اہلِ ہوس اور کہاں مدارجِ عشق
جو روح تک نہیں پہنچے بدن اٹھا لائے

ترے حجاب کی تہ داریوں کے رکھوالے
گلی گلی تجھے بے پیرہن اٹھا لائے۔

برائے شعبۂ منشورِ زندگی یہاں لوگ
کسی کی لاش کسی کا کفن اٹھا لائے

ستارے ڈوب رہے تھے کہ چشمِ یار سے ہم
نویدِ صبح کی تازہ کرن اُٹھا لائے

سلیم کوثر

یوں تو کسی سے کچھ بھی چھپایا نہیں گیا
لیکن کسی کو کچھ بھی بتایا نہیں گیا

ہم ہی نے سنگِ عشق اٹھایا تھا ایک بار
یہ بوجھ پھر کسی سے اُٹھایا نہیں گیا

کیا مہرباں شجر تھے کہ جو کٹ گئے مگر
اُن کا سروں سے آج بھی سایا نہیں گیا

اک بات تھی جو تم سے چُھپائی نہیں گئی
اک زخم تھا جو ہم سے دکھایا نہیں گیا

تارا وہ کون سا ہے کہ دربارِ حُسن میں
جو آسماں سے توڑ کے لایا نہیں گیا

رستہ وہ کون سا ہے کہ تیرے خرام کو
قدموں تلے جو لا کے بچھایا نہیں گیا

تم خود ہی خوابِ غفلتِ دنیا میں گُم رہے
ایسا نہیں کہ تم کو جگایا نہیں گیا

تم لوگ روشنی کے ارادے سے آئے تھے
تم سے تو اک دیا بھی جلایا نہیں گیا

اک عمر ہوگئی ہے مرے حق میں فیصلہ
لکھا تو جا چکا ہے سنایا نہیں گیا

عباس رضوی

نوا گری مرا منصب ہے ہم نوائی نہیں
سو یہ بھی عرضِ حقیقت ہے خود ستائی نہیں

بس اک سوال کی دوری پہ ہے وہ ماہِ تمام
رسائی راہ میں حائل ہے نارسائی نہیں

تمام عمر جو رقصاں مری رگوں میں رہی
وہ روشنی مری آغوش میں سمائی نہیں

صبا کہ نغمہ بہ لب اُس کے گھر سے نکلی تھی
مری گلی سے جو گزری تو گنگنائی نہیں

میں منزلوں کو بہت دور چھوڑ آیا ہوں
شکستگی مرا دکھ ہے شکستہ پائی نہیں

مجھے تو اگلے زمانوں کا حال لکھنا ہے
سو میرا کام فقط داستاں سرائی نہیں

فضائے جبر میں دو چار سانس لینے کو
ذرا سی تازہ ہوا چاہیے خدائی نہیں

عباس رضوی

ہزار طرح کے خوف و خطر میں رہتے ہوئے
ہم ایک دشت میں رہتے ہیں گھر میں رہتے ہوئے

بہت ملول، بہت تجھ سے دور رہتے ہیں
ترے قریب تری رہ گزر میں رہتے ہوئے

سمیٹنا تو کہاں اپنے بس میں تھا خود کو
بکھر گئے ہیں حدودِ ہنر میں رہتے ہوئے

شمیمِ گُل کی طرح دسترس سے باہر تھا
وہ ماہتاب حصارِ نظر میں رہتے ہوئے

کسی پری کے تصور میں عمر بیت گئی
خیال و خواب کے شام و سحر میں رہتے ہوئے

مسافرانِ رہِ عشق کو بتا دینا
کہ ہم کہیں نہیں پہنچے سفر میں رہتے ہوئے

رضی مجتبیٰ

اے خدا اس زندگی کا کیا کریں
روشنی اور تیرگی کا کیا کریں

بے قراری کیوں مگر یہ دل کو ہے
اس مسلسل بے کلی کا کیا کریں؟

کب تلک صیدِ غمِ جاناں رہیں
اضطرابِ عاشقی کا کیا کریں

جگنوؤں کا ہے افق سوزِ دروں
پر نظر کی بے دلی کا کیا کریں

ساقیا ساغر بہ ساغر جو رہے
اس گریزِ بے خودی کا کیا کریں

مانگتی ہے زندگی ہم سے ہمیں
جو نہیں ہے اس رضیؔ کا کیا کریں

گریہ

رضی مجتبیٰ

میں تھا جہاں وہاں پر
تھی جھیل خامشی کی
اک بے نوا سپیدی
تھے دائروں میں جس کے
ٹوٹے ہوئے ستارے
اور ڈوبتی شبوں کی
آنکھوں کے استعارے
یاد آگئے تھے ہم کو
سارے ستم، تمھارے
اور دل کے ٹوٹنے کے
منظر سبھی، ہمارے
جن میں زمانے بھر کی
تھے دل ستانیوں کی
تکرار کے حوالے
سارا جہاں تھا مقتل

ہر ہاتھ جس کا تھا شل
پژمردہ دستکوں سے
بابِ گراں محبت
جس پر پڑے تھے تالے
کب تھے وہ کھلنے والے
ہر کوئی جانتا تھا
پر مانتا نہیں تھا
تھے خیر و شر کے حربے
سارے ہی رائگاں پر
وہ ہاتھ جو کہ شل تھے
دروازہ پیٹتے تھے
جس پر پڑے تھے تالے
اور دُور بادلوں میں
اک شخص رو رہا تھا

○○○

جلیل عالی

شب جو پلکوں پہ گھنی کاہکشاں ہوتی ہے
دید و نادید کا اک اور جہاں ہوتی ہے

دشتِ وحشت کی مسافت میں یہ چِنتا کس کو
دن نکلتا ہے کدھر، رات کہاں ہوتی ہے

ایک قصہ سرِ قرطاس رقم کرتے ہیں
اک کہانی پسِ الفاظ بیاں ہوتی ہے

یوں بھی ہوتا ہے کہ جو بات حقیقت جانو
وہ گماں، صرف گماں، صرف گماں ہوتی ہے

دیتے رہتے ہیں دلیلیں تو 'نہیں' کے حق میں
اور دل بیچ برابر کہیں 'ہاں' ہوتی ہے

زور کرتا ہے بہت شور و شرِ دہر ولے
دل کے حُجرے میں بدستور اذاں ہوتی ہے

ایک ہی خواب اثاثہ ہے قبیلے بھر کا
دیو مرتا ہے، پری رقص کناں ہوتی ہے

جلیل عالی

رنگ لائیں گی نہ جانے یہ وفائیں کیا کیا
اور اُتریں گی دل و جاں پہ بلائیں کیا کیا

رات بھر میرا مکاں آگ کے شعلوں میں رہا
خلقتِ شہر کو دیں میں نے صدائیں کیا کیا

اُس کے ہاتھوں میں بھی پتھر تھے زمانے کی طرح
اِس پہ بھی دل نے اُسے دی ہیں دعائیں کیا کیا

دل جو نکلے ہے ذرا شوق سرا کی جانب
گھیر لیتی ہیں وہیں سوچ ندائیں کیا کیا

وہ جو کل خود سے بھی کہنے میں حجاب آتا تھا
اب اُسی بات کے چرچے کیے جائیں کیا کیا

لفظ کتنے بھی ہوں محتاط مگر بات یہ ہے
دل نہ ہوں صاف تو نکتے نکل آئیں کیا کیا

صبیحہ صبا

ختم ہے قصۂ جنوں، کُوچ پہ ہے بہار بھی
لیجیے ہم نے سی لیا، دامنِ تار تار بھی

سانس بھی تھم کے رہ گئے، اشک بھی جم کے رہ گئے
ساز کنارِ جوئے آب، دھر گئی جوئے بار بھی

آہ و فغاں کے واسطے، لب کوئی کھولتا نہیں
صورتِ عکس ہے خموش، درد سرا ہزار بھی

کارِ رفو ہے ناتمام، چاک نہ دل کا سِل سکا
ہاتھ سے گر کے کھو گئی، سوزنِ بخیہ کار بھی

صحنِ چمن میں آج سے اور ہے ضبط کا چلن
اور کہیں چلی گئی، بلبلِ دل فگار بھی

دل کی خوشی کا ذکر کیا، عارضی ایک چیز تھی
چھین کے لے گیا کوئی، رنج کا اختیار بھی

سن تو صبائے اشک بار، کون ہے تیرا غم گسار
تجھ سے نظر بچا کے دیکھ، لوٹ گئی بہار بھی

اوباما کی تخت نشینی☆

صبیحہ صبا

جو تھا عفریت کل رقصاں، وہی اب آنجہانی ہے
سو پورا ہوگیا وعدہ وہی جو آسمانی ہے
زمیں کو بھوک اُگانے کا عمل اب روکنا ہوگا
لباس اُمید کا دیکھو تو کیا خوش رنگ دھانی ہے
یہ کن ہاتھوں نے آخر نفرتوں کے بیج بوئے ہیں
یہ بارودی سُرنگوں کی بالآخر کیا کہانی ہے
وہی جس کے لہو سے اس کا گارا نم ہُوا ہوگا
فرازِ قصرِ مَرمَر سے اُسی کی حکمرانی ہے
اسی کو راس آجاتا ہے یہ کارِ جہاں بانی
جو یہ سمجھے کہ عدل و منصفی میں کامرانی ہے
"یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم"
نئے منشور میں اقبالؔ کی جادو بیانی ہے
جبیں پر ہے ندامت کا عرق، اس برف موسم میں
یہ اعمالِ سیہ پر کون ہے جو پانی پانی ہے

○○○

☆ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے چوالیس ویں صدر کی رسم وفاداری کا منظر

باصر سلطان کاظمی

ہم کامیاب ہو کے بھی ناکام رہ گئے
اظہار تو ہوا مگر ابہام رہ گئے

آزاد ہو کے جوں ہی کُھلے میرے بال و پر
مجھ پر کُھلا کہ پاؤں تہِ دام رہ گئے

میں دے سکا نہ ان کو کسی تجربے کی آنچ
افسوس کچھ خیال مرے خام رہ گئے

کرتی رہی زباں مری بے دست و پا مجھے
باتوں میں عمر بیت گئی کام رہ گئے

میں راہ دیکھتا رہا یاروں کی صبح تک
باصؔر بھرے بھرائے مرے جام رہ گئے

اگلے سال — چاند ڈوبنے سے پہلے

یونس جاوید

اگلے سال
عید رات کو
چاند ڈوبنے سے پہلے

دل نہ ڈوبے
آنکھ بھرے نا!
آس نہ ٹوٹے!!
رَس برساتا موسم آئے
چاہت کی برکھا برسائے

ملنے کو تب آجانا تم
اک مِک ہو کر مل جانا
کِھلنا چاہو مہکے باغ میں کِھل جانا — اور
لہو میں رَل مل جانا
پھر کبھی نہ جانا — کبھی جدا نہ ہونا

خوابوں کی اس دنیا کو تم سدا سجاتے رہنا
دکھ دھرتی سے ملن کے موتی
جھولیوں میں بھر لینا
چھلنی چھانتے رہنا

اب کے سال
آج کی عید کو
چاند ڈوبنے سے پہلے
اک تیرے نہ آنے سے ہی منظر بدل گیا ہے
آنکھ نے جل برسایا ہے
رات ڈھلی تو یوں لگتا ہے
آس کی ڈوری ٹوٹ گئی ہے
موسم نے جو رنگ دھنک کے اوڑھے تھے
سب کالے ہو کر ڈوب چکے ہیں

میں نے تجھ کو صدیوں صدیوں چاہا تھا،
پگ پگ راہ میں/ تیرے دیے جلائے تھے
سب خواب ہوئے

مِلنا، کِھلنا، اک یک ہونا، چاہت کا رَس
سب کو لے کر اگلے برس کی اُمیدوں کے
دیے جلا کر
ابھی سے راہ میں بیٹھ گیا ہوں
آس کی ڈوری، سانس میں بھر کر، تیری چاہ میں زندہ ہوں
اگلے برس کی عید رات کا
چاند ہے بجھتی آنکھوں میں
نام ہے تیرا اپنے لہو میں
یا برسی برساتوں میں!

○○○

دعا—

یونس جاوید

میں سوچتا ہوں تمھیں دعا دوں

یا

بد دعا دوں

کہ تم جو دنیا کو اپنی الفت کے دائرے میں

پرو رہی ہو

بہت سے لوگوں میں جی رہی ہو، کشید کرتی ہو سانس اپنے

مگر جو تجھ میں ہی سانس لیتا تھا، جی رہا تھا

کہاں گیا وہ

خبر ملے تو مجھے بتانا—

○○○

قدیم عورت اور تخلیق

یاسمین حمید

اپنے لفظوں کو کیسے مرتب کریں
ہم سخن کے خداؤں کی تعظیم کرنے میں مصروف ہیں
لفظ ہم سے مخاطب ہیں
اور پوچھتے بھی ہیں
کیوں ہم نے ایسا کیا
اُن کو حیرت ہے
کیوں، ہم نے سکتے کے عالم میں رہنا گوارا کیا

شور اندر ہی اندر کہیں
نارسا گھاٹیوں میں اترتا گیا
ہم نے خاکے بنائے بہت
پتھروں پہ، چٹانوں پہ، غاروں کے اندر
جہاں روز وشب کی رسائی نہیں تھی

جہاں پر ندامت کا عفریت یوں گشت کرتا
کہ جیسے ہمارا محافظ وہی ہو

نہ آئینہ سازی میں تھی حصہ داری
نہ خواب اور خواہش کی صورت گری میں
ہم اپنا ہی چہرہ بنا کر اسے مسخ کرتے بہت تھے
ہم اپنے ارادے سے اپنی توقع سے ڈرتے بہت تھے

○○○

زندگی

یاسمین حمید

دھوپ اور آگ سے بڑی تھی عمر
رات اور ریت سے بڑا آزار
تیز تر ہوگئی تھی وقت کی دھار

سب عناصر نے مل کے کوشش کی
یک زباں ہوگئے سبھی آثار
جڑ سے ہلتے ہوئے درختوں پر
سایہ کرنے لگے در و دیوار

ایک شہرِ قدیم کا چہرہ
رنگ و روغن نے جب سجا بھی دیا
نعمتوں کے نزول کا لمحہ
جب دریچوں کے پاس آ بھی گیا

ہم نے دیکھا کہ دُور— آنکھ سے دُور
ایک تحریر ہو رہی ہے رقم
اور یہاں جسم و جاں کی سرحد میں
خانۂ دل کا ایک فرد ہے کم

ooo

گیتن گجل

احمد عمر شریف

تجھ بن، کیسے، سوچوں دیوالی
دل دیپک ہے جوت سے خالی
سونا، چاندنی، پاس نہیں ہے
بھیٹ چڑھاؤں گیہوں کی بالی
اب کے آندھی، ایسی چلی تھی
کھا گئی، سپنوں کی، ہریالی
پاس بلانا کام ہے اُن کا
میرے اُن کے بیچ میں جالی
نَس نَس ناچے رانجھن میرا
جاپ جپت نے کی گھوٹالی
دھاروں دھار ہے انسون مینہا
رُت ہے یہ بھی دیکھی بھالی
تُو ہی تُو میں، کب تک بولوں
دونوں ہاتھ سے باجے، تالی
جگ ریوڑ تھا، اُجلا اُجلا
اب ہیں ساری بھیڑیں کالی

رنگ برنگے، میلے ٹھیلے
اِن کی ہونی کس نے اٹھا لی
اک سنگت ہے گیتا جیسی
اک سنگت ہے جیسے گالی
جگ سے چُھپ کر جس کو چاہا
جگ میں اُسی نے بات اُچھالی
دیا میں گیانی، یہ نا دیکھے
کس کا پیالا، کس کی پیالی
سپنوں نے تو مجھے سنبھالا
جیون ڈولی کس نے سنبھالی
اپنی گزرنی تجھ سے کہنے
سانسوں سے اک سانس چرا لی
ہری بھری کب ہوں گی انکھیں
دور ہو من کی خشکن سالی
مانگا جو کچھ اُس سے مانگا
اس نے بھی کوئی بات، نا، ٹالی
شبد لکھت میں ساری عمریا
بھر، نا، پائی، گیت کی تھالی
پھل اور پھول تو سارے اُس کے
داس عمؔر جی، تم ہو ڈالی

○○○

گیتن گجل

احمد عمر شریف

اپنے لوہُو کی، یاں، کھپت کیا ہے
اور، نہیں ہے، تو یہ چمت کیا ہے

ہر سمے، کیوں، نرا کھرا، رہوے
کھوٹے سکّوں میں یہ چلت کیا ہے

اپنا ہونا بھی ہے، نہیں ہونا
ایسے ہونے میں اب سکَت کیا ہے

میری صورت میں چُھپ گیا ہے وہ
میری صورت میں اب دِکھت کیا ہے

پل کی لَے میں پلٹ دے جیون کو
بچی پوتھی کا سُر پڑھت کیا ہے

مورے شبدوں کو کردے من بھاون
کون جانے کے وہ سُنت کیا ہے

جیت کر بھی یہ میری جیت، نہیں
تیری چالوں میں گُپ چلت کیا ہے

کھنکھناتی ہے گیلی ماٹی بھی
دیکھ، مورت کی یہ ڈھلت کیا ہے

پل سے دو پل کے اس تماشے میں
کب کھلے گا جیت مرت کیا ہے

سارا جیون جو کٹ گیا جگ کر
تب یہ جانا کہ جگ جگت کیا ہے

خالی ہونے سے پہلے بھر جاوے
گیانی پیالے میں گُن بھرت کیا ہے

جگ کی ہلچل میں جی لگانے کو
عمر لگتی ہے اور لگت کیا ہے

لوبھ سے ہووے ہے کوئی گھایل
سُول میں پھول کی اڑت کیا ہے

اونچی پینگیں بڑھا، کے سوچ ذرا
من کے جھولے میں یہ جُھلت کیا ہے

سونے والے سکون سے سوجا
نیند میں بھی چلت پھرت کیا ہے

ایک ساگر ہے آگ کا اُس پار
بہنے والے سمجھ، بہت کیا ہے

کوئی چھلکے ہے گیان دھیان کے بیچ
داس عمر، تیری یہ کبت کیا ہے

○○○

شہناز نور

بے سبب، بے طلب جیا جائے
زہرِ جاں کب تلک پیا جائے

اپنے جیسے ہیں سب، چلو خود ہی
چاک دامانِ دل سیا جائے

ہم نے اس کو بُھلا دیا آخر
یہ بھی الزام سر لیا جائے

اس کے ہر ظلم کی اُڑا کے ہنسی
کچھ تو اس کو بھی دکھ دیا جائے

ہوگئی شام، رات آنے کو ہے
نیند کو راستہ دیا جائے

رات بھر اس کی یاد میں جاگے
اب ذرا دیر سو لیا جائے

دل پہ اک رُت ٹھہر گئی ہے نورؔ
آج غم کو بھنور کیا جائے

شہناز نور

کس لیے دِیا جائے رنجشوں کو پانی پھر
جب ہمیں نے لکھی ہے پیار کی کہانی پھر

بے نشان کرنے سے پہلے سوچ لینا تم
میری بے نشانی ہی بن گئی نشانی ـ پھر؟

رکھ دیا گیا مجھ میں پہلے دل سمندر سا
آپ ہی اُتر آئی غم کی بے کرانی پھر

تھوڑی دور تک میرے ساتھ اُس کی خوشبو تھی
کر گئی مجھے تنہا میری کم روانی پھر

جاتے جاتے دیکھا ہے مڑ کے فصلِ گُل نے نورؔ
شہرِ جاں پہ گزرے گی کوئی ناگہانی پھر

موسم کی پہلی بارش

فاطمہ حسن

ایک جھونکے نے پُروا کے چھیڑا انھیں
پیڑ رقصاں رہے رات بھر
بھیگی مٹی کی خوشبو ابھرتی رہی
کارواں بادلوں کا ٹھہر سا گیا
گرتی بوندوں نے جادو کچھ ایسا کیا
ہر تصور حقیقت میں ڈھلنے لگا
میں بھی رقصاں رہی رات بھر
ان ہی پیڑوں کے سنگ
تُو کہیں پاس تھا

○○○

فاطمہ حسن

روح کی مانگ ہے وہ جسم کا سامان نہیں
اُس کا ملنا مجھے مشکل نہ ہو، آسان نہیں

کوئی دم اور ہے بس خاک ہوئے جانے میں
خاک بھی ایسی کہ جس کی کوئی پہچان نہیں

ٹھیس کچھ ایسی لگی ہے کہ بکھرنا ہے اسے
دل میں دھڑکن کی جگہ درد ہے اور جان نہیں

بوجھ ہے عشق تو پھر کیسے سنبھالیں اس کو
دور تک ساتھ چلیں اس کا تو امکان نہیں

مختلف سمت بہائے لیے جاتا ہے ہمیں
وقت کے ساتھ ہمارا کوئی پیمان نہیں

فاطمہ درد کے رشتے سے کنارا کرنا
بے حسی کہہ لو اسے، یہ کوئی نروان نہیں

ضرورت کیا ہے؟

شاہین مفتی

اس قدر ہم سے گریزاں کیوں ہو!
کچھ نہیں ہم ہیں فقط عکسِ خیال
ایک تصویر کا دھندلا سا نشاں
حرف و معنی کے پُراسرار تسلسل میں کہیں
اَن کہی بات کا احساسِ زیاں
اجنبی شہر میں چلتے چلتے— راستہ ہاتھ پکڑ لے تو رُکو
جس طرح تیز ہوا آ کے دریچے پہ کبھی
دستکیں دیتی ہے، چپ چاپ پلٹ جاتی ہے
اور گزرگاہِ سماعت میں فقط گونجتے ہیں
اس کے قدموں کے نشاں
جو یقیں ہیں نہ گماں
کسی اک لمحۂ گزراں کی حقیقت کیا ہے؟
کارِ الفت بھی اگر کارِ اذیت ہے تو پھر
آخر اس کارِ اذیت کی ضرورت کیا ہے؟

○○○

کابوس

شاہین مفتی

رات کے پہلو میں
بیٹھا ہے سنہری اژدھا
احمریں پھنکار کے
مدھم سُروں کا شور ہے
اس گھڑی لگتا ہے وہ کچھ اور ہے
بند ہوتے اور کُھلتے دائروں کے درمیاں
آپ اپنی ذات کے گرداب میں
جیسے کوئی دیوتا محراب میں
وقت کے اس نقشۂ مبہم پہ کون
اِس کے مسکن کا لگائے گا سراغ
کون رکھے گا ہتھیلی پر چراغ
اس کے نیشِ آرزو کے ذائقے چکھے گا کون
کس کو دل داری کی فرصت ہے یہاں
ہاں مگر یہ رات ہے اس کی رفیق
دیر تک اپنا بدن ڈسوائے گی
صبح ہونے تک اسی کے رنگ میں رنگ جائے گی

○○○

شاہین مفتی

اگر یہ روشنی قلب و نظر سے آئی ہے
تو پھر شبیہِ ستم گر کدھر سے آئی ہے

مہک رہا ہے بدن، مانگ میں ستارے ہیں
شبِ فراق بتا، کس کے گھر سے آئی ہے

گلوں میں رنگ تو خونِ جگر سے آیا ہے
مگر یہ تازگی اس چشمِ تر سے آئی ہے

روش روش پہ کچھ ایسے ٹہل رہی ہے صبا
کہ جیسے ہو کے تری رہ گزر سے آئی ہے

اسے تو گوشۂ مخصوص میں سنبھال کے رکھ
کرن ہے کوچۂ شمس و قمر سے آئی ہے

شاہین مفتی

مثالِ سنگِ تپیدہ جڑے ہوئے ہیں کہیں
ہمارے خواب یہیں پر پڑے ہوئے ہیں کہیں

الجھ رہی ہے نئی ڈور نرم ہاتھوں سے
پتنگ شاخِ شجر پر اڑے ہوئے ہیں کہیں

جنھیں اُگایا گیا برگدوں کی چھاؤں میں
بھلا وہ پیڑ چمن میں بڑے ہوئے ہیں کہیں

گزر گیا وہ قیامت کی چال چلتے ہوئے
جو منتظر تھے وہیں پر کھڑے ہوئے ہیں کہیں

بُلا رہا ہے کوئی شہرِ آرزو سے ہمیں
مگر یہ پاؤں زمیں میں گڑے ہوئے ہیں کہیں

رُباعیات

فراست رضوی

یادوں کو سرِ شام لیے بیٹھا ہوں
لوحِ غمِ ایام لیے بیٹھا ہوں
کل کیسا چھلکتا تھا یہ پیمانۂ عمر
اب دُردِ تہِ جام لیے بیٹھا ہوں

برسات میں باغ جل رہا ہو جیسے
صہبا سے ایاغ جل رہا ہو جیسے
اشکوں سے بھری آنکھوں میں تیرا چہرہ
پانی میں چراغ جل رہا ہو جیسے

جب جشنِ طرب رنگ پہ آجاتا ہے
جب نغمہ و صہبا کا فسوں چھاتا ہے
اُس وقت خدا جانے کہاں سے دل میں
اک درد دبے پاؤں چلا آتا ہے

غارت گری و جنگ کی عادت نہ گئی
افراد کی افراد سے نفرت نہ گئی
کیا کیا نہ کیے علم و ہنر میں اعجاز
لیکن دلِ انساں کی شقاوت نہ گئی

احساس کے زخموں کی تمازت مت پوچھ
سینے میں چُھپا دردِ ندامت مت پوچھ
سب شیشے کے ٹکڑوں کی طرح ہیں دل میں
ٹوٹے ہوئے وعدوں کی اذیت مت پوچھ

اے وقتِ رواں، کچھ ہمیں معلوم نہیں
رستوں کے نشاں، کچھ ہمیں معلوم نہیں
ہم لوگ ہیں اک جبرِ مسافت کے اسیر
منزل ہے کہاں، کچھ ہمیں معلوم نہیں

احساس کا رُخ سپاٹ ہوجاتا ہے
ہر لمحہ فنا کا گھاٹ ہو جاتا ہے
وہ وقت بڑا عذاب ہوتا ہے کہ جب
ہر چیز سے دل اُچاٹ ہوجاتا ہے

تقدیر کا ہے پھیر، چلے جائیں گے
مت غم سے ہمیں گھیر، چلے جائیں گے
اے خیمۂ دُنیا، ہیں مسافر ہم لوگ
ٹھیریں گے ذرا دیر، چلے جائیں گے

مبین مرزا

غبارِ راہِ طلسمِ زمانہ ہوگئے ہیں
ہم ایسے لوگ بھی آخر فسانہ ہوگئے ہیں
رہے ہیں رونقِ صد آستاں وہ لوگ کہ آج
یہ چند تنکے جنھیں آشیانہ ہوگئے ہیں
جو مثلِ ابرِ بہاراں ہیں دوسروں کے لیے
وہ لوگ اپنے لیے تازیانہ ہوگئے ہیں
جہاں پہ آئے تھے اک روز طمطراق کے ساتھ
بہ حسرت آج وہاں سے روانہ ہوگئے ہیں
تو کیا ہوئی وہ تمنّا کی دولتِ بیدار
کہ سارے شوق ہی رسمِ شبانہ ہوگئے ہیں
وہ لوگ جن کا طلب گار اک زمانہ تھا
کسی کی سادہ دلی کا نشانہ ہوگئے ہیں
کسی کی چشمِ تغیّر کو جن سے نسبت ہے
میں خوش ہوا کہ وہ غم جاودانہ ہوگئے ہیں
اب اس قدر نہیں خالی ہمارا دامن بھی
گناہ ہم سے بھی کچھ فاخرانہ ہوگئے ہیں
وہ اور شے ہے کہ جس نے کُھلا دیا مجھ کو
کہ یہ عوارضِ جاں تو بہانہ ہوگئے ہیں

مبین مرزا

زمیں بچھا کے الگ آسماں بناؤں کوئی
زماں مکاں سے پرے اب جہاں بناؤں کوئی

تمام عمر چلے میرے ساتھ میری تنہائی
غرض ہی کیا ہے مجھے کارواں بناؤں کوئی

کسی خوشی کو نہیں ہے اگر ثبات یہاں
میں سوچتا ہوں کہ غم جاوداں بناؤں کوئی

یہ دشتِ دل کہ جہاں ریت اُڑتی ہے شب و روز
ترے لیے یہیں موجِ رواں بناؤں کوئی

جو ایسی وحشتِ جاں ہے سرِ یقین و ثبات
سو کیوں نہ وہم تراشوں — گماں بناؤں کوئی

ٹھہرنا کب ہے مجھے ریگ زارِ دنیا میں
سو کیا پڑی ہے یہاں آستاں بناؤں کوئی

یہی سوچ کر

مبین مرزا

یہی سوچ کر میں ہوں مطمئن
مری زندگی تو گزر گئی
کبھی قربتوں کے خمار میں
کبھی وحشتوں کے حصار میں
کبھی رنگ اڑاتی خزاؤں میں
کبھی گل کھلاتی بہار میں
کسی جیت میں کسی ہار میں
مری زندگی تو گزر گئی

کبھی خواہشوں کے جمال میں
کبھی وسوسوں کے سوال میں
کبھی چاہتوں کے عروج پر
کبھی راحتوں کے زوال میں
کبھی ساعتوں کے ملال میں
مری زندگی تو گزر گئی

کسی نام پر کسی باب میں
کسی دل شکستہ کتاب میں

کبھی دور بھاگتی نیند میں
کبھی جاگتے ہوئے خواب میں
مری زندگی تو گزر گئی

مگر ایسے لوگ بھی ہیں یہاں
جنھیں زندگی ہوئی جاوداں
مگر ایک چشمِ گریز میں
کہ جو وہم ہے نہ یقین ہے
کہ جو دُور ہے نہ قرین ہے
وہ بس ایک ساعتِ منجمد
جو سوال ہے نہ جواب ہے
کہ جو نیند ہے نہ ہی خواب ہے
یہ عجیب رنج رسیدہ ہیں
جنھیں اشک بھی نہ ہوئے بہم
جو ہوئے نہ واقفِ بیش و کم
جنھیں راس آیا نہ یہ جہاں
جنھیں مل سکی نہ کہیں اماں

یہی سوچ کر میں ہوں مطمئن
مری زندگی تو گزر گئی
کسی سوچ میں کسی یاد میں
کبھی ابر میں کبھی باد میں

○○○

ملکہ نسیم

آنکھوں میں تھے سراب کے منظر سجے ہوئے
اور دُور تک نہ تھے کہیں پانی کے سلسلے

ٹوٹے ہوئے شجر سے لپٹ کر تو رو چکے
جائیں گے اب کہاں یہ پرندوں کے قافلے

کچھ بڑھ گیا ہے اور بھی احساسِ تشنگی
موجوں نے آ کے جب بھی مرے پاؤں چھو لیے

اُن آہٹوں سے اب بھی تعارف نہ ہو سکا
کانوں میں جل اُٹھے ہیں جس احساس سے دیے

منزل کی بے رُخی کا گلہ بھی ہمیں سے تھا
راہوں میں اس کی میل کا پتھر بھی ہم ہی تھے

گردش میں ہیں لہو کی وہی تیرتے سوال
جن کے جواب وقت کے دھارے میں بہہ گئے

ملکہ نسیم

خزاں کی رُت میں مہکتا گلاب کیا دے گا
اُڑا چکا ہے جو نیندیں وہ خواب کیا دے گا

وہ خامشی ہے کہ سر دُھن رہے ہیں سنّاٹے
کسے پکاریے کوئی جواب کیا دے گا

صداقتوں کا ہو آئینہ جس کا اک اک حرف
قلم جو بیچ دے ایسی کتاب کیا دے گا

میں ہر سوال کا اُس سے جواب کیا مانگوں
وہ ہر سوال کا میرے جواب کیا دے گا

نسیمؔ تشنہ لبی جب تری وراثت ہے
کوئی سراب تجھے جوئے آب کیا دے گا

ملکہ نسیم

موسم گل مرے آنگن میں ٹھہر جانے دے
کوئی لمحہ تو رفاقت میں گزر جانے دے

مجھ کو دے وادیٔ احساس کی بیدار فضا
نقش ماضی کے بکھرتے ہیں، بکھر جانے دے

قربتوں کو دے نئے جسم، نئے پیراہن
خواب اپنے مری آنکھوں میں ٹھہر جانے دے

تجھ کو آباد کروں گردشِ ایام مگر
میرے ہاتھوں کی لکیروں کو سنور جانے دے

یہ تو ہمت تھی مری ورنہ یہی کہتے سب
تشنگی اور سرابوں کا سفر جانے دے

کھول مٹھی ترے جگنو تجھے واپس دے دوں
میرے آنسو مرے آنچل پہ بکھر جانے دے

دل میں ہیں کرچیاں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی نسیم
اب یہ نادیدہ چبھن حد سے گزر جانے دے

ایک نظم کے لیے نظم

ن م دانش

راہ چلتے ہوئے
ہمیشہ مر جاتی ہے کوئی نظم
اپنی موت آپ

وہ میرے ذہن میں
اپنے بازو پھیلا کر
لے لیتی ہے گرفت میں ہر شے کو
بہت تیزی کے ساتھ
میں بھول جاتا ہوں چلتے ہوئے
کہ میں چل رہا ہوں
یا کہیں بیٹھا ہوا ہوں
یا کسی سے بات کر رہا ہوں
بس وہ ہوتی ہے
کاغذ کے بغیر
قلم اور سیاہی کے بغیر
حتیٰ کہ کمپیوٹر کی چھوٹی سی اسکرین کے بغیر

وہ چل رہی ہوتی ہے میرے ذہن میں
کر رہی ہوتی ہے وہ اظہار
غصے اور نفرت کا

کس کے خلاف؟
بیشتر اوقات
یہ خود اس کو بھی پتا نہیں ہوتا
اسے پتا ہوتا ہے صرف اپنے غصے کا
یا نفرت کا
جس کا شکار وہ خود ہی ہوتی ہے
اس کا چلایا ہوا تیر
پلٹ آتا ہے خود اس کی طرف
اور وہ پاتی ہے خود کو زخمی حالت میں
فٹ پاتھ پر
تنہا اور کم زور
کسی دوست اور ہمدرد کے بغیر

مگر غصہ رہتا ہے برقرار اپنی جگہ

ویلفیئر کی لمبی سی لائن میں

نظم غصے سے بِھنائی ہوئی
پھرتی ہے اِدھر سے اُدھر
مگر اسے پتا نہیں چلتا
کہ بے گھر، بے روزگار، بیمار
اور کم زوروں کی اس لائن میں
اسے غصہ کس پر ہے!

وہ غصے میں گئی ایک عورت کے پاس
بچہ تھا اس کی گود میں
اور سوکھی ہوئی تھیں، اس کی چھاتیاں
اسے ماں یاد آ گئی
اور وہ گھبرا کے ہٹ گئی وہاں سے

وہ گئی ایک آدمی کے پاس
کراہ رہا تھا وہ بیماری
اور بے گھری کے دکھ سے
رحم سے اس کا دل پانی ہو گیا
اور غصے میں
وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی

اس کا سارا غصہ اور اختیار بس
چلتا ہے مجھ پر

وہ اپنی کم زوری
اور بے بضاعتی کا بدلہ لیتی ہے مجھ سے
کبھی اسے نہیں ملتے ہیں لفظ
کبھی اسے ہیئت نہیں ملتی
کبھی تنگ پڑ جاتا ہے کوئی خیال
کبھی کہیں کوئی فکر اٹکی رہ جاتی ہے

ایک بار بتایا کسی نے اس کو
کہ یہ سارا کِیا دھرا ہے نظام کا
جب سے وہ تلاش میں ہے نظام کی

بس کی لائن میں
بے روزگاری کے دفاتر میں
اسپتال میں
ذہنی بیماری کے مراکز میں
تھانوں اور نرسنگ ہوم
سب وے☆ میں

☆ زیرِ زمین ریلوے، غالباً انگلستان میں ٹیوب کہلاتا ہے، امریکا میں اسے سب وے (Subway) کہتے ہیں۔

ہوم لیس کے سامان میں
وہ تلاش کرتی ہے نظام کو
اور مایوس ہو کر
اپنا غصہ اور دکھ اتارتی ہے مجھ پر

میں!
جو اسے لکھنا چاہتا ہوں
اسے لفظ اور ہیئت دینا چاہتا ہوں
مگر مجھے ڈر لگتا ہے اس کے غصّے سے
جو نہیں سما سکتا ہے
کسی لفظ کسی ہیئت میں

میں سوچتا ہوں قید کرلوں
اس کو کسی ذرّے میں
کسی دن
جب وہ پھٹ جائے غصّے سے
تو تباہ کردے ان ساری چیزوں کو
جن پر اسے غصہ ہے
یا جن سے وہ نفرت کرتی ہے

○○○

ایک عام آدمی کی کتھا

ن م دانش

ایک عام آدمی کی کتھا میں
کوئی رزمیہ نہیں ہوتا
وہ بس مر جاتا ہے اچانک
اپنے بستر پر
اس کی موت
جو ایک قتل ہے
واقع ہوتی ہے ایک ترتیب میں

گھونٹا جاتا ہے پہلے گلا
اس کی ایک سانس کا
پھر دوسری سانس
پھر تیسری
اور چوتھی سانس کا
یہ سلسلہ چلتے ہوئے
پہنچ جاتا ہے اس کی موت تک

پہلے اُسے اس کا ادراک ہو
اُس سانس کے ساتھ
جس میں مہک تھی کاربو مونو آکسائیڈ کی
آخ تھو!
اسے اُلٹی ہوئی
اور حوالے کر دیا گیا اسے ماہرینِ نفسیات کے

جنھوں نے اسے بتایا
اُلٹی ہونا ایک نفسیاتی بیماری ہے
اگر اُلٹی میں شامل ہے خون
یا زہر
تو یہ بہت ہی گہرا نفسیاتی مسئلہ ہے
نہیں ہے اس کا کوئی تعلق کسی جسمانی عارضے سے

میں دیکھتا ہوں وہاں لوگوں کو
دن بھر اونگھتے ہوئے
انھیں سلا دیا گیا تھا جاگتے میں
وہ خواب میں ہنستے
اور نیند میں باتیں کرتے
نہیں تھی انھیں اجازت جاگنے کی

کہ وہ کسی بھی وقت اپنی دوا کا
ناغہ نہیں کر سکتے تھے
سفید کوٹ پہنے خدا
جس نے ماہرِ نفسیات کا روپ دھارا ہوا ہے
ہر صبح ان کا مقدر لکھتا
اور شام کو مٹا دیتا ہے
اس کی رائے مطلق اور حتمی ہے
نہیں کیا جا سکتا اس پر شک
اور نہیں اٹھایا جا سکتا ہے کوئی سوال

اس پر شک کرنے
اور سوال اٹھانے والا
قرار دیا جاتا ہے پاگل—
اور کوئی جھٹلا نہیں سکتا خدا کی بات کو
اگر خوف ہے آپ کے چاروں طرف
تو یہ وہم ہے آپ کا
اڑائی ہوئی ہیں وہ ساری خبریں دشمن کی
جن سے بھری ہوئی ہیں اخبارات
اور اعلان کرتی ہیں انسان کی سفاکی کا
اگر خون ہے آپ کے اردگرد
تو یہ ہیلوسی نیشن ہے آپ کا

اگر دکھائی ہے دیتا ہے وہ کچھ
روزمرہ کی معمولات میں آپ کو
جس کے دیکھنے کے لیے
صرف آنکھیں ہی کافی نہیں ہیں
درکار ہے دل اور ذہن بھی
تو دکھائی دیتا ہے آپ کو سراب
بیمار اور ابنارمل ہیں آپ
کہ دیکھتے ہیں آپ وہ سب کچھ
جو دکھائی نہیں دے رہا ہے بھیڑوں کے ریوڑ کو

ہونا چاہیے آپ کو احمق اور بیوقوف
کہ طاقت اور سیاست
ہاتھ میں ہے ان کے
جو دیکھنا چاہتے ہیں آپ کو خود سے کم

احساسِ کمتری اتنی بڑھی ہوئی ہے ان کی
کہ وہ تنہائی میں آسماں دیکھ کر
اس پر تھوکتے ہیں
اور پھر اپنا چہرہ صاف کرتے ہیں

○○○

کاتبِ تقدیر

ڈاکٹر جاوید منظر

آؤ چلتے ہیں ذرا کاتبِ تقدیر کے پاس
اُس سے پوچھیں کہ یہاں عمر گزاریں کیسے
عاقبت اپنی شب و روز سنواریں کیسے
عزتِ نفس کی ملتی ہیں بہاریں کیسے
مفلسوں کی یہاں کم ہوں گی قطاریں کیسے

آؤ چلتے ہیں ذرا کاتبِ تقدیر کے پاس
کاش مل جائے وہ، اور اُس سے کریں آج یہ بات
اُس سے پوچھیں کہ یہاں کیسے سنورتی ہے حیات
کیوں پہنچتی نہیں حق دار کے ہاتھوں میں ذات
حاکمِ وقت کی اس دور میں کیا کیا ہیں صفات

آؤ چلتے ہیں ذرا کاتبِ تقدیر کے پاس
اُس سے پوچھیں کہ کہاں حضرتِ انسان گئے
اب کہاں خوفِ خدا، دین کی پہچان گئے

یعنی اس اُمّتِ عاصی کے نگہبان گئے
تیری دنیا سے کہاں بُوذر و سلمان گئے

آوَ چلتے ہیں ذرا کاتبِ تقدیر کے پاس
اُس سے پوچھیں کہ یہاں دین کی حرمت کیا ہے
سارے انسان برابر ہیں تو غربت کیا ہے
حاکمِ وقت کی لوگوں کو ضرورت کیا ہے
گر نہیں ہے یہ قیامت تو قیامت کیا ہے

میں یہاں سوچ کے دھارے پہ ہوں ماضی کو لیے
ہاتھ میں نے جہاں ہر ظلم کے مضبوط کیے
کب دیے میں نے شبِ غم تجھے خوشیوں کے دیے
ظلم کے خوف سے خاموش تھا ہونٹوں کو سیے
کیسے جاؤں میں بھلا کاتبِ تقدیر کے پاس

○○○

شکستِ آرزو

نسیم نازش

مری آرزو کے سبھی دیے
ہیں بہت دنوں سے بجھے ہوئے
وہ جو خواب تھے ترے وصل کے
وہ مثالِ سایہ گزر گئے
رہِ شوق میں تھے جو قافلے
وہ کہاں گئے، وہ کدھر گئے
مجھے منزلیں تو ملی نہیں
چلو سر پہ گردِ سفر سہی
ہے عجیب موسم بے نوا
کسی باغ میں، کسی نخل پر
کوئی پھول ہے نہ کوئی کلی
فقط ایک شاخ جلی ہوئی
میں خزاں نصیب چمن ہوں اب
تہی خواب ہے مری زندگی
کوئی پھول مجھ کو نہ مل سکا

نہ کبھی بھی دل کی کلی کھلی
یہ جو دردِ ہجر ہے مستقل
یہ مری وفا کا صلہ نہیں
میں اُداس اُداس تو ہوں مگر
مجھے زندگی سے گلہ نہیں

○○○

گُم نام

نسیم نازش

ہم نے کتنے دیپ جلائے
ہم نے کتنے نقش بنائے
ہم نے کتنے پھول کھلائے
چلتے چلتے آئے یہاں تک
رنج و زیاں تک
لیکن ہم کو کس نے مانا
کس نے ہمارے درد کو جانا
ہم تاریخ کے زندانوں میں
قید رہے گُم نام رہے
جُرم کیا آدم نے لیکن
ہم پھر بھی بدنام رہے
بے وقعت بے نام رہے

○○○

ابھی کچھ کام باقی ہیں

نسیم نازش

ابھی کچھ کام باقی ہیں
ابھی کچھ دور جانا ہے
جو ہم سے بے سبب روٹھا ہوا ہے
ابھی اُس کو منانا ہے
ابھی یہ رشتۂ انفاس زندہ ہے
خدا کا شکر ہے احساس زندہ ہے
ابھی گزرے دنوں کے کتنے پچھتاوے ہیں جو آکر
کسی تاویل سے پہلے
مرے دل میں اُترتے ہیں
رگ و پے میں بکھرتے ہیں
تو پھر عمرِ رواں کی بے جہت ٹوٹی ہوئی کشتی سے کیا ڈرنا
کہ جب انجام ہے مرنا
کئی بھولے ہوئے جذبے جو اکثر جاگ جاتے ہیں
مسلسل مجھ سے کہتے ہیں
ہمارے ساتھ آجاؤ

میں کہتی ہوں
گزرتے وقت کے سایوں سے کیا ملنا
ادھوری اپنی نظموں کو
مکمل مجھ کو کرنا ہے
ابھی کچھ کام باقی ہیں

○○○

خالد معین

وہ شخص جو رکھتا ہے جمال اور طرح کا
ہے اُس سے بچھڑنے کا ملال اور طرح کا

آثار خرابی کے ہیں آغاز سے ظاہر
لگتا ہے کہ گزرے گا یہ سال اور طرح کا

اس عہدِ زیاں کار کے ادراک سے باہر
میں اب کے دکھاؤں گا کمال اور طرح کا

ہوتا ہے ہمیشہ ہی نئے رنج میں لپٹا
اس جادۂ وحشت پہ دھمال اور طرح کا

وہ دشمنِ جاں بھی ہے کسی اور ہی دُھن میں
باندھا ہے یہاں دل نے خیال اور طرح کا

اس شہرِ فسوں گر کے عذاب اور ثواب اور
ہجر اور طرح کا ہے وصال اور طرح کا

اب گھر سے نکلنا ہی پڑے گا کہ مخالف
اس بار اٹھاتا ہے سوال اور طرح کا

خالد معین

میرا عروج اور ہے، میرا زوال اور ہے
عشوہ گرانِ شہر کے شیشے میں بال اور ہے

رقصِ سپردگی کہاں، چشمِ فسردگی کہاں
دشتِ غزالِ کم نما شہر کا حال اور ہے

کیسے بیان کیجیے، کیسے یہ زہر پیجیے
اب کے گلہ ہے اور ہی، اب کے ملال اور ہے

موجِ ہوا کو تھام کے پاسِ خمارِ شب میں ہوں
ہاں یہ ترنگ اور ہے، ہاں یہ دھمال اور ہے

چارہ گرانِ زخمِ جاں، مجھ کو یہ ہوش اب کہاں
شاخِ گلاب اور ہے، بانہوں کی ڈال اور ہے

کارِ قیود دیکھ کے، کارِ بجود دیکھ کے
نغمہ گروں سے اب بھی کیا کوئی سوال اور ہے

خواب کے رنگ دیکھتے، لفظ کی جنگ دیکھتے
گرچہ یہ تیغ اور ہے، گرچہ یہ ڈھال اور ہے

خالد معین

(نذرِ ثمینہ راجا)

گئے دنوں کی فضاؤں سے بات کی ہم نے
تمام رات ہواؤں سے بات کی ہم نے
پگھلنے والے تھے اک ہجر کی تمازت سے
سو خوش خرام گھٹاؤں سے بات کی ہم نے
اَنا کے زعم میں ڈوبے ہوؤں کو للکارا
نقاب اوڑھے خداؤں سے بات کی ہم نے
سکوت، خوف، ہلاکت، حصارِ شب لیکن
دیے بجھاتی ہواؤں سے بات کی ہم نے
لہو کی تال پہ رقصاں اداس لمحوں میں
کبھی کبھی تو خلاؤں سے بات کی ہم نے
یہ لوگ خون کے بدلے میں خون مانگیں گے
کہ گریہ ناک صداؤں سے بات کی ہم نے
سکوتِ شہر مگر ٹوٹتا نہیں خالدؔ
اگرچہ شعلہ نواؤں سے بات کی ہم نے

حمیدہ شاہین

بے بسی کی مہک اس طرح زیرِ انفاس آنے لگی
لوگ سمجھے ہمیں حبس کی کیفیت راس آنے لگی

اور پھر یوں ہوا میرے لب بھی مِرا دکھ سمجھنے لگے
جب لبا لب چھلکتے کٹوروں میں بھی پیاس آنے لگی

اپنے بچّوں کو بھی لوگ سینے لگانے سے ڈرنے لگے
جب مساموں سے بے روح رشتوں کی بُو باس آنے لگی

پھر سمجھنا کہ بس اب بہاروں کے سب راستے کُھل گئے
جب چٹانوں کی درزوں میں بھی سبز رُو گھاس آنے لگی

اس نے میری طرف پا شکستہ تعلّق روانہ کیا
ساتھ میں کچّے دھاگے سے باندھی ہوئی آس آنے لگی

مائیں جب شیرخواروں کے سر سے کفن باندھنے لگ گئیں
زندگی پھر ذرا شرم کھاتی ہوئی پاس آنے لگی

کیوں تری وادیاں زرد ہونے لگیں، زندگی ہوش کر
دیکھ کن پربتوں سے پگھلتی ہوئی یاس آنے لگی

ستارہ مسکراتا ہے

خلیل اللہ فاروقی

بہت بے چین کرتا ہے
تمھارا بے خبر رہنا
ہمارے آنسوؤں کا اس طرح سے
بے اثر رہنا......!
مگر دل کی یہ خوش فہمی
ہمارے زخم پر مرہم سا رکھتی ہے
کہ سب کچھ ٹھیک ہے
محبوب تو ایسے ہی ہوتے ہیں
تمھاری بے نیازی بھی
کرم کا ایک پہلو ہے
تمھاری سرد مہری میں چھپا
دلکش سا کوئی استعارہ مسکراتا ہے
محبت کا دمکتا جھلملاتا
اِک ستارہ مسکراتا ہے

○○○

اک کہانی کو انجام درپیش ہے

خلیل اللہ فاروقی

قلبِ مضطر ٹھہر لمحہ بھر کے لیے
اس کی رخصت کا ہنگام درپیش ہے
وصلِ شیریں سے گلرنگ ماحول میں
اِک کہانی کو انجام درپیش ہے

آخری بار جی بھر کے میں دیکھ لوں
کیا خبر پھر کبھی ہم ملیں نا ملیں
شاخِ فردا ثمر بار ہو یا نہ ہو
کس کو معلوم پھر گل کھلیں نا کھلیں

وہ نہ ہوگا تو خوشبو ہی کام آئے گی
آخری بار سانسوں کو مہکا تو لوں
ہجر بھی آگ ہے، وصل بھی آگ ہے
چلتے چلتے میں یہ آگ دہکا تو لوں

ایسی ساعت کہاں، ایسا منظر کہاں
رنگ ہی رنگ ہے ، روپ ہی روپ ہے
چھاؤں آنچل کی لے لوں ،گھڑی دو گھڑی
پھر سفر در سفر، دُھوپ ہی دُھوپ ہے

قلبِ مضطر تسلّی کے دو حرف بس
دیکھ چشمِ غزالاں چھلکنے لگی
حُسن پر حزن کے سایے چھانے لگے
آگ فرقت کی دل میں دہکنے لگی

○○○

تمھاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا

خلیل اللہ فاروقی

تمھاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ دل کے کھیل میں کیا جیتنے والے بھی روتے ہیں
وہ جن کی چشمِ خود بیں اور کو دیکھا نہیں کرتی
بھلا کس دل سے غم کے تار میں موتی پروتے ہیں

تمھاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ کیا مانندِ شیشہ پتھروں میں بال آتا ہے
اثر انگیز ہے اب تک محبت کا وہی جذبہ
جو ایسے ہوش مندوں کو بھی یوں پاگل بناتا ہے

تمھاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
مزاجِ حسن میں یوں یک بیک کیا انقلاب آیا
ستارہ دیکھنا اور دیکھ کر افسردہ ہوجانا
بڑی تاخیر سے تم کو ستاروں کا حساب آیا

تمھاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ ترکِ ربط پر کیا مجھ سے وحشی یاد آتے ہیں
تعلق توڑنا آسان تھا تو آنکھ کیوں نم ہے
انا پرور، جفا پیشہ بھی یوں آنسو بہاتے ہیں

تمھاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ جلنے اور جلانے میں بھلا کیا لطف آتا ہے
بس اِک جھوٹی انا کے واسطے برباد ہوجانا
خودی کے زعم میں انسان کتنے دُکھ اُٹھاتا ہے

○○○

شکیل جاذب

دیوانہ مِرا اگرچہ بَن میں
شُہرہ ہے اُس کا انجمن میں

مسموم یہ کس نے کیں ہوائیں
کچھ پھول سے کِھل رہے تھے من میں

کیا اس کے بغیر دیکھتے ہم!
دل ہی تو چراغ تھا بدن میں

کیسے بھلا بانٹو گے پرندے؟
دیوار تو اُٹھ گئی چمن میں

تفصیل ہے گویا، کم نگاہی
اک بات تھی ان کہے سخن میں

جاذبؔ جو ہے عاشق و غزل گو
گویا اس کے زخم ہے دہن میں

شکیل جاذب

داد و تحسین نہ مسند سرِ دربار ملی!
کیسے ملتی کہ مجھے جرأتِ اظہار ملی

ہم کو معلوم ہے سردار نے کس کس در پر
خم کیا ہے سرِ تسلیم تو دستار ملی!

کب غرض عشق میں رکھی تھی گزر جانے سے
ہم کو درکار تھی دیوار سو دیوار ملی

زندگی ایک تھی لیکن ترے دوارے آ کر
ہم نے سو بار لٹائی، ہمیں سو بار ملی

کب کوئی عہد نبھانے کو کہا تھا جاذبؔ
فرصتِ ایک دو نفس بھی نہ تجھے یار ملی؟

شہاب صفدر

میں ساز و رخت لینے میں عجلت نہ کرسکا
اور وقت انتظار کی زحمت نہ کرسکا

تُو چل دیا اُجاڑ کے لیکن ترا خیال
ان بستیوں سے ترکِ سکونت نہ کرسکا

جھونکا ہی اتنا تیز تھا آشفتہ دم شجر
پتّے کو اہتمام سے رخصت نہ کرسکا

یہ دل نہ رکھ سکا تری یادیں سنبھال کر
بے بس امانتوں کی حفاظت نہ کرسکا

تا عمر سر اٹھاتی رہیں خواہشیں شہابؔ
دل سا جری فرو یہ بغاوت نہ کرسکا

شہاب صفدر

کن منزلوں غبارِ رواں دیکھیے تھمے
''رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے''

احساسِ دردِ ہجر زیادہ ہے دم بہ دم
کب گردبادِ آہ و فغاں دیکھیے تھمے

ہیں اہلِ عشق خوفِ گرانی سے خستہ دل
کس وقت کاروبارِ زیاں دیکھیے تھمے

آنے کو ہے خمارِ خور و خواب کا مقام
کچھ دیر کو زمانہ یہاں دیکھیے تھمے

اک مرحلہ فریبِ سفر کا ہے، آسماں
اب مرشدِ نگاہ جہاں دیکھیے تھمے

کیا رنگ ہوگا باغِ یقیں کا خدا پناہ
جب صرصرِ خیال و گماں دیکھیے تھمے

شاید سماعتوں پہ ہو کائی جمی ہوئی
کف در دہاں جو سیلِ بیاں دیکھیے تھمے

دہشت سے موت کی، متزلزل ہیں ساعتیں
کیونکر نشانِ امن و اماں دیکھیے تھمے

بڑھتا ہوا فشارِ شبِ ظلم اے شہابؔ
رُوکش ہوا طلوعِ اذاں، دیکھیے تھمے

مہرباں، نامہرباں

ثروت زہرا

جڑوں تک ہرے یہ تناور زمانے
تمھارے سہارے بڑھے جا رہے تھے
یہ بیلیں، یہ بوٹے، یہ پکّی منڈیریں
تمھیں دیکھ کر بس چڑھے جا رہے تھے
یہ بالوں کے گجرے یہ سرسبز ڈالیں
تمھارے یقیں پر کھلے جا رہے تھے
یہ خوابوں کے گہنے، یہ ماؤں کے سپنے
تری گیلی رت میں ڈھلے جا رہے تھے
اُترتے ہوئے دودھ کے ذائقے تک
تراوٹ کی دنیا بھرے جا رہے تھے
تم آئے تو اس بار رت کے بہانے
یہ کیا کہ تمھی نے گرائے زمانے؟
تناور، تناور کھڑے سب ٹھکانے
مہکتی نگاہوں کی عریاں اڑانیں
منڈیروں کی باتی، گلابوں کی تانیں
تم ہی لوٹ کر لے گئے سب ترانے...

○○○

آخری مسافت

فہیم شناس کاظمی

محبت جاگتی آنکھوں کا قصہ ہے
وفا دہلیز کا ٹوٹا کنارا ہے
گلی خاموش رستہ ہے
ہوا کے ہاتھ سندیسوں سے خالی ہیں
صدائیں ڈھونڈتی ہیں ایسے ہونٹوں کو
جہاں پر پھول کھلتے ہیں
ستارے چومتے ہیں آسمانوں جیسی آنکھوں کو
کہ جن میں رنگ بھرتی خامشی مسند لگائے ہے
کہیں جانے کی جلدی میں
کبوتر اپنا رستہ بھول جاتے ہیں
محبت میں ہر اک جلدی میں ہوتا ہے
مگر یہ ساعتیں صدیوں پہ بھاری ہیں
کوئی ساعت
کسی کو بھی،

کہیں بھی چھوڑ دیتی ہے
وفا دہلیز پہ دم توڑ دیتی ہے
گلی کی جلتی بھٹی سرد ہونے کو نہیں آتی
کئی دریا یہاں چکرائے پھرتے ہیں
کئی موسم یہاں بولائے پھرتے ہیں
دہکتی بھٹی کو راتب ضرورت ہے
ہمارے جسم خالی ہیں
ہماری سوچ گالی ہے
اور اس کی جلد مہتابی
سو اب اس کا مقدر ہے، قیامت تک کی بے خوابی
صداقت کچھ نہیں ہوتی
محبت اور ضرورت میں کوئی بدعت نہیں ہوتی
یہی سمجھا کہ ایسا ہے
محبت خواب کی دہلیز سے آگے نہیں جاتی
کہ جو اک بار بھی دہلیز سے باہر چلا جائے
کبھی واپس نہیں آتا

○○○

رخسانہ صبا

لفظوں سے تصویر بنانی پڑتی ہے
ایک کہانی روز سنانی پڑتی ہے

سایہ بننے کی امید میں ہر لمحہ
راہگزر پر دھوپ بچھانی پڑتی ہے

خوابوں کو نیلام چڑھانے کی دھن میں
آنکھوں سے تعبیر چھپانی پڑتی ہے

دل کو دریا کرنا پڑتا ہے پہلے
پھر رستے میں باڑ لگانی پڑتی ہے

زخم تو لمحوں سے ہی ملتے ہیں لیکن
صدیوں کو روداد سنانی پڑتی ہے

قربت کی دوری میں جھلسے رشتوں کو
آنگن میں دیوار اٹھانی پڑتی ہے

یوں تو عشق کا وار ہے شاید پل بھر کا
لیکن اس میں عمر گنوانی پڑتی ہے

دل وہ بچہ جس کو بہلانے کے لیے
کاغذ کی اک ناؤ بنانی پڑتی ہے

ایک تحیّر کے سرمایے کی خاطر
آئینے کو چھب دکھلانی پڑتی ہے

تحلیلِ نفسی

فیصل عظیم

کچھ دیر باتیں کر کے
چہرہ پڑھ کے
ماتھے کی لکیریں جانچ کر
چند اک سوالوں میں بہت کچھ بھانپ کر
ماہر معالج نے اچانک خود کلامی کرتے کرتے
دل میں بیٹھی خواہشوں کا روپ دھارا
سب ملامت کو سمیٹا
سارے اندیشوں کو ــ توبہ کے خمار آلود پہلو میں لٹایا
جانے کس کو تھپکیاں دے کر سلایا!
خود شناسی کی سزا دے کر
لپک کر، اپنے اندر آ کے
ماتھے کی اکیلی آنکھ سے آئینہ دیکھا
اور دو آنکھوں والا چہرہ اپنے چہرے پر سجا کر
اپنی جلتی بجھتی دنیا کے اندھیروں میں دوبارہ کھو گیا تھا
اور مریضِ خود فریبی!
آنکھیں میچے، جانے کب سے جاگنے کا منتظر ہے

○○○

انا کا ریشم

فوقیہ مشتاق

ختم ہوتا نہ مری آنکھوں کا ریشم ایسے
خواب سے پہلے ہی تعبیر مجھے مل جاتی
میرے پیروں میں نہ زنجیرِ وفا ہوتی یوں
نہ ترستیں مری بانہیں کسی قربت کے لیے
یوں نہ صدیوں کی تھکن چہرے پہ جمتی میرے
میری راہوں میں بچھائے ہوئے پلکیں ہر دم
شہر کا شہر تمنائی نظر آتا مجھے
میری غیرت نے گوارا نہ کیا ورنہ میں
اطلس و ریشم و کمخواب میں لپٹی ہوتی
جاہ و منصب کے حسیں باب میں لکھی ہوتی

○○○

سارا نقشہ کب بدلے گا؟

فوقیہ مشتاق

رات اندھیری چاروں جانب پھیل رہی ہے
اور سحر کی آمد کے آثار نہیں ہیں
سارے پھول اور پتے کب کے اپنا آپ گنوا بیٹھے ہیں
ہر اک شاخِ برہنہ خود سے شرمندہ ہے
سیلن گھر میں پھیل رہی ہے
اور کتابیں شیلف میں رکھّے رکھّے جیسے
ایک ہی رستہ تکتے تکتے
اپنی خوشبو کھو جانے پر
چپکے چپکے اپنے آنسو پونچھ رہی ہیں
باورچی خانے میں ڈھیروں گندے برتن
کب سے یوں ہی رکھّے ہیں
سارے گھر میں بکھرے کپڑے
اب ترتیب سے رکھے جانے کی خواہش ہی کھو بیٹھے ہیں
گھر کی ایک اک چیز پر گرد کا قبضہ ہے
منی پلانٹ کی پیلی بیلیں

بوند بوند کو ترس گئی ہیں
ٹھنڈا بستر ہجر کی چادر خود پر تانے
اونگھ رہا ہے
ساری گھڑیاں ٹک ٹک کرنا بھول گئی ہیں
اک تصویر میں دولھا دلھن
جیسے اپنے بندھن پر شرمندہ ہیں
اور میں یوں ہی جانے کب سے
ٹھنڈی کافی کا مگ تھامے
ایک ہی صوفے پر بیٹھی ہوں
اور اپنی اندھی آنکھوں سے
دروازے کو دیکھ رہی ہوں
سوچ رہی ہوں
سارا نقشہ کب بدلے گا
دروازہ کب بولے گا

OOO

پروفیسر ڈاکٹر سیّد رضی محمد

جس لَو میں جل کے رات گزاری، نہیں رہی
اٹھیے یہ انجمن بھی ہماری نہیں رہی

اب کیا کہیں کہ کتنے وفا آشنا تھے ہم
لیکن وفا بھی عقل سے عاری نہیں رہی

خود مانگنا شعار ہمارا نہیں رہا
عادت نوازنے کی تمھاری نہیں رہی

دیکھا تمھیں بھٹکتے ہوئے تو بھٹک گئے
یک طرفہ بے خودی کبھی طاری نہیں رہی

اس شے کو ہم نے تھوڑا گوارا نہیں کیا
جب اپنی دسترس میں وہ ساری نہیں رہی

جس دن سے ایک شخص ہمارا نہیں رہا
اس دن سے کائنات ہماری نہیں رہی

گھاٹے کے سارے فیصلے اپنے ہی تھے رضیؔ
ان فیصلوں پہ رائے شماری نہیں رہی

عطاء الرحمٰن قاضی

دکھا کے آئنۂ نقشِ ناتمام مجھے
پلا رہا ہے کوئی حیرتوں کا جام مجھے

میں اک کھنڈر کے تعاقب میں کھو گیا خود میں
پکارتے رہے کیا کیا نہ سقف و بام مجھے

یہ کون عکس دکھاتا ہے شعبدے پیہم
مثالِ غولِ بیاباں، کنارِ شام مجھے

اتر رہا ہے رگ و پے میں ماہ و سال کا زہر
سو دیکھنا ہے ابھی اپنا انہدام مجھے

میں ڈر رہا ہوں عطاؔ گھر کی سمت جاتے ہوئے
ہے یاد ایک کہانی کا اختتام مجھے

عطاء الرحمٰن قاضی

دیواروں کے زخم چھپانے سے
ہر سُو پھیل گئے ویرانے سے
کتنے منظر دُھندلا جاتے ہیں
کمرے میں اک دیپ جلانے سے
اندر سے دو لخت ہوا ہوں میں
باہر اک دیوار اٹھانے سے
جانے کیوں لگتے ہیں شام ڈھلے
نئے نویلے درد پرانے سے
اور بھی چمکا پھول ہتھیلی پر
اور بھی بھڑکی آگ بجھانے سے
گھر کی بھی تعمیر کا سوچیں گے
ملی جو فرصت خاک اُڑانے سے
چاروں اور عطاؔ ہے عکس مرا
جاؤں کدھر میں آئینہ خانے سے

یادِ فراموش

عطاء الرحمٰن قاضی

چمنی کو کیا خبر کہ دُھواں پھانکتے گلاب
صحرا کی وسعتوں کو ترستے ہیں رات دن
جینے کی یہ جو خواہشِ بے جا ہے کیا کریں
کوڑے فنا کے ہم پہ برستے ہیں رات دن

روشن تھا بامِ ہجر پہ سہما ہوا دِیا
اب تک مری اداس نگاہوں کو یاد ہے
وہ ہیلیوں کا شور، وہ قدموں کی آہٹیں
میں کیسے بھول جاؤں کہ راہوں کو یاد ہے

میں نے چھپا لیے ہیں کسی کو خبر نہیں
ہردے کی تٹ سے جھانکتے منظر نگاہ میں
اک بارہ ماسہ ہجر کی تلخی لیے ہوئے
ملتا ہے روز دشتِ غزل تیری راہ میں

ڈھلنے لگی تھی شام کہ اک سیلِ نور سے
پتھر بھی جو تھا دیکھنے میں آئنہ لگا
سہمے ہوئے طیور درختوں سے اُڑ گئے
ارجن کا تیر اپنے نشانے پہ جا لگا

آئی یہ کس کی یاد کہ منظر بدل گیا
دیوارِ ہجر دیکھیے گل پوش ہو گئی
اک بجھتی لالٹین حویلی کے صحن میں
کن آہٹوں کی یاد میں خاموش ہوگئی

کس کس طرح سے دل کو سجاتے ہیں اہلِ درد
آ دل میں اور آ کے اجنتا کے غار دیکھ
کُنجِ غزل میں بیٹھ کے ہم ہجر زادگاں
کس طرح کھینچتے ہیں ترا انتظار دیکھ

○○○

نصرت مسعود

بہارِ جاں فزا کی حشر سامانی الگ ہے
در و دیوار پر سبزے کی ارزانی الگ ہے

ہمیں تو آئنے میں عکس اپنا دیکھنا تھا
مگر اب روبرو اس کے پشیمانی الگ ہے

یہ دنیا اک معما تھی سمجھ آنے سے پہلے
سمجھ آنے لگی ہے تو پریشانی الگ ہے

ادھر یہ ہجر کا آزارِ پیہم اور اس پر
دلِ برباد تیری خانہ ویرانی الگ ہے

کہانی میں مرا کردار کیوں رکھا گیا تھا
بہت سی حیرتوں میں اک یہ حیرانی الگ ہے

ہر آنسو کے مقدر میں نہیں تاثیرِ گریہ
جگر کا خوں الگ ہے آنکھ کا پانی الگ ہے

یہ لطفِ عام بھی درکار ہے اس کے علاوہ
دعا اک اور ہے جو تجھ سے منوانی الگ ہے

نصرت مسعود

پوچھ لیتا وہ اگر حالِ شکستہ میرا
دل کا جو درد بھی تھا درد نہ رہتا میرا

اپنی دنیا کی چکا چوند میں ایسا گُم تھا
ایک لمحے کو بھی اس نے نہیں سوچا میرا

اس کے لہجے کی حلاوت پہ نہ جانا اے دل
وہ تو ویسا ہی زمانے کا ہے جیسا میرا

جُز ترے کون ہے احوال سے واقف میرے
کون ہے تیرے سوا شہر میں اپنا میرا

میں تو بس تیرے بھروسے پہ ہوں ورنہ کیا ہوں
دیکھ بن جائے نہ دنیا میں تماشا میرا

میں اِدھر زعمِ شناسائی میں گُم اور اُدھر
شہر کا شہر مخالف نکل آیا میرا

بات اخلاص و مروّت کی جہاں چل نکلے
جانے کیوں تلخ سا ہو جاتا ہے لہجہ میرا

کامی شاہ

اُس نے دیکھا تو اک ہوا تھا میں
اور بہت تیز چل رہا تھا میں

اُس کی آنکھوں کو پار کرتے ہوئے
ایک دن ڈوبنے لگا تھا میں

کشتیاں جانتی نہیں تھیں مجھے
اور دریا کو جانتا تھا میں

چار اطراف تھے بپا مجھ پر
اور سمتوں میں گھر گیا تھا میں

اُن میں آنگن سرے سے تھے ہی نہیں
جن مکانوں میں رہ رہا تھا میں

روح کو روح کی طلب تھی مگر
اک بدن میں گھرا ہوا تھا میں

صاف ستھری سیاہ تختی پر
روشنی سے لکھا گیا تھا میں

وہ تماشا بھی خوب تھا جس میں
آدمی سا بنا ہوا تھا میں

کامی شاہ

یہ تیز روشنی شیشے میں قید ہے کیسے
نظر مری ترے چہرے میں قید ہے کیسے

یہ مجھ میں آتی ہوئی زندگی، یہ جاتی ہوئی
یہ سانس کیا ہے، یہ سینے میں قید ہے کیسے

یہ تیز رَو، یہ درختوں کے سر جھکاتی ہوا
اس آسمان کے حلقے میں قید ہے کیسے

یہ نطق و لوح و قلم کب سے ہیں بھلا مصروف
یہ علم کیا ہے، یہ بستے میں قید ہے کیسے

یہ میرے سامنے شکلیں بدل کے آتا ہوا
یہ آدمی مرے حلیے میں قید ہے کیسے

قدم اُٹھاتا ہے سایہ تو اُٹھنے لگتی ہے
یہ دھوپ کیا ہے، یہ سایے میں قید ہے کیسے

یہ مجھ کو تیری طرف کھینچتا ہوا کامیؔ
یہ راستہ مرے رستے میں قید ہے کیسے

کامی شاہ

کوئی شعلہ نُما ہونے لگا ہے
سو میرا دل نیا ہونے لگا ہے

وہ جس کو دشت نے لکھا ہے، دریا
وہ تن میری قبا ہونے لگا ہے

تری یادوں نے جو روشن کیا تھا
دِیا وہ سبز سا ہونے لگا ہے

الگ ہی آسماں پھیلا ہے مجھ پر
جو نیلے سے ہوا ہونے لگا ہے

سخن آباد کرتا ہجر اُس کا
سخن سے ماورا ہونے لگا ہے

یہ دل اک کھیل میں برباد ہو کر
محبّت آشنا ہونے لگا ہے

توقیر تقی

شبِ شکست کوئی مہربان آیا نہیں
بکھرتے وقت مجھے یہ بھی دھیان آیا نہیں

خدائے خواب نے آنکھوں پہ مہربانی کی
کوئی ملال پسِ داستان آیا نہیں

چہار سمت سے آوازیں آ رہی تھیں مجھے
میں یوں ہی تیری طرف میری جان آیا نہیں

یہ آسماں ہمیں جھک جھک کے دیکھتا تھا بہت
مگر یہ تیرے مرے درمیان آیا نہیں

پلٹ کے دشتِ اجل سے دیارِ دل کی طرف
میں زندگی سے کبھی بدگمان آیا نہیں

سوار ایسے گئے مقتلِ وجود کے پار
ہوا کے ہاتھ کسی کا نشان آیا نہیں

میں کس قبیلۂ افتادگاں کا آدمی ہوں
گواہی دینے مرا خاندان آیا نہیں

توقیر تقی

کمان داروں کا پہلا سفیر ہونے سے پہلے
میں سبز شاخ تھا اے دوست، تیر ہونے سے پہلے

ہر ایک پیڑ کے دُکھ درد کا شریک تھا سورج
قیامتوں کے لیے ناگزیر ہونے سے پہلے

زرِ گلاب لٹاتی تھیں مجھ پہ سبز بہاریں
تمھاری لالہ رُخی کا فقیر ہونے سے پہلے

یہ میں ہوں جس نے تجھے مسئلہ بنا لیا ورنہ
تُو ایک عام سی لڑکی تھی، ہیر ہونے سے پہلے

میں کائنات سے آگے کا رِزق سوچتا کب تھا؟
شعورِ لقمۂ نانِ شعیر ہونے سے پہلے

ہے میرے پاس کوئی دم کو آج مہلتِ ہستی
سو کوئی دم کا تعارف، اخیر ہونے سے پہلے

مرا مقام کہانی میں اور کچھ نہیں توقیر
چراغ گل تھے، مرے ضو پذیر ہونے سے پہلے

نظم دُکھ تو نہیں ہے

اختر رضا سلیمی

نظم دکھ تو نہیں ہے
جسے آپ، ہم ہر کسی کو سناتے پھریں
اور آنسو بہاتے پھریں
نظم تو خواب ہے
ایک شاعر کا خواب
جسے بس وہی آدمی دیکھ سکتا ہے
جو صبح دم خشک ٹہنی پہ لرزیدہ شبنم کے قطرے کا دکھ جانتا ہے
اور اس جاننے کے عمل ہی کو سکھ جانتا ہے

○○○

پانچواں بُعد

اختر رضا سلیمی

ہم اب تک اسے چار ابعاد سے دیکھتے اور پرکھتے رہے
مگر ایک بھکشو نے کل رات مژدہ سنایا
کہ یہ کائنات طویل و عریض و عمیق و قدیم
پانچویں بُعد سے دیکھے جانے کی حق دار ہے
اور وہ پانچواں بُعد دُکھ ہے
محبت کا دُکھ
ازل سے جسے بُعد ہی راس ہے
اسی بعد نے قربتوں کو مٹا کے ہمارے لیے حسن کی دل کشی کو بڑھایا
یہ ہر آن بڑھتی ہوئی حسن کی دل کشی زندگی کی علامت ہے
یہ ہجر سب کی بقا کی ضمانت ہے
وصل اک قیامت ہے
سو
قبل اس کے کہ پھر وصل آغاز ہو
ہم اسے پانچویں بُعد کی معرفت سے سمجھنے کی کوشش کریں
عین ممکن ہے الجھی ہوئی ڈوریاں خود سلجھنے لگیں

○○○

علی یاسر

ڈور کرنے کو تری زلف کا خم اتریں گے
آسمانوں کے ستارے کوئی دم اتریں گے

حوصلہ ، اور ذرا حوصلہ اے سنگ بدست!
وقت آئے گا تو خود شاخ سے ہم اتریں گے

ایک اُمّید پہ تعمیر کیا ہے گھر کو
اس کے آنگن میں کبھی تیرے قدم اتریں گے

ہمیں لکھنا ہے زمیں والوں کے غم کا نوحہ
آسمانوں سے کسی روز قلم اتریں گے

اتنی آہیں نہ بھرو، اشک نہ سارے بہہ جائیں
طبعِ نازک پہ ابھی اور بھی غم اتریں گے

جیسے ہم آنکھ ملا کر ترے دل میں آئے
لوگ اس زینۂ دشوار سے کم اتریں گے

علی یاسر

قابلِ رشک ہے تقدیر مرے قدموں کی
مجھ سے بھاری ہے یہ زنجیر مرے قدموں کی

ایک اک حرف میں منزل کے معانی مخفی
دشت در دشت ہے تحریر مرے قدموں کی

برسرِ آب مرے نقشِ کفِ پا روشن
کم نہیں قوتِ تعمیر مرے قدموں کی

فاصلے کچھ بھی نہیں عزمِ سبک رَو کے لیے
خواب آنکھوں کے ہیں تعبیر مرے قدموں کی

ایک وسعت کہ جسے لوگ زمیں کہتے ہیں
کی ہوئی ہے یہ بھی تسخیر مرے قدموں کی

میرے سینے پہ برسنے کو مچل جاتے ہیں
چاپ سن لیتے ہیں جب تیر مرے قدموں کی

چشمہ و سبزہ و رعنائی و جلوہ، خوشبو
ریگزاروں میں ہے تاثیر مرے قدموں کی

دشت میں قیس، تو کہسار میں آیا فرہاد
سر پہ رکھے ہوئے تصویر مرے قدموں کی

عشق میں ایسے کمالات دکھائے یاؔسر
حُسن بن جاتا ہے جاگیر مرے قدموں کی

یحییٰ خان یوسف زئی

تری یادوں کے چراغوں میں یہ جلتی ہوئی رات
مری آنکھوں سے چھلکتی رہی ڈھلتی ہوئی رات

غم امروز سے مارا ہوا، ہارا ہوا دن
کسی فردا کی اُمیدوں پہ بہلتی ہوئی رات

کبھی آنکھوں میں رُکے کوئی گزرتا ہوا پل
کبھی سانسوں میں اٹک جاتی ہے چلتی ہوئی رات

نہ ٹلا ہے کبھی زخموں میں سلگتا ہوا دن
نہ تھمی ہے کبھی اشکوں میں اُبلتی ہوئی رات

کہیں بے شکل کے سایے، کبھی آواز کوئی
مجھے سونے نہیں دے گی یہ مچلتی ہوئی رات

مرے ہاتھوں کی لکیروں میں مشقت دن کی
مرے خوابوں کے مقدر میں ہے ڈھلتی ہوئی رات

جہانِ دیگراں

شبیر نازش

مجھے وہ دیکھنا ہے جو کسی بھی آنکھ نے دیکھا نہیں ہے
مجھے تحریر کرنے ہیں وہ سارے لفظ جو اب تک قلم کے لمس سے محروم بیٹھے ہیں
مجھے اُس خواب کو تعبیر کرنا ہے جسے میں نے نہیں دیکھا
پھر اُس تصویر میں وہ رنگ بھرنے ہیں جو سب رنگوں سے ہٹ کر ہوں
مجھے یہ جاننے کی جستجو بے چین رکھتی ہے
کہ میں جس خواب کی تعبیر ہوں وہ خواب کیسا تھا...؟
مجھے جانے دو...جانے دو!
مجھے معلوم سے آگے جہانِ دیگراں کی سیر کرنی ہے

○○○

اعتراف

رفیع الدین

کبھی تمھیں بے سپاس و نا آشنا لگوں میں
تو تم بھی میرے قریں نہ آنا
کہ میں نفی کے الاؤ میں سرکشیدہ نیزوں کی
زد پہ ہوتا ہوں
خود نگر مجھ کو میری آنکھیں بھی اجنبی جانتی ہیں
شاید کہ مرگِ اثبات و حفظِ نابود کا کوئی امر
میری مٹی میں مل گیا ہے
وہی مرا رازداں ہے
میں چاہتا نہیں کوئی اس گھڑی کا حساب مانگے
مرا شریکِ سفر ہو

○○○

شمشیر حیدر

دنوں سے کیسے شبوں میں ڈھلتے ہیں دن ہمارے
یہ ہم بدلتے ہیں یا بدلتے ہیں دن ہمارے

جو کٹ گیا ہے سفر ابھی تک نہیں ہمارا
خبر نہیں اور کتنا چلتے ہیں دن ہمارے

یہ کس کے جانے پہ بین کرتی ہیں چاند راتیں
یہ کس کے جانے پہ ہاتھ ملتے ہیں دن ہمارے

جہاں سے آتی ہے مسکراہٹ ترے لبوں کی
وہیں سے روتے ہوئے نکلتے ہیں دن ہمارے

شبیں جہاں اپنی حکمرانی کا سوچتی ہیں
چراغ بن کر وہیں پہ جلتے ہیں دن ہمارے

سجاد بلوچ

باہم جو ہوں وہ حسنِ ہنر فام اور میں
کھلتے ہیں وحشتوں کے در و بام اور میں

ہیں بزمِ ہاو ہو سے ادھر محوِ گفتگو
طاقِ خرد میں جلتی ہوئی شام اور میں

تجھ سے بچھڑ کے آ گئے کتنے قریب دیکھ
تیرے ستم، یہ عشق کے الزام اور میں

ممکن ہے کھل ہی جائیں سرِ لمحۂ وصال
سارے نبود و بود کے ابہام اور میں

تم جان لو کہ جان سے تم بھی گئے تھے پھر
چلتا تمھارے ساتھ جو دو گام اور میں

تراجم

نظمیں — جنگل کا درد

سرویشور دیال سکسینہ

اسد محمد خاں

تعارف

سرویشور دیال سکسینہ اُتر پردیش کے شہر بستی میں ۱۵ر ستمبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ اینگلو سنسکرت ہائی اسکول بستی، کوئنز کالج بنارس اور پریاگ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ماسٹری، کلرکی، آکاش وانی میں اسسٹنٹ پروڈیوسری اور ہفتے وار رسالے ''دنمان'' کی چیف ایڈیٹری کی۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی دلّی کے شعبۂ ہندی ادب میں ''پوئٹ ان ریزیڈنس'' رہے۔ دلّی میں ہی ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔ سرویشور جدید ہندی نظم کے اُن اہم ترین شاعروں میں سے ہیں کہ جن کے حوالے کے بغیر ہندی شعر و ادب کی تاریخ نامکمل ہے۔

انھوں نے کہانیاں، ناول اور ناٹک بھی لکھے ہیں۔ اُن کے معروف شعری مجموعے ''جنگل کا درد''، ''کوانو ندی''، ''کھونٹیوں پر ٹنگے لوگ'' ہیں۔

رَسوئی

میں نہیں جانتا
بھگونے میں کیا پک رہا ہے؟
اور اُس کے دل میں کیا؟
...اور کیا اُن کے خیالوں میں
جو گھر سے باہر سر جھکائے بیٹھے ہیں؟

بس اتنا جانتا ہوں
بھگونا گرم ہے
اور وہ آج اداس نہیں ہے
اور باہر بیٹھے لوگ جانے کی تیّاری
کر رہے ہیں

وہ بار بار کچھ گنگناتی ہے
پھر بھگونے کا ڈھکّن اٹھا
جھانکتی ہے
اور آگ تیز کرتی ہے

باہر لوگوں کے زور زور سے

بولنے کی آواز آتی ہے:
''بہت ہو چکا! اب ایسے نہیں چلے گا!''

میں نہیں جانتا
اس کے بعد کیا ہوگا؟

○○○

نقشہ

اک بچہ نقشہ بناتا ہے
تم جانتے ہو وہ کہاں جاتا ہے؟
اک بچہ نقشے میں رنگ بھرتا ہے
تم جانتے ہو وہ کہاں گیا؟
اک بچہ نقشہ پھاڑ دیتا ہے
تم جانتے ہو وہ کہاں پہنچا؟

اگر تم جانتے ہوتے
تو چپ نہیں بیٹھتے...
اس طرح

○○○

ہاتھ

ہاتھ ضروری ہیں
اُن کا چلنا اور بھی ضروری
اور نہ رکنا سب سے ضروری
بنا سوئیوں کی گھڑی
وقت کو کیسے پہچانے گی...
چاہے کلائی کی ہو
یا گھنٹا گھر کی
ہاتھ ضروری ہیں
گھڑی بند ہو تو بھی
کم سے کم دوسرے
دھوکے میں نہیں رہیں گے

○○○

راستہ

بند راستے پر
دوڑنے کی ابتلا جانتے ہوئے بھی
دوڑو

تبھی اُس اطمینان کو پہچانو گے
جو اس طرح دوڑنے سے ملتا ہے

اپنائی گئی ابتلا
اور حاصل شدہ راحت
دونوں جب آمنے سامنے کھڑی ہوں
تب تم وہ نہیں رہو گے
جس کے لیے راستہ بند تھا
○○○

جڑیں

وحشی ہواؤں میں کھڑا پیڑ
تالیاں بجاتا ہے
کیوں کہ اُس کی جڑیں
دھرتی میں بہت گہری ہیں

تم کیا کرو گے
کھمبے پر ٹکے چھپّر؟

جس کی طاقت سے جُڑو گے
اُسی کی کم زوری سے اُڑو گے
○○○

بھیڑیا — ۱

بھیڑیے کی آنکھیں سرخ ہیں
اُسے تب تک گھُورو
جب تک تمھاری آنکھیں سرخ نہ ہو جائیں

تم اور کر بھی کیا سکتے ہو
جب وہ تمھارے سامنے ہو؟

اگر تم منہ چھپا بھاگو گے
تو بھی تم اُسے
اپنے اندر اسی طرح کھڑا پاؤ گے
...اگر بچ رہے

بھیڑیے کی آنکھیں سرخ ہیں
...اور تمھاری آنکھیں؟

○○○

بھیڑیا — ۲

بھیڑیا غرّاتا ہے
تم مشعل جلاؤ

اُس میں اور تم میں
یہی بنیادی فرق ہے
بھیڑیا مشعل نہیں جلا سکتا
اب تم مشعل اُٹھا کر
بھیڑیے کے قریب جاؤ
بھیڑیا بھاگے گا
کروڑوں ہاتھوں میں مشعل لے کر
ایک ایک جھاڑی کی طرف بڑھو
سب بھیڑیے بھاگیں گے
پھر اُنھیں جنگل سے باہر نکال
برف میں چھوڑ دو
بھوکے بھیڑیے آپس میں غرائیں گے
ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے
بھیڑیے مر چکے ہوں گے
...اور تم؟

○○○

بھیڑیا — ۳

بھیڑیے پھر آئیں گے
اچانک،

تم میں سے کوئی ایک دن بھیڑیا
بن جائے گا
اُس کا خاندان بڑھنے لگے گا

بھیڑیے کا آنا ضروری ہے
تمھیں خود کو پہچاننے کے لیے
بے خوف ہونے کا سُکھ جاننے کے لیے
مشعل اٹھانا سیکھنے کے لیے

تاریخ کے جنگل میں ہر بار
بھیڑیا ماند سے نکالا جائے گا
آدمی، ہمت سے ایک ہوکر
مشعل لیے کھڑا ہوگا
تاریخ زندہ رہے گی
اور تم بھی
...اور بھیڑیا؟

○○○

رینگتا سانپ

کنکریوں میں رینگ رہا ہے سانپ
لاٹھیاں مارنے پر بھی

وہ محفوظ ہے

کیا انتظار کروں؟
جب تک وہ
ہموار زمین پر نہ آجائے
... یا
اپنا ہتھیار
بدل دے؟
○○○

بھوک

جب بھی
بھوک سے لڑنے
کوئی کھڑا ہو جاتا ہے
خوب صورت دِکھنے لگتا ہے:
جھپٹتا باز،
پھن اٹھائے سانپ،
دو ٹانگوں پر کھڑی
کانٹوں سے ننھی پتیاں کھاتی بکری
دبے پاؤں جھاڑیوں میں چلتا چیتا،

ڈال پر اُلٹا لٹک
پھل کترتا توتا
یا ان سب کی جگہ
آدمی ہوتا۔

جب بھی
بھوک سے لڑنے
کوئی کھڑا ہو جاتا ہے
خوب صورت دِکھنے لگتا ہے

○○○

دُھول—۱

تم دُھول ہو
پیروں سے روندی ہوئی دُھول
بے چین ہوا کے ساتھ اُٹھو
آندھی بن
اُن کی آنکھوں میں پڑو
جن کے پیروں کے نیچے ہو

ایسی کوئی جگہ نہیں

جہاں تم پہنچ نہ سکو
ایسا کوئی نہیں
جو تمھیں روک لے

تم دُھول ہو
پیروں سے روندی ہوئی دُھول
دُھول سے مل جاؤ

○○○

دُھول — ۲

تم دُھول ہو
زندگی کی سیلن سے
دیمک بنو

صدیوں سے بند
ان دیواروں کی کھڑکیوں،
دروازوں،
روشن دانوں کو
راتوں رات جلادو

تم دھول ہو
زندگی کی سیلن سے جنم لو،
دیمک بنو، آگے بڑھو

ایک بار راستہ پہچان لینے پر
تمھیں کوئی ختم نہیں کرسکتا

○○○

انتظار دشمن ہے

انتظار دشمن ہے
اُس پر یقین مت کرو
وہ جانے کن جھاڑیوں
اور پہاڑیوں میں
گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے
اور ہم
پتّیوں کی کھڑکھڑاہٹ پر
کان لگائے رہتے ہیں

انتظار دشمن ہے
اس پر یقین مت کرو

وہ چھاپا مار فوجی کی طرح
خود اندھیرے میں رہتا ہے
اور ہمیں اُجالے میں کھڑا
دیکھتا رہتا ہے
اور ہم اندھیرے میں
ٹارچ کی روشنی ہی پھینکتے رہتے ہیں

انتظار دشمن ہے
اُس پر یقین مت کرو

وہ ہمیں ندی بنا کر ہمارے بیچ سے ہی
مچھلی کی طرح بنا دکھائی دیے تیر جاتا ہے
اور ہم لہروں کے بے شمار ہاتھوں سے
اُسے ٹٹولتے رہتے ہیں

انتظار دشمن ہے
اس پر یقین مت کرو

اُس سے بچو

جو پانا ہے فوراً پالو

جو کرنا ہے فوراً کرو

○○○

جنگل کا درد

ایک نے مجھ سے پوچھا:

''جنگل کیا ہوتا ہے؟''

دوسرے نے کہا— ''اور درد؟''

میں خاموش رہا—

میں نے ایک بڑے پنجرے میں دونوں کو

بند کر دیا

اور اوپر ایک کالی مہین چادر ڈال دی

کچھ دنوں بعد وہ مجھے

جنگلی جانوروں کی طرح دیکھنے لگے—

پہلے اُن کی آنکھیں ہری ہوئیں

بے ضرر جانوروں جیسی،

پھر سرخ چیر پھاڑ کرتے جانوروں میں بدل گئیں

...ایک دم خوں خوار

وہ بھوکے تھے
میں نے ٹکڑا پھینکا
وہ کھانا چھوڑ آپس میں گتھ گئے
لہولہان ہو گئے —
طاقت ور نے سب کھا لیا
کم زور نے لاچاری سے
صبر کیا، درد سے منہ چھپا لیا

یہ سلسلہ بہت دنوں تک
میں نے چلنے دیا —
بھوکا رکھنا، ٹکڑا پھینکنا،
طاقت ور میں نخوت جگانا
اور کم زور میں قناعت اور صبر

اور جب وہ اس کے اتنے عادی ہو گئے
کہ کچھ اور سوچ پانا
اُن کے لیے ناممکن ہو گیا
تب میں نے
انھیں پنجرے سے نکال دیا —
اب وہ کھلے میں کھڑے تھے،

کھڑے ہیں،

کھڑے رہیں گے—

ٹکڑے پھینکے جانے کے

انتظار میں

لڑنے کو تیّار

نخوت اور قناعت کے شکار

○○○

کُتّا—۱

کتّے کی دم کاٹ دو، پھر بھی

دُم ہلانے کے طور طریقے

نہیں جائیں گے

سبھی کتوں کی دُم کاٹ دو

پھر بھی، دُم ہلانے کے طور طریقے

نہیں جائیں گے

کیوں کہ کتّا

عادت سے ٹکڑ خور ہے

تمھیں ٹکڑ خوری کے رستے

بند کرنے ہوں گے

○○○

کُتّا۔۲

جب ہر چہرہ ہانپتا،
رال ٹپکاتا نظر آئے
پُچکارتے ہی دُم ہلائے
دُلارتے ہی پیٹ دِکھائے
سارا ماحول اُس کی 'کوں کوں' سے بھر جائے؛
تب سمجھ دار کو چاہیے کہ ڈر جائے!
اس خوف سے بھر جائے
کہ کہیں وہ اُس کی وفاداری سے منہ نہ پھیر لے

○○○

کُتّا۔۳

کتّے کا پٹّا کھول جنگل میں چھوڑ دو،
وہ بھیڑیا بن جائے گا
اُس کے ساتھ اس کی جماعت جوڑ دو،
وہ شیر سے لڑ جائے گا
وہ پٹّا ہے
جس کی وجہ سے
کتّا نکھٹّا ہے

○○○

میمنون نے کہا

والٹیئر

پروفیسر سحر انصاری

علم و ادب سے تعلق رکھنے والا ہر شخص یقیناً والٹیئر کے نام سے آشنا ہے۔ والٹیئر (۱۶۹۴ء۔۱۷۷۸ء) کا پورا نام ژاں فرانسوا میری اروئے دی والٹیئر تھا۔ اس کے علمی آثار میں فلسفہ، ڈراما، تاریخ اور تعلیم و تربیت سے متعلق تحریریں شامل ہیں۔ والٹیئر کا نام انقلاب فرانس کے حلقۂ دانش وراں میں شامل ہے۔ اُس کا فلسفہ، انصاف اور حقوق انسانی پر مبنی ہے، اس کی آزادی رائے سے متعلق تحریروں کو دُنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس بار ہم اس عہد ساز فلسفی کی تحریر کردہ کہانی کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

میمنون نے ایک دن سوچا کہ وہ عظیم فلسفی بننے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے خود سے مخاطب ہوکر کہا، ''ایک مکمل فلسفی اور مکمل طور پر خوش حال رہنے کے لیے مجھے اس کے سوا کچھ نہیں کرنا کہ خود کو خواہشات سے مبّرا کرلوں، اور ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے زیادہ آسان کام کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ میں کبھی محبت نہیں کروں گا۔ جب میں کسی حسین عورت کو دیکھوں گا تو خود سے کہوں گا، یہ گال ایک دن غیر دل کش اور جھری دار ہوجائیں گے، ان آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ جائیں گے، اس کا سینہ سپاٹ ہوجائے گا اور سر کے بال بھی رفتہ رفتہ جھڑنے لگیں گے۔ گویا اس لمحے میں مجھے یہ تصور کرنا ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ حقیقت میں اس کا چہرہ مہرہ کیسا ہوگا؟ جب میں ایسا سوچنے لگوں گا تو کوئی حسین چہرہ بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکے گا۔

دوسرے مرحلے میں، میں ہمیشہ تحمل پسند رہوں گا۔ خوش گوار گپ شپ، خوش ذائقہ شراب یا ماحول کی خوب صورتی اور دل کشی کی طرف مائل ہونا میرے لیے بے سود ہوگا۔

میں حد سے تجاوز کرنے کے نتائج پر غور کرنے لگوں گا، مثلاً سر درد، پیٹ کی خرابی، سوجھ بوجھ، صحت اور وقت کی بربادی۔ اس کے بعد میں اتنا ہی کھاؤں گا جتنا خود کو صحت مند رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح میں خود اور میرے خیالات ہمیشہ خالص، متوازن اور تابناک رہیں گے۔ یہ سب کچھ اتنا آسان ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے کسی خاص ہنرمندی کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن'' میمنون نے کہا، ''مجھے یہ بھی سوچنا ہوگا کہ میں اپنی آئندہ زندگی کس طرح گزاروں گا؟ میری خواہشیں معمولی نوعیت کی ہوں گی، میری دولت ایک اچھے مالیاتی ادارے میں محفوظ کر دی جائے گی اور میں آزادانہ زندگی گزار سکوں گا۔ اس سے بڑھ کر نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے کسی دربار میں مصاحب کی حیثیت سے رقص کرنے کی مصیبت بھی جھیلنی نہیں ہوگی، نہ کوئی مجھ سے حسد کرے گا اور نہ میں کسی سے۔ یہ سب میرے دوست احباب ہیں، ان سے میں تعلق استوار رکھوں گا اور ہم میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ میں کبھی ان سے مخالفانہ رویہ اختیار نہیں کروں گا اور وہ بھی مجھ سے اسی طرح پیش آئیں گے۔ یہ سب کچھ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔''

اپنے فلسفۂ حیات کے اس چھوٹے سے منصوبے پر غور کرنے کے بعد میمنون نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر جھانکا، اُس نے دیکھا کہ اُس کے گھر کے قریب ایستادہ درختوں کے سائے میں دو عورتیں گزر رہی ہیں۔ ان میں ایک معمر تھی اور اس کے طور طریقے اپنی عمر کے مطابق تھے، دوسری جوان اور خوب صورت تھی اور چاق چوبند نظر آتی تھی۔ اُس نے ایک سرد آہ بھری اور رونے لگی۔ اس عمل نے اُسے اور بھی خوب صورت بنا دیا۔ ہمارے فلسفی پر اس خاتون کے رونے کا بڑا اثر ہوا (حالانکہ وہ طے کر چکا تھا کہ اس قسم کے کسی تجربے کو محسوس نہیں کرے گا)، لیکن اس جوان عورت کی زبوں حالی کو دیکھ کر اُس سے نہ رہا گیا۔ وہ زینہ اُتر کر نوجوان عورت کے پاس آیا اور اُسے کسی فلسفیانہ پیرایے میں تسلی دینے کی کوشش کی۔ عورت نے بڑی سادگی کے ساتھ ممنونیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ اُس کے ایک چچا نے کس طرح اُسے جائیداد سے محروم کر دیا، اُس پر تشدد کیا اور اُسے خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا۔

پھر اُس عورت نے کہا، ''تم ایک دانش مند انسان لگتے ہو۔ کیا تم میرے گھر آنے اور میرے معاملات پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت کر سکتے ہو؟ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اُن سفاک حالات سے نجات دلا سکتے ہو جن میں، میں اس وقت گھری ہوئی ہوں۔''

میمنون بغیر کسی حیل حجت کے اُس عورت کے ساتھ ساتھ ہو لیا تا کہ اُس کے حالات زندگی کا فلسفیانہ طریقے سے جائزہ لے کر کوئی مناسب مشورہ دے سکے۔

مصیبت زدہ عورت اُسے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جو خوش بوؤں سے مہک رہا تھا۔ اُس نے اُسے نہایت شائستگی سے اپنے ساتھ ایک بڑے صوفے پر بٹھا لیا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ عورت اپنی کہانی بڑی بے تابی کے ساتھ سنا رہی تھی اور میمنون پورے انہماک سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ خاتون نظریں نیچی کیے اپنے حالات سناتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اُس کی آنکھوں سے ایک آدھ آنسو ٹپک پڑتا اور پھر وہ اپنی پلکیں اُٹھا کر میمنون کی طرف احترام کے ساتھ دیکھنے لگتی۔ یہ گفتگو پُراثر انداز میں جاری رہتی اور جب اُن کی نگاہیں ملتیں تو تاثر میں دُگنا اضافہ ہو جاتا۔ اُس کے حالات کا میمنون نے اپنے دل پر گہرا اثر قبول کیا اور ہر لمحے اُس نے محسوس کیا کہ اس قدر شائستہ لیکن اتنی مصیبت زدہ شخصیت کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ گفتگو کی گرمی کے ساتھ ساتھ اُن کی قربتوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ میمنون نے اُسے بڑی دانش مندی کے ساتھ چند قابلِ عمل مشورے دیے۔ ایسے دل چسپ لمحے میں ذرا سوچیے تو کون آ سکتا تھا؟ جی ہاں، اُس کے چچا تشریف لے آئے۔ وہ سر سے پاؤں تک ہتھیاروں سے لیس تھا اور آتے ہی اُس نے کہا کہ میں فوری طور پر میمنون اور اپنی بھتیجی کو قتل کروں گا۔

میمنون نے اندازہ لگا لیا کہ اچھی خاصی رقم ادا کر کے وہ اپنی اور اُس خاتون کی جاں بخشی کرا سکتا ہے۔ میمنون جو کچھ بھی ادا کر سکتا تھا، ادا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس وقت کا ماحول پھر غنیمت تھا، اُس وقت تک امریکا دریافت نہیں ہوا تھا اور پریشان حال خواتین کو ایسے خطرات لاحق نہیں ہوتے تھے جیسے اب ہوتے ہیں۔

میمنون خفت اور اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ جب اپنے گھر لوٹا تو اُسے ایک دعوت نامہ ملا۔ اُس کے ایک بے تکلف دوست نے اُسے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔

میمنون نے سوچا، 'اگر میں گھر میں تنہا رہا تو یہ سفاک تجربہ جس سے میں ابھی گزرا ہوں، میرے دل و دماغ پر چھایا رہے گا اور میں کچھ بھی نہ کھا سکوں گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس طرح میں بیمار پڑ جاؤں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ اپنے عزیز دوست کے یہاں چلا جاؤں اور کچھ وقت گزار لوں۔ اُن کی خوب صورت محفل میں بیٹھ کر میں اس حماقت کو بھول سکوں گا جو آج صبح مجھ سے سرزد ہو گئی۔'

چنانچہ وہ دعوت میں شریک ہو گیا۔ کبھی کبھی وہ کسی بات پر پریشان ہو جاتا اور شراب

کے گھونٹ انڈیلنے لگتا۔

میمنون فلسفیانہ انداز میں دلیل پیش کرتا، ''تھوڑی سی شراب توازن کے ساتھ پی جائے تو انسان کا دل سکون پا سکتا ہے۔'' اور اس پر عمل کرتے کرتے، وہ اچھا خاصا مدہوش ہوگیا۔

''بے تکلف دوستوں کی محفل میں بیٹھنا وقت گزارنے کا بے ضرر طریقہ ہے۔'' یہ سوچتے سوچتے وہ جوئے میں ہارتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کا بٹوا بالکل خالی ہوگیا۔ پھر یوں ہوا کہ کھیل کے کسی مرحلے پر جھگڑے کی نوبت آگئی، بات بڑھتی گئی اور اُس کے ایک بے تکلف دوست نے اُس کے سر اور آنکھ پر پانسے کا ڈبا کھینچ مارا۔ فلسفی میمنون کو ایک آنکھ بند، نشے میں دُھت اور جیب خالی، اس حالت میں گھر پہنچایا گیا۔

وہ اسی کیفیت میں سوگیا۔ آنکھ کھلنے پر جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے نوکر کو بھیج کر بینک سے رقم منگوائی تاکہ اپنے عزیز دوستوں کا قرض بے باق کرسکے۔ نوکر نے واپس آکر اطلاع دی کہ آپ کے بینک نے دیوالیہ ہونے کا اعلان کردیا ہے اور ایک آپ ہی نہیں تقریباً ایک سو خاندان افلاس اور بے بسی کی حد پر پہنچ گئے ہیں۔ میمنون بجلی کی سی تیزی سے اُٹھا، آنکھ پر پھایا لگایا اور دعویٰ دائر کرنے کے ارادے سے عدالت روانہ ہوگیا تاکہ بادشاہ سے اس دیوالیے کے خلاف انصاف حاصل کرسکے۔ عدالت کے کمرے میں اُس کی ملاقات متعدد خواتین سے ہوئی، وہ اُس صورت حال سے نمٹنے کے لیے جوش و خروش کا اظہار کررہی تھیں۔ اُن میں سے ایک نے میمنون کی طرف دیکھ کر کہا، ''دیکھو اُس خطرناک مخلوق کو۔''

ایک اور نے جو اُسے جانتی تھی کہا، ''سلام صبح مسٹر میمنون! آپ خیریت سے تو ہیں نا؟ مسٹر میمنون آپ کی ایک آنکھ کس طرح ضائع ہوگئی؟'' اور جواب سنے بغیر وہ آگے بڑھ گئی۔

میمنون نے خود کو ایک کونے میں چھپا لیا اور اُس لمحے کا انتظار کرنے لگا جب وہ بادشاہ کے قدموں میں خود کو پہنچا سکے۔ آخرِکار وہ لمحہ آگیا، اُس نے تین مرتبہ زمین کو بوسہ دیا اور اپنا استغاثہ پیش کردیا۔ بادشاہ سلامت نے انتہائی ہمدردی سے اُس کے کاغذات وصول کیے اور اپنے اہل کار کے حوالے کردیے۔ اہل کار نے غصے اور استہزا کے ساتھ اُس سے کہا، ''او ایک آنکھ والے بدھو! تم کوئی سرکس کے مسخرے لگتے ہو، تم میرے پاس آنے کے بجائے سیدھے بادشاہ سلامت تک پہنچ گئے اور طُرہ یہ کہ اُس ایمان دار دیوالیے کے خلاف دعویٰ دائر کررہے ہو۔ اُس کی میں بے حد قدر کرتا ہوں، وہ میری ایک عزیزہ کا بھتیجا بھی ہے۔ میرے دوست اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری دوسری آنکھ بچ جائے تو اس معاملے کو مزید آگے نہ بڑھاؤ۔'' میمنون خواتین سے

ترک تعلقات، کھیل کود، جھگڑے نمٹنے سے دور رہنے اور پھر کبھی عدالت میں نہ جانے کا ارادہ کر کے گھر واپس ہو گیا۔ اُس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، جھگڑا کہیے، بے عزتی کہیے، اُس نے یہی طے کیا کہ اب دوسری طرز کی زندگی گزارے گا۔

حیرت، شکستگی اور ملال کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ جیسے ہی اپنے گھر میں داخل ہونے کو تھا، اُس نے دیکھا کہ کچھ سرکاری افسر اُس کے گھر کا ساز و سامان باہر نکال رہے ہیں تاکہ اُس کے قرض خواہوں کو ادائیگی کی جاسکے۔ وہ تقریباً مردے کی سی بے بسی کے ساتھ ایک درخت کے نیچے گر پڑا۔ اچانک اُس کی نظر صبح والی خوب صورت خاتون پر پڑی جو اپنے پیارے بچّا کے ساتھ جا رہی تھی۔ جب انھوں نے مرہم پٹی سے بندھے ہوئے میمنون کو دیکھا تو ایک زوردار قہقہہ لگایا اور چل دیے۔ رات کا دھندلکا پھیلنے لگا اور میمنون نے اپنے گھر کی دیواروں پر موجود گھاس پھونس سے بستر تیار کر لیا، تکان نے اُسے اپنی گرفت میں اس طرح لے لیا تھا کہ وہ ایک ہی لمحے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ اب وہ کسی ماورائی مخلوق کے ساتھ خواب کے ماحول میں خود کو دیکھ رہا تھا۔

روشن روشن خوب صورت پروں والی چھ ہستیاں اُسے نظر آئیں لیکن اُن میں سے نہ کسی کا سر تھا، نہ پاؤں اور نہ دُم۔ اور وہ ایک دوسرے سے مماثل بھی نہیں تھیں۔

''تم کون ہو؟'' میمنون نے پوچھا۔

''تمھاری ارفع و اعلیٰ دانش۔'' روح نے جواب دیا۔

''تو پھر میری آنکھ اور صحت بحال کرو۔ میرے حالات اور میری دانش خدارا مجھے دے دو۔'' میمنون نے کہا اور اپنے لٹنے پٹنے کی ساری داستان سنا دی۔

''یہ ایسے واقعات ہیں جو اُس دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوتے جس میں ہم رہتے بستے ہیں۔'' روح نے کہا۔

''تو تم کس دنیا میں رہتی ہو؟'' پریشان حال میمنون نے پوچھا۔

''میرا آبائی ملک۔'' ایک اور روح نے جواب دیا، ''سورج سے پچاس لاکھ میل دور ایک ستارے میں ہے جسے تم یہاں سے دیکھ سکتے ہو۔''

''بہت دل کش ملک ہے۔'' میمنون نے کہا، ''تو کیا یہاں کوئی کسی سادہ دل انسان کو دھوکا نہیں دیتا؟ کوئی عزیز دوست کھیل میں رقم نہیں جیت لیتا؟ اُس کی آنکھ نہیں پھوڑتا؟ کیا یہاں کوئی دغا باز دیوالیہ نہیں ہوتا؟ کیا یہاں کسی کو انصاف سے محروم نہیں کیا جاسکتا؟''

''نہیں۔'' ستارے کے باشندے نے کہا، ''ہمارے یہاں اس قسم کا کوئی عمل نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں کوئی بے وفا عورت نہیں ہوتی کیوں کہ ہمارے یہاں عورت ہی نہیں ہوتی۔ ہمیں کسی کی دعوت میں جانے کی نوبت ہی نہیں آتی کیوں کہ ہم نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں۔ ہمیں کسی دیوالیے سے واسطہ نہیں پڑتا، کیوں کہ ہمارے پاس نہ سونا ہوتا ہے نہ چاندی۔ ہماری آنکھیں کوئی بھی نہیں پھوڑ سکتا کیوں کہ ہمارے جسم تمھارے جسموں کی طرح نہیں ہوتے۔ کوئی اہل کار ہمارے ساتھ ناانصافی نہیں کرسکتا، کیوں کہ اپنی دنیا میں ہم سب برابر ہیں۔''

''خدا کو مانو۔'' میمنون نے کہا، ''عورتوں اور کھانے پینے کے بغیر تم کس طرح وقت کاٹتے ہو؟''

دانش و آگہی نے جواب دیا، ''دوسری دنیاؤں پر نظر رکھتے ہوئے جو ہمیں تفویض کی جاتی ہیں اور اب ہم تمھیں تسلی دینے کے لیے آئے ہیں۔''

''افسوس!'' میمنون نے جواب دیا، ''تم لوگ کل کیوں نہیں آگئے؟ میں اتنی ساری آفتوں سے بچ جاتا۔''

روحانی مخلوق نے جواب دیا، ''ہم تمھارے بڑے بھائی کے پاس تھے، وہ تم سے بھی زیادہ قابلِ رحم حالت میں ہے۔ عزت مآب سلطان نے، جہاں وہ خدمت انجام دے رہا تھا، کسی غلطی پر اُس کی دونوں آنکھیں نکلوا دیں۔ اب وہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا قید خانے میں پڑا ہے۔''

میمنون نے کہا کہ، ''کسی خاندان میں ایک دانش مند کا ہونا واقعی نعمت سے کم نہیں۔ دو بھائیوں میں سے ایک کانا ہوجائے اور دوسرا اندھا، ایک گھاس کے بستر پر سوئے اور دوسرا قیدخانے میں۔''

''تمھاری تقدیر جلد پلٹا کھائے گی۔'' ستارے کے باشندے نے کہا، ''یہ تو صحیح ہے کہ تمھیں اب تمھاری آنکھ تو کبھی نہیں ملے گی، البتہ اگر تم دوبارہ مکمل فلسفی بننے کے خنّاس میں مبتلا نہیں ہوئے تو کافی حد تک خوش اور مطمئن رہو گے۔''

''تو پھر کیا یہ ناممکن ہے؟'' میمنون نے پوچھا۔

''ہاں! اتنا ہی ناممکن جتنا ایک مکمل عقل مند کا ہونا۔ مکمل مضبوط، مکمل طاقت ور اور مکمل خوش وخرم رہنا۔ ہم خود اس سے بہت دور ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک دنیا ایسی بھی ہے جس میں یہ سب حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن کائنات کی وسعت میں پھیلی ہوئی کروڑوں، اربوں

دنیاؤں کے اپنے اپنے مقام اور مدارج ہیں۔ ایک دنیا میں دوسری دنیا کے مقابلے میں کم فلسفہ اور کم خوشی ہے جب کہ تیسری دنیا میں یہ صورتِ حال دوسری سے بھی کم ہے۔ اب یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے ایسے نقطے تک پہنچ جاتا ہے جہاں سب احمق اور بیوقوف نظر آتے ہیں۔''

میمنون نے کہا،''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ چھوٹا سا کرۂ ارض انھی کروڑوں اربوں دنیاؤں میں سے،جن کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے، ایک پاگل خانہ ہی ہے؟''

''بالکل تو نہیں،'' روح نے کہا، ''لیکن قریب قریب ہے۔ ہر چیز کو اپنے صحیح مقام پر ہونا چاہیے۔''

''تو کیا وہ شاعر اور فلسفی غلط ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ ہر چیز بہترین کاوش کے لیے ہے؟''

''نہیں، وہ صحیح کہتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ پوری کائنات کے مدارج اور تعلق کے زاویے سے اشیا پر غور کرتے ہیں۔''

''اوہ! میں اس پر اس وقت تک یقین نہیں کروں گا جب تک میری آنکھ مجھے دوبارہ نہ مل جائے۔'' بے بس میمنون نے کہا۔

○○○

لہجہ

وائی زیڈ چن
باقر نقوی

مجھے واقعی بہت اچھا لگتا ہے، جب میرے دوست نئے لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہیں۔ مجھے ان کا وہ مشفقانہ انداز اظہار بہت ہی پیارا لگتا ہے جب وہ کہتے ہیں، ''ان سے ملیے — یہ ہیں سینڈی (Sandy) — بے چاری بہری ہیں''، گویا میں ان کی شفقت کا ثبوت ہوں۔ یہ سن کر، ملنے والے نئے لوگوں کے چہروں پر اچانک آنے والے حیرت کے آثار بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، اور ان کا جلدی سے ہنس دینا، اور پھر ان کی وہ کوشش بھی اچھی لگتی ہے کہ وہ اپنا چہرہ ایسی کیفیت میں رکھیں جسے وہ سنجیدہ سمجھتے ہیں۔

اگر وہ یہ سب کچھ اچھی طرح کر لیتے ہیں تو میں آہستگی سے اپنے سر کو ان کی جانب موڑتی ہوں اور اپنے بالوں کو اُس کان کے پیچھے کر لیتی ہوں جو اُن سے قریب ترین ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ میرے کان میں لگے گلابی رنگ کے ہیرنگ ایڈ کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتے ہیں، جسے سن کر میرے دوستوں کے چہرے چمک اٹھتے ہیں۔

میں تو اب سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ واقعی ہیرنگ ایڈ جمع کرنے کو اپنا مشغلہ بنا لوں۔ یہ بُندوں کے مقابلے میں تو اچھے ہی ہوں گے!

ایک دفعہ میں نے ہیرنگ ایڈ اور ان کو چھپانے کی چیزوں کے بارے میں اشتہار دیکھا تھا۔ مختلف نوعیت اور رنگوں کی وہ ساری مصنوعات فیشن کے لیے تھیں۔ یہ تو بالکل اُس قیمتی ہینڈ بیگ کی جیسی بات ہوئی جو ایستھر (Easther) کے والد نے اسے خرید کر دیا تھا، جب وہ ہائی

اسکول میں تھی۔ ہم سب ساتھی اس کی تعریف ہی کر سکتے تھے، اس کی نقل نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کہ ہمارے والد اتنے امیر کبیر نہیں کہ ہمیں اس طرح خراب کر سکیں۔ اور اب تو میں صرف ہیرنگ ایڈ ہی پہن سکتی ہوں۔ میری سہیلیاں سوائے gush کرنے کے، کر بھی کیا سکتی ہیں۔

سچ پوچھو تو، مجھے اپنا بہرہ پن ہی بہت اچھا لگنے لگا ہے۔

پہلے چند برس میرے لیے بہت مشکل تھے، جب کار کے اس حادثے کے بعد جب وہ نامعقول ائر بیگ پھٹ پڑا تھا۔ مگر اب تو میری یہی کیفیت مجھے اپنے دوستوں میں ممتاز کرتی ہے۔ میرے قریبی دوستوں میں کوئی بھی نہیں جس کی سماعت میں خرابی ہو۔ میں پیدائشی بہری تو نہیں۔

جب تک میری سماعت ختم نہیں ہوئی تھی، میرے حلقۂ دوستاں میں بہت سے لوگ تھے، اور ان میں سے بیشتر ڈراموں میں کام کرنے کے لیے بھاگتے رہتے تھے۔

آپ جب اپنے دوستوں کی بات کرتے ہوں تو انھیں مختلف نام دیتے ہیں: مثلاً ڈریو (Drew) بار والا، کیرل (Carol) نسوانیت والی اور گریگ (Greg) جو ایسا شاطر کہ اپنی زبان سے چیری کی شاخوں کو بھی باندھ دے؛ ہے نا؟ اور میں ہوں سینڈی، بہری لڑکی۔ مجھے تو یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھ میں نہ کوئی اور خصوصیت ہے، نہ ہنر۔ نہ کبھی کچھ تھا۔

یہ بات دراصل ممتاز کر دینے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ یقیناً، میری زندگی میں بہت سے واقعات نہ ہوئے ہوتے، یا اس طرح نہ ہوا ہوتا، اگر میں یہ گلابی رنگ کا ہیرنگ ایڈ نہ پہنتی ہوتی۔ مثال کے طور پر کالن (Colin) کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔

کالن سے میری ملاقات ایک گھریلو پارٹی میں ہوئی تھی۔ جب کیرل نسوانیت والی نے ہم دونوں کا تعارف کرایا تھا۔ اس وقت میں نے فوراً اپنے دونوں کانوں کے پیچھے اپنے بال کر لیے تھے اور حسب معمول اس کے قریب ہو گئی تھی، اس لیے نہیں کہ اس نے کوئی کمال کا کام کیا تھا، مگر اس لیے کہ واقعی وہ بڑا ہیرو جیسا لگ رہا تھا۔ کاش آپ نے اس کی اچانک حیرت، اور فوراً سنبھلنے کی کوشش میں اس کی مسکراہٹ دیکھی ہوتی۔

ہاتھ ملانے کے بعد ہم کچھ مشروب کی تلاش میں ادھر اُدھر بڑھے، اور اس طرف لپکے جس جگہ بار جیسی کوئی شے بنی ہوئی تھی، اور صوفے رکھے ہوئے تھے۔ اس دوران کیرل کہیں غائب ہو گئی تھی۔

''کیا تم ہونٹوں کی حرکت دیکھ کر بات سمجھ سکتی ہو؟— یا تم اشاروں کی زبان سے بھی کام لیتی ہو؟'' چند لمحوں بعد کالن نے پوچھا۔

''میں زیادہ تر ہونٹوں کی حرکت ہی سے بات سمجھ لیتی ہوں، اس لیے کہ اشاروں کے مقابلے میں یہ زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اگرچہ اس وقت، صرف یہی وجہ نہیں تھی کہ میں تمہارے ہونٹوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔'' میں نے جواب میں کہا۔

وہ، کچھ سمجھ کر، ہنس دیا۔ اس نے اور بھی باتیں کیں۔ پھر پارٹی کے میزبان نے موسیقی کی آواز بڑھادی تھی، ڈانس فلور کے لیے روشنی مدھم کر دی تھی۔ اور میں اس کے زیادہ قریب ہوگئی تھی تاکہ اس نیم تاریکی میں اس کے ہونٹوں کو پڑھ سکوں — اور میں اس کے ہونٹوں کو پڑھ رہی تھی۔

ہم دونوں نے معمول کے کام کیے، فون نمبر کی تبدیلی کی — اور ایک ہفتے بعد کالن نے غیر متوقع طور پر مجھ سے رابطہ کیا۔ ہم ایک ساتھ باہر نکلے — اپنے آپ کو مطمئن کیا کہ ہوش کے عالم اور روشنی میں بھی ٹھیک ٹھاک ہیں، اور اس دوران میں اس کے ہونٹ پڑھتی رہی تھی۔

دو ماہ کے اندر ہی میں اور کالن بہت قریب آ گئے تھے۔

حادثے کے بعد کالن پہلا مرد تھا جو میری زندگی میں آیا تھا۔

اب میں اس کے بارے میں سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ حادثے کے بعد کی میری افسردہ جنسی زندگی کہیں میرے احساسِ خود آگہی کی وجہ سے تو نہیں۔ پتا نہیں۔ میں ان دنوں کو یاد بھی نہیں کرنا چاہتی جو مجھ پر بہت بھاری گزرے تھے۔

بلاشبہ، کچھ مشکلات بھی ہوئیں اور شاید میری جانب سے کچھ بدسلیقہ پن بھی رہا۔

ہماری چوتھی ملاقات پر کالن نے مجھے فلم دیکھنے کے لیے اپنے فلیٹ پر مدعو کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا طریقۂ کار یہی تھا، اور میں یہ کہہ نہیں سکتی کہ میرے لیے یہ متوقع نہیں تھا، حالانکہ مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا — کیا اسے احساس نہیں کہ شاید وہ غلطی کر رہا ہے؟

ہم نے روشنی گُل کر دی، اور، ظاہر ہے کہ فلم کے سب ٹائٹل چلا دیے گئے تھے۔ فلم آدھی ہوئی تھی کہ مجھے عجیب سی بے سمتی کا احساس ہوا۔ گویا کالن پگھل کر صوفہ بن گیا ہے — اور میں اس پر بیٹھی ہوئی ہوں — اور کالن غلاف کی طرح مجھ پر چھا سا گیا ہے — اور میں تنہا، تاریکی میں تیر رہی ہوں — اور چند فٹ کے فاصلے کی روشن دھڑکتی ہوئی دوسری دنیا سے اپنی نظریں ہٹا نہیں سکتی۔ یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اور پھر کالن میری طرف جھکا اور سرگوشی میں میرے خراب بائیں کان میں کچھ پیاری پیاری باتیں کہنے لگا۔ مگر میرے کان میں سوائے گرم گرم ہوا کے کچھ بھی نہیں گیا۔

میں نے اسے دھکا دے کر پرے کر دیا۔ شاید میرے نصیب نے مجھ کو یاد دلا دیا تھا کہ میں بہری بھی ہوں — اور ساتھ اندھیرا بھی ہے — یعنی دو قسم کے احساسات کی کمی مجھے بہت

بھاری محسوس ہوئی۔

ہمارے درمیان یہ پہلی مشکل تھی جو محسوس ہوئی۔ مگر یہ اتنی خفیف تھی کہ فوراً ہی زائل ہوگئی— میری باقی رات اس تحقیق میں گزری کہ اس کے ہونٹ کن طریقوں سے استعمال ہوں کہ میں اندھیرے میں بھی سب کچھ سمجھ سکوں۔

کالن کو سبق مل گیا۔

اور اس طرح ایک دوسرے کے انوکھے پن کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ کبھی کبھی میں یہ بھی سوچتی تھی کہ ہمارے درمیان کا رشتہ اس کے لیے دل چسپ ہوگا— اسی طرح جیسے کسی ایسے کھیل کے درمیان، جس میں پہلے سے مہارت ہو، کوئی موڑ آجائے، اور وہ کھیل ایک بار پھر چیلنج بن جائے۔ جہاں تک میں سمجھ پائی تھی، وہ جنسی کھیل بڑی خوبی سے کھیل رہا تھا۔

ہمارے رشتے کی پہلی سال گرہ پر وہ تیئیس برس کا تھا۔ میں نے اسے ریمسٹائن کنسرٹ (Rammstein concert) کے دو ٹکٹ تحفے میں دیے۔ میں جانتی تھی کہ اسے وہ بینڈ بہت پسند تھا— جب میں نے اس کے سامنے ٹکٹ لہرائے تو وہ چونک کر ہنسنے لگا— مگر پھر اچانک خاموش ہوگیا تھا۔

''سینڈی— کیا واقعی تم سنجیدہ ہو؟— میرا مطلب ہے— کیا تم کنسرٹ کا لطف اٹھا سکوگی؟''

میں نے فوراً اپنے بائیں کان کے پیچھے اپنے بال کیے اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''سب سے پہلی بات، کون کہتا ہے کہ میں کنسرٹ کا لطف اٹھانا چاہتی ہوں؟ مجھے اس قسم کا ہنگامہ، سر پھاڑ دینے والا شور کبھی پسند نہیں آیا— تم لوگ جسے موسیقی کہتے ہو۔''

''ہُوں!''

''دوسری بات، ایک حد سے زیادہ ہر بلند آواز مجھے سنائی دیتی ہے، سمجھے؟''

''تو ہم کنسرٹ ضرور چلیں گے۔''

کالن کی مسکراہٹ پر مجھے پیار آرہا تھا۔ میں نے اپنے دوسرے کان کے پیچھے بھی اپنے بال کر لیے۔

ریمسٹائن کنسرٹ میں سچ مچ بہت لطف آیا۔

میں نے اُسے پہلے کبھی اتنا پُر جوش نہیں پایا تھا۔ کیا بتاؤں کہ اُس میں کتنی پھرتی بھر گئی تھی۔ بعد میں— پھر میں نے اسے اس حال میں نہیں پایا۔ ہم بینڈ سے اتنے زیادہ قریب نہیں تھے کہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتے، اس لیے کہ میں نے بالکل سامنے کی قطار کے ٹکٹ لینے پر زیادہ رقم

خرچ نہیں کی تھی۔ کالن تو صرف موسیقی کا دیوانہ تھا۔ میں تو اس وقت بس اس کے کان کے پردوں کا تصور کر رہی تھی؛ کان کے دونوں پردے کسی پاگل آدمی کی طرح اُچھلتے کودتے — اور اس کے اندر کی مسلسل ہیجانی کیفیت کے بارے میں، جسے آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

فوراً ہی، ایک لمحے کے لیے، مجھ میں جذبۂ رقابت جوش مارنے لگا تھا۔ مگر، میرے ذہن میں ابھرنے والے کسی خیال نے نوکِ زباں پر آئے ہوئے لفظ ''مگر میں ہی کیوں؟'' ادا نہیں کرنے دیے۔

رات کا زیادہ وقت کالن کو دیکھتے گزرا تھا — اس کی اچھل کود — چیخ پکار — دانت پیسنا — رنگین روشنیوں میں پھسلتے ہوئے اس کے پسینے کے قطرے، جیسے وہ زندہ ہوں اور چل رہے ہوں۔

گٹار کی بلند آواز اور چیخ پکار میرے لیے ٹھیک ہی تھی، فرشِ زمیں کی لرزش سے میں ڈھول کی دھمک محسوس کر رہی تھی۔ مگر، ظاہر ہے کہ اس طرح نہیں جیسے کہ سماعت والے سنتے ہیں۔

ڈیڑھ ماہ بعد، کالن نے میری سال گرہ پر تحفے میں دو ٹکٹ دیے۔ وہ ٹکٹ اس کی پتلون میں لگی پٹی میں اُڑسے ہوئے تھے، اور مجھے اسی وقت نظر آئے جب اس نے اپنی قمیص اتاری تھی۔ یہ ٹکٹ، ایک کتاب کی دُکان میں، بے حد پیاری ادیب، ایملی بارنس (Emily Barnes) کے ہونے والے جلسے کے تھے جس میں وہ شائق قارئین کو اپنی کتابوں پر دستخط دینے والی تھی۔

''معاف کرنا، یہ پروگرام آج نہیں، اگلے ہفتے ہے! مگر، میں نے سوچا، اس طرح ہم ایک بار پھر، تمھاری سال گرہ منالیں گے۔'' اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

میں خوشی سے اُچھل پڑی۔ اگلے ہفتے تک میں نے اس کی موجود ساری کتابیں ایک بار پھر پڑھ ڈالی تھیں۔ اب میں اس الجھن میں تھی کہ دستخط کے لیے اُس دن چار کتابوں میں سے کون سی کتاب لے چلوں، اس لیے کہ ایک آدمی کو صرف ایک کتاب پر دستخط ملے گی۔ جب میں نے اس سے بھی دستخط کے لیے قطار میں لگنے کا وعدہ لیا تو کالن مجھ پر بہت ہنسا اور بولا، ''تم تو بالکل چھوٹی سی بچی کی طرح ہوگئی ہو۔''

اس دن ہم بہت پہلے ہی کتاب گھر پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے دُکان کا ایک حصہ خالی کرنے کے لیے بہت سی الماریوں کو ڈھکیل کر ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ اس طرح وہ دُکان میری یادداشت کے مقابلے میں بہت زیادہ گھنی لگ رہی تھی، ایک جادوئی جنگل کی طرح جو رات بھر میں پیڑوں سے بھر گیا ہو۔ عارضی طور پر بنایا گیا اسٹیج، اس کے سامنے کرسیوں کی قطاریں، جن پر لوگ اس طرح بیٹھے تھے گویا عبادت کے لیے جمع ہوئے ہوں۔

کالن میرا ہاتھ پکڑے مجھے آخری قطار میں لگی کرسیوں کی طرف لے چلا۔ میں نے احتجاج

کیا تو اس نے مسکرا کر ان لاؤڈ اسپیکروں کی طرف اشارہ کیا جو بالکل ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

''مگر، ہم آگے بیٹھیں تو میں اس کے ہونٹ پڑھ سکوں گی۔''

''مگر یہ قرأت کا مقام تو نہیں، کیوں؟''

''مگر...''

''تمھیں اس کی تحریریں پسند ہیں یا اس کی شکل؟ تم اس کی تحریروں کے بارے میں اس کے اپنے خیالات سننا چاہو گی، یا بس اس کا چہرہ دیکھنا پسند کرو گی؟''

میں ایمیلے بارنس کی دو کتابیں بغل میں دابے بیٹھ گئی، شام سے مطمئن، ایمیلی بارنس سے، اور کالن سے۔ میں آج بھی سوچتی ہوں، کہ وہی بہتر ہوتا۔

ٹھیک چھ بجے شام دُکان کی منیجر عارضی اسٹیج پر جا پہنچی۔ فیروزی سبز رنگ کی اس کی ایڑی بڑی نازک اور غیر محفوظ سی تھی، اور میں ہر قدم کے ساتھ کی کھٹ کھٹ آواز کا تصور ہی کر سکتی تھی۔

''خواتین و حضرات، خوش آمدید!'' اس نے کہا۔

لاؤڈ اسپیکر کا نظام اچھے درجے کا نہیں تھا۔ اور سچ پوچھو تو کتابوں کی دُکان اس قسم کے کام کے لیے تیار نہیں کی گئی تھی، پھر بھی میں اگر فوکس کرتی تو ایمیلی بارنس کے لیے کہے گئے تعارفی کلمات کا ہر لفظ سمجھ سکتی تھی۔ کالن نے ہولے سے میرا ہاتھ دبایا اور میری طرف دیکھ کر ابرو سے اشارہ کیا۔ میں نے بہت محبت سے اس کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے بعد ایمیلی بارنس خود اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ ہمارے آگے کی قطار سے اسٹیج تک کے سارے ہاتھ تالیاں بجا رہے تھے۔ ایمیلی نے سر کو خم کیا، مسکرائی، اور منیجر کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے مائیکروفون لے لیا۔

میرے عقب کے اسپیکروں سے اس نے ''ہیلو'' کہا۔ ایک لمحے توقف کے بعد وہ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرئی اور بولی، ''میں ایسی چیزیں کبھی پسند نہیں کرتی۔''

اور پھر اس نے جھک کر اسٹیج کے فرش پر مائیکروفون رکھ دیا۔ کھڑی ہوئی، اور اس کے ہونٹوں نے حرکت شروع کر دی۔ پہلے تو میں اس پر غور ہی نہیں کر پائی تھی، یا اگر کیا تھا تو چند دقیقوں کے لیے میرا ذہن اس کے پہلے چند سیکنڈ کو process نہیں کر پایا تھا۔ میں حیرت میں ڈوب گئی۔

ایک سیکنڈ بعد، جب میں نے ایمیلی بارنس کے لبوں کی حرکت کو پڑھنا شروع کیا، تو مجھے محسوس ہوا کہ کالن کی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں چار کیں۔ اور اس نے میری طرف اپنا ہاتھ بلند کرنا شروع کیا۔

''نہیں!'' میں نے پھنکارتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کالن نے ایمیلی بارنس کی طرف غصے سے دیکھا۔ اس کے ماتھے کے بل، اور اس کی چڑھی ہوئی تیوریوں کو دیکھتے ہی، اچانک میرے ذہن میں ریمسٹائن کنسرٹ میں اس کی حرکات کی ویڈیو چلنی شروع ہو گئی۔ کتنا پُر جوش تھا اُس دن وہ۔ اس کی اچھل کود — اس کی چیخ پکار — اس کا دانت نکالنا — اور کنسرٹ کی رنگین روشنیوں میں اس کے پسینے کے قطروں کا اس طرح بہنا گویا وہ زندہ ہوں!

''نہیں!'' سختی سے میں نے اس سے کہا تھا۔ میں اپنی پلاسٹک کی کرسی پر ہی بیٹھی رہی، اور میرے ذہن میں چلتی ہوئی اس کی سال گرہ کی ویڈیو نے اچانک مجھ میں خوش رہنے — جوش میں آنے — اُچھلنے کودنے — چیخنے اور دانت نکالنے کی خوں خوار ترین خواہش پیدا کر دی تھی۔ اور میں نے فوراً ہی طے کر لیا تھا کہ میں اب خوش رہوں گی — یہیں — اور ابھی سے — اپنے سال گرہ کے تحفے کے ساتھ۔

''کیوں نہیں؟'' کالن نے پلٹ کے حیرت سے پوچھا۔

''میں اس کے ہونٹوں سے اس کے لہجے کے اظہار کو پڑھ سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا؟؟؟''

''ششش...''

میں کھڑی ہوئی، ایک ایک انچ سرکتے ہوئی، نکلے ہوئے گھٹنوں سے گزرتی ہوئی چلتی رہی جب تک کہ میں ایسی جگہ نہیں پہنچ گئی جہاں میں کسی کی آڑ بنے بغیر کھڑی رہ سکتی۔ کالن کچھ دیر تو اپنی پلاسٹک کی کرسی ہی میں بیٹھا رہا، مگر بالآخر وہ آیا اور پیچھے سے اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ میں نے اسے مڑ کر دیکھا اور مسکرائی۔ اسی قسم کی مسکراہٹ تھی جیسی میں اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ اس دن ایمیلی بارنس کی قرأت غیر معمولی تھی۔ اس نے اپنے الفاظ میں زندگی پھونک دی تھی۔ انھیں اس طرح زندہ کر دیا تھا، جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے لب حرکت کرتے، کھلتے، بند ہوتے، حرکت کرتے، اور میں اس کی سبک افسردگی، محتاط خوشی اور مہذب افسوس کو صاف سن رہی تھی جو ہمیشہ سے اس کی نثر میں موجود تھے، مگر اس دن سے پہلے کبھی دریافت نہیں ہوئے تھے۔

''تم اس کے لبوں کو پڑھتے ہوئے اس کے لہجے/اظہار کا تعین کیسے کر لیتی ہو۔'' واپسی پر کالن مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

میں دستخط شدہ کتابوں کی طرف دیکھ کر صرف مسکرا دی تھی۔

''یہ تو بڑا ہی احمقانہ سوال ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے نابینا لوگوں سے پوچھا جائے کہ سوتے میں وہ خواب کس طرح دیکھتے ہیں۔''

میں تیز تیز چلنے لگی۔ کالن ساتھ چلتا رہا۔ اپنے فلیٹ واپسی تک ہم نے کوئی بات نہیں کی۔

اگر جنگل میں کوئی پیڑ گرتا ہے، اور کوئی اس کی آواز نہیں سنتا، تو کیا اس سے آواز پیدا ہوتی ہے؟ اگر دو لوگ بحث کرتے ہیں، اور ان میں سے ایک دلیل کو نہیں سنتا، تو کیا نقصان کو ختم کیا جا سکتا ہے؟

اس جلسے کے ایک ہفتے بعد پہلی بار میں اور کالن لڑ پڑے تھے۔ وہ ہماری ایک عرصے سے طے شدہ دعوت کو منسوخ کرنا چاہتا تھا۔ وجہ، اس کے فلم ساز دوست کی پہلی فلم کی مہورت تھی۔

''مہورت؟ کیسی مہورت؟ اور وہ بھی اس g.....f تہ خانے میں، لاحول ولا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے — اچھا ہے — اس کی خصوصیت کم سرمایے سے فلمیں بنانا ہے، اس کے علاوہ، اس نے اس فلم پر پورا ایک damn برس صرف کیا ہے، سمجھیں؟ — تم تو فلموں کو سمجھ ہی نہیں سکتیں، بس!''

''خبردار، جو تم نے مجھ سے اس لہجے میں بات کی۔''

مجھے اس کی خاموشی کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر اس نے کہا، ''...ٹھیک — تم میرے ہونٹوں کی حرکت سے میرے لہجے کا اظہار سمجھ سکتی ہو۔ یہی نا... ٹھیک ہے۔''

اور وہ چلا گیا۔ مہورت میں۔

اس کے بعد سے میں گرتی چلی گئی۔ اور میرا خیال ہے کہ ہم دونوں بجھ رہے تھے۔

ہمارے آخری جھگڑے میں، وہ مجھ پر اتنی زور سے چیخا تھا کہ میں سمجھی کہ میری سماعت واپس آ گئی ہے۔

''میں تم سے الگ ہو رہا ہوں!''

ایک لمحے تک میں نے کچھ نہیں کہا، اور جب کہا تو بس اتنا... ''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''کیوں!'' اس نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا، ''کیا تم میرے ہونٹ پڑھ کر بتا نہیں سکتیں کہ میں سنجیدہ ہوں یا نہیں؟''

اور بس، یہی آخری منزل تھی۔

اور، میں اور کالن ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

میرے ذہن میں اس رشتے کے آخری چند ماہ کی کچھ خوب صورت یادیں اب بھی محفوظ ہیں۔ سب سے زیادہ واضح یادیں اس وقت کی ہیں جب کالن مجھ سے کانوں کی پیچھے بال کرنے پر فساد کر رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا، ''تم اسی طرح اچھی لگتی ہو۔ تو اب یہ کیوں نہیں کرتیں؟''

میں نے کالن کو کبھی نہیں بتایا تھا کہ کبھی وہ مجھ پر اتنی زور سے چلاتا ہے کہ مجھے اس کے لہجے کی آواز کو سمجھنے کے لیے ہونٹ پڑھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ کالن کو کبھی علم نہیں ہو پایا تھا کہ کس درجے پر آواز پہنچتی ہے جب میں اس کو صاف سن سکتی ہوں۔ میں نے اس کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ویسا نہیں ہے، جیسا کہ میں اسے سمجھی تھی۔ اس لیے کہ، ظاہر ہے، میں کبھی اس کی آواز سن نہیں پائی تھی، جب تک کہ اس نے چلانا اور مجھ کو بُرا بھلا کہنا شروع نہیں کر دیا تھا۔

میں نے اپنے بال کٹوا لیے ہیں۔

اب تو بال بہت چھوٹے ہو گئے ہیں۔ اور کان میں لگا میرا چمک دار سبز رنگ کا نیا ہیرنگ ایڈ بہت خوب صورت لگتا ہے۔ مجھے اب بھی بہت اچھا لگتا ہے، جب میرے دوست نئے لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہیں۔ کبھی تو میں بالکل بھول ہی جاتی ہوں کہ میرے بال کٹ چکے ہیں، اور لاشعوری طور پر کانوں کے پیچھے کرنے کے لیے میرا ہاتھ بالوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ مگر ردِ عمل پہلے جیسا نہیں رہا، اس لیے کہ ہیرنگ ایڈ اب خفیہ نہیں رہے ہیں۔ لوگ اب انھیں دیکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے، میری سہیلیاں پوچھتی ہیں۔ میں ان سے کہہ دیتی ہوں کہ یہ تو فطرتِ انسانی ہے۔ لوگ اس کو قبول نہیں کر پاتے کہ دوسرے لوگ وہ کچھ بھی دیکھ لیتے ہیں جو بظاہر انھیں نظر نہیں آنا چاہیے۔

اگر آپ کو UFOs نظر آئیں تو آپ خبطی ہیں۔

اگر آپ کو روحیں نظر آئیں تو آپ دھوکے باز ہیں۔

اگر آپ کو سچی محبت نظر آ رہی ہو، جب کہ وہ آپ کو صرف بستر میں لے جانا چاہتا ہو تو آپ چھنال ہیں۔

اور اگر آپ صرف اس کے ہونٹوں کی حرکت سے اس کی آواز کا لہجہ پڑھ سکیں تو آپ خراب گرل فرینڈ ہیں، اور بہری تو ہیں ہی۔

○○○

کاٹھ کباڑ کا ڈھیر

گنٹر گراس

باقر نقوی

جرمن ناول نگار گنٹر گراس بیس ویں صدی کے اُن ادیبوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے جنھیں عالمی سطح پر شناخت حاصل ہوئی۔ اُس نے ایک بھرپور اور سرگرم زندگی گزاری اور اپنے تجربات کو کامیابی سے فن کا حصہ بنایا۔ اُسے ۱۹۹۹ء میں ادب کا نوبیل انعام دیتے ہوئے کہا گیا:

اُس کی شوخی بھری مگر سنگین حکایتیں تاریخ کے فراموش
کردہ چہرے کی پیکر تراشی کرتی ہیں۔

گنٹر گراس نے متعدد ناول تخلیق کیے، لیکن سب سے زیادہ شہرت اس کے The Tim Drum کو حاصل ہوئی۔ باقر نقوی نے اس کا ترجمہ "نقارہ" کے نام سے کیا ہے، جو اردو میں اس معروف ناول کا پہلا ترجمہ ہے۔ زیرِ نظر ترجمہ اس ناول کا ایک باب ہے۔

ملاقات کا دن ہے۔ ماریا میرے لیے ایک نیا نقارہ لائی ہے۔ میرے پلنگ کے گرد لگے چھڑوں کے اوپر سے مجھے نقارہ تھماتے ہوئے، اس نے دُکان کی رسید بھی دینی چاہی تھی، مگر میں نے لینے سے انکار کردیا، اور سرہانے لگے گھنٹی کے بٹن کو اس وقت تک دبائے رکھا جب تک کہ میرا نگہبان برونو آنہیں گیا تھا اور، جب بھی ماریا میرے لیے نیا نقارہ لاتی ہے، اس نے وہی کچھ کیا ہے، جو وہ ہمیشہ کرتا رہا ہے۔ اس نے ڈبے پر بندھا فیتا کھولا، نیلے کاغذ کو خود بہ خود کھل جانے دیا جو نقارے کے گرد لپیٹا گیا تھا، نقارے کو بہت احترام سے باہر نکالا، اور نیلے کاغذ کو

احتیاط سے تہہ کیا۔ اس کے بعد وہ چلا— اور جب میں چلا کہوں تو اس کا مطلب آگے بڑھنا ہوتا ہے— واش بیسن کی طرف، اس نے گرم پانی کی ٹونٹی کھولی، اور اس احتیاط سے کہ نقارے پر لگی ہوئی سرخ و سفید رنگ کی پالش پر نشان نہ پڑ جائے، نقارے پر چسپاں قیمت کی پرچی کو الگ کر دیا۔

جب ایک مختصر ملاقات کے بعد، جس میں اسے زیادہ تکلیف نہیں اٹھانی پڑی تھی، ماریا نے جانے کی تیاری کی تو پرانے نقارے کو اٹھایا، جس کو میں، ہربرٹ ٹروزنسکی کی پشت کی داستان کے بیان، بحری جہاز کے چوبی نشان کی کہانیوں، اور Corinthians کے لیے لکھے جانے والے مراسلوں کی اپنی من مانی تشریح کے دوران تقریباً اچھی طرح تباہ کر چکا تھا۔ وہ اس نقارے کو گھر لے جا کر تہہ خانے میں ایک ساتھ اُن تمام تباہ شدہ نقاروں کے ساتھ، جن کے ذریعے میں اپنے نجی اور پیشہ ورانہ مقاصد پورے کر چکا تھا، محفوظ کر دینے والی تھی۔ ”تہہ خانے میں تو اب زیادہ جگہ باقی نہیں رہی ہے۔“ اس نے ایک آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا، ”اب میں موسم سرما کے لیے اپنے آلو کس جگہ رکھوں گی؟“

میں، ماریا کے اندر پوشیدہ گھر والی کی شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس طرح مسکرایا گویا میں نے کچھ سنا ہی نہیں، اور اس کو کچھ ہدایات دیں۔ استعمال شدہ نقاروں کو سیاہ روشنائی سے نمبر لگائے جانے چاہییں، اور اُن مختصر تفصیلات کو، جو میں ہر نقارے کے کردار کے بارے میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر لکھ چکا ہوں، میری ڈائری میں منتقل کیا جانا چاہیے جو ایک عرصے سے تہہ خانے کے دروازے کی اندرونی جانب ٹنگی ہوئی ہے، اور ۱۹۴۹ء سے ہر نقارے کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔

ماریا نے فرماں برداری کے انداز میں اپنا سر ہلایا اور مجھے الوداعی بوسہ دیا۔ وہ کبھی میرے اس انداز کو سمجھ نہیں سکی ہے، بلکہ وہ تو اس کو تقریباً پاگل پن سمجھتی ہے۔ اب آسکر دیکھ سکتا ہے کہ ماریا کو کیا محسوس ہوتا ہے، کہ وہ خود بھی تباہ شدہ نقاروں کو جمع کرنے کے اپنے اس تفاخر کو سمجھ نہیں پایا ہے۔ اس کا سب سے تعجب خیز حصہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر آلو رکھنے کے تہہ خانے میں جمع اس کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ وہ تجربے کے باعث جانتا ہے کہ بچے اپنے باپ کی جمع شدہ اشیا کی پروا نہیں کیا کرتے، کہ اس کا اپنا بیٹا کرٹ بھی ان قابل افسوس نقاروں پر اسی قسم کی نظر ڈالے گا جب یہ اس کو وراثت میں ملیں گے۔

تو پھر، ہر تین ہفتے بعد میں ماریا کو کیوں یہ ہدایات دیتا رہتا ہوں، جن پر اگر عمل کیا جاتا رہا تو، ایک دن ہمارے تہہ خانے میں بالکل جگہ نہیں رہ جائے گی، اور آلوؤں کو وہاں سے نکال

باہر کرنا ہوگا؟

یہ خیال، جو اکثر و بیشتر میرے ذہن میں سر ابھارتا ہے، حالانکہ اب اس میں کمی آتی جا رہی ہے، کہ کسی دن کوئی عجائب گھر میرے ان از کار رفتہ نقاروں میں دل چسپی لے گا، مجھے اس وقت آیا تھا جب کئی درجن نقارے تہہ خانے میں جمع ہو چکے تھے، گویا یہ خیال میرے جمع کرنے کے جنون کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ میں جتنا زیادہ اس بارے میں سوچتا ہوں اتنا ہی میرا خیال مجھے ایک سادہ سے مفروضے کی طرف لے جاتا ہے— خوف! کمی کا خوف۔ یہ خوف، کہ کسی دن نقاروں پر پابندی لگا دی جائے گی، کہ ان کے موجودہ ذخیرے تباہ کیے جا سکتے ہیں۔ ایک دن آسکر کو مجبوراً چند نقاروں کو نکال کر ان کی مرمت کرانی پڑے گی تاکہ اس خوف ناک عارضی عرصۂ بے نقارگی میں بھی میرا کام چلتا رہے۔

دماغ کے اسپتال کے ڈاکٹر بھی اس قسم کی تشریح پیش کرتے ہیں، مگر وہ اس کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر (مس) ہارن سٹر کو وہ تاریخ معلوم کرنے کا تجسس تھا، جس دن سے میری یہ پیچیدگی شروع ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس کو بتا دیا تھا، نومبر ۱۹۳۸ء کی نویں تاریخ، اس لیے کہ اسی دن مارکس سگکس مُنڈ مجھ سے جدا ہو گیا تھا، جو مجھے نقارے فراہم کیا کرتا تھا۔ میری ماں کے انتقال کے بعد سے ضرورت کے وقت مجھے نقاروں کا حصول مشکل ہو گیا تھا؛ اس لیے کہ پھر وہ جمعراتیں نہیں آتی تھیں جب ہم ''آرسینل پیسیج'' جایا کرتے تھے، ماتسیرات مجھے بہت بے دلی سے نقارے فراہم کرتا تھا، اور جان برانسکی کی مجھ سے ملاقاتیں بھی خال خال ہی ہوتی تھیں۔ اب، جب کہ کھلونوں کی دکان تباہ ہو گئی تھی، میری حالت واقعی دگرگوں ہو گئی تھی۔ مارکس کے خالی میز پر بیٹھے رہنے سے مجھ پر صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اب مارکس مجھے نقارے فراہم نہیں کر سکے گا؛ کہ اب وہ کھلونے فروخت نہیں کرے گا؛ کہ اب خوب صورت سُرخ و سپید نقارے بنانے والوں سے اس کے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔

مگر، اس وقت میں یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا کہ مارکس کی موت کے ساتھ ہی میرے نسبتاً پُرسکون کھیل کود کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ کھلونوں کی تباہ شدہ دکان سے میں نے ایک ثابت نقارہ، اور دو کنارے پر جزوی نقصان شدہ نقارے منتخب کیے، اور اپنے خزانے سمیت گھر جاتے ہوئے میں اس تصور میں تھا کہ مشکل دنوں کے لیے میرے تحفظ کا سامان ہو گیا ہے۔

میں اپنے نقاروں کے بارے میں بہت محتاط ہو گیا تھا۔ میں اشد ضرورت کے وقت ہی نقارہ بجاتا تھا۔ میں نے پوری پوری شاموں کی، اور ناشتے کے وقت کی، نقارہ نوازی بھی ختم کر دی

تھی، جو اَب میرے لیے قابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ آسکر کا طرزِ اب فقیرانہ ہو گیا تھا۔ اس کا وزن کم ہونے لگا تھا، اور اسے ڈاکٹر ہولاتز اور اس کی معاون سسٹر انگے کے پاس لے جایا گیا تھا، جو خود بھی رفتہ رفتہ ہڈی چمڑا ہوتی جا رہی تھی۔ انھوں نے مجھے میٹھی، کھٹی، کڑوی اور کسیلی دوائیں دی تھیں اور میرے غدود کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا، ڈاکٹر ہولاتز کے خیال کے مطابق، جنھوں نے کم تیز اور زیادہ تیز حرکات کے باعث میری جسمانی ساخت کو نقصان پہنچایا تھا۔

ڈاکٹر ہولاتز کے چنگل سے رہائی پانے کے لیے آسکر نے اپنے طرزِ فقیرانہ میں اعتدال پیدا کیا، اور اپنا وزن بڑھا لیا تھا۔ ۱۹۳۹ء کے موسمِ گرما تک وہ اپنی تین برس پُرانی حالت میں واپس آ چکا تھا، مگر اپنے گال کو متناسب بنانے کی کوشش کے دوران مارکس کے نقارے کو ناقابلِ مرمت حد تک تباہ کر لیا تھا۔ وہ شے جو اس کے پیٹ پر لٹکی ہوتی تھی وہ ایک قابلِ رحم کھنڈر، زنگ آلودہ اور سوراخوں والی تھی؛ اس کا سُرخ و سپید رنگ تقریباً ختم ہو چکا تھا اور اس میں سے آواز بھی رنجیدہ سی نکلتی تھی۔

ماتسیرات سے امداد کی طلب فضول تھی، حالانکہ وہ مددگار، اور اپنے طرز میں ایک مہربان انسان تھا۔ میری بے چاری ماں کی موت سے قبل، اس کو سوائے اپنی پارٹی کی مصروفیات کے کچھ بجھائی نہیں دیتا تھا؛ اور جب اسے اپنے ذہن کو کسی اور طرف لگانے کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے یونٹ کے پارٹی لیڈروں سے گفت و شنید کرتا تھا۔ یا آدھی رات کے قریب، جب خاصی مقدار میں شراب پی چکا ہوتا تھا، تو وہ زور زور سے، سیاہ فریم میں لگی ہٹلر اور بیتھوون کی شبیہوں سے خفیہ گفتگو کرتا، جب کہ وہ جینئس اس سے مقدر کی اور فیوہرر دور اندیشی کی باتیں کرتا تھا۔

میں چندہ جمع کرنے والے اتوار کے دنوں کی بات نہیں کرنا چاہتا۔ ان میں سے ایک دن تھا، جب میں نے ایک نیا نقارہ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ ماتسیرات جس نے "ہاؤیت استراسے" اور "اِسٹرن فلڈ اسٹور" کے قریبی آرٹ سنیما کے باہر چندہ جمع کرتے صبح گزار دی تھی، دوپہر کے قریب گھر واپس آیا اور ہمارے دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ کوفتے گرم کیے۔ کھانے کے بعد — مجھے اب بھی یاد ہے کہ کوفتے بہت مزے دار تھے — تھکا ماندہ چندہ جمع کرنے والا صوفے پر کچھ دیر آرام کے لیے دراز ہو گیا۔ جوں ہی اس کے سانس سے گہری نیند کا پتا چلا تھا، میں نے پیانو پر رکھے چندے سے بھرے بکس کو اُٹھایا اور دُکان میں غائب ہو گیا۔ کاؤنٹر کے نیچے چھپ کر میں نے ٹین کے ڈبوں کے سب سے بیہودہ اس ٹین کے ڈبے پر اپنی توجہ کی، اس لیے نہیں کہ اس میں سے میں ایک پنی بھی نکالتا۔ میرا نامعقول ارادہ اس کو نقارے کی طرح استعمال

کرنے کا تھا، مگر میں کسی طرح بھی اس کو بجاتا، کسی طرح بھی چوبی چھڑیوں کا استعمال کرتا، مگر اس میں سے بس ایک قسم کی صدا آتی تھی: ''جاڑے کے موسم کے لیے مدد کیجیے''، ''کسی کو ٹھنڈا اور بھوکا نہیں رہنا چاہیے''، ''سردی کے موسم کے لیے مدد کیجیے۔''

آدھے گھنٹے کوشش کے بعد میں نے ہار مان لی۔ میں نے دُکان کے نقدی کے ڈبے سے پانچ پینی نکالی اور سردی کے موسم کی اپیل کے جواب میں ڈبے میں چندے کے طور پر ڈال دی، اور چندے کے ڈبے کو واپس لے جا کر پیانو پر رکھ دیا، تاکہ ماتسیرات اتوار کا بقیہ دن اس کو ٹھنڈے اور بھوکے لوگوں کی امداد کے لیے ہلاتے گزار دے۔

اس ناکام کوشش نے مجھے ایک سبق سکھا دیا تھا۔ اس کے بعد سے میں نے کبھی کسی ٹین کے ڈبے کو، کسی اُلٹی بالٹی کو، یا واش بیسن کے پیندے کو نقارے کی مانند بجانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر کبھی اس قسم کی کوشش کی بھی تھی تو میں نے ان بیہودہ واقعات کو یاد رکھنے سے پرہیز کیا تھا، اور کسی کاغذ کو ان کے تذکرے سے ضائع کرنا نہیں چاہا۔ ایک معمولی ٹین کا ڈبا نقارہ نہیں بن سکتا؛ بالٹی محض بالٹی ہوتی ہے؛ اور واش بیسن منہ یا موزے دھونے کے کام آتا ہے۔ ایسی کوئی شے نہیں جو نقارے کا نعم البدل بن سکے۔ سفید رنگ کی سطح پر بنے شعلوں سے مزیّن ٹین کا نقارہ اپنا جواب آپ ہوتا ہے، اس کے لیے کوئی اور بول نہیں سکتا۔ آسکر، یکہ وتنہا تھا، اس کے ساتھ دغا کی گئی تھی۔ آخر کس طرح وہ اپنا تین برس پُرانا حلیہ برقرار رکھتا؟ جب اس کے پاس اپنا نقارہ نہیں تھا، جو اس کی بھلائی کے لیے ضروری تھا۔ اپنی ساری خرابیاں، میں برسوں جن کی مشق کیا کرتا تھا، یعنی، کبھی کبھی بستر میں پیشاب کرنا، شام ڈھلے کی دعاؤں میں بچوں کی مانند غوں غاں کرنا، سانتا کلاز سے خوف کھانا، جس کا اصل نام گریف تھا، میرا کبھی نہ تھکنے والا مسخرہ پن، تین برس کے بچوں جیسا سوال کرنا کہ کار میں پہیے کیوں لگے ہوتے ہیں؟ یہ تمام فضولیات، بالغ لوگ جن کی مجھ سے توقع رکھتے، اب مجھے نقارے کے بغیر ہی کرنی پڑ رہی تھیں۔ جلد ہی یہ سب مجھے چھوڑنی پڑی تھیں۔ اپنی مایوسی کے دوران اب مجھے اس آدمی کی تلاش ہوگئی تھی جو میرا باپ نہ ہو، مگر شاید اسی نے میری بنیاد رکھی ہو۔ آسکر، ''رِنگ استراسے'' پر بنے پولش محلّے سے قریب ہی جان برانسکی کا انتظار کر رہا تھا۔

میری مما کے انتقال سے ماتسیرات اور میرے انکل کے درمیان، اس دوران جو ڈاک خانے کے سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوگیا تھا، رشتے منقطع ہوگئے تھے، وہ رشتے جو کبھی دوستی کے برابر ہوا کرتے تھے۔ اس میں اچانک کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا، مگر ان تمام یادوں کے باوجود جو اُن میں مشترک تھیں، سیاسی بحرانات میں اضافے نے رفتہ رفتہ ان کو ایک دوسرے سے دور کر دیا

تھا۔ میری مما کے نازک وجود کے غائب ہو جانے سے ان دونوں آدمیوں کے درمیان کی دوستی کی وجہ بھی بکھر گئی تھی، جو اس کے وجود میں برابر برابر اپنے عکس دیکھتے تھے، اور اس کے جسم سے استفادہ کرتے تھے۔ اس غذائیت اور محدب آئینے سے محروم، ان دو افراد کے درمیان ملاقات کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی تھی، جو متحارب سیاسی تصورات کے پیرو تھے، حالانکہ وہ ایک ہی قسم کا تمبا کو پیتے تھے۔ مگر نہ پولینڈ کا ڈاک خانہ، نہ صرف قیصوں میں ملبوس پارٹی کے رہنماؤں سے ملاقاتیں ایک خوب صورت اور نرم دل خاتون کا نعم البدل ہو سکتی تھیں۔ باوجود شدید حقارت کے — ماتسیرات کو اپنے گاہکوں کے اور اپنی پارٹی کے بارے میں دس بار سوچنا پڑتا تھا، اور جان کو پولش ڈاک خانے کی انتظامیہ کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا — میرے دونوں قیاسی باپ میری مما کے انتقال اور سگس مُنڈ مارکس کے ختم ہونے کے عرصے کے دوران کئی بار مل چکے تھے۔

مہینے میں دو یا تین بار، آدھی رات کے قریب، ہماری بیٹھک کی کھڑکی کے شیشے پر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی۔ ماتسیرات پردے کو ایک طرف ہٹا کر جھانکتا تو دونوں ہی بے حد شرمندہ ہو جاتے، جب تک کہ ان میں سے کوئی شرمندگی مٹانے کے لیے skat کے آدھی رات کے کھیل کا خیال پیش نہیں کر دیتا تھا۔ پھر وہ گریف کو اس کی سبزی کی دُکان سے طلب کرتے، یا اگر وہ راضی نہ ہوتا، جو اکثر جان کی وجہ سے ہوتا تھا، اس لیے کہ سابقہ اسکاؤٹ لیڈر ہونے کی وجہ سے — اس دوران اس نے اپنے اسکاؤٹ گروپ کو توڑ دیا تھا — اسے محتاط ہونا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ نہایت خراب کھلاڑی بھی تھا، اور skat کے کھیل میں اسے زیادہ دل چسپی نہیں ہوتی تھی، تو وہ بیکری کے مالک الیگزانڈر شیفلر کو، تیسرے کھلاڑی کے طور پر بُلا لیا کرتے تھے۔ خود شیفلر بھی زیادہ پُرجوش کھلاڑی نہیں تھا مگر مما سے خاص ربط کے باعث، وراثت کے طور پر اس کی دل چسپی بڑھ گئی تھی، اور کریانہ فروخت ہونے کے ناتے ان کا ایک ساتھ ہونے کا عہد بھی تھا، جو چھوٹی ٹانگوں والا ''کلائن ہامر- ویگ'' سے ماتسیرات کے فون کے جواب میں ہماری بیٹھک میں اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے فوراً چل پڑتا تھا، وہ کپڑوں کے کاٹے ہوئے اپنے زرد اور آٹے کے رنگ کے ہاتھ سے تاش کے پتے پھینٹتا اور ان کو بھوکے لوگوں کو رول کی طرح کھلاڑیوں میں بانٹتا تھا۔

چونکہ اس قسم کے ممنوع کھیل اصولی طور پر آدھی رات سے پہلے شروع نہیں کیے جاتے تھے، تاکہ تین بجے رات تک ختم ہو جائیں، جس وقت شیفلر کی بیکری میں موجودگی ضروری ہوتی تھی؛ اور ایسا شاذ ہی ہوتا تھا کہ میں اپنے بستر سے اُٹھ کر نظر آئے بغیر، کسی قسم کی آواز کیے بغیر، اور اپنا نقارہ لیے بغیر کونے پر رکھی میز کے سایے میں روپوش ہو جاتا تھا۔

بلا شبہ، اب تک آپ نے محسوس کرلیا ہوگا کہ، مجھے، میزوں کے نیچے ہمیشہ غور وفکر کے آسان ترین مواقع ملتے تھے: اب میں وہیں موازنہ کیا کرتا تھا کہ میری مما کی موت کے بعد حالات کتنے بدل گئے تھے۔ جان برانسکی، جو کبھی میز کے اوپر محتاط ہونے کے باوجود کھیل پر کھیل ہارتا جاتا تھا، مگر میز کے نیچے وہ بے باک جوتے کے بغیر موزے پہنے پیروں سے مما کی رانوں کے درمیان مہمات سر کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اب، محبت تو کجا، skat کی میز پر سے جنس بھی غائب ہوگئی تھی۔ پتلونوں میں ملبوس چھ عدد مذکر ٹانگیں مختلف انداز میں مچھلی کے کانٹوں کے نمونے میں نیچے رکھی نظر آتی تھیں، جن میں سے کچھ برہنہ اور کچھ ٹخنوں تک بال سے محروم۔ نیچے ساری چھ ٹانگیں ایک دوسرے سے ہلکے سے مَس سے بھی محتاط، پھر بھی خوش قسمت، مگر میز کے اوپر ان کے تجاوزات — بدن، سر، بازو — خود کو ایسے کھیل میں مصروف رکھے ہوئے تھے جس کو سیاسی بنیادوں پر ممنوع ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ ہر ہار یا جیت ایسے غصیلے یا فاتحانہ انداز پیش کرتی تھی جیسے کہ: پولینڈ کو بڑی شکست ہوئی ہے، یا، آزاد شہر ڈانسِگ نے ایک ہیروں والا ہاتھ جرمن رائخ سے چھین لیا ہے۔

یہ پیش بینی ہرگز ناممکن نہیں تھی کہ یہ سارے جنگی کھیل، قلب ماہیت کے ساتھ ختم ہو جائیں گے، اور، جیسا کہ جنگی کھیلوں میں ہوتا ہے، سب کٹھن حقیقتوں میں بدل جائیں گے۔

۱۹۳۹ء کے موسم گرما کی ابتدا میں یہ واضح ہوگیا تھا کہ ماتسیرات کو اس کی پارٹی کی ہفتہ وار کانفرنسوں کے دوران پولینڈ کے ڈاک خانے کے افسران اور سابق اسکاؤٹ رہنماؤں کے مقابلے میں کم رعایت کرنے والے skat کے ساتھی مل گئے ہیں۔ جان برانسکی کو وہ کیمپ یاد تھا — بلکہ اسے یاد کرنے پر مجبور کیا گیا تھا — جس میں اس کا مقدر اسے لے گیا تھا؛ اس نے اپنے ڈاک خانے کے ساتھیوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے کی کوشش کی تھی: مثال کے طور پر، Marszalek Pilsudski میں اپنی خدمات کے زمانے سے معذور دربان کوبیلا کی ایک ٹانگ ایک انچ یا اس سے کچھ زیادہ چھوٹی تھی۔ اس کے لنگ کے باوجود کوبیلا لاجواب دربان تھا، ساتھ ہی ایک ہنرمند مرمت کرنے والا بھی، جو، مجھے محسوس ہوا تھا کہ، میرے بیمار نقارے کو شفایاب بھی کرسکتا تھا۔ کوبیلا کی جانب جانے والا راستہ جان برانسکی سے ہو کر جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے شام چھ بجے کے بعد پولینڈ والوں کی آبادی کے قریب جان کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگست کی دم گھونٹنے والی گرمی میں بھی میں نے انتظار کیا، مگر جان، جو عام طور پر کام ختم ہونے کے بعد بڑی پابندی سے گھر کی طرف چل پڑتا تھا، نظر نہیں آیا۔ اپنے آپ سے یہ سوال کیے بغیر کہ تمھارا قیاسی باپ کام ختم ہونے کے بعد کیا کرتا ہے، میں اکثر سات یا ساڑھے آٹھ بجے تک اس کا انتظار کرتا تھا۔ میں آنٹی

ہیڈوگ کے پاس چلا گیا ہوتا۔ شاید جان بیمار تھا، ہو سکتا ہے کہ اس کو بخار رہا ہو، یا اس کا پاؤں ٹوٹ گیا ہو اور اس پر پلاسٹر چڑھا رہا ہو۔ آسکر وہیں ٹھہرا رہا اور کبھی کبھی ڈاک خانے کے سیکریٹری کے فلیٹ اور کھڑکیوں پر لگے پردوں کی جانب دیکھنے پر اکتفا کر لیتا تھا۔ آسکر کو آنٹی ہیڈوگ سے ملنے کے بارے میں حیرت انگیز ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی جس کی مادرانہ، گائے کی سی، آنکھ نے اس کو افسردہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ، اسے برانسکی کے بچوں، یعنی اس کے قیاسی بھائی بہن، سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ وہ لوگ اس کے ساتھ کھلونے کی طرح پیش آتے تھے، اور اس کھلونے سے کھیلنا چاہتے تھے۔ اسٹفن کو کیا حق تھا، جو صرف پندرہ برس کا تھا، کہ وہ اس پر باپ جیسی یا اسکول ماسٹر جیسی کرم فرمائی کرتا؟ اور چوٹیوں اور موٹے گول مٹول چہرے والی دس برس کی مارگا کو کس نے حق دیا تھا کہ وہ آسکر کو ایک پُتلے کی مانند دیکھتی، اس کو کپڑے پہناتی، کنگھی کرتی، برش سے سنوارتی اور اس کو ہر گھنٹے لیکچر دیا کرتی؟ ان دونوں کے لیے میں پریشان خیالی اور ایک رقت انگیز بونے سے زیادہ نہیں تھا، جب کہ وہ لوگ عام جسم کے بڑے مستقبل والے تھے۔ وہ تو نانی امّاں کو واچکی کے پسندیدہ بھی تھے، مگر مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ میں نے ان کے لیے مشکلیں کھڑی کر دی تھیں۔ مجھے پری کہانیوں اور تصویری کتابوں میں زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ مجھے اپنی نانی سے صرف اتنی توقع تھی کہ آج میں خوب صورت تفصیل والے جتنے خواب دیکھتا ہوں، وہ بہت سادہ بھی ہیں اور صاف بھی، اور اسی وجہ سے ان کا حصول مشکل ہے: جوں ہی اس نے نانی کو دیکھا، تو آسکر نے اپنے نانا کواچکی کی تقلید کرنے اور اس کے لہنگے کے نیچے پناہ لینے کی کوشش کی تھی، اور اگر ممکن ہوتا تو وہ کبھی اس کے حفاظتی سناٹے کے باہر سانس بھی نہ لیتا۔

میں اس خیمے میں داخل ہونے کے کوشش میں کس حد تک گیا تھا؟ مجھے یقین نہیں کہ وہ اس کے نیچے آسکر کے بیٹھے کو ناپسند کرتی۔ مگر اسے کچھ تامّل تھا اور ہمیشہ کی طرح اس نے انکار کر دیا تھا؛ میرا خیال ہے کہ وہ کسی بھی شخص کو جس میں کوواچکی کی نصف شباہت بھی آتی ہو اجازت دے دیتی: جب کہ میں تھا جس سے نہ اس کی جسامت ملتی تھی اور نہ دیا سلائی سمیت اس کے آگ لگانے والے ہاتھ ملتے تھے، جو اس کی جیسی گھات لگا سکتے تھے۔

میں تصور کر سکتا ہوں کہ تین برس کا آسکر ربڑ کی گیند سے کھیل رہا ہے، اور اتفاق سے گیند لڑھکتی ہوئی اس کے لہنگے کے نیچے چلی جاتی ہے، اور، قبل اس کے کہ نانی امّاں اس کی چالاکی کو سمجھتے ہوئے اسے گیند واپس کر دیتی، گیند کی تلاش کے بہانے آسکر اس کے نیچے چلا جاتا۔ جب بالغ لوگ موجود ہوتے، تو میری نانی امّاں کبھی دیر تک مجھے اپنے لہنگوں کے نیچے رہنے نہیں دیتی۔

اس لیے کہ بالغ لوگ اکثر، بہت بیہودے انداز میں اس کا مذاق اڑاتے اور آلو کے کھیت میں اسے اپنی شادی کی اس وقت تک یاد دلاتے رہتے، جب تک کہ میری نانی اماں، جو فطری طور پر زرد چہرے والی نہیں تھی، شرم سے سُرخ نہ ہو جاتی، کہ اس قسم کی لجاوٹ اس کے تقریباً سفید بالوں پر — کہ وہ ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی — بجتی نہیں تھی۔

مگر، جب میری نانی اماں بالکل اکیلی ہوتی — جیسا کہ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا، کہ میں اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے بتدریج اس کے پاس کم جانے لگا تھا، اس لیے اور بھی کہ اس نے "لانگ فوز" کے ہفتہ وار بازار میں اپنا اسٹال لگانا چھوڑ دیا تھا — وہ مجھے اپنی آلو کے رنگ کے لہنگوں کے نیچے پناہ لینے، اور اس کے نیچے زیادہ دیر تک ٹھہرنے دینے پر زیادہ مائل نظر آتی تھی۔ ایسے میں تو مجھے ربڑ کی گیند کی احمقانہ چالاکی کی بھی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ اپنے نقارے کے ساتھ فرش پر پھسلتے ہوئے، ایک پاؤں پر زور دیتے ہوئے فرنیچر کے سہارے، میں نانی اماں کے پہاڑ نما لہنگوں کے خیمے کی طرف چلا جاتا؛ اور اس کے پاؤں کے قریب پہنچ کر میں اپنے چوب نقارہ سے چار پرتوں والی نقاب اٹھاتا، اور ایک بار نیچے چلا جاتا تو، ان کو فوراً ہی گر جانے دیتا۔ اور، ایک لمحے کے لیے ساکت بیٹھا، میں ایسے مکھن کی بو سونگھتا رہتا جو کئی موسم گزر جانے کے بعد بھی زیادہ خراب نہیں ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آسکر اپنی نقارہ نوازی شروع کر دیتا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کی نانی اماں کیا سننا پسند کرتی ہے، میں اپنے نقارے سے اکتوبر کی بارش کی آواز نکالتا، ویسی ہی آواز جو اس نے سلگتے ہوئے آلو کے پودوں کے پاس بیٹھے سنی ہوگی، جب کوواچکی، کسی آگ لگانے والے شخص جیسی بو دیتا ہوا اس کے پاس پناہ کے لیے آیا تھا۔ پھر میں نقارے سے بارش کی آڑی گرتی ہوئی بوندوں کی آواز اس وقت تک نکالتا رہتا جب تک کہ میرے اوپر سے بے چین سانسوں، اور صوفیوں کے ناموں کی آوازیں آنے نہیں لگتیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ بے چین آہوں اور صوفیوں کے ناموں سے آپ کیا مطلب نکالتے ہیں، جو ۱۸۹۹ء میں لیے گئے تھے، جب میری نانی تو بیٹھی بارش میں بھیگ رہی تھی اور اس خیمے کے نیچے کوواچکی پاک صاف بیٹھا ہوا تھا۔

جب میں پولش آبادی کے باہر، ۱۹۳۹ء میں جان برانسکی کا انتظار کرتا، تو مجھے اکثر اپنی نانی اماں یاد آجاتی تھی۔ شاید اس وقت وہ آنٹی ہیڈوگ کے پاس گئی ہوئی ہوتی تھی، مگر اس کے لہنگے کے نیچے بیٹھنے، اور بو دیتے مکھن کی بو سونگھنے کی رغبت کے باعث بھی نہ میں دو منزل سیڑھیاں چڑھا، نہ میں نے جان برانسکی کے نام کی تختی کے نیچے لگے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ آسکر کے پاس اپنی نانی کو دینے کے لیے تھا ہی کیا؟ اس کا نقارہ ٹوٹا ہوا تھا، اس سے موسیقی کی آواز نہیں

نکلتی تھی، اس کو بارش کی آواز بھی یاد نہیں رہی تھی، وہ بارش جو آلوؤں کے پودوں کے جلتے ہوئے ڈھیر پر آڑی گرتی تھی۔ اور چونکہ خزاں کی یہی آوازیں اس کی نانی کو متوجہ کرنے کا طریقہ تھیں، وہ ''رنگ استراسے'' سے دور ہی رہتا، پانچ نمبر ٹرام گاڑی کو دیکھتا، جب وہ ''ہیرے سانگر'' آتے جاتے اپنی گھنٹیاں بجاتی تھیں۔

تو کیا میں اب بھی جان کے انتظار میں تھا؟ کیا میں نے اس سے ملنے کا ارادہ ترک نہیں کر دیا تھا؟ میں اس وقت بھی اسی مقام پر کھڑا تھا؛ کیا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ابھی تک میں نے جانے کے کسی قابل قبول طریقے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا؟ کبھی کبھی دیر تک ٹھہرنا تعلیماتی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر طویل انتظار انسان کو آنے والے مقابلے کے ایسے سحر میں بھی مبتلا کر دیتا ہے جو خوش آئند حیرتوں کے امکانات کو تباہ کر دیتا ہے۔ پھر بھی، جان نے مجھ کو حیران کر دیا تھا۔ میں تو اس کو اچانک ادھر پکڑنے، اور اپنے بچے کھچے نقارے سے نغمہ باری کرنے کے لیے چوب نقارہ تیار کیے کھڑا تھا۔ اگر میرے نقارے کی کراہیں اور چیخیں ہی میری ناامیدی کی کیفیات کا اظہار کر سکتیں، تو بیزار کن حد تک طویل تشریحات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پانچ مزید ٹرام گاڑیاں — میں خود سے کہہ رہا تھا — مزید تین، صرف یہ والی: اور میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی، جب میں تصور کر رہا تھا کہ جان کی درخواست پر برانسکی خاندان کا ''ماڈلن'' یا ''وارسا'' تبادلہ ہو رہا ہے۔ اور میں تصور ہی میں جان کو ''برام برگ'' یا ''تھارن'' کا پوسٹ ماسٹر دیکھ رہا تھا۔ پھر، اپنے آپ سے کیے وعدوں کے خلاف، میں نے ایک اور ٹرام گاڑی کا انتظار کیا، اور گھر واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ آسکر کو کسی نے عقب سے پکڑ لیا۔ ایک بالغ شخص نے اپنے ہاتھوں سے آسکر کی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

مجھے قیمتی صابن کی خوش بو میں بسا نرم ہاتھ محسوس ہوا، دل پذیر، خشک مردانہ ہاتھ۔ وہ جان برانسکی ہی تھا۔

جب میں اس کی گرفت سے آزاد ہوا، اور اس نے قہقہہ مار کر مجھے اپنے اطراف گھمایا، تو نقارے کے ذریعے اپنے دگرگوں احوال کا مظاہرہ کرنے میں دیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں نے نقارے بجانے والی دونوں چوب اپنی گندی نیکر، جس کے دونوں جیب پھٹے ہوئے تھے، کہ ان دنوں میرا خیال کرنے والا کوئی نہیں تھا، سنبھالنے والے suspenders میں اڑس لیے تھے۔ اس طرح میرے دونوں ہاتھ نقارہ اٹھانے کے لیے آزاد ہو گئے تھے، ان اعتراضات سے بھی بلند، جو فادر وینکے نے مقدس اجتماع کے دوران لگائے تھے، میں بھی جن کے جواب میں کہہ سکتا تھا، یہ میرا جسم

ہے، یہ میرا خون ہے، مگر میں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ میں صرف اپنا خستہ نقارہ بلند کیے ہوئے تھا۔ مجھے کسی قسم کی بنیادی یا معجزانہ قلب ماہیت کی خواہش بھی نہیں تھی؛ مجھے تو صرف اپنے نقارے کی مرمت کی فکر تھی، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

جان کا قہقہہ محض جذباتی عمل تھا۔ اس کو اپنا یہ عمل نا وقت معلوم ہوا ہوگا، اسی لیے وہ اک دم رُک گیا تھا۔ اس نے میرا نقارہ دیکھا مگر وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا، مگر اس نے فوراً ہی نقارے سے نظریں ہٹا کر میری چمک دار، تین برس والی آنکھوں کی طرف دیکھا جس سے اس وقت بھی راست بازی جھلک رہی تھی۔ پہلے تو اسے اور کچھ نظر نہیں آیا تھا سوائے نیلی پتلیوں کے، جو جھلک اور انعکاس نور سے لبریز تھیں، کہ یہ مختصر آنکھیں ہر قسم کی کمی سے ماوراتھیں، پھر وہ یہ قبول کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میری آنکھوں کے انعکاس کی صلاحیت کسی اعلیٰ درجے کی چھوٹی سی جھیل کے مقابلے میں نہ کم تھی نہ زیادہ۔ اس نے اپنی تمام تر خوش اخلاقی جمع کی، اپنی یاد داشت کو مرتکز کیا، اور میرے کاسۂ چشم میں میری مما کی حسین آنکھوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو کئی برس تک، اس کے لیے، خیر خواہی سے لے کر جوش اور ولولے تک کے جذبات منعکس کرتی رہی تھیں۔ شاید وہ میری آنکھوں میں اپنی پرچھائیں پا کر مضطرب ہو گیا تھا، مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جان ہی میرا باپ تھا، یا، میں صحیح معنوں میں اسی کا نطفہ تھا۔ اس لیے کہ اس کی آنکھوں، مما کی آنکھوں اور میری آنکھوں میں وہی ذی شعور بھولپن، وہی نورانی پن، وہی بے محل حسن موجود تھا جو تمام برنسکیوں میں، اسٹیفن میں، مارگا میں کم و بیش پایا جاتا ہے، سب سے زیادہ میری نانی اور اس کے برادر وِنسنٹ میں۔ پھر بھی، میری نیلی آنکھوں اور سیاہ پلکوں کے باوجود مجھ میں کوواچکی کے آتش زن خون کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں ملتی — تو میں اپنے گانے کے ذریعے شیشے توڑنے پر خوشی کا کیا جواز پیش کروں؟ جب کہ اس میں رھائنیت (Rhenish) اور ماتسیراتی خصوصیات کی تمیز کرنا میرے لیے بہت مشکل کام ہوگا۔

اُس موقعے پر، جب میں نے اپنا نقارہ اٹھایا اور اپنے کام پر نظریں مرکوز کیں، خود جان کو بھی، جو ایسے سوالات نظر انداز کرنا چاہتا تھا، اعتراف کرنا پڑے گا، اگر اس سے براہِ راست پوچھا جائے، کیا یہ اس کی ماں ایگنس ہے جو میری طرف دیکھ رہی ہے؟۔ یا شاید، میں خود ہی اپنی جانب دیکھ رہا ہوں۔ اس کی ماں اور میرے درمیان بہت کچھ مشترک تھا، مگر ایک بار پھر، وہ میرا انکل کوواچکی ہو سکتا ہے، جو یا تو امریکا میں ہے، یا سمندر کی تہہ میں ہے۔ مگر، وہ ماتسیرات ہرگز نہیں جو میری طرف دیکھ رہا ہے، اور یہی صحیح ہے۔

جان نے میرا نقارہ لیا، اس کو گھما پھرا کر، ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اس بے عمل، پتلی پتلی انگلیوں والے نے، جو ٹھیک سے ایک پنسل بھی تراش نہیں سکتا، اپنے اطراف ایسے شخص کا ہالا بنالیا تھا جیسے کہ نقاروں کی مرمت کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہو۔ ظاہری طور پر، فیصلہ کرتے ہوئے، جس سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، میری حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب اس نے میرا ہاتھ تھاما، اس لیے کہ مجھے اس سے اس سُرعت کی توقع نہیں تھی، اور وہ مجھ کو ''رنگ استراسے'' سے ''ہیری سینگر'' کے ٹرام اسٹاپ تک لے گیا۔ اور جب ٹرام کار آئی، تو اس نے مجھ کو اس ٹریلر کے اندر کھینچ لیا جس میں تمباکو نوشی کی اجازت تھی۔

جیسا کہ آسکر کو شبہ ہوا تھا، ہم لوگ شہر کی طرف جا رہے تھے، ''ہو۔لیس پلاٹز'' کے پولش ڈاک خانے کی طرف، دربان کوبیلا سے ملنے، جس کے پاس اوزار تھے اور وہ ہنر بھی، جو آسکر کے نقارے کی اشد ضرورت تھا۔

اس ۵ نمبر ٹرام کار کا جھن جھن کرتا مختصر سفر نہایت پُرسکون تفریح کا سفر ہوتا، اگر ہمارا یہ سفر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء سے قبل ہوا ہوتا۔ اس دن ''میکس۔ہالبے۔پلاٹز'' کے اسٹاپ پر ٹرام کار تھکے ماندے شور مچاتے ''بروئسن'' کے نہانے والوں سے بھر گئی تھی۔ وہ گرمی کے موسم کی کتنی سہانی شام ہوتی، کیفے ''والٹرز کے'' میں نقارہ جمع کرنے کے بعد سوڈا پینے کا کیا لطف ہوتا اگر لڑاکا بحری جہاز Schleswig اور Schleswig Holstein بندرگاہ کے دہانے پر اپنا لنگر ڈالے، خوف ناک آہنی بازو، دہری نالوں والی توپیں، اور مورچے نما بندوقیں تانے کھڑے نہ ہوتے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر پولش ڈاک خانے کے دربان کوبیلا کے گھر کے باہر گھنٹی بجا کر ایک معصوم بچے کے نقارے کو مرمت کے لیے چھوڑا جاسکتا۔ اگر پچھلے چند ماہ کے اندر ڈاک خانے میں آہنی پلیٹیں نہ لگا دی گئی ہوتیں، اور اس کو قلعے میں تبدیل نہ کر دیا گیا ہوتا جس میں، اس سے قبل تک معصوم، امن سے محبت کرنے والے افسران، کلرک اور ڈاکیے کام کیا کرتے تھے، جو اپنی ہفتے وار چھٹی کے دن Gdingen اور Oxhoft کے کیمپوں میں تربیت میں گزارتے تھے۔

ہم ''اولیوا'' گیٹ پہنچنے ہی والے تھے۔ جان برانسکی پسینے میں شرابور تھا، اس کی نظریں Hindenburg-Allee کے دھول بھرے سبز پیڑوں پر جمی ہوئی تھیں، اور وہ سنہرے ٹپ والی سگریٹ پر سگریٹ داغے جا رہا تھا، جو اس کے معاشی بجٹ کے خلاف تھا۔ آسکر نے کبھی اپنے قیاسی باپ کو اس قدر پسینہ آتے نہیں دیکھا تھا، سوائے دو یا تین مواقع کے، جب وہ اس کی مما کے ساتھ صوفے پر نظر آیا تھا۔

مگر میری بیچاری مما کو مرے کافی دن ہو گئے تھے۔ اب جان برانسکی کو پسینہ کیوں آ رہا تھا؟ جب میں نے دیکھا کہ وہ ہر اسٹاپ پر ٹرام سے اترنے کی تیاری کرتا، مگر ہر بار بالکل آخری وقت اس کو میری موجودگی یاد آ جاتی، اور جب مجھے احساس ہوا کہ اگر اسے دوبارہ کرسی پر بیٹھنا پڑتا تھا تو وہ میری اور میرے نقارے کی وجہ سے ہوتا تھا، تب مجھے معلوم ہوا کہ اس کو پسینہ کیوں آ رہا تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک افسر ہونے کی حیثیت میں پولش ڈاک خانے کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی۔ وہ اس کام کے لیے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا، مگر اس کی ''رنگ استراسے'' اور Heeresanger کے کونے پر مجھ سے اور میرے نقارے سے ٹکر ہو گئی تھی۔ مگر اس نے اپنا فرض نبھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے مجھ کو ٹرام میں گھسیٹا: میں نہ کوئی افسر تھا اور نہ ڈاک خانے کے تحفظ کے قابل، اور اب وہ ٹرام کار میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور پسینہ بہا رہا تھا۔ وہ ٹرام سے اُتر کیوں نہیں گیا؟ یقیناً، میں اس کو روکتا تو نہیں۔ اب بھی وہ اپنی زندگی کے عروج پر تھا، پینتالیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا، آنکھیں نیلی اور بال بھورے تھے۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ سلیقے سے manicured تھے، اور اگر وہ اتنی بُری طرح پسینے میں شرابور نہ ہوتا تو جب آ کر اپنے قیاسی باپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس کے نتھنوں میں پسینے کی نہیں کولون کی خوشبو آ رہی ہوتی۔

''ہولٹز مارکٹ'' کے قریب پہنچ کر ہم ٹرام کار سے اتر گئے اور ''آلشٹیڈ یشر'' تک پیدل چلے۔ گرمیوں کے موسم کی خاموش رات تھی۔ گھنٹیوں کی کڑک دار آواز آسمانوں کی طرف جا رہی تھی، جیسا کہ ہمیشہ آٹھ بجے ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی کبوتروں کا بادل سا فضا میں بلند ہو گیا۔ گھنٹیاں "Be True and Upright to the Grave" گا رہی تھیں۔ اس قدر خوب صورتی سے کہ سُن کر رونا آ جائے۔ مگر ہمارے لیے صرف قہقہے تھے۔ عورتیں اور سورج کی کرنوں کے سنولاتے ہوئے بچے، ساحل کی سوتی قبائیں، تیز رنگوں کے بڑے بڑے گیند اور بادبانوں کی کشتیاں، ''گلزکاؤ'' اور ''ہیوبوڈے'' کے ساحلوں سے تازہ تازہ نہائی ہوئی حسین لڑکیاں۔ سورج میں پکی ہوئی رس بھری کے برف جیسے ٹھنڈے شربت کے نشے میں مست لڑکیاں۔ ایک پندرہ برس والی کی آئس کریم گر گئی، اس کو اُٹھانے ہی والی تھی، مگر وہ ہچکچائی اور پھر اس نے ارادہ بدل دیا، اور تیزی سے گھلتی ہوئی اس لذت کو پیدل چلنے والے پتھروں اور گزرنے والے جوتوں کے تلووں کے لیے چھوڑ دیا: جلد ہی وہ بالغ ہو جائے گی اور سڑک پر آئس کریم کھانا چھوڑ دے گی۔

''شنائیدر موہلن گاسے'' پہنچ کر ہم بائیں جانب مُڑ گئے۔ ''ہے ویلیئس پلاٹز'' کو، جہاں تک یہ چھوٹی سی گلی جاتی تھی، SS Home Guards نے بند کر دیا تھا، اور وہ گروہوں میں جا بجا

کھڑے ہوئے تھے: نوجوان، اور عمر رسیدہ لوگ، بازوؤں پر پٹیاں باندھے اور پولیس کی رائفلیں لیے ہوئے تھے۔ اس محاصرے سے بچتے ہوئے کسی اور طرف سے نکل کر ''رحم'' سے ڈاک خانے تک جانا آسان ہو سکتا تھا۔ مگر جان برانسکی جان بوجھ کر سیدھا SS والوں کے پاس گیا۔ اس کا مقصد واضح تھا، وہ چاہتا تھا کہ اپنے بڑے افسروں کی نظروں میں، جو'' ہے ویلیس پلانز'' پر یقیناً نگاہ رکھے ہوئے ہوں گے، اس کو روک دیا جائے، اور واپس بھیج دیا جائے۔ اس کو امید تھی کہ اس طرح وہ ایک نسبتاً محترم اور پسپا کی ہوئی شخصیت بن کر اُسی پانچ نمبر ٹرام سے گھر واپس لوٹ جائے گا، جس پر سوار ہو کر یہاں تک آیا تھا۔

ہوم گارڈ والوں نے ہم کو چلا جانے دیا؛ شاید ان کو اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مہذب لباس میں ملبوس ایک شریف انسان، جس کے ساتھ ایک تین برس کا بچہ بھی ہے، ڈاک خانے جانا چاہتا ہے۔ انھوں نے نہایت شائستگی سے ہمیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور جب تک ہم بیرونی پھاٹک سے باہر نکل نہیں گئے تھے جو مرکزی دروازے تک لے جاتا تھا، انھوں نے ''ٹھہرو'' کی آواز نہیں لگائی۔ جان لاپروائی سے ایک طرف مُڑ گیا۔ بھاری دروازہ تھوڑا سا کُھلا اور ہم کو اندر گھسیٹ لیا گیا، اب ہم خوش گوار ٹھنڈک، اور ایک نصف روشن مرکزی ہال میں تھے۔

جان برانسکی کے ساتھیوں نے اسے دوستانہ انداز میں خوش آمدید نہیں کہا۔ انھیں جان پر اعتبار نہیں رہ گیا تھا، وہ شاید اس سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے صاف صاف کہا تھا، وہ سب جان پر شبہ کر رہے تھے کہ یہ ڈاک خانے کے محکمے کا سکریٹری اپنے فرائض سے پہلو تہی کرے گا۔ جان کو اپنی صفائی پیش کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ کسی نے اس کی بات نہیں سُنی۔ اس کو آدمیوں کی ایک قطار میں دھکیل دیا گیا تھا جو تہہ خانے سے ریت بھری بوریاں لا رہے تھے۔ ریت بھری بوریاں اور دوسری غیر متعلق چیزیں شیشے والی کھڑکیوں کے پیچھے جمع کی جا رہی تھیں؛ فائل رکھنے والی الماریاں اور دوسرے بھاری فرنیچر کو مرکزی دروازے کے قریب لے جایا جا رہا تھا، تاکہ ہنگامی حالات میں اس کی ناکہ بندی کی جا سکے۔

کسی نے آگے بڑھ کر میرے بارے میں سوال کیا کہ میں کون ہوں، نگران کے پاس جان کے جواب کا انتظار کرنے کا وقت نہیں تھا۔ لوگ بہت گھبرائے ہوئے تھے؛ ایک دوسرے پر غصہ کر رہے تھے، اچانک ضرورت سے زیادہ محتاط ہو جاتے، اور سرگوشی کرنے لگتے۔ میرا نقارہ اور اس کی مشکل بھلا دی گئی تھی۔ کوبیلا دربان، جس پر میں بھروسا کر رہا تھا، میں نے جس سے توقع رکھی تھی کہ وہ میرے گلے میں لٹکے اس کباڑ کے ڈھیر کو بحال کر دے گا، کہیں نظر نہیں آیا؛ وہ شاید

اس عمارت کی تیسری یا چوتھی منزل پر تھا، اور ہمارے اطراف کے کلرکوں، ڈاکیوں کی طرح بخار زدہ کیفیت میں ریت بھری بوریاں جمع کر رہا ہوگا، جن کا مقصد بندوق کی گولیوں کو روکنا تھا۔ اُس جگہ آسکر کی موجودگی برانسکی کے لیے واقعی پریشانی کا باعث تھی۔ جوں ہی ایک شخص، جس کو لوگ ڈاکٹر می شون کے نام سے پکار رہے تھے، جان کو احکام دینے بڑھا، میں وہاں سے کھسک گیا تھا۔ نہایت احتیاط سے، اس ڈاکٹر می شون سے بچتا بچاتا، جو لوہے کی بنی پولش ہیٹ پہنے ہوئے تھا، اور بظاہر پوسٹ ماسٹر لگتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور مجھے دوسری منزل لے جانے والی سیڑھی نظر آ گئی۔ دوسری منزل کی راہداری کے آخر میں، مجھے ایک درمیانے درجے اور بغیر کھڑکیوں کا کمرہ نظر آ گیا جہاں نہ کوئی اسلحے کی پیٹیاں تھیں اور نہ کوئی ریت بھری بوریاں جمع کر رہا تھا۔ دراصل یہ کمرہ ویران تھا۔

رولروں پر رکھی کئی عدد چھابیاں ڈھکیل کر ایک جگہ کھڑی کر دی گئی تھیں؛ وہ ڈاک کے رنگا رنگ ٹکٹ لگے خطوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کمرے کی چھت بہت نیچی تھی، اور اس کی دیواروں پر سُرخ رنگ کا کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ مجھے ربڑ کی ہلکی سی بو محسوس ہوئی۔ چھت سے بجلی کا ایک بلب لٹک رہا تھا جس پر کوئی شیڈ نہیں لگا تھا۔ آسکر تکان کے باعث بجلی کا بٹن تک ڈھونڈنے کے قابل نہیں تھا۔ اور پھر، دور سے سینٹ میری، سینٹ کیتھرین، سینٹ جان، سینٹ بریجٹ، سینٹ باربرا، ٹرینٹی اور کارپس کرسٹ کی گھنٹیوں نے اعلان کیا: نو بج گئے ہیں۔ اب تمھیں سو جانا چاہیے، آسکر۔ اور میں ڈاک کے بکسوں میں سے ایک میں لیٹ گیا، اپنے نقارے کو بھی اپنے پہلو میں لٹا دیا، جو اتنا ہی تھکا ہوا تھا جتنا کہ میں، اور ہم پر نیند غالب آ گئی۔

○○○

تاریکی

انتون چیخوف

نعیم صبا

انقلاب روس کے ماقبل کے تمثیل نگاروں اور افسانہ نویسوں میں انتون چیخوف بہت نمایاں درجہ رکھتا ہے۔ وہ ڈاکٹر تھا لیکن اپنے پیشے کی طرف کم توجہ دیتا تھا اور اپنا سارا وقت لکھنے میں صرف کرتا تھا۔ اُس کو اپنی صحت کی طرف سے ہمیشہ شکایت رہی۔ ۱۸۹۷ء میں وہ ماسکو سے کریمیا (Crimea) جانے پر مجبور ہو گیا جہاں وہ جولائی ۱۹۰۴ء میں دق سے جاں بر نہ ہو سکا۔

گے گن سو رہا تھا کہ اُس کی ناک میں ایک مچھر گھس گیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اتفاقاً اُس کی ناک میں گھس گیا یا تاریکی کی وجہ سے کسی طرح اندر چلا گیا۔ خیر، جو کچھ بھی ہو ناک نے غصے میں ایک مستقل ہنگامہ برپا کر دیا۔ گے گن کو متواتر کئی چھینکیں آتی رہیں، اتنی زور سے کہ سارے بستر میں زلزلہ آ گیا۔ گے گن کی بیوی میریا، جو متناسب الاعضا، صحت مند اور قبول صورت عورت تھی، اس ہنگامے سے چونک پڑی اور اُٹھ بیٹھی۔ تاریکی ہر طرف لپٹی ہوئی تھی — سانپ کی طرح پھنکار مارتی ہوئی بھیانک تاریکی۔ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن کچھ بھی نظر نہ آیا تو ایک لمبی سانس لے کر دوسری طرف کروٹ پھیر لی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر کروٹ لی اور آنکھیں زور سے بند کر لیں لیکن پھر بھی اُسے نیند نہ آئی۔ ایک وقفے تک وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی اور پھر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ پہلے شوہر کے پاس گئی لیکن وہ خواب نوشین کے مزے لے رہا

تھا اور وہ وہاں سے گرگابی پہن کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔

ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی جیسے فطرت نے غم کا سیاہ لباس پہن لیا ہو۔ درختوں کے دھندلے سایے اور اصطبل کی چھتوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی اور فضا میں نیند اور تاریکی کا حسین امتزاج تھا۔ یہاں تک کہ چوکی دار بھی جو رات کے سکوت میں خلل انداز ہونے کے لیے تنخواہ پاتا ہے، اُس وقت خاموش تھا۔

اس ہیبت ناک طلسمی سکوت کو خود میریا نے توڑا۔ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی اور سائبان کی پُراسرار تاریکی کو دیکھ کر اُس نے ایک چیخ ماری۔ اُس نے تصور میں دیکھا کہ صحنِ باغ سے ایک سیاہ مجسمہ گھر کی جانب آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ یہ کوئی گھوڑا یا گائے ہے، لیکن جب اُس نے حواس کو مجتمع کر کے غور سے دیکھنا شروع کیا تو صاف طور پر ایک انسانی پیکر نظر آیا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ وہ سایہ باورچی خانے کی کھڑکی کے پاس آ کر رُکا اور ایک لمحے کے بعد کھڑکی کی راہ، تاریکی میں غائب ہوگیا۔

میریا خوف سے کانپی۔ آہستہ آہستہ ایک مہیب خاکہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔

ایک چور یا نقب زن! اُس نے سوچا۔ پھر اُس کے تصورات نے ایک دوسری شکل اور تصویر پیش کی۔ ایک چور یا نقب زن باورچی خانے میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں سے کھانے کے کمرے میں جاتا ہے۔ الماری میں بیش قیمت چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ خواب گاہ کے متصل کمرے میں — ایک خنجر، بدمعاش کا ڈراؤنا چہرہ، سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں اور — اور زیورات — اُس کے تمام جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔

''باسیل!'' اُس نے اپنے شوہر کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا، ''ہم پر رحم کرو، ممکن ہے وہ زندہ نہ ہو۔ اٹھو باسیل! میں تم سے التجا کرتی ہوں۔''

''اچھا —'' باسیل نے غنودگی کی حالت میں گنگناتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے اٹھو۔ ایک چور باورچی خانے میں گھس گیا ہے۔ میں کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہی تھی کہ ایک آدمی اندر داخل ہوا اور اب وہ کھانے کے کمرے میں پہنچ جائے گا۔ زیورات الماری میں ہیں۔ باسیل! یہ حادثہ گزشتہ سال ایک ہمسایے کے گھر میں ہو چکا ہے۔''

''اونہہ — کیا قصہ ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔

''یا خدا، تم سمجھ بھی نہیں سکتے۔ سنو بزدل آدمی، ایک شخص ابھی باورچی خانے کی کھڑکی سے اندر داخل ہوا ہے۔ پلیٹی ڈر جائے گی — اور زیورات الماری میں ہیں۔''

''لغو— مہمل— فضول بکواس ہے یہ!''

''باسیل! میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔ میں تمھیں ایک اہم خطرے کی اطلاع دے رہی ہوں اور تم ہو کہ اُٹھتے ہی نہیں۔ آخر تمھارا مطلب کیا ہے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تباہ و برباد ہو جائیں، قتل کر دیے جائیں؟''

گے گن آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور تیزی سے جمائیاں لینے لگا۔

''خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ عورتیں کس قسم کی مخلوق ہوتی ہیں۔'' اُس نے جھنجھلا کر کہا، ''رات کو بھی آرام سے سونے نہیں دیتیں— اور ان لغو اور بیہودہ باتوں کے لیے بے کار نیند سے جگایا جاتا ہے۔''

''لیکن باسیل! میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے ایک آدمی کو اندر آتے دیکھا ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟ جانے دو اُسے، یقیناً وہ پلیجی کا چاہنے والا ہوگا— ہاں، اُس کا شیدائی باورچی!''

''کیا— ؟ کیا کہا تم نے؟'' میریا نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں کہتا ہوں کہ اندر آنے والا آدمی کوئی بھی نہیں۔ پلیجی کا باورچی ہے جو رات کی تنہائی میں اُس سے ملنے آیا ہے۔''

''کتنی بے کار سی بات ہے۔'' میریا نے تنگ آ کر کہا، ''یہ تو ایک چور کے آنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات ہے۔ میں اس گھر میں ایسے لوگوں کے ساتھ ہرگز نہیں رہ سکتی جن کے دماغ میں فتور ہے۔''

''پھر— تو ہم بہت خوش قسمت ہیں۔ سنکی کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ بے چاری! یہ خود سنک نہیں تو اور کیا ہے۔ اس طرح کے اجنبی اور غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے فائدہ؟ میری جان، جب سے دنیا قائم ہوئی ہے، اُسی وقت سے یہ کھیل ہوتا آرہا ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے۔ باورچی کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے— !''

''نہیں باسیل، معلوم ہوتا ہے کہ تم کو مجھ سے بالکل محبت نہیں رہی۔ میں اس قسم کے خیال... میں کہتی ہوں کہ ایسا اپنے مکان میں... نہیں، تم فوراً جا کر اُسے باورچی خانے سے نکال دو۔ ابھی، اسی وقت— اور کل میں پلیجی سے بھی کہوں گی کہ آخر وہ اتنی آوارہ کیوں ہوتی جا رہی ہے— ! جب میں مر جاؤں تو تم گھر میں ایسی بداخلاقیوں کو راہ دے سکتے ہو لیکن میری موجودگی میں تم ایسا کبھی نہیں کرسکتے۔ اب خدا کے لیے تم وہاں جاؤ۔''

''جہنم میں جائے۔'' گے گن نے تنگ کر کہا، ''ذرا اپنے چھوٹے نسائی دماغ سے سوچو اور غور کرو کہ آخر میں وہاں جا کر کیا کروں؟''

''باسیل!'' وہ چیخی، ''تم نہیں جاؤ گے تو میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔''

گے گن نے آخر کار غصے کی حالت میں چپل پہنی اور بڑبڑاتا ہوا باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ اُسے آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ سے ٹٹولنا پڑتا تھا۔ وہ ٹھوکریں کھاتا ہوا بازو کے کمرے میں پہنچا اور نرس کو جگایا۔

''ویسی لتا۔'' اُس نے زور سے پکار کر کہا، ''تم نے کل رات کو میرا گون دھونے کے لیے لیا تھا، وہ کہاں ہے؟''

''جناب میں نے اُسے پلیجی کو دے دیا تھا۔''

''لاپروائی کی انتہا ہے یہ! تم نے گون کو واپس لا کر کیوں نہ رکھا؟ نہ جانے وہ اس وقت کہاں ہے۔ اب مجھے بغیر گون کے باہر جانا پڑے گا۔''

وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف گیا جہاں ایک کونے میں پلیجی سو رہی تھی۔

''پلیجی!'' گے گن نے اُس کا شانہ ہلا کر جگاتے ہوئے کہا، ''پلیجی تُو بہانہ کیوں کر رہی ہے؟ تُو ہرگز سو نہیں رہی ہے۔ ابھی کھڑکی سے کون اندر آیا تھا؟''

''آں... اے... کھڑکی سے... آخر کون ہو سکتا ہے؟''

''ضرور آیا ہے۔ اس بات کو چھپانے کی کوشش کرنا بے کار ہے۔ تم اپنے شیدائی سے کہو کہ وہ یہاں سے فوراً باہر چلا جائے۔ سنتی ہو؟ اُسے ابھی یہاں سے نکال دو، اُس کے یہاں آنے کا کام ہی کیا ہے؟''

''معاف کیجیے جناب! آپ اس وقت ایسی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ میں ایسی ناسمجھ ہوں۔ یہ سراسر الزام ہے، سارا دن کام کر کے ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں، ایک لمحے کے لیے بھی آرام نہیں ملتا اور پھر رات کو یہ تہمت لگائی جاتی ہے۔ ماہانہ چار روبل اور اس پر میں چائے اور چینی اپنا خرچ کرتی ہوں اور جس کا صلہ مجھے یہ مل رہا ہے۔ میں ایک سوداگر کے یہاں بھی رہ چکی ہوں لیکن وہاں کبھی میری توہین نہیں کی گئی۔''

''بس، بند کرو اس بکواس کو... اس وقت میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے اپنے دوست کو جانے کے لیے کہو اور بس — سنا تم نے؟''

''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جناب!'' پلیجی سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔

وہ اُس کے آنسوؤں کے بہنے کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

''آپ شریف آدمی ہیں اور تعلیم یافتہ — اور آپ کا ایسا خیال... اس محنت اور مشقت میں آہ یہ بدنصیبی!'' وہ رو پڑی، ''ہماری توہین کرنا بہت آسان ہے کیوں کہ ہم غریب ہیں، ہمارا کوئی اپنا نہیں، مددگار نہیں۔''

''دیکھو، یہ رونا فضول ہے۔ مجھے اس کی امید بھی نہ تھی۔ اب چپ بھی ہو جاؤ، میں خود کیوں آتا، مجھے تمھاری بیگم صاحبہ نے یہاں بھیجا تھا— تم کھڑکی میں سے انسان کیا کسی شیطان کو بھی اندر بلاؤ تو مجھے پروا نہیں۔''

گے گن کو اپنا پہلو بچانے کا یہی موقع تھا اور اُسے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔

''پلیجی — وہ میرا گون؟'' وہ یکا یک کچھ سوچ کر بولا، ''تم نے دھونے کے لیے لیا تھا۔ میرا گون کہاں ہے؟''

''میں نادم ہوں جناب! میں اُسے آپ کی کرسی پر رکھنا بھول گئی۔ وہ چولھے کے قریب ایک کھونٹی پر لٹکا ہوا ہے۔'' گے گن نے ہاتھ بڑھا کر گون اتارا اور اُسے پہن کر خاموشی سے اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔

شوہر کے جانے کے بعد میریا پلنگ پر لیٹ کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔ چند منٹ تک اُس کا دماغ ساکن رہا لیکن پھر بے چین ہونے لگا، ''اُن کو گئے ہوئے اتنی دیر کیوں ہوئی؟'' اُس نے سوچا، ''اگر وہ وہی ہے تو خیر کوئی بات نہیں — آوارہ مزاج! لیکن اگر وہ کوئی چور یا ڈاکو—''

لیکن اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے باسیل کی تصویر ناچ گئی۔ وہ تاریک باورچی خانے میں داخل ہوا۔ یکا یک کسی نے خنجر سے حملہ کیا— خاموشی— اور بغیر آہ کیے مر رہا ہے اور خون کا ایک چشمہ رواں ہے۔

پانچ منٹ اور گزر گئے — اور پھر سکوت۔ اُس کی پیشانی نم ہو گئی۔

''باسیل!'' وہ چلّانے لگی۔ ''باسیل!''

''کیوں چلّا رہی ہو؟ میں یہاں ہوں۔''

اُس نے شوہر کی آواز اور قدموں کی چاپ سنی۔

''کیا تم قتل کیے جا رہے ہو؟''

گے گن بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔

''وہاں کوئی نہیں ہے۔'' اُس نے کہا، ''یہ تمھارا وہم تھا، صرف خواب یا واہمہ۔ اب تم

آرام سے سو سکتی ہو۔ پلیجی کا بیوقوف دوست اتنا ہی اچھا ہے جتنی کہ اُس کی مالکہ — تم بھی کیسی بزدل ہو!'' اور گے گن اپنی بیوی کو چھیڑنے لگا۔ اُس کے دل میں جذبات اب پورے طور پر بیدار ہو چکے تھے اور اس تاریکی میں وہ دل بستگی اور تفریح کا سامان ڈھونڈ رہا تھا اور یہ تفریح صرف اُس کی بیوی تھی۔

''تم اس قدر ڈرتی کیوں ہو؟'' اُس نے اپنی بیوی کے پہلو میں گدگداتے ہوئے کہا۔

اُس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ وہ پھر سونا نہیں چاہتا تھا۔

''بہتر ہے کہ تم کل ڈاکٹر کے پاس جا کر ان واہموں کا علاج کراؤ۔ سمجھیں — تم بالکل وہمی ہو۔'' وہ مسکرانے لگا۔

''یہ کس چیز کی بو ہے؟'' میریا نے اپنے شوہر کی تنگ آغوش سے نکلتے ہوئے کہا، ''شاید پیاز، سالن — یا کوئی اور چیز!''

''ہاں، میں سو نہیں رہا ہوں — مگر موم بتی کہاں ہے اور دیا سلائی؟ — اور میں تم کو قصرِ عدن کے خادم کی تصویر بھی دکھاؤں گا۔ اُس نے مجھے کل جاتے وقت یہ تصویر دی تھی جس پر اُس کے دستخط بھی ہیں۔''

گے گن نے موم بتی جلائی۔ تاریکی گھٹی اور ایک مدھم سحر طراز روشنی کمرے میں پھیل گئی، لیکن بستر سے ایک قدم آگے بڑھنے سے پہلے اُس نے پیچھے سے ایک دل دوز چیخ سنی اور وہ ایکا ایکی گھوم گیا۔ اُس کی بیوی متعجب ہو کر اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں خوف و ہراس جھلک رہا تھا۔

''تم نے اپنا گون کہاں اتارا؟'' اُس نے متحیر ہو کر کہا۔

''کیوں؟ کیا بات ہے؟''

''اپنے آپ کو دیکھو۔''

گے گن نے ایسا ہی کیا۔

وہ حیران رہ گیا۔ اُس کے جسم پر اپنا نہیں بلکہ باورچی کا گون تھا۔ وہ یہاں کس طرح پہنچ گیا —؟

جب کہ وہ اس معمے کو حل کرنے میں مصروف تھا، اُس کی بیوی کے ذہن میں دوسری ناممکن اور حیرت انگیز تصویر گھوم رہی تھی۔

اور پھر اندھیرا — سکوت — سرگوشیاں!

○○○

بُری عورت

البیئر کامیو
مبین مرزا

بس کی سبھی کھڑکیاں یوں تو بند تھیں لیکن ایک مکھی پچھلے کئی منٹ سے مسلسل بس میں گھومتی پھر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے بوجھل پروں کے ساتھ کبھی اڑ کر آگے آتی اور کبھی پیچھے چلی جاتی۔ گھڑی بھر کے لیے وہ ژنین کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی لیکن اگلے ہی لمحے اُس نے اسے اپنے شوہر کے ساکت ہاتھ پر ٹکا ہوا دیکھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ ریتیلی ہوا کے تھپیڑے جب کھڑکیوں پر پڑتے تو مکھی تھرا جاتی۔ سردیوں کی صبح کے مدھم اُجالے میں دھات کے بنے ڈھانچے اور ایکسل سے شور پیدا کرتی اور ہچکولے کھاتی بس بہ مشکل تمام آگے بڑھ رہی تھی۔ ژنین نے اپنے شوہر پر نگاہ ڈالی، پھیڈی ناک اور لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ وہ ایک بیزار دیو مالائی آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ مارسل کی تنگ پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں میں سپیدی نمایاں تھی۔ بس کے ہر دھچکے کے ساتھ ژنین کو اس کے جسم کی رگڑ محسوس ہوتی، پھر اس کا بڑھا ہوا پیٹ اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر آ ٹکتا اور وہ ساکت ہو کر خلا میں گھورنے لگتا۔ اس کے بالوں سے عاری بھاری ہاتھوں کے سوا جو فلالین کے زیر جامے کی بڑی آستینوں کی وجہ سے کچھ اور چھوٹے معلوم ہو رہے تھے، اس پورے وجود میں حرکت اور زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس کے ہاتھوں نے گھٹنوں کے بیچ دبے ہوئے چمڑے کے سوٹ کیس کو اس طرح مضبوطی سے تھاما ہوا تھا کہ وہ مکھی کی موجودگی سے باخبر محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

یک لخت ہوا کا شور بڑھ گیا اور جو دھند بس پر چھائی ہوئی تھی اس کی تہ اور دبیز ہوگئی۔

ریت کے جھکڑ بس کے شیشوں پر یوں پڑ رہے تھے جیسے غیبی ہاتھ مٹھیاں بھر بھر کے برسا رہے ہوں۔ مکھی نے ایک پر پھیلا کر ٹانگیں سیدھی کیں اور اُڑ گئی۔ بس کی رفتار کم ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے وہ رک جائے گی لیکن ہوا کا زور کم ہوا، دھند چھٹنے لگی تو بس کی رفتار پھر بڑھ گئی۔ ریت کی دیوار میں روشنی کے کئی ایک شگاف سے پڑ گئے۔ پام کے دو تین کم زور سفیدی مائل پیڑ جو دھات کے بنے ہوئے لگ رہے تھے، پل بھر کے لیے کھڑکی کے سامنے آئے اور دوسرے ہی پل اوجھل ہو گئے۔

''کیا ملک ہے یہ بھی؟'' مارسل نے کہا۔

بس عربوں سے بھری ہوئی تھی جنھوں نے برنوس پہنے ہوئے تھے اور یہ ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ سو رہے ہیں۔ ان میں کئی ایک نشستوں کے اوپر پاؤں سمیٹے ہوئے بیٹھے تھے اور بس کے ہچکولوں کے ساتھ دوسرے مسافروں سے کچھ زیادہ جھوم رہے تھے۔ لوگوں کی خاموشی اور ماحول کا سناٹا ژنیں کے ذہن پر بوجھ بن کر چھا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کئی روز سے اس خاموش گروہ کے ساتھ سفر میں ہے۔ حالانکہ بس آج تڑکے پو پھٹے چلی تھی اور پچھلے دو گھنٹے سے ایک سنگلاخ اور اُجاڑ ہموار پہاڑی راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ آغاز میں یہ راستہ سرخی مائل افق تک پھیلا دکھائی دیتا تھا لیکن جب ہوا چلنا شروع ہوئی تو ریت نے جیسے اس وسیع و عریض علاقے کو نگل لیا۔ ایسے میں مسافروں کو باہر کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک ایک کر کے سب نے چپ سادھ لی اور اب جیسے وہ سبھی ایک بے خواب رات کے سناٹے میں سفر کر رہے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر میں اپنی آنکھوں اور ہونٹوں کو پونچھ رہے تھے کیوں کہ ریت درزوں سے چھن چھن کر بس میں آ رہی تھی۔

''ژنیں!''

اپنے شوہر کی آواز پر وہ چونکی۔ ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ اس جیسی لانبی اور تنومند عورت کے لیے یہ نام کتنا بے تکا اور مضحکہ خیز ہے۔ مارسل نے پوچھا کہ اس کا نمونوں والا بکس کہاں ہے؟ اس نے اپنی نشست کے نیچے پاؤں سے ٹٹولا اور جب اس کا پاؤں ایک چیز سے ٹکرایا تو اس نے اندازہ لگایا کہ یہی نمونوں کا بکس ہے۔ جھک کر بکس باہر نکالتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا۔ جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی تو اسے جمناسٹک کا اوّل انعام ملا تھا، اس وقت اسے خبر ہی نہیں تھی کہ سانس پھولنا کیا ہوتا ہے؟ یہ کتنے عرصے پہلے کی بات تھی؟ پچیس سال۔ پچیس سال ہوتے ہی کیا ہیں؟ اسے تو یوں لگتا تھا جیسے کل ہی کی بات ہے کہ جب وہ شادی اور آزادی کی زندگی کے مابین الجھی ہوئی تھی اور فکر مند تھی کہ اگر اس نے آزادی کے حق میں فیصلہ دیا تو بڑھاپا اکلاپے کی اذیت میں گزرے گا، لیکن اب وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ شعبۂ قانون کا وہ طالب علم جو ہمیشہ

اس کے ساتھ رہنے کا تمنائی تھا، اس وقت اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بالآخر وہ اس کی بیوی بننے پر راضی ہوگئی تھی حالانکہ وہ قد میں اس سے چھوٹا تھا اور اسے اس کی پر شور ہنسی اور سیاہ رنگ ابلی ہوئی آنکھیں کچھ ایسی پسند نہیں تھیں، لیکن وہ جو اس ملک میں رہنے والے سبھی فرانسیسیوں کا خاصہ ہے، یعنی زندگی سے مسابقت کا جذبہ، وہ اس کی بہت قائل تھی۔ اسے اس شخص کی وہ آزردگی بھی اچھی لگتی تھی جو ایسے وقت میں اس کے چہرے پر دکھائی دیتی جب وہ کسی شخص یا واقعے سے مایوسی محسوس کرتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اسے چاہا جانا پسند تھا اور اس کا شوہر اپنی توجہ ہر وقت اس پر مرکوز رکھتا۔ اس نے کتنی ہی بار اسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ تو صرف مارسل کے لیے جیتی ہے۔ یوں اس نے حقیقتاً اسے جینے کی اُمنگ دی تھی۔ نہیں، وہ اکیلی نہیں تھی۔

بس کا ہارن بج رہا تھا اور وہ نادیدہ رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ بس میں موجود سب لوگ ساکت بیٹھے تھے۔ ژنیں کو یکبارگی محسوس ہوا جیسے کوئی اسے گھور رہا ہے، اس نے مڑ کر پچھلی قطار کی طرف دیکھا۔ اسے دیکھنے والا شخص عرب نہیں تھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی کہ اس نے شروع ہی میں اس شخص کی موجودگی کو محسوس کیوں نہیں کیا۔ وہ صحرا کی فرانسیسی فوج کی وردی اور کوری لینن کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا اور گیدڑ کی طرح لمبوترا تھا۔ اس کی نگاہیں ژنیں کا جائزہ لے رہی تھیں اور ان میں ایک طرح کی ناپسندیدگی کا اظہار تھا۔ وہ یکدم جھینپ کر رہ گئی اور اس نے چہرہ اپنے شوہر کی طرف پھیر لیا جو بدستور اپنی ناک کی سیدھ میں تکے جا رہا تھا۔ ژنیں نے اپنا کوٹ اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا مگر وہ اب بھی اس فرانسیسی سپاہی کو دیکھ سکتی تھی جو اپنی چست وردی میں اتنا لمبا اور دُبلا دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے کسی خشک دھات سے بنایا گیا ہو، ایسے مرکب سے جو ریت اور ہڈیوں سے تیار کیا گیا ہو۔ اس گھڑی اس کی نظر سامنے بیٹھے ہوئے عرب مسافروں کے پتلے سوکھے ہاتھوں اور ان کے مٹتے ہوئے چہروں پر جا ٹھہری۔ اس نے دیکھا کہ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کے باوجود ان عربوں کے پاس بیٹھنے کی کشادہ جگہ تھی۔ حالاں کہ جن نشستوں پر وہ لوگ بیٹھے تھے، وہ اتنی ہی بڑی تھیں، جس پر وہ اور اس کا شوہر پھنس پھنسا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کوٹ کو گھٹنوں پر لپیٹ لیا۔ اس پر موٹاپا نہیں آیا تھا۔ ہاں قد لانبا تھا اور جسم بھرا ہوا۔ اس کے قد و قامت سے میل نہ کھاتا ہوا بھولا چہرہ، چمک دار اور معصوم آنکھیں، وہ اب بھی پر کشش تھی اور ایسی نظر آتی تھی کہ اس کے جسم کی آرزو کی جائے۔ جب بھی مردوں کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھتیں، اسے یہی محسوس ہوتا، وہ جانتی تھی کہ اس کے جسم میں حدت اور کشش ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا جس کی اسے توقع تھی۔ پہلے پہل مارسل نے اسے جب اس سفر پر ساتھ لے جانے کا کہا تھا تو وہ راضی نہیں تھی۔ وہ خاصے دنوں سے اس سفر کا ارادہ باندھ رہا تھا، اسی وقت سے جب جنگ بند ہوئی تھی اور کاروبار پھر سے بہتر ہونے لگا تھا۔ جنگ سے پہلے قانون کی تعلیم ترک کر کے جو چھوٹا موٹا کاروبار اسے اپنے والدین سے ملا تھا، اس سے ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو جاتی تھی۔ ساحلی علاقے میں جوانی خوش وخرم گزاری جاسکتی ہے لیکن جسمانی مشقت کے کام کی طرف مارسل کا رجحان نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے کچھ ہی دن بعد اسے ساحل لے جانا چھوڑ دیا۔ اب صرف اتوار کی سہ پہر کو وہ اسے اپنی چھوٹی سی گاڑی میں سیر کرانے نکلتا تھا۔ باقی سارا وقت وہ کپڑوں سے ٹھنسی ہوئی دکان میں گزارنا پسند کرتا جو عربوں اور یورپیوں کی ملی جلی آبادی کے علاقے میں تھی۔ دکان کے اوپر ہی تین کمروں کے ایک فلیٹ میں ان دونوں کی رہائش تھی جو عربی اشیا اور گیلری باربے سے آئے ہوئے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ان کے یہاں بال بچہ کوئی نہ تھا۔ اوپر تلے کئی سال تین کمروں کے نیم تاریک ماحول میں گزرتے چلے گئے۔ گرمیوں کی تفریح، ساحل کی سیر، گھومنا پھرنا یہاں تک کہ آسمان کا نظارہ جیسے سب کچھ بھولے بسرے قصے ہو گئے تھے۔ مارسل کو اپنے کاروبار کے سوا کسی شے سے رغبت نہیں تھی۔ ژنیں کو ایسا لگتا تھا جیسے مارسل کو صرف دولت کمانے کی دُھن ہے اور نہ معلوم کیوں خود اسے اس دُھن سے چڑ تھی۔ حالانکہ فائدہ اسی کا تھا، اس لیے کہ مارسل کی طبیعت میں کنجوسی نہیں شاہ خرچی تھی، خاص طور سے بیوی کے اخراجات کے معاملے میں تو اس کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا۔ وہ اس سے کہا کرتا تھا، ''اگر مجھے کچھ ہو جائے تو بھی تمھیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' آنے والے دنوں کی فکر ضروری ہے لیکن بنیادی ضرورتوں کے علاوہ بھی تو آدمی کی دوسری کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ان ضرورتوں کو کس طور پورا کیا جائے؟ کچھ اس قسم کا ایک گنجلک سا سوال رہ رہ کر اس کے ذہن میں اُٹھتا تھا۔ خیر، اس عرصے میں وہ مارسل کی دکان کے حساب کتاب میں اس کا ہاتھ بٹاتی رہی اور کبھی کبھار اس کی جگہ دکان پر کام بھی کرتی رہی۔ اس دوران گرمیوں کا موسم سب سے بڑھ کر گراں گزرتا کہ جب گرمی بیزاری کا احساس تک کچل ڈالتی۔

گرمی ہی کا موسم تھا جب یکایک جنگ چھڑ گئی۔ مارسل کو فوج میں بھرتی کے لیے طلب کر لیا گیا، لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے اسے لوٹا دیا گیا۔ کپڑے کی قلت ہو گئی، کاروبار بیٹھ گیا اور گرمی سے تپتی ہوئی سڑکیں سنسان نظر آنے لگیں۔ ان حالات میں اگر مارسل کو کچھ ہو جاتا تو ژنیں کو مستقبل کی پریشانی لاحق ہوتی۔ اس لیے جیسے ہی کپڑا ایک بار پھر مارکیٹ میں آیا تو مارسل

نے سطح مرتفع کے شمالی علاقے کے گاؤں دیہات کا پھیرا لگانے کا سوچا تا کہ کسی دلال کو بیچ میں ڈالے بغیر وہ خود عرب سوداگروں کو اپنا مال فروخت کر سکے۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ژینیں کو معلوم تھا کہ اس علاقے کا سفر کٹھن ہے۔ اسے سانس کی تکلیف بھی تھی، اس لیے وہ گھر پر ہی رہنا چاہتی تھی، مگر مارسل بضد ہوا اور اسے شوہر کی بات ماننی پڑی کیوں کہ اس میں دوٹوک انکار کی ہمت نہیں تھی۔ اب جب کہ وہ اس سفر پر نکل کھڑے ہوئے تھے، اسے لگ رہا تھا کہ کچھ بھی ویسا نہیں ہے جیسا اس نے سوچا تھا۔ اسے گرمی، مکھیوں کی یورش اور گندے ہوٹلوں سے الجھن ہوتی تھی۔ اس نے خنکی، چبھتی ہوئی ہوا اور ان قطبین سے مشابہ مرتفع سطحوں کا بھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے تو پام کے درختوں اور ملائم ریت کا تصور کیا تھا لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ ریگ زار اس کے گمان کے صحرا سے یکسر مختلف تھا۔ یہاں تو صرف پتھر تھے۔ ہر طرف پتھر ہی پتھر۔ فضا پر پتھروں کی دھول چھائی ہوئی تھی، کھسکھساتی ہوئی دھول اور خنکی اور ان پتھروں کے بیچ زمین پر خشک گھاس کے سوا کچھ نہیں اگتا تھا۔

بس ایک دم رک گئی۔ ڈرائیور اونچی آواز میں اس زبان میں کچھ بولا جسے وہ ہمیشہ سے سمجھے بغیر سنتی چلی آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' مارسل نے دریافت کیا۔

ڈرائیور نے اب فرانسیسی میں جواب دیا کہ گاڑی کے کاربوریٹر میں ریت چلی گئی ہے۔ مارسل پھر اس ملک کو برا بھلا کہنے لگا۔ ڈرائیور ہنسا اور بولا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ گھڑی بھر میں کاربوریٹر کو صاف کر لے گا اور بس پھر چل پڑے گی۔ اس نے دروازہ کھولا تو خنک ہوا کا جھکڑ بس میں گھسا اور مسافروں کے چہروں پر ریت کے ان گنت ذرّے برسا گیا۔ بے چارے مسافروں نے چپ چاپ اپنے چہرے برنوسوں میں چھپا لیے اور سمٹ کر بیٹھ گئے۔

''دروازہ بند کر دو۔'' مارسل نے چلا کر کہا۔

ڈرائیور دروازے کی طرف واپس آتے ہوئے مسکرایا۔ اس نے اطمینان سے کچھ اوزار نکالے اور دروازہ بند کیے بغیر دوبارہ دھند میں غائب ہو گیا۔ مارسل نے ٹھنڈا سانس بھرا، ''لگتا ہے اس نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی موٹر دیکھی تک نہیں ہو گی۔''

''بس بھی کرو۔'' ژینیں بڑبڑائی۔ وہ ایک دم چونک پڑی۔ سڑک سے تھوڑا سا پرے بس کے قریب ہی لبادے اوڑھے ہیولوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ برنوسوں میں سے صرف ان کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ غیب سے رونما ہونے والی یہ مخلوق خاموشی سے کھڑی ہوئی بس کے

مسافروں کو تکے جا رہی تھی۔

''یہ گڈریے ہیں۔'' مارسل نے کہا۔

بس میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ سب مسافر منڈ کڑی مارے ہوا کے شور پر کان دھرے بیٹھے تھے۔

ژینیں نے اچانک محسوس کیا کہ بس میں سامان نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہاں ریل کی مسافت ختم ہوئی اور وہ اس بس میں سوار ہوئے وہاں ڈرائیور نے ان کا صندوقچہ اور دوسری گٹھریاں بس کی چھت پر اٹھا کر رکھوا دی تھیں۔ بس کے اندر سامان رکھنے والے خانوں میں دو چار آڑی ترچھی چھڑیوں اور سودا سلف کی چند ایک ٹوکریوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گویا جنوبی علاقے کے یہ سب لوگ خالی ہاتھ سفر کر رہے تھے۔

ڈرائیور واپس آ رہا تھا۔ اس نے بھی نقاب سے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا جس میں سے اس کی مسکراتی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے بتایا کہ بس جلد ہی چل دے گی۔ اس نے دروازہ بند کیا تو ہوا کا شور تھم سا گیا اور بس کی کھڑکیوں پر ریت کی بوچھار واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ بس کا انجن ایک بار پھر گھر گھرا کر بند ہو گیا۔ کئی بار کی مسلسل کوشش کے بعد آخر انجن نے ہنکارا ابھرا۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا وزن بڑھایا تو بس نے جیسے جھرجھری سی لی اور پھر ہچکولا سا کھا کر چل پڑی۔ گڈریوں کے ساکت غول میں سے ایک ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور کہر میں کھو گیا۔ بس چلتے ہی ہچکولے کھانے لگی کیوں کہ سڑک کا یہ ٹکڑا زیادہ خراب تھا۔ بس کے دھکوں نے عرب مسافروں کو ہلا دیا، وہ اب مسلسل ڈول رہے تھے۔ ژینیں کو غنودگی محسوس ہونے لگی۔ یکایک اس کے آگے ایک پیلا ڈبا آ گیا جو مٹھائی کی ٹکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ گیدڑ نما سپاہی اسے دیکھ کر دانت نکوس رہا تھا۔ اس نے پل بھر کے لیے تامل کیا پھر ایک ٹکیا اُٹھائی اور سپاہی کا شکریہ ادا کیا۔ گیدڑ نے ڈبا بوجھے میں ڈالا اور اس کے ساتھ ہی مسکراہٹ بھی سمیٹ لی۔ اب وہ سامنے پھیلی ہوئی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ ژینیں مارسل کی طرف پلٹی تو اسے صرف اس کی موٹی گردن کا پچھلا حصہ دکھائی دیا۔ وہ کھڑکی کے اس طرف دبیز ہوتے ہوئے کُہر کو تک رہا تھا۔

وہ کئی گھنٹوں سے سفر کر رہے تھے اور تھکن کے احساس سے بس کے اندر زندگی کی رمق ماند پڑ گئی تھی کہ باہر سے شور شرابا سنائی دینے لگا۔ برنوس پہنے بچے بس کے گرداگرد اچھل کود رہے تھے، لٹوؤں کی طرح گھوم رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ بس ایک ایسی طویل سڑک پر آ گئی تھی جس کے دونوں جانب چھوٹے مکانوں کی قطاریں تھیں۔ نخلستان شروع ہو چکا تھا۔ ہوا میں اب بھی

تیزی تھی، لیکن مکانوں کی دیواریں اب ریت کے ذرّوں کی راہ روک رہی تھیں۔ روشنی نسبتاً زیادہ محسوس ہو رہی تھی لیکن آسمان پر اب بھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ شور شرابے اور بریک کی آوازوں کے ساتھ بس ایک محراب دار ہوٹل کے سامنے جا تھمی۔ ہوٹل کی کھڑکیاں گندی دکھائی دے رہی تھیں۔ ژینیں بس سے اُتری اور فٹ پاتھ پر آتے ہی لڑکھڑا گئی۔ مکانوں سے ذرا پرے اسے ایک مینار دکھائی دیا۔ اس کے بائیں طرف نخلستان کے پام کے قامت کشیدہ درخت ایستادہ تھے۔ اس کے جی میں آئی کہ ان کی طرف جائے۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی لیکن ٹھنڈک کا احساس بدستور ویسا ہی تھا اور ہوا کے ساتھ اسے جھرجھریاں آنے لگی تھیں۔ وہ مارسل کی طرف پلٹی تو سپاہی کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے دیکھ کر دانت نکوسے گا یا سلیوٹ کرے گا، لیکن وہ اس پر نظر ڈالے بغیر آگے نکلتا چلا گیا اور غائب ہو گیا۔ مارسل بس کی چھت پر رکھے کپڑوں کے سیاہ صندوقچے کو اُتروانے میں لگا ہوا تھا۔ یہ آسان کام نہیں تھا، اس لیے کہ سامان اُتارنے والا صرف ایک آدمی تھا، بس کا ڈرائیور... اور وہ بھی بس کی چھت پر کھڑا ان عربوں پر تقریر جھاڑ رہا تھا جو بس کو گھیرے کھڑے تھے۔ ہڈیوں پر مڑھی ہوئی کھال والے چہروں اور حلق کے اندر سے آتی ہوئی آوازوں کے بیچ کھڑے ہوئے ژینیں کو بری طرح تھکن محسوس ہونے لگی۔ ''میں اندر جا رہی ہوں۔'' اس نے مارسل سے کہا جو مسلسل ڈرائیور کو ڈانٹ پلانے میں مصروف تھا۔

وہ ہوٹل میں داخل ہوئی تو منیجر نے جو دُبلا سا کم گو فرانسیسی تھا، اس کا استقبال کیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دوسری منزل پر ایک بالکونی میں لے گیا جہاں سے باہر سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں ایک کمرے میں لوہے کا ایک پلنگ، ایک رنگ کی ہوئی لوہے کی کرسی، پردوں کے بغیر کپڑوں کی الماری اور ایک چٹائی رکھی تھی جس پر گرد جمی ہوئی تھی۔ منیجر کمرے کا دروازہ بند کر کے لوٹ گیا تو ژینیں نے محسوس کیا کہ کمرے کی خالی دیواروں سے ٹھنڈک رِس رہی ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ اپنے تھیلے کو کہاں رکھے اور اپنے لیے کون سی جگہ منتخب کرے؟ وہ چاہے لیٹ جاتی یا کھڑی رہتی، لیکن اسے بہرحال ٹھٹھرتے رہنا تھا۔ اس نے کھڑا رہنا مناسب سمجھا اور تھیلا تھامے رہی۔ اس کی نگاہ چھت کے قریب بنی ہوئی کھڑکی پر پڑی جس میں سے آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ منتظر تھی لیکن کس شے کی؟ اسے اپنی تنہائی، جسم میں داخل ہوتی ہوئی ٹھنڈک اور دل پر طاری بوجھ کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اصل میں ایک خواب میں محو تھی۔ اس کے کان سڑک سے آتے اس شور کو نہیں سن رہے تھے جس میں مارسل کی جھلائی ہوئی آواز بھی شامل تھی۔ اس شور سے زیادہ اس کا دھیان اس آواز کی طرف تھا جو چھت کے قریب بنی ہوئی کھڑکی سے آ رہی تھی۔ اسے یہ بجتے ہوئے

دریا کی آواز لگ رہی تھی، لیکن حقیقتاً یہ آواز پام کے درختوں کے بیچ سے گزرتی ہوا سے پیدا ہو رہی تھی، ان درختوں سے جو اسے نہایت قریب محسوس ہو رہے تھے۔ پھر ہوا تیز ہوگئی اور موجوں کی سبک خرام آہٹ لہروں کا خروش بن گئی۔ اس کا تصور اسے ایک ایسے منظر میں لے پہنچا جہاں کمرے کی دیواروں کے دوسری طرف پام کے اونچے اونچے لیکن جھومنے والے درختوں کا سمندر موج زن تھا۔ یہاں کچھ بھی ویسا نہیں تھا جیسا اس کے تصور نے اسے دکھایا تھا لیکن ان نادیدہ لہروں نے اس کی مضمحل آنکھوں کو راحت دی تھی۔ وہ کھڑی تھی۔ اسے اپنا جسم بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ لٹکا رکھے تھے۔ وہ قدرے آگے کو جھکی ہوئی تھی اور ٹھنڈک اس کی فربہ ٹانگوں کے راستے اس کے جسم میں گھستی چلی آ رہی تھی۔ وہ پام کے اونچے اونچے لیکن جھومنے والے درختوں اور اس لڑکی کے تصور میں گم تھی جو ایک زمانے میں وہ خود رہی تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ دونوں کھانے کے کمرے میں پہنچے۔ کھلی دیواروں پر اونٹوں اور پام کے درختوں کی رنگ دار تصویریں تھیں۔ کھانے کے کمرے کی کھڑکیوں سے جن کے باہری رخ پر محرابیں بنی ہوئی تھیں، ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ مارسل نے ہوٹل کے منیجر سے مقامی تاجروں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں۔

اس کے بعد ایک عمر رسیدہ عرب نے جس کے کوٹ کے کالر پر ایک تمغا لگا ہوا تھا، ان کے سامنے کھانا چنا۔ مارسل نے جو ذہنی طور پر کہیں اور تھا، روٹی اٹھا کر اس کے کئی ٹکڑے کر دیے۔ اس نے بیوی کو پانی پینے سے روکا۔ ''پانی اُبلا ہوا نہیں ہے، شراب ٹھیک رہے گی۔'' لیکن وہ شراب نہیں پینا چاہتی تھی کیوں کہ شراب پی کر اسے نیند آنے لگتی تھی اور پھر یہ کہ کھانے میں سؤر کا گوشت تھا۔ ''یہ لوگ سؤر کا گوشت نہیں کھاتے اس لیے کہ قرآن میں اس سے منع کیا گیا ہے، لیکن انھیں یہ پتا نہیں کہ اچھے طریقے سے پکایا گیا سؤر کا گوشت صحت کے لیے مضر نہیں رہتا۔ تم کیا سوچ رہی ہو؟'' مارسل بولا۔ ژنیں کوئی خاص بات نہیں سوچ رہی تھی یا پھر مارسل نے سؤر کے گوشت کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ شاید اس پر غور کر رہی تھی۔ کھانا اسے بہرحال جلد کھانا تھا، اس لیے کہ اگلی صبح انھیں پھر سفر کرنا تھا اور آج دوپہر یہاں کے سب بڑے تاجروں سے ملنا تھا۔ مارسل نے بوڑھے عرب کو جلد کافی لانے کے لیے کہا۔ عرب نے سر کے اشارے سے مارسل کو اثبات میں جواب دیا اور چلا گیا۔ ''صبح کے وقت دھیرے دھیرے اور دوپہر کو زیادہ عجلت نہیں۔'' مارسل نے ہنستے ہوئے کہا۔ آخر کافی آ گئی۔ انھوں نے عجلت سے اسے پیا اور ٹھنڈی گرد آلود سڑک پر نکل آئے۔ مارسل نے ایک نوجوان عرب سے معاوضے کے بارے میں بات چیت کی اور پھر معاملہ

طے ہونے پر صندوقچہ اُٹھوا دیا۔ ایسے کاموں میں بھاؤ تاؤ کرنا اس کا معمول تھا۔ اس کا خیال جس سے وہ بارہا ژنیں کو آگاہ کر چکا تھا، یہ تھا کہ ایسے لوگ مزدوری دُگنی مانگتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ بات ایک چوتھائی پر طے ہو جائے گی۔ مارسل اور عرب نوجوان صندوقچہ اُٹھائے ہوئے تھے اور ژنیں ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اس نے کوٹ کے نیچے اُونی پوشاک بھی پہن رکھی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ان کپڑوں میں وہ زیادہ بھاری بھرکم لگ رہی ہے۔ یوں بھی سؤر کا گوشت کھانے اور شراب پینے سے اسے کچھ کوفت سی ہو رہی تھی۔

وہ لوگ ایک عوامی باغ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے جس میں گرد سے اٹے ہوئے درخت ایستادہ تھے۔ راستے میں کئی عرب آئے جو سامنے سے ایسے ہٹ جاتے جیسے انھوں نے انھیں دیکھا ہی نہیں اور اپنے گرد برنوس لپیٹ لیتے۔ ان لوگوں کے چہروں پر جو چیتھڑوں میں ملبوس ہوتے، ژنیں کو ایک طرح کا وقار دکھائی دیا جو اسے اپنے قصبے کے عربوں میں کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ صندوقچے کے پیچھے چلی جا رہی تھی جو بھیڑ میں اسے راستہ دلا رہا تھا۔ مٹی کی فصیل میں بنے ہوئے قصبے کے دروازے سے گزر کر وہ لوگ ایک چھوٹے سے چوک میں آپہنچے جس کے حاشیوں پر ویسے ہی درخت تھے، جیسے انھوں نے باغ میں دیکھے تھے۔ چوک کے آخری سرے پر محراب دار دُکانیں تھیں۔ وہ لوگ چوک کے بیچ میں ایک ایسی چھوٹی سی عمارت کے سامنے جا کر رک گئے جو توپ کے گولے سے مشابہ تھی اور اس پر نیلا رنگ کیا گیا تھا۔ یہ عمارت صرف ایک کمرے پر مشتمل تھی اور اسی کمرے میں جس کی روشنی دروازے کے راستے باہر آ رہی تھی، ایک بوڑھا عرب جس کی مونچھیں سفید تھیں، ایک چمکیلے تختے کے عقب میں کھڑا تھا۔ وہ بہت سارے چھوٹے چھوٹے رنگین گلاسوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ انھیں کچھ اور بھائی دے پودینہ ملی چائے کی خوش بو نے ان کا استقبال کیا۔ مارسل چوکھٹ الانگ کر لٹکی ہوئی کیتلیوں، طشتریوں اور پیالیوں سے اپنا سر بچاتے ہوئے کاؤنٹر کے سامنے جا پہنچا، ژنیں دروازے پر ہی ٹھہری رہی بلکہ سرک کر ایک طرف ہو گئی تا کہ روشنی نہ رکے۔ اسے کمرے کی تاریکی میں بوڑھے عرب کے پیچھے دو اور عرب دکھائی دیے جو ان لوگوں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ ان ٹھونس کر بھرے گئے بوروں پر بیٹھے تھے جن سے دکان کا پچھلا حصہ اٹا ہوا تھا۔ سرخ و سیاہ قالین اور کاڑھے گئے لمبے رومال دُکان کی دیواروں پر جھول رہے تھے۔ فرش بوریوں اور خوش بودار بیجوں سے بھرے چھوٹے چھوٹے بکسوں سے چھپا ہوا تھا۔ کاؤنٹر پر چمکیلی ترازو اور ایک گز جس کے ہندسے اور نشانات مٹ چکے تھے، دھرے تھے اور مصری کے آبخوروں کی ایک قطار تھی۔ ان میں سے ایک کا وہ کھردرا نیلا کاغذ جو اس پر لپٹا ہوا

تھا، اتارا جا چکا تھا اور اس کا اوپر کا حصہ کاٹ دیا گیا تھا۔ جب بوڑھے تاجر نے کیتلی رکھ کر ان کو سلام کیا تو ان کے نتھنوں میں چائے کی مہک کے ساتھ اون اور مصالحوں کی خوش بو بھی داخل ہوئی۔

مارسل اپنی خاص کاروباری دھیمی آواز میں جلدی جلدی بات کر رہا تھا۔ اس نے صندوقچہ کھولا، ترازو اور گز کو سرکا کر اونی اور ریشمی کپڑے بوڑھے تاجر کے سامنے پھیلا دیے۔ بات کرتے ہوئے وہ جوش میں تھا۔ اس نے اپنی آواز ذرا سی اونچی کی اور ان عورتوں کی طرح کھلکھلایا جو مردوں کی توجہ حاصل کرنا چاہتی ہیں لیکن انھیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اب وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر ایسی حرکتیں کر رہا تھا جو خرید و فروخت کے دوران اس کا معمول تھیں۔ بوڑھے تاجر نے سر کو جنبش دی، چائے کے گلاسوں والی طشتری ان دو نوجوان عربوں کی طرف بڑھائی جو پیچھے بیٹھے تھے اور کوئی ایسی بات کہی جسے سن کر مارسل نے حوصلہ ہار دیا۔ اس نے کپڑے اٹھا کر واپس صندوقچے میں رکھے اور پسینہ پونچھنے کے انداز میں پیشانی پر ہاتھ پھیرا حالانکہ وہاں پسینے کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ اس نے مزدور کو بلایا اور وہ لوگ چوک سے محراب دار حصے کی طرف چل دیے۔ وہاں پہلی دکان میں انھیں کچھ کامیابی ہوئی حالانکہ اس دُکان دار نے بھی پہلے تو اسی طرح بے رخی کا انداز اختیار کیا تھا۔ ''یہ لوگ خود کو خدا سمجھتے ہیں''، مارسل بولا۔ ''خیر یہ لوگ بھی بہر حال کاروبار تو کرتے ہیں۔ جینا سبھی کے لیے دُشوار ہے۔''

کوئی جواب دیے بغیر ژنیں اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ ہوا تقریباً بند ہو چکی تھی۔ آسمان جگہ جگہ سے صاف ہو رہا تھا اور گہرے بادلوں میں جو دریچے سے کھلے تھے، ان سے ٹھنڈی اور تیز روشنی چھن رہی تھی۔ وہ لوگ چوک کو پیچھے چھوڑ کر اب تنگ گلیوں میں مٹی کی دیواروں کے سائے میں آگے جا رہے تھے۔ دیواروں پر موسم سرما کے سوکھے ہوئے گلاب اور کہیں سوکھے سڑے کیڑا لگے انار لٹک رہے تھے۔ دھول اور کافی کی باس، جلتی ہوئی لکڑیوں کا دُھواں اور بکریوں اور بھیڑوں کی بدبو اس علاقے میں رچی بسی تھی۔ یہاں پر دکانیں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں۔ ژنیں کے پاؤں شل ہو رہے تھے لیکن اس کا شوہر خوش تھا کیوں کہ اب اس کا مال فروخت ہو رہا تھا۔ اس نے ژنیں کو ''بے بی!'' کہہ کر مخاطب کیا، ''سفر بے کار نہیں رہے گا؟ ان لوگوں سے براہِ راست معاملہ کرنا ہی درست ہے۔''

وہ لوگ ایک اور گلی سے ہو کر چوک میں واپس پہنچے۔ شام ہونے کو آئی تھی اور مطلع اب بالکل صاف ہو چکا تھا۔ وہ کچھ دیر چوک میں ٹھہرے۔ مارسل اب خوش تھا اور کپڑوں والے صندوقچے کو محبت سے دیکھ رہا تھا۔ ''ذرا دیکھو!'' ژنیں بولی۔ چوک کے دوسرے کنارے سے

ایک دراز قد عرب ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کا جسم دُبلا پتلا لیکن مضبوط تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا برنوس، بھورے رنگ کے جوتے اور دستانے پہنے ہوئے تھے۔ وہ اپنا درشت لمبوترا چہرہ اٹھا کر چل رہا تھا اور ان مقامی امور سے متعلق فرانسیسی افسروں سے مشابہت رکھتا تھا جو بعض اوقات ژنیں کو اچھے لگتے تھے۔ وہ ٹھوس قدموں سے ان کی سمت آ رہا تھا لیکن جب اس نے آہستہ سے ایک ہاتھ کا دستانہ اتارا تو یوں لگا جیسے وہ ان لوگوں سے آگے کسی اور شے کو دیکھ رہا ہے۔ ''یہ تو جیسے خود کو جنرل سمجھتا ہے؟'' مارسل کاندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں کے سبھی عرب متکبر دکھائی دیتے تھے لیکن اس نے تو انتہا ہی کر دی تھی۔ وہ لوگ چوک کے بیچوں بیچ تھے اور ان کے چاروں طرف خاصی کھلی جگہ تھی لیکن وہ عرب صندوقچے پر یا ان پر نگاہ کیے بغیر سیدھا صندوقچے کی جانب چلا آ رہا تھا۔ جب ان کے اور عرب کے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا اور وہ ان کے سر پر آ پہنچا تو مارسل نے صندوقچے کا کنڈا پکڑ کر اسے فوراً اس کے رستے سے ہٹا دیا۔ عرب ان کے قریب سے یوں گزرا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں اور انھی ٹھوس قدموں سے فصیل کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ ژنیں نے اپنے شوہر پر نگاہ ڈالی، اس کے چہرے پر بے چارگی طاری تھی۔ ''اب تو یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر طرح من مانی کر سکتے ہیں؟'' وہ بولا۔ ژنیں خاموش رہی۔ اسے عرب کے ناگوار تکبر پر جھلاہٹ ہو رہی تھی اور وہ یک بہ یک رنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ یہاں سے فوراً لوٹ جائے اور اس خیال کے ساتھ ہی اسے اپنا چھوٹا سا فلیٹ یاد آنے لگا، لیکن ہوٹل کے یخ بستہ کمرے میں واپس جانے کے خیال نے اسے نڈھال کر دیا۔ یکایک اسے یاد آیا کہ ہوٹل کے منیجر نے اس سے کہا تھا کہ قلعے کی چھت سے صحرا کا نظارہ ضرور کرنا۔ اس نے مارسل سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ وہ صندوقچے کو ہوٹل چھوڑ آئے۔ مارسل تھک چکا تھا اور رات کے کھانے سے قبل ذرا سا آرام کرنا چاہتا تھا، لیکن ژنیں نے جب ملتجیانہ لہجے میں کہا تو اس نے ہمہ تن گوش ہو کر اس پر نگاہ ڈالی، بولا، ''ضرور میری جان!''

وہ ہوٹل کے سامنے والی سڑک پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ عربوں کی بھیڑ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس بھیڑ میں ایک بھی عورت نہیں تھی۔ ژنیں نے سوچا کہ اس نے آج تک اتنے سارے مرد کبھی اکٹھے نہیں دیکھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی۔ چند ایک نے اپنے سُتے ہوئے دُبلے چہرے اس کی طرف موڑے تھے لیکن یوں جیسے وہ اسے دیکھ نہیں رہے۔ الگ الگ چہروں کے باوجود یہ سب لوگ اسے ایک سے لگتے تھے۔ یہ چہرے اس فرانسیسی سپاہی جسے اس نے بس میں دیکھا تھا اور اس عرب کے چہرے سے جو دستانے پہنے ہوئے تھا،

مشابہت رکھتے تھے، جن پر بہ یک وقت چالاکی اور تکبر کا تاثر تھا۔ ان لوگوں کے یہ چہرے اس اجنبی عورت کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ اسے دیکھتے نہیں، یہ اس کے قریب سے خاموشی اور نرمی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ جب کہ وہ یہاں تھکی ماندی کھڑی ہے۔ اس کی بے کیفی اور اس جگہ سے لوٹ جانے کی خواہش بڑھنے لگی۔ میں یہاں آئی کیوں؟ اس نے سوچا، سامنے سے مارسل چلا آرہا تھا۔

جب وہ زینہ طے کر کے قلعے میں پہنچے تو پانچ بج رہے تھے۔ ہوا تھم چکی تھی اور آسمان مکمل طور پر صاف سبزی مائل نیلا تھا۔ ٹھنڈک میں اب زیادہ خشکی تھی جس کی وجہ سے ان کے چہروں پر کھنچاؤ سا آگیا تھا۔ انھوں نے ابھی آدھا زینہ ہی طے کیا تھا کہ انھیں ایک عمر رسیدہ عرب ملا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے ان سے دریافت کیا کہ انھیں گائیڈ کی ضرورت ہے؟ وہ اپنی جگہ اسی طرح ساکت رہا جیسے اسے ان کے انکار کا پہلے سے یقین ہو۔ زینہ لمبا اور شروع میں تنگ تھا لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے وہ پھیلتا چلا گیا اور ٹھنڈی خشک روشنی بڑھتی گئی جس میں سے گزر کر آنے والی نخلستان کی ہر آواز ان تک صاف پہنچ رہی تھی۔ خشک اور صاف ہوا ان کے اردگرد موجیں مار رہی تھی اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہے تھے ان موجوں میں پھیلاؤ آرہا تھا، گویا ان کا خرام روشنی کے ایک آئینے سے ٹکرا کر آواز کی وہ موجیں پیدا کر رہا تھا جو دائرہ در دائرہ پھیلتی چلی جارہی تھیں۔ وہ جیسے ہی چھت پر پہنچے، ان کی نظریں پام کے درختوں کے جھنڈ کے اُس طرف پھیلے وسیع افق میں کھو گئیں۔ ژنین کو یوں لگا جیسے پورا آسمان ایک مختصر لیکن تیز سُر سے گونج اٹھا جس کی بازگشت سے اس کے اوپر تیرتا ہوا خلا دھیرے دھیرے پُر ہو گیا۔ پھر یک لخت یہ سُر تھم گیا اور اسے چپ چاپ سامنے پھیلی ہوئی وسعت، جس کی حدیں نہیں مل پا رہی تھیں، کا نظارہ کرتے ہوئے چھوڑ گیا۔

اس کی نظریں کسی چیز سے ٹکرائے بغیر ایک مکمل قوس کی صورت مشرق سے مغرب کی سمت آہستگی سے گھومتی رہیں۔ نیچے مغربی حصے کی نیلی سفید چھتیں ایک دوسرے سے کاندھے ملائے بچھی ہوئی تھیں اور ان پر گول خشک مرچیں پڑی سوکھ رہی تھیں۔ کہیں کوئی آدم زاد دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن مکانوں کے صحنوں سے بھنتی ہوئی کافی کی خوش بو کے ساتھ ٹھٹھول اور پاؤں پٹخارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مکانوں سے آگے پام کے درختوں کے جھنڈ کا اوپری حصہ جسے مٹی کی دیواریں اٹھا کر چھوٹے بڑے چوکور خانوں میں بانٹا گیا تھا، اس ہوا میں لہرا رہا تھا جو قلعے کی چھت پر محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے اور آگے خاکستری اور سیاہی مائل سرمئی رنگ کے پتھروں کا علاقہ پھیلا ہوا تھا جس کی حدیں افق سے جا ملی تھیں اور جس میں زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے

رہے تھے، لیکن نخلستان سے کچھ فاصلے پر، اس وادی کے نزدیک، جو پام کے جھنڈ کے مغربی جانب پھیلی ہوئی تھی، چند بڑے بڑے سیاہ خیمے دکھائی دے رہے تھے۔ ان خیموں کے چاروں طرف عربی نسل کے اونٹوں کا ریوڑ ساکت کھڑا تھا۔ قلعے کی چھت سے یہ اونٹ چھوٹے چھوٹے نظر آرہے تھے اور سیاہی مائل زمین کے پس منظر میں ہاتھ سے لکھی ہوئی کسی عبارت کے ایسے سیاہ حروف معلوم ہورہے تھے جن کے معانی ابھی سمجھے نہ گئے ہوں۔ ریگستان پر طاری سکوت بھی ویسا ہی بے کنار تھا جیسا کہ خلا۔

پورے وجود کو منڈیر پر ڈالے ہوئے خاموش ژینیں اپنے سامنے پھیلے ہوئے خلا میں گم ہوگئی تھی لیکن اس کے ساتھ کھڑا ہوا مارسل بے چین ہورہا تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی اور وہ واپس جانا چاہتا تھا۔ یہاں دیکھنے کے لیے بھلا تھا ہی کیا؟ لیکن ژینیں کی نگاہیں اُفق پر مرکوز تھیں۔ اسے یک بہ یک یوں لگا جیسے بہت دُور، اور پرے جنوب میں، اُس مقام پر جہاں زمین آسمان ایک سیاہ لکیر کی صورت ایک دوسرے میں ضم ہورہے تھے، کوئی ایسی شے اس کی منتظر تھی جو اس کی زندگی سے ہمیشہ دور رہی لیکن جس کا احساس اسے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ڈھلتی ہوئی سہ پہر کی روشنی میں نرماہٹ آچلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک عورت کے دل میں وہ گرہ جو محض ایک اتفاق سے پڑ گئی تھی اور جسے وقت، عادت اور اُکتاہٹ نے کس ڈالا تھا، دھیرے دھیرے ڈھیلی پڑرہی تھی۔ وہ خانہ بدوشوں کے پڑاؤ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ان خیموں میں مقیم لوگوں کو اس نے دیکھا تک نہیں تھا اور نہ ہی ان خیموں میں حرکت محسوس ہورہی تھی لیکن یہی خانہ بدوش جن کی موجودگی کا علم اسے آج سے پہلے نہیں تھا، اس کے ذہن پر مسلط تھے۔ یہ بے گھر، بے تعلق، مٹھی بھر افراد اس وسیع و عریض علاقے میں گھومتے پھرتے ہیں جو اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور جو اس وسیع تر خطے کا صرف ایک حصہ تھا، اس وسیع تر خطے کا حصہ جس کی حدیں ہزاروں میل جنوب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جہاں ایک دریا ایک جنگل کو سیراب کرتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اس بے حصار خطے کی بے آب و گیاہ چٹیل زمین پر کچھ لوگ سرگرمِ سفر رہے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس کچھ مال و منال نہیں، کوئی اثاثہ نہیں لیکن انھوں نے کبھی کسی کا دست نگر ہونا قبول نہیں کیا۔ یہ مفلوک الحال لوگ اس انوکھی سلطنت کے خودمختار حکمراں رہے ہیں۔ اس خیال نے نجانے کیوں ژینیں کو ایک ایسے میٹھے اور گہرے دُکھ سے بھر دیا تھا کہ اس نے آنکھیں موند لیں۔ اسے پتا تھا کہ یہ وہ سلطنت ہے جس کا ابد میں اس سے وعدہ کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ سلطنت کبھی بھی اس کی نہیں ہوگی، دوبارہ کبھی نہیں، سوائے اس گزرتے ہوئے پل کے، جب اس

نے گویا دوبارہ آنکھیں کھولیں، اس کی نگاہیں روشنی کی ان ہموار کرنوں پر جاٹھہریں جو ساکت آسمان سے آ رہی تھیں، جب کہ عرب قصبے سے آنے والی آوازیں جیسے ایک دم بند ہوگئیں، اسے یوں لگا گویا دُنیا کی حرکت ابھی ابھی تھمی ہے اور یہ کہ اس پل کے بعد سے نہ تو کسی کی عمر بڑھے گی اور نہ ہی کوئی مرے گا۔ اس گھڑی کے بعد زندگی ہر سمت ٹھہر سی گئی تھی سوائے اس کے دل کے جہاں اسی لمحے کوئی کرب اور تحیر کے ساتھ رو رہا تھا۔

لیکن ٹھہری ہوئی روشنی میں حرکت پیدا ہوئی اور حرارت سے محروم شفاف سورج مغرب کی سمت ڈوبنے لگا جس سے اس کا افقی حصہ سرخی مائل ہوگیا جب کہ مشرق میں ایک سرمئی لہر دھیرے دھیرے ساری وسعتوں پر چھا جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ پہلا کتا کہیں بھونکا اور اس کی آواز اس ہوا میں اُبھری جو اب کچھ اور خنک ہوگئی تھی۔ ژینیں نے محسوس کیا کہ اس کے دانت بج رہے ہیں۔ ''ہم لوگوں کو جاڑا چڑھ رہا ہے۔'' مارسل نے کہا، ''تم تو خبطی ہو۔ چلو بس اب واپس چلیں۔'' اس نے بھونڈے پن سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ژینیں منڈیر سے ہٹ کر چپ چاپ اس کے ساتھ ہولی۔ زینے پر بے حس و حرکت کھڑے بوڑھے عرب نے انھیں اتر کر قصبے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کسی کی طرف نگاہ کیے بغیر چلی جا رہی تھی، تھکن کے شدید احساس نے اسے آلیا اور یکا یک اس کا جسم بوجھل ہوگیا، اس قدر بوجھل کہ نا قابلِ برداشت محسوس ہونے لگا جسے وہ وقت سے گھسیٹ رہی تھی۔ اس کے احساس کی رفعت رخصت ہو چکی تھی۔ اس دُنیا کے لیے جس میں وہ ابھی ابھی وارد ہوئی تھی وہ خود کو بے حد طویل قامت، بھاری بھر کم اور کورا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی بچہ، کوئی لڑکی، کوئی سوکھا سڑا آدمی، کوئی مسروقہ گیدڑ ایسی مخلوقات ہی اس زمین پر بے آواز قدموں سے چل سکتے ہیں۔ یہاں آج کے بعد وہ خود کو نیند کی طرف، موت کی طرف ڈھوتے کے سوا اور کیا کرے گی؟

وہ حقیقتاً اپنے شوہر کے ساتھ خود کو ہوٹل کی طرف گھسیٹے جا رہی تھی جو اپنی تھکن کی شکایت کے سوا اچانک گم سم ہوگیا تھا جب کہ وہ سردی کے خلاف معمولی سی مزاحمت کر رہی تھی اور بخار کو چڑھتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بمشکل خود کو گھسیٹ کر بستر تک پہنچایا جہاں تھوڑی ہی دیر میں مارسل بھی پہنچ گیا۔ اس نے اس سے کچھ کہے سنے بغیر بتی بڑھا دی۔ کمرے میں ٹھنڈک بہت بڑھ گئی تھی۔ ٹھنڈ اس کے اندر گھسی چلی آ رہی تھی، بخار تیز ہوگیا تھا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ اس کے جسم میں دوڑتا ہوا خون اسے گرمی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے کروٹ لی تو اس کے بوجھ سے لوہے کا پرانا پلنگ کراہ اٹھا۔ نہیں، وہ بیمار پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا شوہر پہلے ہی سو چکا تھا، اسے بھی سونا چاہیے، یہ ضروری تھا۔ دریچے کی درز سے قصبے کی نا قابلِ فہم آوازیں اس

تک پہنچ رہی تھیں۔ موری قہوہ خانوں سے پرانے گراموفون پر ایسی دھنیں بج رہی تھیں جو اس کے لیے کسی قدر جانی پہچانی تھیں، وہ کسی ست رو مجمعے کی طرح اس تک آ رہی تھیں۔ اسے ضرور سو جانا چاہیے لیکن وہ سیاہ خیمے گن رہی تھی۔ اس کے پپوٹوں کے عقب میں بے حرکت اونٹ چر رہے تھے اور اس کے اندر لامحدود تنہائیاں چکراتی پھر رہی تھیں۔ ہاں، وہ یہاں کیوں آ گئی؟ اس سوال پر پہنچ کر اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے اطراف میں گہرا سکوت تھا۔ لیکن قصبے کی سرحدوں پر پُرسکوت رات میں کتے بھونک رہے تھے۔ ژنیں نے جھرجھری لی۔ کروٹ لینے پر اس کے شوہر کا مضبوط کاندھا اس کے جسم کو چھو گیا، وہ نیم خوابیدہ حالت میں یک لخت اس سے لپٹ گئی۔ وہ گہری نیند میں اُترے بغیر غنودگی کی سطح پر تیرے جا رہی تھی اور لاشعوری طور پر اس کاندھے سے اس طرح لپٹی ہوئی تھی جیسے اس کا محفوظ ترین مسکن یہی ہے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بات کر رہی تھی لیکن خود بھی نہیں سن پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے؟ اسے صرف مارسل کے جسم کی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ بیس برس سے زیادہ ہو رہے تھے ان دونوں کو اس طرح رہتے ہوئے، خواہ علیل ہوں، خواہ سفر میں جیسے اس وقت تھے — وہ گھر پر تنہا رہ کر کرتی کیا؟ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ کیا اس کی زندگی میں یہی کمی تو نہیں تھی؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ تو بس مارسل کے ساتھ لگی رہی تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ کوئی ہے جسے اس کی ضرورت ہے۔ اس سے جو خوشی ژنیں کو ملی تھی وہ صرف یہی احساس تو تھا کہ وہ مارسل کی ضرورت ہے۔ محبت، چاہے وہ نفرت کے احساس سے لبریز کیوں نہ ہو، اس میں ایسی رُکھائی تو نہیں ہوتی۔ آخر مارسل کا چہرہ ہے کس قسم کا؟ وہ دونوں تاریکی میں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر بس ٹٹول کر محبت کا عمل کیا کرتے تھے۔ کیا تاریکی کی محبت کے علاوہ بھی کوئی محبت ہوتی ہے؟ ایسی محبت جو دن کی روشنی میں چیخ چلا سکے۔ وہ نہیں جانتی، لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ مارسل کو اس کی ضرورت ہے اور یہ کہ یہی ضرورت خود اس کی اپنی بھی ہے، یہ کہ اس کے دن رات اسی ضرورت کے تحت بسر ہو رہے ہیں، رات خاص طور پر — ہر رات جب وہ تنہا نہیں ہونا چاہتا یا یہ کہ بڑھاپے یا موت سے ہراساں ہوتا ہے، اس کے چہرے پر وہ مخصوص تاثر ابھر آتا ہے جسے اس نے کم کم ہی دوسرے مردوں کے چہروں پر دیکھا ہوگا، وہ مشترک تاثر جو دانش مندی کا ڈھونگ رچانے والے خبطی مردوں کے چہروں پر اس وقت اُبھرتا ہے جب ان کی دانش مندی ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور انھیں مایوسی کے ساتھ عورت کے جسم کی طرف ہنکا دیتی ہے تاکہ وہ اس جسم میں خواہش کے بغیر

خوف زدہ کرنے والی ہر وہ شے دفن کر دیں جو کہ تنہائی اور رات ان کے سامنے لے آتی ہے۔

مارسل کا جسم کسمسایا جیسے وہ اس سے الگ ہونا چاہتا ہو۔ نہیں، وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ اسے تو صرف اس کا خوف ہے جو وہ نہیں ہے۔ ان دونوں کو تو بہت پہلے الگ ہو جانا چاہیے تھا اور ہمیشہ اکیلے سونا چاہیے تھا، لیکن ہمیشہ کون اکیلا سو سکتا ہے؟ بعض مرد اپنے پیشے کی مجبوری یا مقدر کی مار کی وجہ سے ضرور دوسروں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر رات اپنے بستر پر اسی ایک بستر پر موت کی طرح جاتے ہیں۔ مارسل کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ تو سب سے بڑھ کر ایک ایسا کم زور ہنستا ہوا بچہ ہے جو ہر وقت مصائب سے سہا رہتا ہے، اس کا اپنا بچہ جسے بلاشبہ اس کی ضرورت ہے اور جو اس وقت ٹھنک رہا ہے۔ وہ اس کے اور قریب ہوگئی اور اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس نے مارسل کا وہ نام جو اس نے بہت عرصے پہلے پیار سے رکھا تھا، دھیرے سے پکارا۔ وہ دونوں یہ سوچے بغیر کہ اس کے کیا معنی ہیں، اب بھی کبھی کبھی یہ نام استعمال کیا کرتے تھے۔

اس نے نہایت گہری محبت سے اسے پکارا۔ خود اسے بھی تو آخر اس کا، اس کی قوت کا، اس کی الٹی سیدھی حرکتوں کا سہارا چاہیے تھا اور اسے بھی تو موت سے خوف آتا تھا۔ ''اگر میں اس خوف پر قابو پالوں تو خوش رہ سکتی ہوں...'' یکایک ایک بے نام کرب نے اسے آلیا۔ وہ مارسل سے الگ ہوگئی۔ نہیں وہ کسی شے پر قابو نہیں پا رہی تھی۔ وہ خوش نہیں تھی۔ آزادی حاصل کیے بغیر وہ سچ مچ موت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے دل میں تکلیف محسوس کی۔ اچانک اس نے شدید بوجھ تلے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کیا۔ اس بوجھ کا جس کا ابھی ابھی اس پر انکشاف ہوا تھا، جو وہ لگ بھگ بیس برس سے ڈھو رہی تھی۔ وہ اس بوجھ سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی، چاہے مارسل اور دوسرے لوگ اس سے کبھی نہ نکلنا چاہیں۔ وہ اب پوری طرح جاگ چکی تھی۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس پکار کو سننے لگی جو کہیں بہت ہی قریب سے آرہی تھی، لیکن رات کی سرحدوں سے صرف نخلستان کے کتوں کی خالی خالی مگر کبھی نہ مضمحل ہونے والی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا پھر چلنے لگی تھی اور اس نے اس آہستہ رو پانی کی آواز سنی جو پام کے درختوں کے جھنڈ میں بہہ رہا تھا۔ ہوا جنوب کی طرف سے آرہی تھی جہاں ریگستان اور رات اب ایک بار پھر تبدیلی سے عاری آسمان تلے ایک دوسرے میں گھل مل رہے تھے، جہاں زندگی تھم گئی تھی، جہاں نہ آئندہ کوئی عمر رسیدہ ہوگا اور نہ ہی مرے گا۔ پھر ہوا کے پانیوں کا بہاؤ تھم گیا اور اسے یہ خیال بھی وثوق سے نہ رہا کہ اس نے کوئی آواز سنی ہے، سوائے اس خاموش پکار کے جسے چاہے تو وہ روک دے اور چاہے

تو سن لے، لیکن اگر اس نے اس پکار پر فوراً لبیک نہ کہا تو آئندہ پھر کبھی وہ اس کے معنی نہ پا سکے گی۔ فی الفور— یہاں کم سے کم اتنی بات تو یقینی تھی۔

وہ دھیرج سے اٹھی اور پلنگ کے پاس بے حرکت کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنے شوہر کے سانسوں کی آواز سن رہی تھی۔ مارسل محوِ خواب تھا۔ اگلے ہی لمحے بستر کی گرمی اس کے جسم سے رخصت ہوگئی اور ٹھنڈک اس پر طاری ہونے لگی۔ درزوں سے چھن کر آتی ہوئی باہر کی روشنی میں اس نے ٹٹول کر آہستہ سے کپڑے پہنے، جوتے ہاتھ میں لیے وہ دروازے تک آئی۔ اس نے اندھیرے میں پل بھر تامل کیا پھر نرمی سے دروازہ کھولا۔ دروازے کی چرچراہٹ پر وہ ایک بار پھر ساکت کھڑی ہوگئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کا پورا جسم گوش بر آواز اور تناؤ میں تھا۔ اس نے سکوت کا ایک بار پھر احساس کیا اور ہاتھ کو تھوڑا سا اور گھمایا۔ اسے لگا جیسے دروازے کا کھٹکا گھوم ہی نہیں رہا۔ آخر کار اس نے دروازہ کھول ہی لیا، چپکے سے باہر کو کھسکی اور اسی نرمی سے دروازہ بند کر دیا۔ ایک لمحے دروازے سے کان لگا کر اس نے انتظار کیا۔ گھڑی بھر میں اس نے فاصلے سے مارسل کے سانسوں کو محسوس کیا۔ برفیلی ہوا نے اس کے گال تھپتھپائے، اس نے لپک کر بالکونی کو طے کیا۔ باہری دروازہ بند تھا۔ جب وہ اس کا کھٹکا گھما رہی تھی تو اس کی نظر دربان پر پڑی جو زینے کے اوپری حصے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری نیند کے آثار تھے۔ اس نے اس سے عربی میں بات کی، ''میں جلد لوٹ آؤں گی۔'' کہتی ہوئی ٹھنیں رات کے اندھیارے میں باہر نکل کھڑی ہوئی۔

گھروں اور پام کے درختوں پر سیاہی مائل آسمان سے ستاروں کے ہار جھول رہے تھے۔ اس نے قلعے کی طرف جانے والا چھوٹا راستہ جو اب خالی پڑا تھا، دوڑتے ہوئے طے کیا۔ ٹھنڈک نے، جسے اب سورج کی مزاحمت کا سامنا نہیں تھا، رات پر دھاوا بولا ہوا تھا۔ یخ بستہ ہوا نے اس کے پھیپھڑوں کو کاٹ ڈالا، لیکن وہ تاریکی میں نیم وا آنکھوں کے ساتھ دوڑتی چلی گئی۔ آخر راستے کے اختتام پر روشنیاں دکھائی دیں جو لہراتی ہوئی اس کی طرف لپک رہی تھیں۔ وہ ٹھہر گئی، اس نے پہیوں کی آواز سنی اور پھر پھیلتی ہوئی روشنیوں کے عقب میں اسے بائیسکلوں کے نازک شفاف پہیوں پر برنوس دکھائی دیے۔ برنوس اس کے پاس سے پھڑپھڑاتے ہوئے نکل گئے۔ اس کے بعد اس کی پشت پر تاریکی میں تین سرخ روشنیاں نمودار ہوئیں اور جلد ہی غائب ہوگئیں۔ وہ قلعے کی طرف دوڑتی رہی۔ آدھا زینہ چڑھ کر اس نے نہایت شدت سے محسوس کیا کہ ہوا اس کے

پھیپھڑوں کو کاٹے ڈال رہی ہے، اس نے رکنا چاہا لیکن اس کی جسمانی قوت کی آخری لہر نے اس خواہش کے برخلاف اسے منڈیر پر لا ڈالا۔ اب اس کا پیٹ منڈیر سے دب رہا تھا۔ وہ ہانپ رہی تھی اور اس کی نگاہوں کے سامنے ہر شے دُھندلا گئی تھی۔ دوڑنے سے بھی اس کے جسم میں حرارت پیدا نہیں ہوئی تھی، اور وہ اب تک کانپ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا جسے وہ منہ کھول کر نگل رہی تھی، اس کے اندر گھومنے لگی۔ اس کی کپکپاہٹوں کے بیچ حدت کا ایک کوندا سا لپکا۔ آخر کار اس نے رات کی وسعتوں کے روبرو آنکھیں کھول دیں۔

پتھروں کے چٹخنے کی موہوم سی آواز کے سوا کوئی سرسراہٹ، کوئی آہٹ اس تنہائی اور سکوت میں مخل نہیں ہو رہی تھی جس نے اس وقت ژینیں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ تاہم گھڑی بھر بعد اسے یوں لگا جیسے اس کے اوپر پھیلا ہوا آکاش دھیرے دھیرے گھوم رہا ہے۔ خشک اور خنک رات کی پہنائیوں میں ہزاروں ستارے مسلسل نمودار ہو رہے تھے اور برف کے جھولتے ہوئے چمکیلے ٹکڑوں کی طرح اُفق کی سمت پھسلتے جا رہے تھے۔ ژینیں ان بہتے ہوئے شعلوں پر سے نگاہیں نہیں ہٹا سکتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی اور اُس کی اس ساکت حرکت نے اسے آہستگی سے اپنے وجود کی اُن گہرائیوں سے جا ملایا تھا جہاں اس وقت ٹھنڈک اور خواہش ہم آمیز ہو رہے تھے۔ اس کے سامنے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور ریگستان کے پتھروں میں بجھ رہے تھے اور ہر بار ژینیں کا وجود رات پر کچھ اور عیاں ہو رہا تھا۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے وہ ٹھنڈک، دوسروں کے بے مصرف بوجھ، زندگی کے خبط اور حبس، جینے اور مرنے کے طویل حزن کو فراموش کر چکی تھی۔ برسا برس کے بعد پاگل پن، خوف سے بے مقصد فرار کے بعد بالآخر وہ ٹھہر گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنی جڑیں پا لی ہیں اور جیون کا رس ایک بار پھر اس کے جسم میں، جس پر اب لرزہ طاری نہیں تھا، دوڑ رہا ہے۔ اپنے پیٹ کا سارا وزن منڈیر پر ڈال کر وہ متحرک آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ صرف دل کی دھڑکنوں کے معمول پر آنے کی منتظر تھی تاکہ اس کے اندر سکوت قائم ہو۔ ستاروں کے آخری جھرمٹ اپنے جھنڈ ریگستان کی سطح پر کچھ اور جھکا کر ساکت ہو گئے۔ پھر رات کا پانی ناقابلِ برداشت کوملتا کے ساتھ ژینیں کے اندر بھرنے لگا۔ اس نے ٹھنڈک کو غرقاب کر دیا۔ وہ اس کے وجود کی مخفی گہرائیوں سے اُمڈ رہا تھا اور موج در موج بہے جا رہا تھا، یہاں تک کہ اس کے حلق تک چڑھ آیا جو کراہوں سے لبریز تھا۔ اگلے لمحے ژینیں پیٹھ کے بل ٹھنڈی زمین پر پڑی تھی، پورا آکاش اس کے اوپر پھیلا ہوا تھا۔

ژینیں جس احتیاط کے ساتھ گئی تھی، اسی کے ساتھ جب وہ کمرے میں واپس آئی تو مارسل بیدار نہیں تھا، لیکن جب وہ بستر پر پہنچی تو وہ بڑبڑایا اور چند لمحوں میں اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ کہا، لیکن وہ ژینیں کے پلّے نہ پڑا۔ وہ اُٹھا اور بتی جلا دی جس سے ژینیں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ ڈولتا ہوا واش بیسن کی طرف گیا اور منرل واٹر کی بوتل سے لمبا سا ایک گھونٹ لیا۔ واپس آ کر بستر میں گھس ہی رہا تھا کہ پلنگ پر ایک گھٹنا ٹیکتے ہوئے اس نے ژینیں کی طرف ان جانی نظروں سے دیکھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور خود کو سنبھالنے سے قاصر تھی۔ ''نہیں، کچھ نہیں ہے میری جان!'' وہ بولی، ''کچھ بھی تو نہیں۔''

○○○
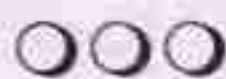
انگور کی بیل

جمال میر صادقی
معین نظامی

وہ گھنٹی کی آواز سے جاگ گیا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ اس کی بیوی کی آواز میں دکھ تھا۔

''میں نے تمھیں جگا دیا؟''

''ہاں، رات دیر سے سویا تھا۔''

''میں نے ایک بُری خبر سنی ہے، ٹھیک ہے کیا؟''

''صحیح ہے۔''

''کیا ہوا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم، اس کی خون آلود لاش اُس کی گاڑی کے پاس ایک نشیبی جگہ سے ملی۔''

''یعنی اسے لے جا کے وہاں پھینک دیا گیا تھا؟''

''پتا نہیں، ابھی کچھ نہیں معلوم۔''

''کل تم نہیں تھے، میں نے کئی بار فون کیا۔''

''یونی ورسٹی گیا تھا۔ اس کا جنازہ وہاں سے اٹھایا گیا۔ ہم بہشتِ زہرا قبرستان گئے اور پھر اس کے گھر۔ کل رات بھی میں وہیں ٹھہرا۔ کب آ رہی ہو؟''

''ٹکٹ ملتے ہی۔''

''سب ٹھیک ہیں؟''

"ہاں، بچہ جاگ گیا ہے۔ تمھیں دوبارہ فون کروں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا اور بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ کھڑکی میں سے مدھم سی روشنی اندر آ رہی تھی۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ کوئی گاڑی گلی میں سے گزری۔ کسی بلّی کی چیخ پکار سنائی دی۔ وہ پشت کے بل لیٹ گیا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ افق سے کالے بادل اٹھ رہے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ سر کے نیچے رکھا اور ٹانگیں پیٹ کی طرف سمیٹ لیں۔ گلی میں سے گزرنے والے کسی مرد کی آواز آئی اور پھر کسی عورت کی ہچکیاں بلند ہوئیں۔ پھیری والا گلی میں آ گیا اور اپنی چیزوں کا ہانکا لگانے لگا۔

وہ اٹھا اور بستر سے نیچے اتر گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ ہاتھ منہ دھو کر برش کیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ واش روم سے باہر آ گیا۔

کچن میں اس نے سماوار چلایا۔ واپس کمرے میں آیا۔ پھیری والے کی صدائیں اور اونچی ہو گئی تھیں۔ انگور کی بیل کا ایک پتا ٹوٹا، لہرایا اور نیچے گر گیا۔

اس نے واپس کچن میں جا کر چائے کو دم دیا۔ روٹی اور پنیر ٹرے میں رکھے۔ اس نے عورتوں کی آوازیں سنیں جو پھیری والے سے بھاؤ تاؤ کر رہی تھیں۔ اس نے برتن دھوئے، خشک کیے اور الماری میں رکھ دیے۔ سماوار کھول رہا تھا۔ اس نے گلاس چائے سے بھرا اور روٹی اور پنیر والی ٹرے لیے واپس کمرے میں آ گیا۔ اُس نے گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پی اور چائے کے ساتھ روٹی اور پنیر کے چند لقمے نگلے۔ اُس نے پشت سے ٹیک لگا لی۔ اسے بھوک نہیں تھی۔

ایک اور پتا ٹوٹا اور چکراتا ہوا زمین پر آ رہا۔ صحن پتوں میں چھپ گیا تھا۔ انگور کی بیل درمیان میں سے ٹوٹ گئی تھی اور اس کی ٹہنیاں ہوا میں نیزے بنی کھڑی تھیں۔

بجلی چمکی، بادل گرجا، شیشے کانپ اٹھے۔

وہ اٹھا اور کچن میں گیا۔ اس نے روٹی اور پنیر فریج میں رکھے، اپنے لیے دوبارہ چائے ڈالی، سماوار بند کیا اور کمرے میں لوٹ آیا۔ اس نے میز پر سے رات کا اخبار اٹھا لیا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"سو تو نہیں رہے تھے؟"

"نہیں..."

"ٹھیک ہو؟"

"گزارا ہے۔"

"کل میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ دوست احباب آگئے تھے؟"

"ہاں۔"

"بے چارے کو ہوا کیا تھا؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"کہاں دفن کیا گیا؟"

"فن کاروں کے احاطے میں۔"

گلی سے پھیری والے کی آواز آئی:

"پیاز، آلو، کھیرے، ٹماٹر...."

آواز دوبارہ اس کے کان میں گھومی۔

"....سہ پہر کو تمھاری طرف چکر لگاؤں گا، ہو گے نا؟"

"میں ان کے گھر جانا چاہوں گا۔ طے پایا ہے کہ وہاں اکٹھے ہوں گے۔"

"میں بھی آجاؤں گا، مل کر چلیں گے..."

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

پھیری والے نے دوبارہ ہانکا لگایا۔ بیل سے ایک اور پتا ٹوٹ کر چکرایا۔ فون کی گھنٹی پھر بجی۔

"سلام، کیسے ہو؟"

"بس ٹھیک ہی ہوں۔"

"میں کل نہیں پہنچ سکا تھا۔ جنازہ یونی ورسٹی سے اٹھایا گیا؟"

"ہاں۔"

"میرا آنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔ کچھ پتا چلا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں۔"

اُس نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اُس نے جھک کر ساکٹ سے تار کھینچ دی۔ صوفے سے ٹیک لگا کر اخبار کی ورق گردانی کی اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ اس کی نظر مکڑی کے جالوں پر پڑی جو چھت سے لٹکے جھول رہے تھے۔

اُس نے ٹی وی آن کیا۔ کچھ چوڑے چکلے کسرتی بدن والے مرد تنگ لباس پہنے جھک

رہے تھے اور سیدھے ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی ایک وزنی تھیلا آگے کو دھکیل رہا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔ اُس نے چینل تبدیل کیا۔ ایک شیر نے ہرن پر چھلانگ لگائی۔ اُس نے ٹی وی بند کر دیا۔

وہ اٹھا، پچن سے ایک لکڑی اٹھا لایا اور جالے اتارے، صحن میں جا کر باغیچے اور گملوں کو پانی دیا۔ ٹہنی پر سے ایک چڑیا اڑ گئی۔ ایک کوے نے کائیں کائیں کی۔

اُس نے بیل کی ٹہنیاں پکڑ کے کھینچیں۔ اس کے ہاتھوں میں درد ہونے لگا۔ بیل کی جڑیں مضبوط تھیں، نکل ہی نہیں رہی تھیں۔ گلی میں سے کوئی گاڑی گزری۔ دوسری طرف کی گلیوں سے پھیری والے کی ہانک سنائی دے رہی تھی۔

ہوا نے ہمسایے کے گھر کے کواڑ بجائے۔ درختوں کی سرسراہٹیں بڑھ گئی تھیں۔ بارش کے ٹھنڈے قطرے اس کے چہرے پر پڑے۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہا تھا۔

وہ واپس کمرے میں آ گیا۔ اس نے بستر پر سیدھا لیٹ کر ٹانگیں پھیلا لیں اور ٹکٹکی باندھے کھڑکی کے سامنے والی اونچی دیوار کو دیکھنے لگا۔ بارش کی موٹی موٹی بوندیں شیشے بجا رہی تھیں۔ اُس نے چہرے پر کمبل کھینچ لیا۔

(۲۰۰۵ء)

حوالہ: درختِ مو، مشمولہ ''نامِ تو آبی است''، تہران، ۱۳۸۸ش، ص ۱۶۵ تا ۱۷۱۔

○○○

ٹکڑے ٹکڑے پاسپورٹ

جمال میر صادقی
معین نظامی

انھوں نے سوٹ کیس ٹرالیوں پر رکھے۔ ایک ٹرالی اس نے پکڑ لی، دوسری اس کے بیٹے نے۔ اس کی بیوی اور بیٹی سارے بیگ ایک اور ٹرالی پر لادے لے آتی تھیں۔ وہ صبح روانہ ہوئے تھے اور کہیں رات کے اندھیروں میں پہنچے۔ درمیان میں وہ چند گھنٹے رکے بھی۔

وہ دوسری ٹرالیوں کے پیچھے پیچھے کسٹم سے گزرے اور ایئر پورٹ کے ہال سے باہر آ گئے۔ فریدون اور فریبا ان کے منتظر تھے۔ انھوں نے سوٹ کیس گاڑیوں کی ڈگیوں میں رکھے۔ اس کی بیوی اور بیٹی، فریبا کی گاڑی میں بیٹھ گئیں اور وہ اور اس کا بیٹا، فریدون کی گاڑی میں۔ گاڑیاں آگے پیچھے چل پڑیں اور کچھ تنگ ذیلی سڑکوں سے ہوتی ہوئی چوڑی سڑک پر آ گئیں۔ فریدون نے گاڑی تیز کی۔

وہ مبہوت اور خالی خالی سا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور منہ خشک ہو گیا تھا۔ وہ بلند و بالا عمارتوں، بتیوں اور طرح طرح کے بڑے بڑے سبز بورڈز کو دیکھے جاتا تھا۔ گاڑیاں لکیروں کے درمیان آگے پیچھے تیزی سے بھاگی جا رہی تھیں اور ان کا شور اس کے کانوں میں گھوم رہا تھا۔

فریدون مسلسل باتیں کیے جا رہا تھا۔ سترہ، اٹھارہ سال ہو گئے تھے کہ وہ فریدون سے نہیں ملا تھا۔ وہ اس کا محلے دار تھا اور دونوں ایک ہی سکول میں پڑھتے رہے تھے۔ فریدون میڈیکل کالج میں چلا گیا اور وہ کالج آف لٹریچر میں۔ ایک رسالے میں اس کا پہلا افسانہ چھپا تھا کہ فریدون نے تعلیم مکمل کر لی اور اپنی بیوی کے ساتھ امریکا چلا آیا۔

''موٹے ہو گئے ہو فری، لگتا ہے یہ ملک تمھارے لیے بہت سازگار رہا۔''

فریدون مسکرایا۔

''پہلے پہل تو بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ ہم اپنے ساتھ جو پیسے لائے تھے، وہ تین چار مہینوں میں ختم ہو گئے۔ جو کام بھی مل جاتا تھا، ہم کر لیا کرتے تھے۔ میں ایک اسٹور میں کام کرتا تھا اور فریبا پھول بیچا کرتی تھی۔ میں نے تین امتحان دیے تب کہیں پاس ہوا اور ایک لیبارٹری میں نوکری ملی۔ یہ سب میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ کسی جنت میں آ گئے ہو۔ گدھے کی طرح کام کرنا پڑتا ہے، صبح سے شام تک چل سو چل۔ تین چار سال لگے ہماری زندگی کو کسی ڈھب پر آنے میں۔''

''تیز ڈرائیو نہیں کر رہے ہو فری؟''

گاڑی اتنی تیز چل رہی تھی کہ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ فریدون ہنس پڑا اس کی ہنسی کی آواز خاصی اونچی تھی۔

''اگر تیز نہ چلوں تو جرمانہ ہو جائے سر! یہاں ہر چیز کا ایک ضابطہ ہے۔''

بتیاں تیز تیز گزرے جاتی تھیں، گاڑیاں تیز تیز دوڑ رہی تھیں۔ سڑکیں کئی ذیلی سڑکوں میں بٹی جاتی تھیں۔ سبز بورڈ آتے اور گزر جاتے۔ درخت، کئی کئی منزلہ عمارتیں، مینار۔ ہر چیز اجنبی اور بڑی۔ چھ سات لین کی ایک ایک سڑک، آگے پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں، جیسے کسی جنازے کے پیچھے پیچھے چل رہی ہوں۔ ہر گاڑی میں ایک عورت یا ایک مرد، چہرے اوپر کو اٹھائے، سامنے ٹکٹکی باندھے۔

''شروع میں مشکل ہوتی ہے۔ کسی طرح تمھیں اس کا عادی ہونا ہوگا۔ زیادہ اخراجات میں نہ پڑنا۔ ہو سکتا ہے تمھیں جلدی کام نہ ملے۔ چیر پھاڑ دینے والا ملک ہے یہ، ظالم کسی پر ترس نہیں کھاتا۔''

لفظ فریدون کے منہ سے گر رہے تھے اور اس کے ہونٹ کھل اور بند ہو رہے تھے۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت لٹک گیا تھا۔ سامنے کے بال جھڑ چکے تھے۔

جب وہ ایئر پورٹ کے ہال سے نکلا تو پہلے تو اس نے فریدون کو نہیں پہچانا تھا۔ فون پر اس سے بات ہوئی تھی تو اس نے فریدون کے لب و لہجے پر دھیان نہیں دیا تھا، ایسا لب و لہجہ جو اس میں اجنبیت کا احساس جگا دیتا تھا۔

''میرے لیے گھر ڈھونڈ لیا تم نے؟''

''ہاں، ہمارے گھر کے پاس ہی ہے۔ تین کمرے ہیں اس کے اور ایک ہال۔ کچھ چھوٹا ہے۔ ابھی اسی میں گزارا کرو، کام مل گیا تو بینک سے قرض لے کر کوئی گھر خرید لینا۔ اپنا گھر بیچ دیا؟''

''ہاں، سب کچھ نیلام کر دیا۔ اور کیا ہو سکتا تھا؟ بچے آنا چاہتے تھے۔ میں انھیں ان کے حال پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔''

اس نے فلک بوس عمارتوں اور میناروں پر نظر ڈالی۔ چھوٹی چھوٹی روشن کھڑکیاں جو ایک دوسرے کے قریب تھیں، آتیں اور گزر جاتیں۔ لائٹوں کی روشنی اس کی آنکھوں کو چبھ رہی تھی۔

''میرا یہاں زیادہ رہنا مشکل لگ رہا ہے۔ بچے ایڈجسٹ ہو گئے تو واپس چلا جاؤں گا۔''

اس کا بیٹا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ باہر کے نظاروں میں گم تھا اور کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ فریدون نے قہقہہ لگایا۔

''اکثر لوگ جب آتے ہیں تو ان کی سوچ یہی ہوتی ہے لیکن چند سال رہ لینے کے بعد ان کی واپسی خواب و خیال بن جاتی ہے۔''

فریدون دوبارہ ہنسا۔ فریدون کی ہنسی سے اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔

''کبھی چاہتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی ایران لوٹ جائیں، کبھی واپس جانا چاہتے ہیں۔ یہاں کے قبرستان ایرانیوں سے بھرے پڑے ہیں۔''

''نزہت آنا چاہتی تھی یہاں، کہتی ہے بچوں کے لیے تعلیمی مواقع زیادہ ہیں۔''

فریدون سامنے دیکھ رہا تھا، گاڑی گاڑیوں میں بھاگی چلی جاتی تھی۔ فریدون کے ہونٹ ہل رہے تھے اور الفاظ باہر گر رہے تھے۔

''روزانہ آنے جانے میں تین گھنٹے ڈرائیونگ کی مشقت اٹھاتا ہوں۔ بندے کی عمر ہر روز کئی کئی گھنٹے گاڑی میں گزر جاتی ہے۔ کبھی تو ناشتا بھی گاڑی میں کرتا ہوں، شیو بھی۔ گاڑی آدمی کا دوسرا گھر بن گئی ہے۔ تمھیں سب سے پہلے جو کام کرنا ہے، وہ ہے ایک گاڑی کی خریداری۔ یہاں ہر ایک کے پاس گاڑی ہونا مجبوری ہے۔''

فریدون اسی طرح بولے جاتا تھا۔ وہ مزید سُن نہیں رہا تھا۔ اسے نیند آ گئی تھی۔ فریدون کی سپاٹ سی آواز اس کے سر میں گونج رہی تھی۔ وہ پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ وہ زور لگا کر آنکھیں کھلی رکھے ہوئے تھا۔ اس کا بیٹا پچھلی سیٹ پر سو گیا تھا۔ اس نے آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھا۔

''ابھی کافی فاصلہ باقی ہے؟''

''نہیں، بس پہنچ ہی گئے۔''

سڑکیں چھوٹی ہو گئی تھیں۔ لوگ فٹ پاتھوں پر آ جا رہے تھے۔

''نیند آ گئی تمھیں؟''

''ہاں... کل رات ڈھنگ سے نہیں سویا۔''

''میں بہت خوش ہوں کہ ہم دوبارہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ یہاں اپنے جیسا آدمی کم کم ہی ملتا

ہے۔ کیا اچھے دن تھے وہ اسکول والے، ہم کیسے کیسے مزے اڑاتے تھے۔''

سامنے سے ایک عورت آ رہی تھی۔ ایک کتا اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اس نے بہت باریک سی تسموں والی شرٹ اور آدھی پینٹ پہن رکھی تھی۔ وہ نیم برہنہ تھی، گاڑی رک گئی۔ عورت اور کتا گاڑی کے آگے سے گزر گئے۔

''یہاں ہر کسی نے کتا یا بلی پالے ہوتے ہیں۔ ان کے جانوروں کی ان کے شوہروں سے زیادہ عزت ہے۔''

''یہاں زیادہ گرمی ہے وہاں کے مقابلے میں۔''

''چند دن سے ہی موسم گرم ہوا ہے، ٹھنڈ ہو جائے گی۔''

اندھیرا گہرا ہو چکا تھا جب وہ پہنچے۔ انھوں نے سوٹ کیس گھر کے گیراج میں رکھے اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ چھٹی کا دن تھا۔ اس کا بیٹا اور بیٹی فریدون کے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ باہر چلے گئے۔ موسم زیادہ گرم ہو گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ سب تھکے ہوئے بھی ہیں اور پسینے میں نہائے ہوئے بھی، کھانا تیار ہونے تک نہا لیجیے، کچھ بہتر ہو جائیں گے۔'' فریبا نے کہا۔

نزہت بولی، ''مجید آپ پہلے جائیں، مجھے سوٹ کیس سے لباس نکالنے میں وقت لگ جائے گا۔''

اس نے اپنے سر پر ٹھنڈا پانی کھول دیا۔ بدن کا پسینہ دھویا، پھر ٹب میں لیٹ کر ٹونٹی کھول دی۔ پانی اونچا ہونے لگا۔ پانی کی آواز نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ اس کا پبلشر تھا۔

''خوش قسمتی سے آپ کی کتاب شائع کرنے کے لیے اجازت نامہ جاری کر دیا گیا ہے، صرف سرورق پر عورت کی تصویر تبدیل کرنا ہوگی۔''

''میں روانہ ہو رہا ہوں۔''

''کہاں؟''

''امریکا۔''

''کب تک واپس آئیں گے؟''

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پانی اس کے گلے تک آ چکا تھا۔ اس نے ٹونٹی بند کر دی۔ وہ دوبارہ پانی میں گھس گیا۔ اس کی پلکیں مند گئیں۔

''آلو، پیاز، ٹماٹر، کھیرے، سرخ سیب، لال انگور، گھروں والو! تھیلے لے کر آ جاؤ۔''
پھیری والے کی آواز گلی میں پھیلی ہوئی تھی۔

''مجید! ہمارے آلو اور پیاز ختم ہو چکے ہیں۔ مجید......''

نزہت نے اونچی آواز میں کہا، ''مجید...... مجید...... مجید......''

اس نے آنکھیں کھولیں۔

''ہوں''

''آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''ٹھیک ہوں......''

''جواب کیوں نہیں دیتے؟ نکلیں گے نہیں؟''

''کیوں نہیں۔''

ٹب کے نیم گرم پانی سے نکلنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ تھوڑا سا وہیں دوبارہ اونگھ لے۔

''میں نے آپ کے کپڑے دروازے کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ جلدی نکل آیئے۔ میں بھی نہا لوں۔''

وہ بادلِ ناخواستہ ٹب سے نکل آیا۔ اپنے لیے رکھے گئے تولیے سے اُس نے خود کو خشک کیا۔ آئینے میں جھانکا تو چہرہ سُوجا ہوا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔

فریبا نے کہا، ''باہر چلیے، باہر موسم بہتر ہے۔''

گھروں کے سامنے ایک میز اور کچھ کرسیاں رکھی گئی تھیں جن پر لوگ بیٹھے تھے۔

گھروں کے سامنے والا باغیچہ سرسبز اور پودوں اور پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھروں کے مرکزی دروازوں پر لگی لائٹوں سے چمن روشن ہو رہا تھا۔ وہ فریدون کے سامنے جا بیٹھا۔

''سب لوگ باہر نکل پڑے۔''

''چھٹی کے دن باہر آ جاتے ہیں، کچھ لطف اٹھانے کو۔''

ایک لڑکا اور لڑکی تین پہیوں والی سائیکل پر ان کے سامنے سے گزرے۔ ایک ننھا منا سا لڑکا ان کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور چیخ چلا رہا تھا۔

''یہ لوگ آپس میں اکٹھے نہیں ہوتے؟''

''نہیں، کبھی کبھار اکا دکا لوگ مل کر ایک آدھ جام پی لیتے ہیں اور پھر اپنی میز پر لوٹ جاتے ہیں۔ یہ ملنے ملانے میں پُر جوش نہیں ہیں۔''

''بہت گرمی ہے، مجھے بہت پسینا آ گیا تھا۔''

''دو تین ہفتوں میں موسم خنک ہو جائے گا۔ ان دنوں تو گرمی کا عروج ہے۔'' نزہت اور فریبا کھانا لائیں۔ نزہت نے پستے سے بھرا ہوا ایک برتن مشروبات کے ساتھ رکھا۔ اس نے لباس تبدیل کر رکھا تھا... خاکہ روخا کہ کردہ بو؟

''پانی سے میرے حواس بحال ہوئے، خود سے بُو آنے لگی تھی۔''

فریبا نے کہا، ''یہاں اگر ہر روز نہایا نہ جائے تو اسی طرح بساند آنے لگتی ہے۔''

فریدون نے کہا، ''آخر آپ لوگ بھی آ ہی گئے ہمارے پاس۔''

نزہت کہنے لگی، ''بھلا یہ حضرت راضی ہونے والے تھے؟ کہتے تھے آپ لوگ چلے جایئے، میں یہیں رک جاتا ہوں۔ میرے بھائی یہاں آ گئے، عزیز رشتہ دار آ گئے یہاں، اور یہ تھے کہ وہاں سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔''

فریدون نے ایک گلاس بھر کر اس کے آگے رکھا۔

''ٹھنڈا ہے، یخ، تر و تازہ کر دے گا تمھیں۔''

نزہت نے کہا، ''بات ہی نہیں آ رہی تھی ان کی سمجھ میں۔ کیا یہاں رہ کر لکھنے کا کام نہیں ہو سکتا؟''

اس نے ایک گھونٹ بھرا اور کندھے اچکائے۔

''آدمی اپنا پاسپورٹ تو نہیں پھاڑ سکتا نا!''

نزہت نے کہا، ''کس نے کہا ہے کہ آپ اپنا پاسپورٹ پھاڑیے، ٹِک کے بیٹھ جایئے اور جو جی میں آتا ہے لکھیے، یہاں تو سنسر وغیرہ کا جھنجھٹ بھی نہیں ہے۔''

اس نے ایک اور گھونٹ لیا۔ گلے میں گدگدایا اور حلق سے نیچے اتار لیا۔

''فارسی کتابوں کی اشاعت کی کیا صورت حال ہے یہاں فری؟''

فریدون نے کہا، ''کوئی خاص قابلِ ذکر نہیں ہے۔''

نزہت نے کہا، ''پچھلی بار جب میں بھائی جان کے ہاں آئی تھی، ایرانی بک شاپس یہاں کی چھپی ہوئی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔''

فریدون نے کہا، ''کتابیں اپنے خرچ پر ہی چھپتی ہیں۔''

فریبا نے کہا، ''پڑھنے کے لیے لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے۔''
فریدون بولا، ''اکثر لوگ انگریزی کتابیں پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔''

نزہت نے سر اٹھایا، ''فرض کیا یہاں قارئین نہیں ہیں تو یہ اپنی کتابیں شائع کرنے کے لیے وہاں بھی تو بھیج سکتے ہیں۔''

''اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی ہے؟'' فریدون نے پوچھا۔

''ہاں۔''

نزہت حقارت سے ہنسی۔

''آمدنی کہاں کی، یہ ایک ناول پر دو تین سال لگاتے ہیں، رقم بروقت بھی مل جائے تو دو تین مہینے کے اخراجات کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔''

''بندہ پیسے کے لیے تو نہیں لکھتا۔''

نزہت نے منہ بنایا۔

''پھر نہ شروع ہو جائیے گا۔ کون سی عزت، کون سا احترام دیا گیا آپ کو؟ کون سی کلغی سجائی گئی آپ کے سر پر؟''

اس نے گلاس خالی کر دیا۔ اس کا معدہ گرم ہو رہا تھا۔

''بچے نہیں آئے؟''

فریبا نے کہا، ''ابھی نہیں آئیں گے۔ ڈسکو پہ گئے ہیں، صبح کے قریب ہی آئیں گے۔''

فریدون نے اس کا گلاس بھرا اور ہنسا۔

''مجید یاد ہے تم نے مجھے تھپڑ مارا تھا؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''ان کے ہمسایے میں ایک لڑکی سے ایک دو باتیں کی ہوں گی میں نے کہ جناب والا کی غیرت جاگ اٹھی تھی۔''

اس نے مسکرا کر گلاس اٹھا لیا۔

''ہاں تو وہی وجہ بنی ہماری دوستی کی۔''

گھروں کے سامنے پڑی کرسیاں خالی ہو رہی تھیں۔ عورتیں اور مرد گھروں کو لوٹ رہے تھے اور بچوں کا شور وغل رک گیا تھا۔ فریبا نے جمائی لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بس بہت ہے فری، تم نے بہت زیادہ باتیں کرلیں۔ انھیں جا کے سونا بھی ہے، تھکے ہوئے ہیں۔'' فریدون گلاس چڑھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم لوگوں کے بستر میں نے ڈرائنگ روم میں لگا دیے ہیں۔ بچے بچوں کے ساتھ ان کے کمروں میں سو جائیں گے۔''

وہ برتن سمیٹ کر گھر کو چل دیے۔ فریدون نے کرسیاں ایک دوسرے پر رکھیں اور میز کھینچ کر باغیچے کے قریب کردی۔

فریبا نے کہا، ''ہم تو کل دوپہر تک سوئیں گے، آپ لوگوں کو ناشتا کرنا ہو تو سب چیزیں فریج میں ہیں۔''

سرہانے پر سر رکھتے ہی نزہت کے خراٹے سنائی دینے لگے۔

وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ پسینہ بہت آرہا تھا۔

وہ اٹھا اور کھڑکی کے سامنے آکھڑا ہوا۔ گھروں کے مرکزی دروازوں کی لائٹیں جل رہی تھیں۔ کوئی اُلّو بول رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ اس نے بے آواز طریقے سے دروازہ کھولا۔ گرمی کا جھونکا کسی مُکّے کی طرح اس کے چہرے پر لگا۔ وہ آنکھیں بند کرتا اور کھولتا آگے بڑھا۔ وہ سڑک کے رخ پر کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔ آسمان صاف اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ درختوں کے گہرے سائے باغیچوں پر پڑ رہے تھے۔ سڑک پر سے کوئی گاڑی گزری، ہر طرف سناٹا تھا۔ اس کا سر بے اختیار سینے سے جا لگا اور وہ بغیر کسی آواز کے رونے لگا۔

(۲۰۰۶ء)

حوالہ: شناسنامۂ پارہ شدہ مشمولہ ''نامِ تو آبی است''، تہران، ۱۳۸۸ش، ص ص ۱۲۳۔۱۳۴

○○○

طوالت میں

احمد رضا احمدی

ترجمہ: معین نظامی

رات کی طوالت میں
یہ خواب دیوار کی رطوبت کے ساتھ
دیوار سے زمین پر گرتا ہے
گرمیوں میں
مزید کسی بہار کی ہمت نہیں ہے
مَیں یاد کرتا ہوں
پاک دلوں کو
جو اس گلی میں
اِن گرمیوں میں
بادلوں کے محاصرے میں تھے
اور درختوں کی ٹہنیوں سے نیچے گر پڑے تھے
ہمارے ملبوسات پُرانے ہیں
کوئی انھیں نہیں پہنتا

ہمارے پاس نہ جوتے ہیں
نہ دستانے
نہ چھتری
سردیاں راستے میں ہیں
لیکن
میرے گھر میں روٹی ہے، تمھارے لیے
میرے گھر پرانی ٹوپی ہے، تمھارے لیے
مَیں تمھاری آنکھوں میں
ایک پرانی گلی کو آواز دیتا ہوں
کوئی جواب نہیں ملتا
کوئی بات نہیں ہے
مجھے جواب نہ دو
مَیں دوبارہ خواب میں ڈوب جاتا ہوں
یہ خواب دیوار کی رطوبت کے ساتھ
دیوار سے زمین پر گرتا ہے
مَیں بوڑھا ہو گیا ہوں
خواب کو زمین سے اُٹھا نہیں سکتا ۔

○○○

گرمیوں کی طرح سفید

ماہور احمدی

ترجمہ: معین نظامی

گرمیاں آنے کو ہیں
ہم سب نے اپنے سفید لباس پرانے صندوقچے سے نکال لیے ہیں
چیری کے پھل ابھی سفید ہیں
چیری کی ٹوکری، چیری کے درخت کے نیچے
انتظار کر رہی ہے کہ پھل سرخ ہو جائے
کھڑکی کا خس کا پردہ آہستہ آہستہ نیچے آتا ہے
ہم نے حوض کے پانی کو گہرا نیلا کر دیا ہے
لیکن تم ابھی نہیں آئے ہو
تم نے ابھی تک سیاہ لباس پہنا ہوا ہے
تمھارے ہاتھوں میں ابھی تک مالٹوں کی ٹوکری ہے
گرمیاں آگئی ہیں
ہم نے اپنے سفید لباس پہن لیے ہیں
ہماری چیری کی ٹوکری چیری کے سرخ پھلوں سے بھری ہوئی ہے
لیکن تم نے ابھی تک سیاہ لباس پہنا ہوا ہے

کل آؤ تو سفید لباس پہن کر آنا
لیکن تم اگلے دن بھی نہیں آئے ہو
ہم سفید لباس اور چیری کی ٹوکری کے ساتھ قبرستان جاتے ہیں
تمھیں سفید لباس میں سوئے ہوئے دیکھتے ہیں
کیا تم فوت ہو گئے ہو؟
ہم اپنے ہونٹوں پر سرخ ترین چیریوں کا رس ٹپکاتے ہیں
تم ابھی تک سردیوں میں سوئے ہوئے ہو
لیکن اب چیری کے جوس کے ساتھ تم بھی گرمیوں کے ہو گئے ہو
اب تم نے سفید لباس پہن رکھا ہے
تم زندہ ہو اور سفید لباس پہنے ہوئے چیری کی ٹوکری کی طرف آتے ہو
مَیں اور تم چیری کی ٹوکری کے ساتھ، ہوا میں، گھر کو لوٹتے ہیں
حوض کا پانی ابھی نیلا ہے
قبرستان سے ہماری واپسی میں کئی سال لگ گئے
لیکن خس کا پردہ ابھی نیچے ہے
ہمارے بال سفید ہو گئے ہیں
مَیں اور تم جس طرح گرمیوں میں قبرستان بھاگے تھے
اسی طرح گرمیوں میں گھر لوٹتے ہیں
مَیں گھر کا دروازہ کھولتی ہوں
مَیں تمھیں قبرستان ہی میں کہیں بھول آئی ہوں
افق تک جاتے ہوئے راستوں سے ہوتی ہوئی مَیں تمھاری طرف آتی ہوں

ان راستوں میں
مجھے ایک لڑکا دکھائی دیتا ہے
جو مستقبل کی طرف سے بہت آسودہ ہو کر جا رہا ہوتا ہے
اسے مستقبل کا کوئی خوف نہیں ہوتا
مَیں لاجوردی آسمان پر کسی چھوٹے سے پنچھی کی اڑان دیکھتی ہوں
کہ وہ لاجوردی فضاؤں میں کتنا آزاد ہے
ایک بوڑھے کو دیکھتی ہوں
کہ دن گزارنے کے لیے کیسے بانسری بجاتا ہے
مَیں دیکھتی ہوں کہ اس راستے کے اختتام تک پہنچ گئی ہوں
جو اُفق پر ختم ہوتا ہے
اس اُفق نے اپنے آپ میں ایک قبرستان کو قید کر رکھا ہوتا ہے
مَیں اُس قبرستان میں پہنچ گئی ہوں
جہاں مَیں تمھیں کہیں بُھلا بیٹھی تھی
مَیں تمھیں پکارتی ہوں
تم میری طرف آتے ہو
سفید لباس اور چیری کی ٹوکری کے ساتھ
ہم گھر لوٹ آتے ہیں
گھر میں ابھی گرمیاں ہیں
لیکن گلیوں میں برف باری ہو رہی ہے
ہماری زندگیاں سفید ہو گئی ہیں

گلیاں بھی سفید ہو گئی ہیں
چیری کے پھل بھی سفید ہو گئے ہیں
تم زندہ ہو
میں، تم اور سب لوگ زندہ ہیں، گرمیوں میں زندہ ہیں
سفید لباس کے ساتھ
سفید چیریوں والی ٹوکری کے ساتھ
سفید گرمیوں میں
گرمیوں جیسی سفیدی میں

○○○

اجازت مل سکے گی کیا؟

نزار توفیق قبانی☆

ترجمہ: حارث خلیق

جہاں سب سوچنے اور لکھنے والوں کا مقدر
ارضِ مقتل ہے
جہاں لب قید ہیں
اور جُبّہ و خرقہ نے تازہ لفظ پر پہرے بٹھائے ہیں
جہاں کچھ پوچھ لینا لائقِ تعزیر ٹھہرا ہے
وہاں مجھ کو
اجازت مل سکے گی کیا؟
اجازت مل سکے گی اپنے بچوں کو
میں پالوں جس طرح سے پالنا چاہوں
بتا پاؤں کہ مذہب فرد اور اس کے خدا کے
باہمی رشتے کو کہتے ہیں
کوئی بھی تیسرا۔ عالم، مبلّغ، درمیاں آ ہی نہیں سکتا

☆ نزار توفیق قبانی کی عربی نظم کا تخلیقی ترجمہ اضافوں کے ساتھ۔

اجازت مل سکے گی اپنے بچوں کو
میں پہلے یہ بتا پاؤں کہ مذہب نام ہے
اخلاق کا، سچائی کا، ایمان داری کا
پھر اس کے بعد جی چاہے تو سوچیں
منتخب کیا ہے
وضو کیسے کریں، کیسے نہائیں
وہ داہنے ہاتھ سے لقمہ بنائیں

اجازت مل سکے گی اپنی بیٹی پر یہ وا کردوں
خدائے عزّ وجل کو پیار ہے اُس سے
وہ جب چاہے، جہاں چاہے دعا مانگے
خدا سے علم و حکمت اور جزا مانگے
بس اس کی ہی رضا مانگے
اجازت مل سکے گی اپنے بچوں کو
بڑے جب تک نہ ہو جائیں
عذابِ قبر سے ہرگز ڈراؤں میں نہیں تب تک
کہ بچے موت سے پوری طرح واقف نہیں اب تک

اجازت مل سکے گی
پیاری بیٹی کو میں پہلے رکھ رکھاؤ

اپنی تہذیب و تمدن سے مکمل آشنا کردوں
یہ بہتر ہے کہ وہ انسانیت کے دین کو دل میں بسائے
پھر جو خود چاہے تو اپنا سر ڈھکے، زینت چھپائے

اجازت مل سکے گی اپنے بیٹے کو یہ سمجھاؤں
تعصّب بر بنائے رنگ و نسل و جنس و مذہب
آدمی کو اپنے ربّ سے دور کرتا ہے
کسی کو دکھ نہ دے اور معاف بھی کردے
کہ بس احسان ہی انسان کو پُر نور کرتا ہے
اجازت مل سکے گی اپنی بیٹی کو بتا پاؤں
کہ بس آیات کو یوں منہ زبانی یاد کرلینا نہیں کافی
جو وہ اسکول میں پڑھتی ہے وہ سب کچھ ضروری ہے
حصولِ علم سے اِس دین کو اک خاص نسبت ہے
سمجھ کر پڑھنے والوں سے خدا کی خاص قربت ہے

اجازت مل سکے گی اپنے بیٹے سے یہ کہہ پاؤں
کہ دنیا میں لباس اور وضع، قطع ثانوی ہیں سب
حضورِ پاکؐ نے جو رہ دکھائی ہے
اگر اس پر چلو تو شرطِ اوّل ہی
دیانت اور وفا سے آشنائی ہے

اجازت مل سکے گی
اپنی بیٹی کو دلاسا دوں کہ وہ بے فکر ہو جائے
نہ روئے سوچ کر
اس کی وہ پیاری سی سہیلی جو مسیحی ہے
وہ کافر ہے، وہ ہر حالت میں دوزخ میں ہی جائے گی
اگر وہ میری بیٹی کی طرح
پیاری سی اور اچھی سی بچّی ہے
تو بیٹی اس کو اپنے ساتھ جنّت ہی میں پائے گی

اجازت مل سکے تو میں علی الاعلان یہ کہہ دوں
پیمبر، ہادی و سرور
حضورِ پاکؐ پر یہ سلسلہ موقوف ہوتا ہے
یہ اہلِ جُبّہ و خرقہ
خدائے عزّ و جل کے نام سے فرمان جاری کر نہیں سکتے
یہ لوگوں کے دلوں پر خوف طاری کر نہیں سکتے

اجازت مل سکے تو عرض کر دوں میں
خدا نے خود کہا ہے جس نے ایک انسان کو مارا
یہ سمجھو اس نے سب انسانیت کو مار ڈالا ہے
کلامُ اللہ کا محکم حوالہ ہے

مسلماں کا مسلماں کو ڈرانا اور دھمکانا
نبیؐ سے اور نبیؐ کی آلؑ سے منکر ہے ہو جانا
مسلماں ہو نہ ہو انساں ہو جو بھی
سمجھ لو خونِ ناحق فسقِ ایماں ہے
یہ تذلیلِ بنی آدم ہے اور تسکینِ حیواں ہے

ooo

بھائی عبدالرحمٰن

امر لعل ہنگورانی
رفیق احمد نقش

کچھ لوگ اُسے مست کہتے تھے اور کچھ اُسے درویش سمجھتے تھے۔ شاید وہ مست بھی تھا اور درویش بھی۔ بدن کا دبلا پتلا، گندمی رنگت، عام روایتی قد سے کسی قدر لمبا۔ بدن پر اوڑھتا تھا فقط گدڑی، یوں بالکل ننگا بھی نہ رہتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے رمز میں رنگا رہتا تھا، کبھی مندر میں تو کبھی مسجد میں۔ اکثر شام کو وہ سکھر میں بندرگاہ پر، ''شارع ثمر'' پر، ریلوے گڈس آفس کے قریب، جہاں دکانوں کے پہلو میں اُن دنوں سامی کے سلوک پڑھے جاتے تھے، بیٹھ کر کان لگائے رسان سے سنتا تھا۔ بعض اوقات وہ یوں بڑبڑاتا تھا، ''بھائی عبدالرحمان، سمجھتے ہو یا نہیں؟ نہ جانے کب تمھاری قسمت کھلے گی؟''

ایک بار راستے میں آتے ہوئے پتھر سے اُس کے پیر میں چوٹ لگی۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا، ''بھائی عبدالرحمان، کس قدر تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے! تمھاری آنکھیں ہیں آکاش پر۔ اگر آنکھیں کھول کر چلتے تو پتھر تمھیں نہ لگتا۔'' وہ وہیں سوچ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بولا، ''بھائی عبدالرحمان، دیکھو، تم کتنے خود غرض ہو! بھائی عبدالرحمان، یوں ہی نقصان وہ پتھر راستے پر چھوڑ کر جا رہے ہو؟ کل کلاں کو کسی اور راہ گیر کو لگ جائے!'' پھر کچھ دم بھر کر اور سوچ کر کہنے لگا، ''بھائی عبدالرحمان، اگر تم اچھے آدمی ہو تو پتھر اٹھا کر دور پھینک دو۔'' اور اُس نے پتھر اٹھا کر دور پھینک دیا۔

یہ اُس کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ خودکلامی کرتا تھا اور خود کو مخاطب کرتا تھا، ''بھائی عبدالرحمان!'' شاید اپنے مشاہدے سے، خود میں رس کر وہ رمز بھری باتیں کرتا تھا۔ اگر کوئی اُس

سے پوچھ ہی بیٹھتا کہ عبدالرحمان، کھانا کھاؤ گے؟ تو پہلے وہ اپنے آپ سے پوچھتا تھا، "بھائی عبدالرحمان، یہ پوچھ رہے ہیں کہ کھانا کھاؤ گے؟" پھر خود کو جواب دیتا تھا، "خوردن برائے زیست است، نہ زیست برائے خوردن۔" یعنی کھانا زندگی کے لیے ہے نہ کہ زندگی کھانے کے لیے۔ اس طرح وہ صلاح مصلحت سے جواب دیتا تھا۔

وہ فارسی کا شاعر تھا۔ حافظ تو شاید اُسے زبانی یاد تھا۔ وہ شاہ اور سامی کا بھی ماہر تھا، سچل سائیں کا تو پیروکار تھا وہ۔ اُس نے اردو بھی پڑھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار جب اردو میں پنجاب سے خط آتے تھے تو لوگ عبدالرحمان کو ڈھونڈ کر اُس سے پڑھواتے تھے۔ وہ فطرتاً حلیم الطبع تھا۔ اُسے اور کوئی لالچ نہ تھا، وہ تھوڑے سے دانے پانی میں گزارا کرلیتا تھا۔ گدڑی ہمیشہ، جاڑے گرمی، اُس کے کاندھے پر ہوتی تھی۔ رات کو وہ گدڑی کو اوڑھ لپیٹ کر سوجاتا تھا۔ شاید وہ محبوب سے، لوگوں سے چھپ کر، دل بہلاتا تھا۔

ایک بار کوئی غریب کسی ناحق میں پھنس گیا۔ اُس پر الزام تھا کہ اُس کے پاس سے چوری کی گھڑی نکلی ہے۔ پولیس نے اُس کی تلاشی لی تھی۔ مشیروں کے رُوبہ رُو گھڑی اُس سے برآمد ہوئی تھی؛ گھڑی بھی طلائی، کسی مسلمان سیٹھ کی تھی۔ الزام کوئی مہینے بھر پہلے لگایا گیا تھا۔ ملزم پر استغاثہ ٹھوس اور مضبوط تھا، اُس کا چھوٹنا مشکل تھا؛ اُدھر سیٹھ بھی جما ہوا تھا۔ ملزم کا دفاع یہ تھا کہ وہ کسی سیٹھ کے گھر کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ سیٹھ کو شبہ ہوا کہ وہ اُس کی بیوی کو اشارہ کررہا ہے سو اُسے وہیں پکڑ کر مار لگائی گئی۔ اگر عبدالرحمان بیچ میں نہ پڑتا تو مار مار کر وہ اُس کا دم نکال دیتے۔ عبدالرحمان کے بیچ میں پڑنے سے سیٹھ کوئی باز آنے والا تھا کیا؟ بولا، یہ ہماری لاج کی طرف نظر بد ڈالتا ہے۔ ہم عزّت دار لوگ ہیں۔ عبدالرحمان نے حد درجے مداخلت کی، مگر وہ نہ مانا۔ تب عبدالرحمان اپنے آپ سے کہنے لگا، "بھائی عبدالرحمان، یہ سیٹھ باز نہیں آئے گا۔ اِسے عزّت کا خیال ہے۔ اِس کی پینتیس برس کی بہن بیٹھی ہے۔ اُس سے حق بخشوالیا ہے، مبادا آبائی وراثت میں حصہ بٹائے۔ پھر جب اُس کا شوہر نہیں تو ضرور...؟" اِتنا کہہ کر وہ رک گیا اور پھر اپنے آپ سے کہنے لگا، "عبدالرحمان، تُو کسی کا پردہ نہ کھول۔ پھر سے سیٹھ کو ہاتھ جوڑ کر سمجھا اور اگر وہ نہ سمجھے تو پھر سچ بول دے۔"

عبدالرحمان خودکلامی کرتا تھا تو بڑبڑاتا نہیں تھا، سب سنتے تھے۔ لوگ اشارہ سمجھ گئے اور سیٹھ نے بھی سنا۔ یوں غریب کی جان آزاد ہوئی۔ عبدالرحمان نے پردہ فاش کرنا نہ چاہا، تاہم بات لوگوں کے ہونٹوں پر گئی اور بیچ مچ جھوٹے سیٹھ کی بہت غیبت ہوئی۔ ملزم یہ دفاع پیش کررہا تھا۔

دوسرے جو لوگ تھے آس پاس کے، انھیں اُس نے گواہی میں بلوایا تھا۔ سیٹھ گواہی میں عدالت میں ساری بات سے بالکل ہی منکر ہو گیا۔ ملزم نے تین محلّے والے گواہ دیے تھے اور چوتھا تھا عبدالرحمان۔ چار پانچ ساعتوں پر تو وہ گواہ آئے تھے، لیکن مقدمہ نہ چلا۔ دو گواہوں سے تو ملزم کو دست بردار ہونا پڑا، جنھیں سیٹھ نے لالچ دے کر اپنی طرف کر لیا تھا۔ ایک گواہ کسی ایک ساعت پر نہیں آیا تھا تو مجسٹریٹ نے اُس کے وارنٹ نکال دیے اور کچھ بیچ کے لوگوں نے کہا کہ اگر تم یہ وجہ بتاؤ گے کہ جناب مجھے کچھ پتا نہیں تو مجسٹریٹ معاف کر دے گا۔ تیسرا بے چارہ تو یوں اپنی جان چھڑا گیا۔ باقی بچا عبدالرحمان۔ ملزم کے وکیل کا کہنا تھا کہ دفاع کا دارومدار ایسے گواہ پر نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم ملزم عبدالرحمان پر اعتماد رکھتا تھا کہ وہ خدا ترس آدمی ہے، کسی کا بھی لحاظ نہیں کرے گا۔

عبدالرحمان کو عدالت کا بلاوا آیا۔ ''بھائی عبدالرحمان، عدالت کا بلاوا آیا ہے۔ عدالت میں ادب سے جانا چاہیے۔'' سو اُس نے جوتیوں کی ایک جوڑی فراہم کی۔ ہر ساعت پر وہ اُسے گدڑی میں لپیٹ کر لاتا تھا۔ آخرکار اُسے عدالت میں پکار پڑی۔ عبدالرحمان نے جوتیاں جوش و خروش سے پہنیں۔ اُس نے گدڑی دوہری کر کے گردن میں ڈال دی۔ ابھی وہ اندر داخل ہوا ہی تھا کہ چپراسی نے اُس سے کہا، ''جوتیاں باہر اتار دو۔''

عبدالرحمان اپنے آپ سے کہنے لگا، ''بھائی عبدالرحمان، عدالت کا چپراسی کہتا ہے کہ جوتیاں باہر اتار دو۔ اسے بتاؤ کہ میں عدالت ہی کے لیے تو جوتیاں لے کر آیا ہوں۔''

اُس نے چپراسی سے کہا، ''عدالت کی خاطر تو جوتیاں لے کر آیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔ مجسٹریٹ اُسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ ابھی وہ کٹہرے میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ مجسٹریٹ نے کڑک کر پوچھا، ''رلّی کیوں کندھے پر رکھ کر آئے ہو؟''

عبدالرحمان اپنے آپ سے کہنے لگا، ''بھائی عبدالرحمان، مجسٹریٹ پوچھتے ہیں کہ گدڑی گردن میں کیوں پہنے ہوئے ہو۔ عدالت میں آئے ہو، سمجھ کر پورا جواب دو، مجسٹریٹ صاحب کو بتاؤ کہ جناب، ہندو جب عدالت میں آتے ہیں تو انگوچھا، دُپٹا، یا تولیا گردن میں پہن کر پھر بیان دیتے ہیں۔ میں نے بھی اسی لیے گدڑی گردن میں ڈالی ہے، عدالت کا احترام کرنے کے لیے۔''

(عدالت سے): ''جناب، ہندو جب عدالت میں آتے ہیں تو انگوچھا، دُپٹا، یا تولیا گردن میں ڈال کر پھر بیان دیتے ہیں۔ میں نے بھی اسی لیے عدالت کا احترام کرنے کے لیے گدڑی گردن میں ڈالی ہے۔'' جواب بالکل لاثانی تھا۔

سرشتے دار: ''کہو کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔''

عبدالرحمان (اپنے آپ سے): ''بھائی عبدالرحمان، سرشتے دار کہتے ہیں کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا اور سچ کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ سرشتے دار کہتے بالکل سچ ہیں۔'' (سرشتے دار سے): ''میں خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا اور سچ کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہوں گا۔''

سرشتے دار: ''نام؟''

عبدالرحمان (اپنے آپ سے): ''بھائی عبدالرحمان، سرشتے دار صاحب نام پوچھ رہے ہیں؟ انھیں بتاؤ، عبدالرحمان۔'' (سرشتے دار سے): ''عبدالرحمان۔''

رہ رہ کر عدالت میں دبے دبے قہقہے گونج رہے تھے۔ مجسٹریٹ پہلے تو مسکرا رہا تھا، لیکن پھر کچھ خشم گیں ہوگیا۔ وکیلوں میں سے ایک وکیل نے اٹھ کر مجسٹریٹ کو انگریزی میں سمجھایا کہ اس کی یہ فطری عادت ہے۔

جب سرشتے دار نے اُس سے پوچھا، ''مذہب؟''

عبدالرحمان (اپنے آپ سے): ''بھائی عبدالرحمان، سرشتے دار صاحب مذہب پوچھ رہے ہیں۔ بھائی عبدالرحمان، یاد رکھنا کہ تم نے حلف اٹھایا ہے، سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ سوال تو خاصا کسیلا ہے۔ اگر کہتا ہوں کہ مسلمان تو ہندو برا مانیں گے۔ سچ بتا دو۔ ارے بھائی عبدالرحمان، ذرا سی بات میں جھجک گئے ہو۔ انھیں بتاؤ پتّل کی بات: ہندو مومن نہیں ہوں میں، جو ہوں سو ہی ہوں!''

سرشتے دار مجسٹریٹ کی طرف منہ کر کے دیکھنے لگا۔

مجسٹریٹ (سرشتے دار سے): ''لکھو، مسلمان۔''

سرشتے دار: ''عمر؟''

عبدالرحمان: ''بھائی عبدالرحمان، سرشتے دار صاحب عمر پوچھ رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں، مسلمان نہیں ہیں تو مجسٹریٹ لکھتے ہیں، مسلمان۔ سرشتے دار سے کہو کہ چاہیں تو یہ بھی مجسٹریٹ سے پوچھ لیں۔'' (سرشتے دار سے): ''جناب، یہ بھی چاہیں تو مجسٹریٹ سے پوچھ لیں۔''

عبدالرحمان کے فقط اتنا کہنے کی دیر تھی، مجسٹریٹ کے منہ سے کف اڑنے لگا اور اُس نے دھمکا کر عبدالرحمان سے کہا، ''جاہل، سیدھی طرح بیان دو۔ عدالت میں آئے ہو۔''

عبدالرحمان مسکراتا رہا اور اپنے آپ سے کہنے لگا، ''بھائی عبدالرحمان، مجسٹریٹ کہتے ہیں کہ جاہل، سیدھی طرح بیان دو۔ عبدالرحمان، مجسٹریٹ سے پوچھو کہ وہ جاہل کس کو کہ رہے ہیں۔''

ابھی عبدالرحمان مجسٹریٹ سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجسٹریٹ نے اُس سے کہا، ''جاہل ان پڑھ کو کہا جاتا ہے۔''

عبدالرحمان (اپنے آپ سے): ''بھائی عبدالرحمان، مجسٹریٹ صاحب کہتے ہیں کہ جاہل اَن پڑھ کو کہا جاتا ہے۔ بھائی عبدالرحمان، تب تو تم جاہل نہ ہوئے۔ سندھی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی جانتے ہو۔ تم پانچ زبانیں جانتے ہو۔ مجسٹریٹ صاحب سے پوچھو کہ آپ کتنی زبانیں جانتے ہیں۔''

عبدالرحمان (مجسٹریٹ سے): ''جناب!...''

مجسٹریٹ نے آدھے میں کاٹ کر اُس سے کہا، ''جاہل وہ ہے جو انگریزی نہیں جانتا۔''

عبدالرحمان (اپنے آپ سے): ''بھائی عبدالرحمان، مجسٹریٹ صاحب کہتے ہیں کہ جاہل وہ جو انگریزی نہیں جانتا۔ خود انگریزی جانتے ہیں ٹوپن مل کے صاحب زادے، والد جن کے کانجی ہاؤس کے منشی۔ ان سے پوچھو کہ جناب تب تو آپ کے باپ دادا جو انگریزی نہیں جانتے تھے، وہ بھی جاہل تھے، یعنی آپ ہوئے جاہل کے...''

مجسٹریٹ مشتعل ہوگیا۔ اُس نے فوراً ورق اور قلم لیا اور عبدالرحمان سے بولا، ''تم پر کیوں نہ قاعدے کی کارروائی کی جائے کہ تم نے عدالت کی توہین کی ہے۔ اب زیادہ مت بولو۔ جو کچھ لکھنا ہو، سو لکھ کر دے دو۔''

عبدالرحمان نے قلم اور ورق لے کر حسبِ ذیل عبارت لکھی:

جناب مجسٹریٹ صاحب!

بھائی عبدالرحمان نے عدالت کی توہین نہیں کی ہے، آپ نے خود عدالت کی توہین کی ہے۔ آج آپ نے دوسرے گواہوں کو گالیاں دی ہیں۔ بھائی عبدالرحمان کو گالیاں اُس کی گدڑی کے دامن کو بھی نہیں لگیں۔ لوگوں کے حاکم نہیں ہیں آپ، بلکہ اُن کے نوکر! ہم گواہ عدالت میں خود تو نہیں آئے، آپ نے بلایا ہے، اور آنے والے کی یہ آؤ بھگت کر رہے ہیں! کون آپ کی عدالت میں گواہی دے گا، اگر گواہوں پر گالیوں کی برسات ہوگی! آپ وجہ بتائیں کہ کیوں نہ آپ کو موقوف کیا جائے، کیوں کہ آپ نے عدالت میں گواہوں کو گالیاں دی ہیں۔ بھائی عبدالرحمان نے تو، جیسا کہ آپ نے اُس سے حلف اٹھوایا ہے کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا، سچ کے سوا اور کچھ نہ کہوں گا، وہی سچ کہا ہے۔

○○○

اُجالا

امر جلیل
کرن سنگھ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مفلسی نے ہم کو بے آب ماہی کی طرح اپنے جال میں پھنسا لیا تھا اور ہم پر مصیبتوں اور آفتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ نوکری جانے کی فکر ابھی دل میں گرہ لگائے ہوئے تھی کہ ان مشکلات میں مزید اضافہ کرنے کے لیے جنید کو معیادی بخار نے آگھیرا۔ میں اپنے چھوٹے معصوم بھائی کی حالت آنکھوں سے دیکھ رہا تھا مگر مجبور تھا۔ میری بہنیں زیبو اور کمو، جنید کی اکھڑتی سانسیں اور لال آنکھیں دیکھ کر روہانسی ہوگئی تھیں۔

''دیکھ نہیں رہے، نظر نہیں آ رہا؟'' کمو نے مجھے کندھے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا،'' کچھ کرو۔ جنید کے لیے کچھ کرو۔''

میں نے گردن جھکا لی۔

گھر کا کم و بیش سارا سامان میری بے روزگاری کی نذر ہو چکا تھا۔ صرف ایک پرانا گھڑیال باقی بچا تھا جو دیوار سے چپکا، ہمارے دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے سوچا انسان کے دل کی طرح اس گھڑیال کی ٹک ٹک بند ہوجائے گی، موت کی طرح خاموش ہوجائے گی مگر اس گھڑیال کی موت اور انسان کی موت میں کتنا فرق ہے۔ انسان کی تخلیق گھڑیال میں، بند ہونے کے بعد چابی سے دوبارہ زندگی پیدا کی جاسکتی ہے مگر انسان کے ٹھنڈے جسم میں دوبارہ کون روح پھونک کر زندگی پیدا کرسکتا ہے؟

میں نے گردن گھما کر جنید کی طرف دیکھا۔

اور پھر پرانا گھڑیال کندن مل پنساری کے پاس دس روپے میں گروی رکھ دیا۔ اگرچہ دس روپے ڈاکٹر کی فیس اور کلورومائی سن کے کیپسول کے لیے کم تھے۔ دس روپے کا نوٹ مٹھی میں دبا کر فکر کے بھنور میں ڈوبتا تیرتا گھر لوٹ آیا۔

ان کالے دنوں میں محلے میں سے کسی سے پیسے لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سے ایک انگریز انجینئر کی تنخواہ پوری کرنے کے لیے کارخانے میں سے ہم چالیس مزدوروں کو نکالا گیا تھا، تب سے محلے کے سبھی گھروں کی حالت ایک دوسرے سے بدتر ہوگئی تھی۔ مزدوروں کے گھروں کا سامان کوڑیوں کے مول کباڑیوں کے ہاتھوں بک گیا تھا۔ جن گھروں میں زیادہ بھوکے پیٹ تھے، ان کی عزت اور عصمت شہر کے ہوٹلوں اور بنگلوں میں بکنے لگی۔

اچانک ذہن کے اندھیرے میں امید کا جگنو چمک اٹھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ ربو نے مجھ سے بارہ روپے اُدھارے لیے تھے۔ ویسے تو میں اس سے پیسے ہرگز نہ مانگتا مگر ربو کی حالت ہماری جیسی نہ تھی، وہ نوکری کھونے کے بعد بھی آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لوگوں کو پکا یقین تھا کہ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی ملکیت ربو کے ہتھے چڑھ گئی ہے یا پھر اس نے نوٹ چھاپنے کی مشین ایجاد کرلی ہے۔ اس کے بچوں کی آنکھوں تلے بھوک کے سیاہ حلقے نہیں پڑے تھے اور نہ ہی وہ خود کنستری مارنے سے کنارہ کش ہوا تھا۔

میں زیبو اور کمو کو تسلی دے کر ربو سے پیسے واپس لینے کے لیے گھر سے باہر نکلا۔

گلی میں محلے کے سوکھے سہمے دبلے پتلے آدھے ننگے بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے اپنا کم سن جنید یاد آیا جو جھگی میں تار تار ہوئی بان کی کھاٹ پر موت اور زندگی کی کش مکش میں، کسی ڈاکٹر کا انتظار کر رہا تھا۔ کہاں تھے وہ شیخی خور ڈینگ مارنے والے ڈاکٹر جنھیں دعویٰ ہے کہ وہ قوم اور انسانیت کے خادم ہیں۔ ان دنوں وہ ڈاکٹر کہاں تھے، جب انسانیت کی ننھی روح مفلسی میں سسک رہی تھی۔ وہ دردمند حکیم اور طبیب کہاں تھے، جب ایک انسان کی ہستی دس روپے کے لیے مٹ رہی تھی۔ اسی لمحے خیالات کی اپسراؤں نے سرگوشی کی کہ انسان ازل سے دولت کا غلام ہے اور دولت دیوتاؤں سے زیادہ طاقت ور ہے۔

میں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گلی کے نکڑ پر پہنچا۔ ربو کا گھر ساتھ والی گلی میں تھا جہاں دونوں گلیاں ملتی تھیں۔ انھی دنوں وہاں ایک گرد آلود درویش نے آکر ڈیرہ جما لیا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی رہتی تھیں۔ چاروں پہر بدن کو بھبھوت ملے، دھونی رمائے، اپنی جھونپڑی کے آگے بیٹھا رہتا تھا۔ محلے کی عورتیں اس سے مرادیں مانگتی تھیں اور مرد اس سے سٹے کا

نمبر پوچھتے تھے۔ جب سے ہمارے محلے میں بے روزگاری نے پیر جمائے تھے، تب سے درویش کی تو جیسے عید ہوگئی تھی۔ اس کا بھاری بدن مزید بھاری ہوتا جا رہا تھا، پیٹ کی گولائی سے بل ختم ہوگئے تھے اور اس کی ناف کی گہرائی بھی کم ہوگئی تھی۔ گھروں میں فاقے پڑ رہے تھے مگر درویش کو حلوے مانڈے اور قورمہ کھلایا جا رہا تھا۔

جب میں گلی کے موڑ پر پہنچا تو درویش دھونی رمائے، بدن پر بھبھوت ملے، اپنی جھونپڑی کے آگے بیٹھا تھا۔ اس کی کلائیوں میں کڑے تھے اور بائیں ہاتھ میں بڑا چمٹا، جس کو دائیں ہاتھ سے بجا رہا تھا۔ مجھے لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا، ''مانگ جو مانگنا ہے۔'' پھر انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا، ''آج ہم آسمان سے تارے بھی توڑ لائیں گے۔'' وہ شام کا وقت تھا، ابھی آسمان پر تارے نہیں تھے۔

میں نے جھک کر ادب سے سلام کیا۔ پورے محلے میں یہ بات مشہور تھی کہ درویش کو ناراض کرنا دونوں جہان برباد کرنے کے برابر ہے۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا، ''درویش بابا آپ کی دعائیں چاہییں۔''

''جاؤ، بیڑا پار ہے۔'' درویش نے اپنی سرخ آنکھیں میری آنکھوں میں گھونپ دیں۔ ٹوٹی ہوئی امیدوں کو تو جیسے آسرا مل گیا۔

میں ربو کی ڈیوڑھی پر آکھڑا ہوا۔ دل کہہ رہا تھا کہ ربو نہ صرف بارہ روپے لوٹا دے گا بلکہ کچھ روپے قرض بھی دے دے گا۔

میں نے ابھی بہ مشکل دروازہ کھٹکھٹایا ہی تھا کہ ربو کی نوخیز بیٹی جنان، ریشمی کپڑوں میں خوشبو لگاتی ہوئی مٹکتی ایک طرف چلی گئی۔ میں نے دوبارہ کنڈا بجایا۔ تھوڑی دیر بعد ربو باہر آیا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور شیو بھی تازہ کی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔

''کہو کیسے آنا ہوا؟''

میں نے اسے سارا ماجرا سنایا۔ میری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

''ابھی، اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''کچھ تو دو، ربو۔'' میں نے اس سے التجا کی، ''کچھ تو دو، میرا جنید...'' آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔

''یوں کرو...'' ربو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، ''کل صبح مجھ سے سو، سوا سو لے جانا۔''

''کل میں روپوں کا کیا کروں گا ربو۔'' میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''سوال تو

آج کی رات کا ہے، یہ ایک رات میرے جنید کے لیے بہت بھاری ہے۔"
"میں مجبور ہوں۔" ربو نے کہا، "صبح سے پہلے میں تمھیں ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔"
"ربو!" میں نے ربو کا بازو پکڑتے ہوئے کہا، "اس وقت تمھارے پاس کچھ بھی نہیں ہے ربو۔"
"نہیں۔" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "تو کیا صبح تک تیری مرغی سونے کے انڈے دے گی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔
ربو نے جھٹکے سے بازو چھڑایا اور ڈیوڑھی پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ اسی لمحے میں نے اپنی پشت پر ایک مکار قہقہہ سنا، جیسے کوئی میرا مذاق اڑا رہا ہو۔ میں نے مڑ کر دیکھا، بنڈل دادا میرے قریب کھڑا تھا۔ گردن میں لال رومال لپٹا، منہ میں آدھی جلی ہوئی بیڑی۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا، "ربو کے پاس سونے کا انڈا دینے والی ایک مرغی ہے۔"
"میرے کس کام کی؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔
"تمھیں پیسوں کی ضرورت ہے نا؟"
"ہاں، صرف بیس روپوں کی۔"
اس نے قہقہہ لگایا، "بیوقوف، تیرے پاس بھی تو دو مرغیاں ہیں جو سونے کے انڈے دے سکتی ہیں۔"
میں نے گھور کر اس کی چندھیائی آنکھوں میں دیکھا، "چاہو تو میں چوتھائی حصے پر دونوں کا بندوبست کروں۔"
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"
"یہ دولت اور جوانی کا دور ہے۔"
سیدھی بات کیوں نہیں کرتے۔"
"سن سکو گے؟"
"میں جنید کے لیے سب کچھ سن سکتا ہوں، سب کچھ۔"
"تو پھر سنو۔" بنڈل دادا نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "کمو اور زیبو ایک رات کے لیے۔"
"بدمعاش!" جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی میں اس پر حملے کے لیے لپکا مگر اُلٹا میں ہی گندگی کے ڈھیر پر جا گرا۔
بنڈل دادا قہقہہ لگاتے ہوئے چلا گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا، "بھوکے مر جاؤ گے

غریب کے بچے۔"

میں اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ ہزاروں طوفان جاگ اٹھے، میں نے فیصلہ کیا کہ بھلے جنید مر جائے، چاہے میری حسرتیں اور امیدیں خاک میں مل جائیں، اس خاک میں سے نئے جنید پیدا ہوں گے، مضبوط ارادوں اور عزم والے جنید پیدا ہوں گے۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں جنید اس خاک میں سے پیدا ہوں گے۔ جس خاک میں میرا جنید شبنم کی طرح گم ہو جائے گا۔ بھلے ہی جنید مر جائے، میرا جنید قربان ہو جائے۔

بھانت بھانت کے خیال، سمندری لہروں کی طرح میرے ذہن میں اُترتے چڑھتے رہے۔ میں نے سوچا میرے جنید کی قربانی، دنیا کی سب سے بڑی قربانی ہوگی۔ تاریخ میں اس کی قربانی کے حوالے دیے جائیں گے۔ جب بھی عظیم قربانیوں کا ذکر ہوگا، جنید کا نام پتھر پر لکیر کی طرح اُبھرے گا۔

میں خیالات کے سیاہ جنگل میں بھٹکتا ہوا، دل ہی دل میں روتا ہوا، جب گلی کے سرے پر پہنچا تو جُمن ماشکی کی بیوی درویش کی جھونپڑی سے نکل کر گلی کے ایک کچے گھر میں گم ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں درویش چمٹا بجاتا ہوا باہر آیا، مجھ پر نظر پڑی تو ایک دم مجھ سے کہا، "مانگ جو کچھ مانگنا ہے۔"

دل مضبوط کر کے میں نے کہا، "بیس روپے دو گے۔"

"نادان! مایا کا کیا کرو گے؟" اس نے چمٹا بجاتے ہوئے کہا، "جاؤ تمہارے دونوں جہاں آباد کیے۔"

دل نے چاہا کہہ دوں، "جب اس جہاں کا یہ حال ہے تو پھر ان دیکھے جہاں کا اللہ جانے کیا حال ہوگا۔"

میں تھکے قدموں سے اپنی گلی میں لوٹ آیا۔ مجروح روح ٹیسیں مار رہی تھی اور دل کے زخم رس رہے تھے۔ رہ رہ کر عذاب جیسا خیال روح کو برچھی کی طرح کاٹ رہا تھا کہ آج کی شام میرے جنید کی آخری شام اور آج کی رات میرے جنید کی آخری رات ہے۔ کل جب نیا سورج اُبھرے گا تب جنید نہیں ہوگا، صرف جنید کی یاد رہ جائے گی۔

"کن خیالات میں ڈوبے ہوئے ہو؟"

میں چلتے چلتے رُک گیا۔ سامنے دیکھا تو چاچا واحد تھا۔ چاچا واحد کارخانے میں سب سے زیادہ پرانا مزدور تھا اور جب سے بے روزگاری کا یہ منحوس سایہ مزدوروں پر پڑا تھا، تو سب سے پہلے چاچا واحد کو نوکری سے نکالا گیا تھا۔ وہ عمر میں ہم سب سے زیادہ تھا، اس لیے سب اسے چاچا کہتے تھے۔

"جا جلدی گھر جا۔" اُس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا، "زیبو کو ابھی بیس روپے

دے کر آیا ہوں۔"

"بیس روپے۔"

"ہاں، جلدی کرو، ڈاکٹر کو لے آؤ۔"

"چاچا۔"

"ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

"چاچا!" میں نے شکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "تم پیسے کہاں سے لائے چاچا۔"

"تمھیں پیسوں کی ضرورت ہے، یا..."

"ہے، مگر..."

"چاچا نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا، "بیٹے سے محروم ہوں تو کیا ہوا، میری جوان بیٹی تو ہے نا۔"

"چاچا۔"

"کبھی کبھی جوان بیٹی بھی بڑھاپے کا بڑا سہارا بن جاتی ہے۔" چاچا نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے چاچا کو ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا جو لہر غم کے کنارے ڈبوتی جا رہی تھی اس میں چاچا بھی بہہ جائے گا۔

اس نے کہا، "لیکن میری بیوی بھی میری بیٹی سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔"

دل نے چاہا کہ اس بوڑھے، بدکردار، خبیث کا سر ہتھوڑے سے کچل دوں۔ جس طرح بات کر رہا تھا، لگ رہا تھا کہ بنڈل دادا کا مقابلہ کر رہا تھا۔

"مگر تم جاؤ، ڈاکٹر کو لے کر جلدی گھر پہنچو۔"

میں نفرت اور حقارت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "کل سے تم بھی کمو اور زیبو کو کام سے لگا دینا۔"

کراہت سے میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"میری بیٹی اور گھر والی، زیبو اور کمو کی مدد کریں گی۔ ایک دو دن انھیں تکلیف ہوگی، پھر ہفتے بھر میں عادت ہو جائے گی۔"

میں نے دل ہی دل میں اس ننگے بوڑھے کو گلا گھونٹ کر مار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری

ہاتھوں کی مشکیں تن کر کسی ہوئی رسّی کی طرح ہوگئیں اور جب میرے ہاتھ آہستہ آہستہ چاچا کی گردن کی طرف بڑھنے لگے، چاچا نے کہا، ''ایک دن میں دو دوپٹوں پر کناری لگا لیتی ہیں، چار شلواروں کے پائینچے بنا لیتی ہیں۔''

رگوں میں کھولتا ہوا خون اچانک جم کر برف ہوگیا، جوڑ جوڑ میں کپکپاہٹ کا احساس ہونے لگا۔

چاچا نے کہا، ''بس گزر اوقات جتنا پیسا روز کما لیتی ہیں۔ یہ سارا سنسار روٹی کپڑے کے لیے سرگرداں ہے نا! بس روٹی کپڑا عزت سے مل جاتا ہے۔''

میں چاچا واحد کے قدموں میں گر گیا۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہو!'' چاچا نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا، ''جلدی کرو ڈاکٹر کو لے کر گھر جاؤ، پھر اندھیرا ہو جائے گا، دیکھو ابھی اُجالا ہے۔''

میں اسپتال کی طرف دوڑتا ہوا گیا، دوڑتے دوڑتے میں نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں دور اُفق پر اب بھی اُجالا تھا۔

○○○

ریس کے بعد

جیمز جوئس

سیّد کاشف رضا

کاریں تیزی سے ڈبلن کی جانب آ رہی تھیں۔ وہ ناس روڈ پر جو درمیان سے گہری ہو چکی تھی، گیندوں کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ انچی کور کے علاقے میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تماشائی اُن کاروں کو دیکھنے جمع ہوئے تھے، جو اب اپنے اپنے وطن روانہ ہونے والی تھیں۔ غربت اور بے کاری کی رودبار سے ایک براعظم اپنی دولت اور صنعت کے نمونے تیزی سے گزار رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ جمع ہونے والے لوگ داد و تحسین کی آوازیں بلند کرتے جو پچھڑے ہوئے لوگ انتہائی شکر گزاری کے عالم میں بلند کر سکتے ہیں۔ تاہم اُن کی ہمدردیاں نیلی کاروں کے ساتھ تھیں جو اُن کے دوست فرانسیسیوں کی تھیں۔

یہ بھی تھا کہ فرانسیسی ہی اس دوڑ کے فاتح رہے تھے۔ اُن کی ٹیم نے دوڑ کو خوبی سے ختم کیا تھا۔ اُن کے کھلاڑی دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہے تھے اور جرمن کی جو کار جیتی تھی، اس کا ڈرائیور بلجیم کا شہری بتایا جاتا تھا۔ اسی لیے جب بھی کوئی نیلی کار پہاڑی کے قریب سے گزرتی تو وہ عام طور سے دی گئی داد و تحسین کے مقابلے میں دُگنے کی مستحق ٹھہرتی۔ اس داد و تحسین کو کاروں میں بیٹھے لوگ مسکراہٹوں اور سر کے اشاروں کے ساتھ قبول کرتے۔ ان ہلکی پھلکی کاروں میں سے ایک میں چار نوجوانوں کا ایک ٹولا بیٹھا تھا جس کا جوش و خروش فرانس کی گیلک حب الوطنی کے عام جوش و خروش سے بھی زیادہ تھا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ یہ چاروں قہقہے لگا رہے تھے۔ ان میں کار کا مالک چارلس سیگواں،

کناڈا میں پیدا ہونے والا الیکٹریشن آندرے رویغ، ایک لمبا تڑنگا ہنگیرین ولونا اور ایک صاف ستھرا اور شائستہ نوجوان ڈوئل شامل تھے۔ سیگواں ہشاش بشاش تھا کیوں کہ اس نے غیر متوقع طور پر کاروں کی فروخت کے کچھ آرڈر حاصل کر لیے تھے (وہ عنقریب پیرس میں موٹر کاروں کا کاروبار شروع کرنے والا تھا)۔ رویغ خوش تھا کیوں کہ وہ اس کاروبار کا منیجر تعینات کیا جانے والا تھا۔ یہ دونوں آپس میں کزن بھی تھے اور اس لیے بھی خوش تھے کیوں کہ فرانسیسی کاریں جیت گئی تھیں۔ ولونا اس لیے خوش تھا کہ اُس نے ڈٹ کر دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اور ویسے بھی وہ فطری طور پر ایک پُرامید نوجوان تھا۔ اس ٹولے کا چوتھا رکن ایسے جوش و خروش میں تھا جو ہر خوشی سے بھی زیادہ تھا۔

اُس کی عمر چھبیس سال تھی۔ چہرے پر نرم، ہلکی بھوری مونچھیں تھیں اور اس کی سرمئی آنکھیں کچھ معصوم سی تھیں۔ اُس کے باپ نے اپنی زندگی کا آغاز ایک کٹر آئرستانی قوم پرست کی حیثیت سے کیا تھا لیکن جلد اپنے خیالات تبدیل کر لیے تھے۔ اُس نے پہلے تو کنگز ٹاؤن میں ایک قصاب کی حیثیت سے روپیا بنایا اور پھر ڈبلن اور اس کے نواح میں مزید دکانیں کھول کر اس میں اضافہ کیا۔ وہ یوں بھی خوش قسمت رہا تھا کہ اُسے پولیس کو گوشت سپلائی کرنے کے کچھ کنٹریکٹ بھی مل گئے اور بالآخر وہ اتنا دولت مند ہوگیا کہ ڈبلن کے اخبارات میں اُس کا تذکرہ کسی تاجر شہزادے کی طرح ہونے لگا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو انگلستان بھیجا تاکہ وہاں وہ ایک بڑے کیتھولک کالج میں تعلیم حاصل کرے اور پھر بعد میں اسے ڈبلن یونی ورسٹی روانہ کیا تاکہ وہ وہاں قانون کی تعلیم پائے۔ جمی نے دیانت داری سے تعلیم کی جانب توجہ نہیں دی اور وقت گزاری کے لیے بے کار سے کورس منتخب کر لیے۔ اُس کے پاس پیسا تھا اور وہ ہر دل عزیز بھی بہت تھا۔ یہ بات تجسس انگیز تھی کہ اُس نے اپنا وقت موسیقی اور موٹر ریس کے شوقین حلقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پھر اسے ذرا دنیا وغیرہ دیکھنے کی خاطر ایک ٹرم کے لیے کیمبرج بھیجا گیا۔ اُس کی کارکردگی پر اُس کے باپ نے احتجاج تو کیا لیکن اندر سے اسے کئی معاملوں میں اپنے بیٹے کی فضول خرچی پر فخر بھی تھا، سو اُس نے اُس کے تمام بل ادا کیے اور اسے گھر واپس بلوا لیا۔ یہ کیمبرج ہی تھا جہاں اُس کی ملاقات سیگواں سے ہوئی تھی۔ ابھی تک دونوں کا تعلق فقط تعارف تک محدود تھا لیکن جمی کو ایک ایسے شخص کی صحبت میں بہت لطف آیا تھا جس نے دنیا کو اس قدر دیکھ رکھا تھا اور جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ فرانس کے بعض سب سے بڑے ہوٹل اسی کی ملکیت ہیں۔ ایسا شخص (جیسا کہ اُس کے باپ نے تسلیم کیا) اس قابل تھا کہ اُسے جانا جائے، چاہے وہ اُس قدر سحر انگیز نہ ہوتا کہ وہ تھا۔ ولونا کچھ مزے کا آدمی تھا — ایک زبردست پیانو نواز — مگر بدقسمتی سے بہت غریب۔

کار قہقہے اڑاتے نوجوانوں سمیت خوشی خوشی بھاگی جا رہی تھی۔ دونوں کزن کار کی اگلی نشستوں پر براجمان تھے۔ جمی اور اُس کا ہنگیرین دوست پیچھے بیٹھے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ ولونا بہت مزے میں تھا۔ وہ سڑک پر میلوں دور تلک باس[☆۱] پر ایک دُھن چھیڑے رہا۔ آگے بیٹھے دونوں فرانسیسی قہقہے اور ہلکے پھلکے جملے کاندھوں سے پیچھے اچھالتے اور جمی کو اُن کے جملے گرفت میں لانے کے لیے سر آگے کو جھکا کر بہت توجہ دینا پڑتی۔ یہ سب اُس کے لیے زیادہ خوش گوار نہیں تھا کیوں کہ تقریباً ہر بار اُسے اُن کے معنی کا صرف اندازہ لگانا پڑتا اور تیز ہوا کے دوران کوئی مناسب جواب واپس بھی پھینکنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ولونا کی دُھن کسی کو بھی مخمصے میں ڈال دیتی۔ اور ہاں کار کی آواز بھی۔

کسی مقام پر تیزی سے مسلسل حرکت ہمیں خود سے غافل سا کر دیتی ہے۔ بدنامی کے ساتھ بھی سلسلہ یہی ہے۔ اور روپیا پیسا زیر تصرف ہونے کے ساتھ بھی۔ جمی کے جوش و خروش کے بھی یہی تین اسباب تھے۔ اُسے اُس روز اُس کے کئی دوستوں نے براعظم کے ان باشندوں[☆۲] کی صحبت میں دیکھا تھا۔ ریس شروع ہونے سے قبل سیگواں نے جمی کو اپنے ایک فرانسیسی حریف سے ملایا تھا۔ جمی کی جانب سے اظہار تشکر کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے جواب میں اُس ڈرائیور کے سیاہ پڑتے ہوئے چہرے نے اپنے چمکتے ہوئے سفید دانتوں کی نمائش کی تھی۔ اس عزت افزائی کے بعد جمی کے لیے تماشائیوں کی رذیل دنیا میں واپسی خوش گوار رہی تھی جہاں لوگ اسے کہنیاں مارتے اور معنی خیز نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ جہاں تک روپے پیسے کا معاملہ تھا تو واقعتاً اُس کے پاس بہت مال تھا۔ ہوسکتا تھا سیگواں اسے اتنا زیادہ روپیا نہ سمجھتا ہو لیکن جمی، جو اپنی وقتی غلطیوں کے باوجود ایک خاص جبلّی ذہانت رکھتا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ پیسا کس مشقت سے جمع کیا گیا تھا۔ اسی علم نے اس سے پہلے اس کے بل کو فضول خرچی کے کسی قدر عقلی دائرے میں رکھا تھا۔ اور اگر وہ کیمبرج میں اس روپے کے حصول میں لگی ہوئی محنت کا احساس رکھتا تھا تو یہاں اسے اس کا کتنا خیال ہوگا جہاں وہ اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ داؤ پر لگانے والا تھا۔ ہاں یہ اُس کے لیے ایک سنجیدہ معاملہ تھا۔

ظاہر ہے اُس کی یہ سرمایہ کاری اچھی رہی اور سیگواں اُسے یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا کہ اُس کی دوستی کی خاطر جوئے میں آئرستانی پیسا بھی لگایا گیا۔ جمی کاروباری معاملات میں

☆۱۔ Bass: ایک مغربی آلۂ موسیقی جو کچھ کچھ گٹار سے ملتا جلتا ہے۔

☆۲۔ انگلستان اور آئرلینڈ کے لوگ باقی یورپ کے لوگوں کو continental یا براعظم کے باشندے کہا کرتے ہیں۔

اپنے باپ کی ہوشیاری کا معترف تھا اور یہ اُس کا باپ ہی تھا جس نے اس معاملے میں اُسے سرمایہ کاری کا مشورہ دیا تھا، اور کہا تھا کہ موٹروں کے کاروبار میں روپیا مل سکتا تھا، بہت سارو پیا۔ مزید یہ کہ سیگواں کو دیکھ کر ہی اُس کی امارت کا احساس ہوتا تھا۔ جمی اس شاہانہ کار کے ساتھ گزارے ہوئے دن کو یاد کرنے لگا۔ کتنی سہولت سے چلتی تھی وہ، کس انداز میں وہ لوگ دیہی راستوں پر اسے دوڑاتے ہوئے آئے تھے۔ اس سفر نے زندگی کی نبض پر اپنا جادوئی ہاتھ رکھ کر انھیں دکھا دیا تھا اور انسانی اعصاب کے نظام نے کس دلیری سے اس سبک خرام نیلے جانور کی اچھل کود پر غلبہ حاصل کیا تھا۔

کار دوڑاتے ہوئے وہ ڈیم اسٹریٹ☆۳ پر چلتے گئے۔ سڑک پر ٹریفک معمول سے زیادہ تھا۔ موٹر کاروں کے ہارن اور بے قرار ٹرام ڈرائیوروں کے گانگ☆۴ کی آوازوں سے شور برپا تھا۔ بینک آف آئرلینڈ کی عمارت کے قریب سیگواں نے گاڑی کھڑی کی اور جمی اور اُس کا دوست باہر نکل آئے۔ ہونکتی ہوئی موٹر کار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروہ فٹ پاتھ پر جمع ہوگیا۔ کار سوار نوجوانوں کی پارٹی کو اُس شام سیگواں کے ہوٹل میں کھانا کھانا تھا اور اس دوران جمی اور اُس کے دوست کو، جو ان دنوں اُس کے ساتھ ہی مقیم تھا، گھر جا کر لباس تبدیل کرنے تھے۔ کار آہستگی سے گرافٹن اسٹریٹ☆۵ کی جانب پھسلتی گئی، جب کہ دونوں نوجوان تماشائیوں کے گروہ میں سے راستہ بنانے لگے۔ وہ شمال کی جانب چلنے لگے اور اس عمل میں ایک عجیب سی مایوسی محسوس کی۔ اس دوران شہر نے گرما کی شام کی حدت میں اُن کے سروں پر روشنی کے مرجھائے ہوئے گلوب تانے رکھے۔

شام کے اُس کھانے کو جمی کے گھر میں ایک اہم تقریب قرار دیا جاچکا تھا۔ اس کھانے کے لیے اس کے اہلِ خانہ کے احساسِ تفاخر کے ساتھ اُس کے والدین کی تشویش بھی شامل تھی کہ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہوجائے۔ سب کو کچھ بے چینی بھی تھی، یہ کچھ ایسا تھا جیسے وہ بڑے غیرملکی شہروں کے نام پر جلد از جلد کھیل کر کچھ اڑانا چاہ رہے ہوں۔ جمی بھی لباس تبدیل کرنے کے بعد خوب جچ رہا تھا۔ اور جب وہ ہال میں کھڑا اپنی ٹائی کی گانٹھ کو آخری بار سنوار رہا تھا، اُس کے باپ نے اس بات پر تجارتی اطمینان بھی محسوس کیا ہوگا کہ اُس نے اپنے بیٹے کے لیے وہ خصوصیات بھی

☆۳۔ Dame Street

☆۴۔ Gang

☆۵۔ Grafton Street

حاصل کرلیں جو خریدی نہیں جاسکتیں۔ اسی لیے اُس کا باپ ولونا سے بے حد دوستانہ انداز میں باتیں کرتا رہا اور اُس کا انداز غیر ملکیوں کی کامیابیوں کے لیے اُس کی حقیقی تعظیم کو ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن میزبان کی یہ نزاکتیں ہنگری کے اُس شہری پر بلاوجہ ضائع ہو رہی تھیں جو بڑی شدت سے اپنے عشائیے کا منتظر تھا۔

بالآخر جب وہ کھانے پر پہنچے تو اسے شان دار اور نفیس پایا۔ جمی نے محسوس کیا کہ سیگواں نہایت نفیس ذوق کا مالک ہے۔ اُن کی پارٹی میں راؤتھ نامی ایک نوجوان انگریز کا اضافہ ہوگیا تھا جسے جمی نے کیمبرج میں سیگواں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بعد نوجوانوں نے ایک نیم گرم کمرے میں، جو بجلی کے قمقموں سے روشن کیا گیا تھا، شراب پی۔ انھوں نے بہت کھل کر باتیں کیں۔ جمی نے، جس کا تخیل اب جاگنے لگا تھا، فرانس کے دونوں باشندوں کی قہقہہ بار نوجوانی کے ساتھ ساتھ انگریز باشندے کے انداز و اطوار کا بھی مشاہدہ کیا۔ وہ اُسی کا عکس تھے، اُس نے سوچا، اور یہ مبنی بر انصاف بھی تھا۔ اُن کا میزبان (سیگواں) جس مہارت سے گفتگو کی باگیں تھامے ہوئے تھا، اُسے بہت پسند آیا۔ پانچوں نوجوانوں کے ذوق مختلف تھے اور اب اُن کی زبانیں کھل چکی تھیں۔ ولونا نے حد درجہ تعظیم کے ساتھ برطانیہ کے میڈریگال گیتوں[☆۶] کے حسن کو دریافت کیا جس پر انگریز باشندے کو ذرا سی حیرت بھی ہوئی۔ اُس نے پرانے مزامیر کا استعمال ترک کیے جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔ رولیغ نے فرانسیسی ماہرین میکانیات کی فتوحات سے جمی کو آگاہ کرنے کی ذمے داری سنبھالی اور اُس کا یہ اقدام کچھ زیادہ ذہانت پر مبنی نہیں تھا۔ ہنگری کے باشندے کی گونجتی ہوئی آواز رومانی دور کے مصوروں کی بنائی ہوئی عجیب و غریب بانسریوں کا بلند آہنگ مضحکہ اڑانے ہی والی تھی کہ سیگواں نے پارٹی کو سیاست کے موضوع پر لگا دیا۔ یہ سب کے لیے محبوب میدان تھا۔ اس بے تکلفانہ ماحول میں جمی نے اپنے اندر اُس خواہش کو پھر سے بیدار ہوتے محسوس کیا جسے اُس کا باپ خود میں دفن کر چکا تھا۔ سو اُس نے بالآخر پُرسکون راؤتھ کو بھی چھیڑ ہی دیا۔ نیم گرم کمرہ اور بھی گرم ہوگیا اور سیگواں کو اپنا کام ہر لمحے مشکل سے مشکل تر محسوس ہونے لگا۔ اس دوران ایک دوسرے سے ذاتی چھیڑ چھاڑ کا احتمال ہوگیا۔ تب سمجھ دار میزبان نے موقع دیکھتے ہوئے انسانیت کے نام پر اپنا جام بلند کیا۔ جب بنام انسانیت یہ جرعہ نوش کیا جا چکا تو اس نے گفتگو پر پوری طرح اثر انداز ہوتے ہوئے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔

اُس رات شہر کسی دارالحکومت کا نقاب اوڑھے ہوئے تھا۔ پانچوں نوجوان اسٹیفن کے

☆۶۔ انگلستان میں الزبتھ اول کے دور کے مخصوص گیت

سبزہ زار[۷] کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے رہے اور اُن کے اردگرد ایک ہلکا خوشبودار دھواں پھیلا رہا۔ انھوں نے بلند آواز سے اور چہک چہک کر باتیں کیں اور اُن کے چوغے اُن کے کاندھوں سے ہوا میں لہراتے رہے۔ لوگ ان کے لیے راستہ بناتے رہے۔ گرافٹن اسٹریٹ کے کونے پر ایک پستہ قد موٹا شخص دو خوب صورت خواتین کو کار میں بیٹھے ایک اور موٹے شخص کی نگرانی میں دے رہا تھا۔ کار روانہ ہوگئی اور پستہ قد موٹے شخص نے نوجوان کی پارٹی سے نظریں چار کیں۔

''آندرے!''

''یہ تو فارلے ہے۔''

دونوں میں کچھ بات چیت ہوئی۔ فارلے ایک امریکی تھا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ بات چیت کس بارے میں ہوئی۔ ولونا اور روئیغ سب سے زیادہ اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن پُرجوش سبھی تھے۔ پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور قہقہے لگاتے ہوئے کار میں سوار ہوگئے۔ کار ایک ہجوم کے قریب سے گزری۔ ہجوم جو اب ہلکے رنگوں میں تبدیل ہوگیا تھا اور جس سے گھنٹیوں کی خوش باش موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ ویسٹ لینڈ رو[۸] سے انھوں نے ایک ریل گاڑی پکڑی اور جیسا کہ جمی کو محسوس ہوا، کچھ ہی ثانیوں بعد وہ کنگز ٹاؤن اسٹیشن کے باہر چہل قدمی کر رہے تھے۔ ٹکٹ کلکٹر نے جمی کو سیلوٹ کیا، وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔

''رات سہانی ہے جناب!''

وہ گرما کی ایک پُرسکون رات تھی۔ ساحل ایک سیاہ آئینے کی طرح اُن کے قدموں میں پڑا تھا۔ وہ بانہوں میں بانہیں ڈالے اس کی سمت چلے۔ وہ مل جل کر کیڈٹ روزل[۹] گا رہے تھے اور جب بھی اس کا ٹیپ کا مصرع آتا، اُس کی دھن پر اپنے پیر زمین پر پٹختے۔

ایک ڈھلوان سے وہ ایک کشتی میں سوار ہوئے اور وہاں سے امریکی باشندے کی کشتی کی جانب چلے۔ وہاں اُن کا ارادہ کھانے کا تھا اور پھر موسیقی اور تاش۔ ولونا نے فیصلہ کن انداز میں کہا، ''یہ خوب صورت ہے۔''

کشتی کے کیبن میں ایک پیانو تھا۔ ولونا نے والز کی ایک دھن بجائی جس پر فارلے اور روئیغ نے اداکاری کے جوہر دکھائے۔ فارلے نے ایک شہ سوار جب کہ روئیغ نے ایک خاتون

☆۷۔ Stephan's Green: ڈبلن کے مرکزی علاقے کا ایک باغ

☆۸۔ Westland Row: ڈبلن کا ایک ریلوے اسٹیشن

☆۹۔ Cadet Roussel: انقلاب فرانس کے زمانے کا ایک فرانسیسی گیت

کا کردار نبھایا۔ اس کے بعد ایک رقص چلا جس میں سب اپنے اپنے کردار میں خود ہی موجود تھے۔ کیا مسرت تھی! جمی نے اس سب میں بخوشی حصہ لیا۔ تو یہ تھا جانا کہ زندگی ہے کیا۔ پھر فارلے کی سانس پھولنے لگی اور اس نے چلا کر کہا بس! ایک شخص نے ہلکا پھلکا سا کھانا لگا دیا اور تمام نوجوان اپنی طاقت بحال کرنے کے لیے اس کے گرد بیٹھ گئے۔ ساتھ ہی وہ بوہیمین انداز میں پیتے بھی گئے۔ انھوں نے آئرلینڈ، انگلستان، فرانس، ہنگری اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کے نام پر شراب پی۔ جمی نے ایک طویل تقریر بھی کر ڈالی۔ جب اُس میں وقفہ آتا تو ولونا واہ وا کے نعرے لگاتا۔ جب وہ تقریر کرکے بیٹھا تو سب نے زور شور سے تالیاں بجائیں۔ فارلے نے اُس کی پیٹھ تھپکی اور زور زور سے قہقہے لگائے۔ کیسے قہقہہ بار دوست تھے وہ، اور مل جُل کر کیا خوب مزے کر رہے تھے۔

تاش! تاش! ایک میز صاف کردی گئی۔ ولونا اپنے پیانو کی جانب لوٹ آیا اور اُن کے لیے رضاکارانہ طور پر اسے بجانے لگا۔ دوسرے نوجوانوں نے ایک کے بعد دوسری بازی لگائی اور خود کو بڑی دلیری سے اس مہم جوئی کے سپرد کردیا۔ اب انھوں نے تاش کی ملکاؤں کے نام پر پی۔

جمی نے ایک ناقابلِ فہم انداز میں اپنے لیے سامعین کی کمی محسوس کی۔ اُس کی حس مزاح پھڑک رہی تھی۔ کھیل میں گرمی آگئی اور نوٹ اِدھر سے اُدھر ہونے لگے۔ جمی کو ٹھیک سے معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ جیت کون رہا تھا لیکن اتنا وہ ضرور جانتا تھا کہ ہار وہی رہا ہے۔ لیکن غلطی اُسی کی تھی جو وہ اکثر و بیشتر تاش کا کوئی بے تکا پتا ہی نکالتا اور دوسرے نوجوانوں کو اُس کی ہاری ہوئی رقم کا حساب رکھنا پڑتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے سے شیطان نظر آرہے تھے لیکن جمی کی خواہش تھی کہ کھیل بند کردیا جائے کہ رات بہت بھیگ چکی تھی۔ کسی نے اُس کشتی کا جامِ صحت تجویز کیا جس میں وہ سوار تھے اور جس کا نام "حسینۂ نیو پورٹ"[☆۱۰] تھا۔ پھر کسی اور نے تجویز دی کہ بس ایک ...ور آخری بازی کھیلی جائے۔

پیانو رک چکا تھا، شاید ولونا اوپر عرشے پر جاچکا تھا۔ وہ ایک بھیانک بازی ثابت ہوئی۔ بازی کے اختتام سے ذرا پہلے انھوں نے طے کیا کہ اپنی اپنی خوش بختی کے لیے شراب پئیں۔ جمی نے جانا کہ اب کھیل راؤتھ اور سیگوان کے درمیان تھا۔ کیا جوش و خروش تھا۔ جمی بھی خوش تھا۔ وہ ظاہر ہے کہ ہار رہا تھا۔ وہ کتنی رقم ہار چکا تھا، کچھ معلوم نہیں۔ پھر وہ سب اپنی اپنی آخری چالیں چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، باتیں کرتے اور منہ بناتے ہوئے۔ راؤتھ جیت گیا۔

☆۱۰- The Belle of Newport

کیبن اُن نوجوانوں کی چیخ پکار سے گونج اٹھا اور تاش کے پتے پھر سے اکٹھے کر دیے گئے۔ انھوں نے اپنی جیت کی رقم اکٹھی کرنا شروع کر دی۔ فارلے اور جمی نے سب سے زیادہ رقم گنوائی تھی۔

جمی جانتا تھا کہ صبح اسے اس پر افسوس ہوگا لیکن فی الحال وہ اپنے سکون پر مسرور تھا۔ اُس بیوقوفی کے بہانے پر مسرور تھا جس کے کھاتے میں وہ بعد میں اپنی غلطی کو ڈالنے والا تھا۔ اُس نے اُسی میز پر کہنیاں پھیلائیں اور ان کے درمیان اپنا سر رکھ کر اپنی کنپٹیوں سے اٹھنے والی درد کی ٹیسیں شمار کرنے لگا۔ کیبن کا دروازہ کھلا اور اُس نے روشنی کی ایک سرمئی لکیر میں ہنگری کے باشندے کو کھڑا دیکھا۔

''صبح ہوگئی دوستو!''

○○○

اپنے محبوب کے لیے

لیڈی کاسا[☆]

ترجمہ: شاہدہ تبسم

شبنم کے موتیوں کی طرح
اپنے باغ کے سبزے پر
شام کے سایوں میں
میں نہیں رہوں گی

صدیوں کی طرح پھیلے ہوئے ساحل کی،
ریت کے ذرّے بھی
میرے محبوب جزیرے کے ساحل کے
نگراں سے زیادہ نہیں

سمندر کی موجیں
ساحل پر طوفانی شور مچا رہی ہیں
کیا یہ اتنی ہی سنگ دل، اتنی ہی مغرور ہیں
جتنا کہ وہ، جس نے میرا دل چرایا ہے

☆ جاپانی شاعرہ

میں نے ایک تلوار خواب میں دیکھی
جو میرے پہلو میں آویزاں تھی
جانتے ہو اس کی کیا تعبیر ہے
میں تم سے ضرور ہم کنار ہوں گی

اب شام کا گجر بجا
جو ایک ندا ہے
کہ جاؤ سو جاؤ
لیکن کیا میں
اپنے محبوب کا تصور کرتے ہوئے
کبھی سو سکتی ہوں؟

کبھی نہ آنے والے سے محبت کرنا
ایسا ہی ہے
جیسے ایک بڑے مندر میں
کسی بت کی پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہو کر
دعا مانگی جائے

○○○

وجود

تاکاہاشی شنکیچی ☆

ترجمہ: شاہدہ تبسم

کیا کبھی میرے ہاتھوں نے تمھارے بالوں کو چھوا؟
کیا میری انگلیوں نے تمھاری نرم جلد کو محسوس کیا؟

ہمارے درمیان ہمیشہ ایک سرمائی سرد مہری پلتی رہی
گرمیوں کا دھندلا کہر چھایا رہا
کہو ایسا ہی ہوا ہے نا؟

تب بھی تمھارا شکم بچے سے پُر
تندی سے چیخ اور دھڑک رہا ہے

ہم ایک ہی بستر پر سوتے رہے ہیں
لیکن میں ابھی تک نہیں جانتا
کہ تم کون ہو

☆ جاپانی شاعر

تم جس بچے کو جنم دینے والی ہو
یہ تم ہی ہو سکتی ہو
یا پھر ہو سکتا ہے کہ میں ہوں
اور تم میری طرح سے
نہیں جانتیں کہ میں کون ہوں
اب دو زندگیاں تمھارے ہاتھ ہیں

مجھ سے یہ تخصیص اب زیادہ برداشت نہیں ہوتی
تم جس بچے کو جنم دو گی، اب تمھارے سارے پیار کا محور
وہی ہے

اور میں جو کہ باپ ہوں
میرا ہونا نہ ہونا اس بچے کی آمد کے مقابل
کوئی اہمیت نہیں رکھتا

یہ میرا التباسِ نظر ہے
شاید تمھارا اور میرا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے
محض لمس و وصال کے لمحوں میں ہم نے
خود کو جیتا جاگتا محسوس کیا ہے
جیسے خواب میں ہوں
اور اب ہمارا بچہ اسی خواب کے ہاں پیدا ہوگا

جو پیدا ہو گیا
وہ ابد تک زندہ نہیں رہتا
اور جو موجود ہے
وہ دوبارہ پیدا نہیں ہوتا
سو تم موجود ہو
یا کوئی ایسی شے ہو جو پیدا ہو چکی ہو
میں نہیں جانتا

○○○

لوئی سا، بس اب گھر آجاؤ

شرلی جیکسن

عنبریں حسیب عنبر

شرلی جیکسن ۱۴ردسمبر ۱۹۱۶ء کو سان فرانسسکو میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۳۷ء میں اُن کی پہلی کہانی شائع ہوئی۔ کہانی کار کی حیثیت سے انھوں نے نام کمایا اور متعدد اعزازات حاصل کیے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں پر ڈرامے اور فلمیں بنیں۔ ۸راگست ۱۹۶۵ء کی سہ پہر کھانے کے بعد آرام کے لیے لیٹیں اور قیلولے کے دوران ہی اچانک حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ۴۸ برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔

میں نے ریڈیو پر اپنی ماں کی آواز سنی، ''لوئی سا!'' اُس نے کہا، ''بس اب گھر آجاؤ۔ تمھیں دیکھے ہوئے تین سال ہوگئے ہیں۔ ہم سب تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم واپس آجاؤ۔ لوئی سا، خدا کے لیے گھر آجاؤ۔''

میں سال میں ایک بار یہ اعلان سنتی، اپنے فرار کی سال گرہ کے دن۔ میں نے اخباری کہانیاں بھی پڑھیں، ''لوئی سا ٹیتھر کو غائب ہوئے ایک سال ہوگیا۔'' یا دو سال، یا تین۔ میں ۲۰رجون کا انتظار کیا کرتی تھی جیسے اُس دن میری سال گرہ ہو۔

میں چینڈلر میں رہ رہی تھی۔ یہ بڑا شہر میری روپوشی کے لیے موزوں تھا۔ یہ میرے پرانے گھر کے قریب بھی تھا، اس لیے اخبارات اس واقعے والے دن بہت واویلا کرتے تھے۔

سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگنے کا فیصلہ میں نے اچانک نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کے لیے ایک طویل عرصے تک منصوبہ بندی کی تھی۔ ضروری تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو۔ اگر کچھ غلط ہوجاتا تو

میں بالکل تماشا بن کر رہ جاتی۔ میری بہن کیرول مجھے اس کے لیے کبھی معاف نہ کرتی۔

میں نے یہ منصوبہ اس کی شادی سے ایک دن پہلے بنایا تھا۔ اخبارات سے پتا چلا کہ اس کی شادی بہرحال اسی طرح ہوئی تھی۔ کیرول نے ایک اخباری نمائندے کو بتایا کہ اس کی بہن لوئی سا یہی چاہتی تھی، ''وہ کبھی نہیں چاہتی تھی کہ میری شادی کی خوشی غارت ہو۔'' کیرول نے کہا لیکن اُسے معلوم تھا کہ میں بالکل یہی چاہتی تھی۔ بہرحال، جب گھر میں ہر طرف شادی کی گہما گہمی تھی اور ہر شخص تیاریوں میں مصروف تھا، میں ٹہلتی ہوئی دروازے سے باہر نکلی اور چل دی۔

وہاں صرف ایک اڑچن ہوئی، پال نے مجھے دیکھ لیا۔ پال ہمیشہ ہمارے دروازے پر ہی منڈلاتا رہتا تھا۔ کیرول مجھ سے زیادہ اُس سے نفرت کرتی تھی۔ میری ماں بھی اُسے برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

ظاہر ہے، وہ نہیں جانتا تھا کہ میں بھاگ رہی ہوں۔ میں نے اُسے وہی بتایا جو میں اپنے والدین کو بتا چکی تھی کہ میں شہر کے اندرونی حصے میں جا رہی ہوں تاکہ تمام شور شرابے سے دور جاسکوں۔ وہ میرے ساتھ آنا چاہتا تھا لیکن میں بس کی طرف لپکی اور اُس کو وہیں کھڑا چھوڑ دیا۔

میں نے اندرونِ شہر کی بس لی اور ریلوے اسٹیشن چلی گئی۔ میں نے ریل کا آنے جانے کا ٹکٹ خرید لیا، تاکہ وہ یہی خیال کریں کہ میں لوٹ آؤں گی۔ یوں وہ میری تلاش فوراً شروع نہیں کریں گے۔ میں جانتی تھی کہ وہ سوچیں گے کہ میں کرائن میں ٹھہری ہوں۔ وہ اُس راستے کا سب سے بڑا شہر تھا، جہاں ٹرین جاتی تھی، اس لیے میں وہاں صرف ایک دن رُکی۔

میں نے کرائن میں ایک ڈیپارٹمینٹل اسٹور سے زردی مائل بھوری برساتی خریدی۔ اپنے گھر سے پہنا ہوا نیا جیکٹ چھوڑ دیا۔ میں نے اُسے دکان کے کاؤنٹر پر بس یوں ہی چھوڑ دیا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے اُسے بعد میں خرید ہی لیا ہو۔

مجھے ایک بات کا پورا یقین تھا کہ وہاں لازمی ہزاروں لڑکیاں ہوں گی جو انیس سال کی، گھنے بالوں والی، پانچ فٹ چار انچ لمبی، ۱۲۶ پونڈز کی ہوں گی۔ اور اُن میں سے بہت ساری برساتی پہنے ہوئے ہوں گی۔ کیا زبردست بات ہے کہ کوئی آپ پر توجہ ہی نہ دے۔ سیکڑوں لوگوں نے اُس دن مجھے دیکھا مگر درحقیقت ایک نے بھی مجھے نہیں دیکھا۔ میں نے چینڈلر کے لیے ٹرین لی کہ میں اب اُسی طرف جا رہی تھی۔ میں ٹرین میں سوگئی۔

جب میں چینڈلر پہنچی تو میں نے ایک سوٹ کیس خرید لیا۔ میں نے لمبی جرابیں اور ایک چھوٹی گھڑی خریدی، اور انھیں سوٹ کیس میں رکھ لیا۔ اب میں چینڈلر میں بسنے کے لیے خود کو تیار کرچکی تھی۔ کچھ بھی کرنا مشکل نہیں، الّا یہ کہ آپ اس کے بارے میں پریشان یا جذباتی نہ ہوں۔

میں نے طے کرلیا تھا کہ میری نئی شناخت کیا ہوگی۔ میں ایک انیس سال کی لڑکی تھی جس کا نام لوئیس ٹیلر تھا۔ دور افتادہ شہر میں میرا ایک اچھا خاندان تھا۔ میں نے اتنے پیسے جمع کرلیے تھے کہ میں چینڈلر میں رہ سکوں۔ جب گرمیاں ختم ہوں گی تو میں وہاں ایک بزنس اسکول میں چلی جاؤں گی۔ اسکول کے اخراجات ادا کرنے کے لیے مجھے ایک نوکری کی ضرورت ہوگی۔

میں ناشتے اور اخبار کے لیے دواؤں کی دکان میں رُکی۔ میں نے تیار کمروں کے لیے دیے گئے اشتہارات پڑھے۔ سوٹ کیس، برساتی، کرایے پر کمرہ — یہ سب کچھ بالکل معمول کے مطابق لگ رہا تھا۔ جب میں نے کلرک سے پوچھا کہ پرائم روز سڑک تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے تو اُس نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔

میں پرائم روز سڑک پر واقع مسز پی کاک کے گھر آرام سے پہنچ گئی۔ فوراً ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ بالکل مناسب جگہ ہے۔ میرا کمرہ اچھا تھا اور مسز پی کاک اور میں ایک دوسرے کو پسند آئے۔ وہ خوش تھی کہ میری ماں کی خواہش ہے کہ میں ایک اچھے محلے میں ایک صاف ستھرا سا کمرہ تلاش کروں۔ وہ یہ جان کر خوش ہوئی کہ میری خواہش ہے کہ میں کچھ پیسے بچا کر ہر ہفتے اپنے گھر بھیجوں۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر، مسز پی کاک میرے من گھڑت خاندان کے بارے میں سب کچھ جان چکی تھیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میری ماں بیوہ ہے۔ میری بہن کی ابھی شادی ہوئی ہے اور میرے چھوٹے بھائی پال کی وجہ سے میری ماں بہت پریشان رہتی ہے کیوں کہ وہ کہیں ٹک کر کام نہیں کرتا۔

مسز پی کاک میری نگہداشت پر مائل تھیں۔ انھوں نے مجھے محلے کی ایک اسٹیشنری کی دکان پر ملازمت کے بارے میں بتایا۔ سو میں وہاں چلی گئی۔ مجھے گھر سے نکلے چوبیس گھنٹے ہوچکے تھے، اور میں مکمل طور پر ایک نئی شخصیت بن چکی تھی۔ میں لوئیس ٹیلر تھی، میں پرائم روز سڑک پر رہتی تھی اور ایک اسٹیشنری کی دکان میں نوکری کرتی تھی۔

مسز پی کاک اور میں ناشتے کے دوران اخبارات پڑھتے۔ وہ اُس لڑکی کے بارے میں میری رائے پوچھتیں جو روک وائل سے غائب ہوگئی تھی۔ میں کہتی، وہ ضرور پاگل ہوگی جو اتنا اچھا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک مرتبہ میں نے اخبار اُٹھایا اور تصویر دیکھی، ''آپ کا کیا خیال ہے، یہ مجھ جیسی لگتی ہے نا؟'' میں نے مسز پی کاک سے کہا۔

مسز پی کاک نے کہا،''نہیں۔ اس کے بال زیادہ لمبے ہیں اور اس کا چہرہ زیادہ بھرا ہوا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ یہ مجھ سے ملتی ہے۔'' میں نے کہا۔

چینڈلر کے اخبارات میں میری بے شمار تصویریں تھیں لیکن کسی نے بھی مجھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں کام پر جاتی، دکانوں سے خریداری کرتی، مسز پی کاک کے ساتھ فلمیں دیکھنے اور ساحل پر گھومنے جاتی، لیکن کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں بڑی مہارت سے اپنی شناخت تبدیل کر چکی تھی۔ ایک صبح مسز پی کاک میری گم شدگی کے بارے میں پڑھ رہی تھیں، ''اب یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اغوا ہوئی تھی۔'' انھوں نے کہا۔

''ارے کتنے افسوس کی بات ہے، بے چاری۔'' میں نے کہا۔

''تم یہ نہیں کہہ سکتیں''، انھوں نے کہا، ''ہوسکتا ہے، وہ اپنی مرضی سے مغوی کے ساتھ چلی گئی ہو۔''

اپنے فرار کی سال گرہ کے دن میں نے ایک نئی پیچ دار ٹوپی خریدی۔ جب میں گھر پہنچی تو مسز پی کاک ریڈیو سن رہی تھیں۔ میں نے اپنی ماں کی آواز سنی، ''لوئی سا!'' اس نے کہا، ''بس اب گھر آجاؤ۔''

''بے چاری غریب عورت۔'' مسز پی کاک نے کہا، ''سوچو، وہ کیسا محسوس کرتی ہوگی۔ اُس نے ابھی تک اُمید نہیں چھوڑی کہ وہ اپنی ننھی بچّی کو ایک دن زندہ تلاش کر لے گی۔''

میں نے بزنس اسکول چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

اسٹیشنری کی دکان چل نکلی تھی۔ ممکن تھا کہ میں جلد منیجر بن جاؤں۔ مسز پی کاک اور میں متفق تھے کہ اتنی اچھی نوکری چھوڑنا حماقت ہے۔

اب تک میں نے بینک میں کچھ پیسے جمع کر لیے تھے۔ میں اکیلے ٹھیک تھی۔ مجھے کبھی واپس جانے کا خیال نہیں آیا۔ یہ صرف بدقسمتی تھی کہ میری ملاقات پال سے ہوگئی۔

میں اُسے دیکھ کر بغیر سوچے سڑک پر رُک گئی۔ میں چلائی، ''پال۔''

وہ مڑا اور مجھے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اُس نے کہا، ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' اُس نے کہا کہ مجھے واپس چلنا ہی ہوگا۔ اگر میں نہیں گئی تو وہ اُن کو بتا دے گا کہ میں کہاں ہوں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ابھی تک مجھے ڈھونڈ کر لانے والے کے لیے انعام ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ انعام حاصل کر لے تو میں دوبارہ بھاگ سکتی ہوں۔ شاید میں درحقیقت گھر جانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لیے میں سڑک پر اُس کا نام لے کر چلائی تھی۔ بہرحال، میں نے اُس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے مسز پی کاک کو بتایا کہ میں دور افتادہ علاقے میں اپنے خاندان سے ملنے جا رہی ہوں۔ مجھے یہ سب مضحکہ خیز

لگ رہا تھا۔ پال نے میرے والدین کو ٹیلی گرام کر دیا تھا۔

جب ہم روک وائل پہنچے، ہم نے ایک ٹیکسی لی۔ میں مضطرب ہو کر ٹیکسی سے باہر دیکھنے لگی۔ میں قسم کھا سکتی تھی کہ میں نے تین سال تک روک وائل کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ لیکن مجھے سب یاد تھا، جیسے میں یہاں سے کبھی گئی ہی نہیں تھی۔

ٹیکسی میرے محلے کی سڑک پر مڑی۔ تب میں نے گھر دیکھا۔ میں تقریباً رو دی، ''ہر چیز بالکل ویسی ہی ہے۔'' میں نے کہا، ''میں نے اس جگہ سے بس پکڑی تھی۔''

''اگر میں تمھیں روک لیتا،'' پال نے کہا، ''تو تم یقیناً دوبارہ کوشش نہ کرتیں۔''

ہم راہ داری میں چلنے لگے۔ مجھے لگا جیسے وہ کھڑکی سے دیکھ رہے ہوں۔ میں دروازے کی گھنٹی بجانے میں متذبذب تھی۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں بجایا تھا۔

جب کیرول نے دروازہ کھولا، میں حیران رہ گئی، ''کیرول!'' میں نے کہا۔ میں اُسے دیکھ کر سچ مچ خوش ہوئی۔

اُس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ گئی اور مجھے اپنے ماں باپ دکھائی دیے۔ میں اُن کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ مگر میں نے خود کو بہ مشکل روکا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں یا میرے واپس آ جانے پر خوش ہیں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ اس لیے میں بس وہیں کھڑی رہی اور کہا، ''ماں!''

اُس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ وہ بہت دیر تک میرے چہرے کو تکتی رہی۔ وہ رو رہی تھی اور وہ بوڑھی اور اُداس نظر آ رہی تھی۔

پھر وہ پال کی طرف مڑی اور کہا، ''تم دوبارہ میرے ساتھ یہ کیسے کر سکتے ہو؟''

پال جیسے ایک دم گڑبڑا گیا، ''مسز ٹیتھر...''

میری ماں نے مجھ سے کہا، ''تمھارا نام کیا ہے بچی؟''

''لوئی سائیتھر،'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں بچی!'' اس نے بہت نرمی سے کہا، ''تمھارا اصلی نام۔''

اب میرا دل بھر آیا، ''لوئی سائیتھر،'' میں نے کہا، ''میرا نام یہی ہے۔''

''تم لوگ ہمیں اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔'' کیرول چیخی۔

''ہم برسوں سے اپنی بہن کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور تم جیسے لوگ صرف

ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہو تا کہ انعام کی رقم ہتھیا سکو۔"

"کیرول!" میرے والد نے کہا، "تم اس بے چاری بچّی پر کیوں چلاّ رہی ہو؟"

"نوجوان لڑکی!" اُنھوں نے مجھ سے کہا، "مجھے نہیں لگتا کہ تم جان سکتی ہو کہ یہ ہمارے ساتھ کتنا ظلم ہے۔ تم ایک اچھی لڑکی لگتی ہو۔ تصور کرو اگر تمھاری اپنی ماں ہوتی اور کوئی اُس کے ساتھ یہ کرتا۔"

میں نے اپنی ماں کا تصور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کی سمت دیکھا۔

میرے والد نے کہا، "مجھے یقین ہے کہ اس نوجوان آدمی نے تمھیں نہیں بتایا ہوگا کہ وہ ایسا دو بار پہلے بھی کر چکا ہے۔ وہ ہمارے پاس لڑکیاں لایا جو ہماری لوئی سا ہونے کی جھوٹی دعوے دار تھیں۔ پہلی بار تو ہم کئی دن تک بے وقوف بنتے رہے۔ اُس کی حرکات ہماری لوئی سا جیسی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے خاندان کی ایسی چیزیں بھی جانتی تھی جو صرف لوئی سا—یا پال— جانتے ہوں۔ لیکن وہ ہماری بیٹی نہیں تھی اور میری بیوی مزید تکلیف سے گزرتی ہے، ہر بار اُس کی اُمیدیں بڑھ جاتی ہیں۔

اُنھوں نے ایک بازو میں میری ماں کو سمیٹا اور دوسرے میں کیرول کو، وہ سب وہاں کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔

پال نے اُن کے ساتھ بحث شروع کر دی تھی۔ اُس وقت مجھے پتا چلا، میرے دل میں صرف ایک خواہش ہے کہ میں وہاں رُک سکوں لیکن نہیں رُک سکتی تھی۔ وہ ذہنی طور پر قبول کر چکے تھے کہ میں اُن کی لوئی سا نہیں تھی۔

"پال!" میں نے کہا، "کیا تمھیں دکھائی نہیں دے رہا کہ تم جناب مِیتھر کو صرف غصہ دلا رہے ہو؟"

"درست، نوجوان لڑکی!" میرے والد نے کہا۔

"پال!" میں نے کہا، "ان لوگوں کو ہمارا یہاں رُکنا گوارا نہیں۔" پال ایک بار پھر بحث پر آمادہ تھا۔ لیکن اس کے بجائے وہ مڑا اور باہر چلا گیا۔ میں بھی اُس کی تقلید کرتے ہوئے مڑ گئی۔ میرے والد— میرا مطلب ہے جناب مِیتھر — نے میرا ہاتھ پکڑا، "میری بیٹی! تم سے چھوٹی تھی، مجھے اُمید ہے کہ ہماری لوئی سا کے لیے بھی کوئی کچھ کرے گا۔"

"الوداع، پیاری بچّی!" میری ماں نے کہا، "شاد آباد رہو۔"

''مجھے اُمید ہے کہ ایک دن آپ کی بیٹی واپس آجائے گی۔'' میں نے انھیں دلاسا دیا، ''الوداع!''

میں نے پال کو پیسے دیے، وہ بہت تکالیف سے گزرا تھا۔ اور میری نوکری اب تک اسٹیشنری کی دکان میں تھی۔

میری ماں ابھی بھی ہر سال ایک بار مجھ سے مخاطب ہوتی ہے، ''لوئی سا!'' وہ کہتی ہے، ''بس! اب گھر آجاؤ، ہم تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تمھاری ماں اور باپ تم سے محبت کرتے ہیں اور ہم تمھیں کبھی نہیں بھولیں گے۔ لوئی سا! بس اب گھر آجاؤ۔''

○○○

فلم، ٹی وی
موسیقی، اداکاری

خیال کی خوشبو — امراؤ بندو خاں

پروفیسر سحر انصاری

برصغیر پاک و ہند میں موسیقی کی روایات بہت طویل ہیں اور زندگی سے معمور چلی آ رہی ہیں۔ اس ضمن میں مسلمانوں نے جو بڑے کارنامے انجام دیے ہیں، وہ اس قدر اہم ہیں کہ اُن کا احاطہ کرنے کے لیے اب تک دفتر تیار کیے جا چکے ہیں۔ موسیقی اور اس کے متعلقات محض تقاریب یا بعض دوسرے ممالک کی طرح محض تہواروں تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ تین بڑے ادارے موسیقی کی ترقی میں اس طرح شامل رہے جیسے انسانی جسم میں خون کی گردش۔ ایک ادارہ درباروں، بادشاہوں، امیروں اور وزیروں پر مشتمل تھا، جو موسیقی کی سرپرستی کرتے تھے۔ دوسرا ادارہ صوفیائے کرام کا تھا جن کی محفلوں میں خاص طور پر سماع کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ تیسرا ادارہ عوام کا تھا جو اپنی مرضی، ذوق اور ماحول کے مطابق موسیقی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس ضمن میں امیر خسرو کا نام بہت اہم ہے جنھوں نے ہندوستان کی قدیم گائیکی کو تبدیل کیا۔ دُھرپد کو خیال میں بدلا، نیردن کو دو حصوں میں تقسیم کر کے طبلے کی جوڑی تیار کر لی اور ستار جیسے ساز کی ایجاد کا سہرا بھی انھی کے سر ہے اور انھیں جو فیضِ صحبت حضرت نظام الدین اولیاؒ سے حاصل ہوا، اس نے بھی امیر خسرو کے اسلوب موسیقی میں چار چاند لگا دیے۔

جہاں تک درباروں کا تعلق ہے، جون پور کے سلاطینِ شرقی، شمالی ہند کے مغل بادشاہ، جنوبی ہند میں بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی اور آصف جاہی کی سرپرستی نے موسیقی کو فروغ دیا۔ سلطنت اودھ میں واجد علی شاہ اختر کی عملی دل چسپی کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے بھی موسیقی سے گہری دل چسپی رکھی اور کئی ٹھمریاں ان سے یادگار ہیں۔

موسیقی کو فن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچانے میں یقیناً امرا اور عوام کا ہاتھ رہا ہے۔ اکبر اعظم نے اپنے نورتن دربار کی زینت بنائے تو ان میں تان سین جیسے عظیم موسیقار کو اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔

موسیقی میں ساز و آواز کا بنیادی دخل ہوتا ہے۔ اساتذہ نے گائیکی اور آلاتِ موسیقی کے استعمال کو ایک اعلیٰ فن بنا دیا اور رفتہ رفتہ ہر استاد خود ایک دبستاں کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان دبستانوں کو موسیقی کی دنیا میں گھرانے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

برصغیر میں گائیکی کا اعلیٰ ترین اور متنوع معیار انھی گھرانوں نے قائم کیا۔ ان گھرانوں کے تسلسل کو موسیقی کی دُنیا میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ دہلی میں استاد چاند خاں کا گھرانا ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، اس میں کئی پشتوں سے موسیقاروں کا انتہائی اہم تسلسل چلا آرہا ہے۔ استاد بندو خاں کا تعلق استاد چاند خاں کے گھرانے سے تھا۔ استاد بندو خاں نے سارنگی نواز کی حیثیت سے تاریخ میں اپنا انتہائی اہم مقام پیدا کیا۔ اُن کی سارنگی کی ساخت اور ہیئت میں خود استاد بندو خاں کی نادرہ کاری کا دخل تھا۔ ان جیسا سارنگی نواز ماضیِ قریب میں کوئی دوسرا پیدا نہ ہو سکا۔ استاد بندو خاں کو طرح طرح سے نذرانہ عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے لیکن ایک یادگار گلِ عقیدت وہ ہے جو جدید اردو شاعری کے ایک رُجحان ساز شاعر عزیز حامد مدنی نے استاد بندو خاں کی نذر کیا ہے:

بندو خاں کی سارنگی سے خطاب

استاد بندو خاں کو موسیقی سے ایسا ہی لگاؤ تھا جیسے دل کو اپنی دھڑکن سے ہوتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی اولاد کو بھی اس فن سے آشنا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ان کے دو صاحب زادوں سے میری ملاقاتیں رہی ہیں، ایک امراؤ بندو خاں اور دوسرے بلند اقبال۔ استاد امراؤ بندو خاں دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، بلند اقبال ہمارے درمیان ہیں۔ دعا ہے کہ وہ سلامت رہیں اور اپنے گھرانے کی میراث کو مستقبل کے لیے بیش از بیش فروغ دیتے رہیں۔

اس وقت تذکرہ ہے استاد امراؤ بندو خاں کا۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ بالکل بچپن ہی میں استاد بندو خاں نے ان سے ریاض کرانا شروع کر دیا تھا، موسیقی کے رموز اور گائیکی کے اصول ان کے رگ و پے میں پیوست کرنے لگے تھے۔ اُسی کا یہ نتیجہ تھا کہ استاد امراؤ بندو خاں کو ایک غیر معمولی فن کار کا مرتبہ حاصل ہوا۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان، فلم انڈسٹری اور ٹیلی وژن کے لیے بے شمار دھنیں تیار کیں۔ انھیں خود گائیکی میں ایک خاص کمال حاصل تھا۔ مزاجاً وہ ایک منکسر المزاج اور سادہ طبیعت کے انسان تھے، ہمیشہ خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ کسی لمحے بھی اُن کے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنے بڑے گائیک اور استادِ فن ہیں۔ مجھے انھیں چائے کی

میز پر، محفلوں میں، موسیقی کے فیسٹول میں اور نجی تقاریب میں ملنے اور سننے کا موقع ملتا رہا۔

ہمارے حلقۂ احباب میں ایک بڑی اہم شخصیت ایم ایچ عباسی کی تھی، جو علی گڑھ یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل تھے اور وہاں ہاکی ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ کراچی میں ان کا آخری عہدہ کلکٹر کسٹم کا تھا اور وہ کراچی ایئرپورٹ پر تعینات تھے۔ انھیں موسیقی سے بے پناہ لگاؤ تھا، خود بھی بہت اچھا گاتے تھے اور کبھی کبھی رات نو، ساڑھے نو بجے گیت، غزلیں گانا شروع کرتے تو فجر کی اذان پر اختتام ہوتا۔ اس اثنا میں وہ اکیلے ہی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے، درمیان میں سہگل، نذیر، سورن لتا، استاد جھنڈے خاں، طلعت محمود، استاد بڑے غلام علی خاں، آفتاب موسیقی استاد فیاض علی خاں اور شہنائی کے بے مثل استاد بسم اللہ خاں کی صحبتوں کا ذکر بھی ہوتا رہتا تھا۔ ان کے یہاں اکثر موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور ان میں استاد امراؤ بندو خاں کو بطورِ خاص مدعو کیا جاتا تھا۔ استاد جس طرح اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے، لگتا تھا کہ یہ لے کاری، پلٹے اور راگ کے مختلف روپ نہیں بلکہ وہ اپنی آواز سے مسلسل نئے نئے چراغ روشن کرتے جارہے ہیں۔ جب وہ اپنی پُرسوز آواز میں:

دیا کہاں گئے وہ لوگ

سناتے تھے تو لگتا تھا کہ دل پھٹ جائے گا، ہر آنکھ آب دیدہ ہوجاتی تھی۔ کسی بھی راگ کا دورانیہ مختصر نہیں ہوتا تھا۔ وہ فن کے سارے کمالات اپنی گائیکی میں پیش کرتے اور محفل کو بے حال کر دیتے تھے۔ درمیان میں راگ راگنیوں کے بارے میں سامعین کو کچھ نہ کچھ نکتے سمجھاتے جاتے تھے۔

ادارۂ یادگارِ غالب کے معتمد مرزا ظفر الحسن تھے۔ علمی، ادبی اور انتظامی شعبوں کے علاوہ ریڈیو پاکستان سے بھی ان کی گہری وابستگی تھی۔ میں اس وقت ادارے کا نائب معتمد تھا۔ ہم ادارے کی کارکردگی کو زندہ اور فعال رکھنے کے لیے نئے نئے پیرائے تلاش کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اقبال بانو کو مدعو کیا گیا۔ انھوں نے غالب اور فیض کی غزلیں سنائیں۔ محفل دیر تک گرم رہی۔ اقبال بانو دیر تک اپنی آواز کا جادو جگاتی رہیں، آخر میں مرزا ظفر الحسن نے جو بذلہ سنجی کا موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، اقبال بانو سے کہا کہ، ''بانو، ادارۂ یادگار غالب بھی غالب ہی کی طرح تنگدستی رہتا ہے۔ لہٰذا ہم آپ کی خدمت میں ادارے کی مطبوعات ہی پیش کرسکتے ہیں۔'' اقبال بانو نے بڑی خندہ پیشانی سے وہ تحفہ قبول کیا، کتابوں کو چوما اور کہا کہ، ''مجھے موسیقی کی ایک ایک محفل میں لاکھوں روپے مل جاتے ہیں لیکن اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی جتنی ادارۂ یادگارِ غالب کی یہ کتابیں حاصل کرکے ہوئی۔''

اسی تسلسل میں ایک بار استاد امراؤ بندو خاں کو بھی زحمت دی گئی کہ وہ ادارے میں

اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور کچھ موسیقی کے رموز بھی سامعین کے لیے پیش کریں۔ اُس شام انھوں نے واقعی چند گھنٹوں میں گلوکاری کے وہ یادگار مظاہرے کیے کہ آج تک کانوں میں وہ خوب صورت لہریں رقص کر رہی ہیں۔ راگ راگنیوں کا تعارف کراتے ہوئے سُروں اور سرگم کی نزاکتوں کو واضح کرتے ہوئے کئی مثالیں پیش کیں اور اپنی گلوکاری کے ذریعے یہ واضح کیا کہ کلام کی دھن اور اس کے لیے راگ کا انتخاب کلام کے مزاج کے مطابق کرنا چاہیے۔ انھوں نے داغ کی غزل کا یہ مطلع مثالاً پیش کیا:

بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

کہنے لگے کہ اس غزل میں شوخی ہے، چنچلتا ہے اور ایک ماحول اور پیکر کی مرقع کشی ہے، اس کی طرز کو انھی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ استھائی اور انترے کو کئی طریقوں سے گا کر بتایا اور آخر میں اس امر کو واضح کر دیا کہ حقیقتاً اس غزل کی طرز کیا ہونی چاہیے۔ پھر غالب کی غزل پر آ گئے:

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اور اس غزل کے موڈ اور اشعار کی سنجیدگی، غزل کی چھوٹی بحر جیسے زاویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے، اس غزل کی گائیکی میں اضطراب قلب کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ پھر غزل کی گائیکی سے محفل کو پوری طرح محظوظ کرنے کے بعد راگ ایمن، ٹھمری، دادرا، ملہار اور جے جے ونتی کی کچھ مثالیں نہایت بھرپور انداز میں پیش کیں۔ اُن کی گائیکی اور نرت میں جو بے ساختگی تھی، وہ واقعی دیکھنے اور سننے کی چیز تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انھوں نے اس فن میں کتنا ریاض کیا ہے کہ جو سُر ادا ہوتا ہے، لگتا ہے کہ بغیر کسی کاوش کے (effortless) ادا کر دیا گیا ہو۔

ایم ایچ عباسی مرحوم کے پاس استاد امراؤ بندو خاں کی گائیکی کے طویل دورانیوں کے اسپول موجود تھے، معلوم نہیں، اب ان کا کیا مصرف ہے۔ بہر حال اس سے قطعِ نظر جی چاہتا ہے کہ استاد امراؤ بندو خاں کے افرادِ خاندان، مثلاً بلند اقبال اور مظہر امراؤ بندو خاں ان کے فن کو نئی نسل تک پہنچانے کے لیے سی ڈیز تیار کرائیں تا کہ امراؤ بندو خاں جیسے بڑے فن کار کی آواز اس انتشار زدہ ماحول میں سکون کا رس گھول سکے۔

○○○

خیال کی خوشبو — جگجیت سنگھ

پروفیسر سحر انصاری

برصغیر پاک وہند میں موسیقی کی روایت بہت قدیم ہے۔ امیر خسرو سے قبل کی ہندوستانی موسیقی اپنا ایک الگ رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ امیر خسرو نے سازوں، سُروں اور راگوں میں اپنی انتہائی تخلیقی ذہانت کے ساتھ کچھ ایسی ایجادات کر دیں کہ اب اُن کی ان اختراعات سے باہر موسیقی کا تصور ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کم از کم ہزار سال کی مدت میں برصغیر نے بڑے گائیک پیدا کیے۔ مردوں کے علاوہ ہمارے اپنے زمانے میں روشن آرا بیگم، نور جہاں، بیگم اختر فیض آبادی، زہرہ بائی امبالہ والی، لتا منگیشکر، اقبال بانو، اوشا منگیشکر، خورشید، ملکہ پکھراج، طاہرہ سید، بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مرد گائیکوں کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اچھی خاصی ڈائریکٹری تیار ہو جائے گی۔ میاں تان سین سے لے کر مہدی حسن تک ایک سے ایک آفتاب و مہتاب موسیقی کی دُنیا میں درخشاں و تابندہ نظر آتے ہیں۔ موسیقی کی سرپرستی نوابوں، بادشاہوں اور راجاؤں، مہاراجوں نے اس طرح کی کہ انھیں اپنے دُنیاوی مسائل سے بے نیاز کر دیا۔ کئی حکمراں خود بھی موسیقی سے استادانہ لگاؤ رکھتے تھے اور اُن میں سے کئی ایک کی ٹھمریاں اور دادرے اب بھی سنجیدہ محفلوں میں اپنا رنگ جما دیتے ہیں۔ موسیقاروں نے اپنی ہنرمندی سے جو راہیں نکالیں اُن کی بدولت برصغیر میں موسیقاروں کے گھرانے معرضِ وجود میں آگئے۔ اب بھی بعض گلوکار اور موسیقار ان گھرانوں سے اپنی نسبت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

موسیقی کے اس پس منظر میں جس ادارے نے موسیقی کو بے انتہا فروغ دیا اور درباروں اور امرا کی محفلوں سے نکال کر اسے عام انسانوں تک پہنچایا، وہ فلمی دُنیا ہے۔ فلموں میں گیت، غزل، حمد و نعت، بھجن اور دیگر نوع نوع کی شاعری، جس میں ہماری اردو کی مروجہ غزلیں اور

نظمیں بھی شامل ہیں، مختلف ادوار میں گلوکاروں کی انفرادی کاوشوں کی بنا پر یادگار ہوتی چلی گئیں۔ ان گلوکاروں میں پنکج ملک، کے ایل سہگل، محمد رفیع، منا ڈے، کے سی ڈے، مکیش، کشور کمار، طلعت محمود کے نام نمایاں ہیں۔ دورِ جدید میں غزل کی گائیکی کو خاص مقام حاصل ہوا۔ اس کا ایک طویل پس منظر ہے اور اسی فضا میں ہمیں غزل کے ایک انتہائی منفرد اور ہر دل عزیز گائیک جگجیت سنگھ یاد آرہے ہیں۔ جگجیت اور اُن کی اہلیہ چترا نے اپنی انفرادیت کو اس حد تک منوالیا کہ بعض غزلیں اور گیت ان کی آوازوں سے مخصوص ہو کر رہ گئے۔ جگجیت نے حقیقتاً اس گیت میں جو تاثر پیدا کیا تھا:

ہونٹوں سے چھولو تم، میرا گیت امر کردو

تو واقعی جس گیت اور غزل کو انھوں نے اپنے ہونٹوں سے چھوا وہ امر ہوگئے۔ ذرائع ابلاغ اور فلموں کے علاوہ موسیقی کی محفلوں میں انھوں نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی بڑا نام کمایا۔ ہم نے انھیں پاکستان اور ہندوستان کی محفلوں میں بالمشافہ سنا اور دیکھا، لیکن تین سال قبل جب ہم ایک پروگرام کے تحت صرف جگجیت سنگھ سے ملنے کے لیے ممبئی گئے تو اُن سے قربتیں حاصل ہوئیں، اور ایک فن کار کی شہرت اور اس کی بے مثال کارکردگی کا تاثر لیے ہوئے جب ہم جگجیت سے ملے تو اُن کی شخصیت اور انسانیت کے ایسے پہلو ہم پر اُجاگر ہوئے، جن سے ہم اب تک ناآشنا تھے۔

ممبئی سے پہلے دہلی کے غالب انسٹی ٹیوٹ میں ہمارا قیام رہا۔ کراچی میں معروف صحافی اور ادیب تنویر کاظمی نے غالب کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے وہ سکریٹری ہیں اور مجھے بھی اس میں شمولیت کا شرف حاصل ہے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ غالب کے سلسلے میں کوئی ایسا کام کیا جائے کہ ہندوستان اور پاکستان کے ثقافتی روابط میں عوامی سطح پر خوش گوار فضا قائم ہو۔ چنانچہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے صدیق الرحمٰن قدوائی اور شاہد ماہلی کے ساتھ باقاعدہ یہ معاہدہ ہوا کہ غالب کے سلسلے میں ایک سال بڑی تقریب پاکستان میں ہوگی اور دوسرے سال ہندوستان میں۔ اس ضمن میں یہ خیال آیا کہ جگجیت سنگھ نے گلزار کی ٹیلی فلم میں غالب کی غزلیں جس طرح گائی ہیں، وہ مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ تنویر کاظمی کی تجویز تھی کہ انھیں "شہنشاہِ غزلیاتِ غالب" کا خطاب دیا جائے اور کراچی میں انھیں مدعو کر کے ایک بڑی غالب کانفرنس کی جائے۔ ہم ممبئی یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر معین الدین جینابڑے کے ہم راہ جگجیت سنگھ سے طے شدہ مقام پر صبح نو بجے ملنے پہنچ گئے۔ یہ ممبئی کا ریس کورس تھا، جہاں جگجیت صبح کے وقت جاگنگ کے لیے آتے تھے اور پھر وہیں کے ریسٹورینٹ سے ناشتے کی چیزیں منگوا لیتے اور احباب کی اچھی

خاصی محفل آراستہ ہوجاتی۔ ہم معاملات کو طے کرنے کے لیے تین دن تک برابر وہاں جاتے رہے، ہر روز جگجیت نے فلمی اور علمی دنیا کی اہم شخصیتوں کو مدعو کیا اور ہمیں ان سے متعارف کرایا۔ ہر روز ہمارے اس عذر کے باوجود کہ ہم گھر سے ناشتا کر کے آئے ہیں، جگجیت بڑے مفصل ناشتے کا اہتمام کر دیتے تھے اور ان کے اصرار پر کچھ نہ کچھ انصاف کرنا ہی پڑتا تھا۔ وہ انتہائی مخلص، سادہ مزاج اور اپنائیت کا ایک مجسمہ لگے۔ ہم یہاں سے مشروبات کے چھ گلاس جن پر مرزا غالب کی شبیہ کندہ تھی، تحفے کے طور پر اُن کے لیے لے گئے تھے۔ انھوں نے ان گلاسوں کو ہاتھوں میں لے کر میرے اور تنویر کاظمی کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔ وہ اس طرح خوش ہو رہے تھے جیسے کوئی بہت ہی قیمتی تحفہ ان کی نذر کیا گیا ہو۔ جب اُن کے سامنے ہم نے اپنا مدعا رکھا اور یہ بتایا کہ آپ کے اعزاز میں محفلِ موسیقی منعقد کریں گے تاکہ ہم غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرح کا ایک ادارہ غالب کے نام سے کراچی میں بھی قائم کریں، تو انھوں نے یہ پیش کش کی کہ میں آپ سے کوئی پائی پیسا نہیں لوں گا اور سارا پروگرام بلامعاوضہ کروں گا۔ آپ اس محفل سے جو رقم بھی جمع کر سکیں وہ اس ادارے کی تعمیر کے لیے میری طرف سے عطیہ ہوگی۔ ہمارے کانوں کو یقین نہیں آیا کیوں کہ ہم نے دہلی میں سن رکھا تھا کہ جگجیت سنگھ ۲۵ رلاکھ روپے لے کر ہی اسٹیج پر قدم رکھتے ہیں، باقی معاملات ان کے علاوہ ہوتے ہیں، لیکن جگجیت سنگھ نے ہم سے باقاعدہ تحریری معاہدہ کیا اور یہ بھی کہا کہ اگر حالات سازگار رہے تو چترا کے علاوہ نصیر الدین شاہ اور گلزار کو بھی میں اپنے ہمراہ لاؤں گا۔ معاہدوں پر دستخط ہوئے اور جگجیت سنگھ نے اپنے پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات کی نقول ہمارے سپرد کر دیں۔

ہماری ملاقاتیں بہت یادگار اور دلچسپ رہیں، ممبئی کی بعض شخصیات سے ملاقاتیں بھی ایسی تھیں کہ جدید ہندوستان کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ فلمی دنیا کے نئے منصوبوں کا بھی علم ہوا، لیکن! اور یہ لیکن بڑے دل خراش انداز میں میرے قلم سے نکل رہا ہے کہ ہماری ملاقاتوں کے تیسرے دن شام کے وقت جگجیت سنگھ کا فون آیا کہ، ''بھائی نہایت معذرت کے ساتھ میں یہ اطلاع دے رہا ہوں، کہ پاکستان اپنی آمد کی جو تاریخ ہم نے مقرر کی ہے اُس دن میرے جوان، مرحوم بیٹے کی پہلی برسی ہے۔ یہ بات مجھے چترا نے یاد دلائی تو میں سناٹے میں آ گیا۔ میں اُس بیٹے کا غم دل میں چھپائے دنیا کے سارے کام بدستور کرتا رہتا ہوں لیکن مجھے برسی کی تاریخ یاد نہیں تھی۔''

ظاہر ہے کہ ہم اس دکھ میں برابر کے شریک تھے، ہم نے ملاقات کر کے انھیں تسلی دی

اور کہا کہ ''یار زندہ صحبت باقی، آئندہ چند ماہ کے بعد ایسا ہو جائے گا۔'' لیکن ہمارے اپنے ملک میں بھی ایک قیامت برپا ہوگئی کہ ۲۷؍دسمبر کو محترمہ بے نظیر بھٹو کو شہید کر دیا گیا، لہٰذا آئندہ چند ماہ تک ایسی فضا نہ بن سکی کہ اُس میں طرب و خوشی کے جامے پہنے جاتے۔ کچھ عرصے بعد یہ اطلاع ملی کہ جگجیت پر نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا ہے اور وہ اسپتال میں داخل ہیں۔ میں اور تنویر کاظمی جگجیت اور چترا سے عیادت کرتے رہے، پھر وہ صحت یاب ہوکر اپنی روزمرہ زندگی کی طرف واپس آگئے، لیکن ہمارے یہاں زلزلے کے بعد دو سال تک سیلاب کی جو مسلسل تباہ کاریاں ہوئیں، اُن کے پیشِ نظر ہم ایسا کوئی پروگرام نہ بنا سکے اور پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ جگجیت پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ دوبارہ ہسپتال میں داخل ہوگئے ہیں۔ اس خبر نے غیر محسوس طریقے سے دل میں ایک ملال کی کیفیت پیدا کردی، دل ایک ایسی خبر کے لیے تیار ہوگیا جو سننے اور ماننے کے لائق نہیں تھی، لیکن وہ جاں کاہ خبر آ ہی گئی کہ غزل کا جادو جگانے والی یہ بے مثل آواز اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ جگجیت اب ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کی آواز اب بھی کانوں میں رس گھولتی ہے اور مجھے رئیس امروہوی کا یہ شعر یاد آنے لگتا ہے

کہاں ہم اختتامِ نغمہ کے بعد
اگر ہوں گے، تو صرف آواز ہوں گے

○○○

استاد فیاض خان اور آگرہ گھرانا

کمار پرساد مکھرجی
سلیم صدیقی

برصغیر کی کلاسیکی موسیقی کی تاریخ، تخلیق اور جدت طرازی کے حوالے سے دو بڑے استادوں کی فنی عظمت کو تسلیم کیے بغیر انتہائی نامکمل سمجھی جائے گی۔ یہ دو موسیقار استاد عبدالکریم خان اور استاد فیاض خان ہیں۔ یہ دونوں بیسویں صدی کے آغاز میں پورے ہندوستان پر شہرت و عزت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے اور خاص طور پر کلاسیکی موسیقی کے ایک انداز یعنی خیال کو بالکل ہی نیا اور انقلابی روپ دے کر ثابت کر چکے تھے کہ اُن کے مدِ مقابل کوئی بھی فن کار نہیں۔ قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ خیال گائیکی کا اُنھوں نے جہاں جدید ترین تصور دیا، وہیں صدیوں کی روایات کو بھی یکسر پامال نہیں کیا۔

جہاں تک موسیقی میں آگرہ گھرانے کے ''آفتاب موسیقی'' فیاض خان کا تعلق ہے، اُن کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی دیوقامت ہاتھی کھڑا ہو اور نابینا لوگوں میں سے کوئی اُس کی سونڈ پکڑتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ اژدھا ہے۔ کوئی اس کا پاؤں چھوتا ہے تو وہ اس کو ایک مضبوط ستون قرار دیتا ہے۔ جب کہ تیسرے آدمی کے ہاتھ میں اُس کی دُم آتی ہے تو وہ اُس کو گھومتی ہوئی کوئی رسّی کا نام دیتا ہے۔ غرض کہ کسی بھی نابینا آدمی کو پورے اور سالم ہاتھی کا خیال نہیں آتا ہے۔

استاد فیاض خان نامی اس فن کار ''ہاتھی'' کے بارے میں کچھ ''نابینا'' استادوں کی رائے سنیے:

استاد حافظ علی خان، جو عظیم سرود کار استاد امجد علی خان کے والد تھے، انھوں نے ایک

بار راقم (کمار پرساد مکھرجی) سے کہا کہ، ''ہائے ہائے، کیسا زبردست فن کار تھا۔ خیال ہو یا ٹھمری، کوئی بھی ہندوستان میں 'بول بنانا' میں فیاض خان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔'' منّو بابو، جو نام ور ستار نواز تھے، اُن کا کہنا تھا کہ تال اور لے کاری کے وہ لاثانی استاد تھے۔ استاد ولایت خان نے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا، اپنے انٹرویو میں بیان کیا کہ انھوں نے اپنے والد استاد عنایت خان کے استاد عبدالکریم خان اور استاد فیاض خان سے زندگی بھر اپنے فن میں رہنمائی حاصل کی۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ فیاض خان کے دُرت خیال اور تار سپتک کے گندھار سے اترتے ہوئے سپاٹ حلق تانوں کی کوئی مثال نہیں۔ پنڈت روی شنکر کو فیاض خان کے ہاں اظہار کی جادوئی قوت نظر آتی ہے۔ استاد امیر خان کا بھی تقریباً یہی کہنا تھا۔ وہ اظہار کی اس قوت کو ''میجسٹک'' کا نام دیتے تھے۔ پروفیسر ڈی پی مکھرجی (میرے والد) کو استاد فیاض خان کے فن میں راگ داری اور الاپ کا حسین تعمیراتی عمل نظر آتا ہے۔ غرض ان ''نابینا'' لوگوں، جن میں مندرجہ بالا شہرۂ آفاق فن کار اور ناقد بھی شامل تھے، کو استاد فیاض خان کی لامحدود فنی اور تخلیقی صلاحیتوں اور خوبیوں کو سمیٹنے اور یک جا کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ صرف چند ہی لوگ تھے جو اس فن کار کو ''مکمل موسیقار'' کا درجہ دے کر کسی حد تک استاد فیاض خان کی فنی شخصیت کو صحیح طور پر بیان کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

موجودہ دور کے کلاسیکی موسیقی سے دل چسپی رکھنے والوں میں سے شاذ و نادر ہی کسی کو ذاتی طور پر فیاض خان کو سننے کا موقع ملا ہوگا۔ اُن کی آواز میں جو 78 RPM کے ریکارڈ ملتے ہیں اور جن کی بنیاد پر لانگ پلے اور سی ڈیز دستیاب ہیں، اُن سے استاد فیاض خان کے فن اور آواز کا سو فی صد اندازہ کرنا مشکل ہے، کیوں کہ الیکٹرونک دور سے پہلے کے غیر معیاری ریکارڈنگ سسٹم کے ذریعے کچھ تھوڑے بہت ہی ریکارڈ بن سکے۔ پھر مائیکروفون بھی خان صاحب سے کم از کم دو فٹ دور رکھا جاتا تھا تاکہ خان صاحب کی طاقت ور آواز مسخ شدہ حالت میں ریکارڈ نہ ہوجائے۔ ان ریکارڈوں کے علاوہ لوگوں کو استاد فیاض خان کو آل انڈیا ریڈیو سے بھی اس وقت سننے کا موقع ملا، جب کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں پہنچ چکے تھے اور ٹی بی نے ان کے دونوں پھیپھڑوں کو متاثر کردیا تھا۔ یہاں تک کہ حلق تانوں کے دوران اُن کے منہ سے خون تک آ رہا تھا۔ یہ تو کہیے کہ سورگ باشی سنیل بوس، جو ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۹ء میں آل انڈیا ریڈیو بڑودہ کے انچارج تھے، جن کی کوششوں سے استاد فیاض خان کی آخری دنوں میں طبّی سہولتوں اور ان کے اہلِ خانہ کی مالی اعانت کے علاوہ ان کی آواز کے کچھ نمونوں کو محفوظ کرنے کا کچھ کام ہوسکا، ورنہ شائقین موسیقی کو موسیقی کے ایک اَن مول ورثے سے محروم ہونا پڑتا۔ نئی نسل کے لیے یہ

ریکارڈز اور سی ڈیز وغیرہ ایک متاع عظیم سے کم نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ استاد فیاض خان ان میں اپنے اصلی روپ کی بجائے اپنی مدھم پرچھائیں ہی نظر آتے ہیں۔ آگرہ گھرانے کے استاد ولایت خان اور اُن کے ہونہار بیٹے یونس خان (افسوس جو خود بھی مرحوم ہو چکے ہیں) نے اپنے گھرانے کی سلسلہ وار تاریخ مرتب کی ہے۔ اس سلسلۂ نسب کے مطابق اُن کا آگرہ گھرانا میاں تان سین کے گوالیار گھرانے سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ جسونت راؤ نے استاد خادم حسین خان پر اپنی کتاب میں اس گھرانے کا سلسلہ دیوگری کے گوپال نائک سے جوڑا ہے، جن کو حضرت امیر خسرو، علاء الدین خلجی کے دور میں دہلی لائے تھے۔ آگرہ گھرانے کے پہلے مسلمان گائیک کا نام حاجی سجن خان تھا، جو میاں تان سین کے ہم عصر اور اکبر بادشاہ کے ہی دربار سے منسلک تھے۔ اکبر بادشاہ نے ہی اُن کو "دیپک جیوت" کا لقب دیا تھا، غالباً اس لیے کہ یہ دیپک راگ بہت مہارت سے گاتے تھے۔ میاں تان سین کے روپ میں کندن لال سہگل فلم "تان سین" میں یہ راگ گا کر اپنے جسم کو بری طرح جھلسا بیٹھے تھے، جب کہ آج کل اس دیپک راگ کی اتنی مٹی پلید ہے کہ بڑے سے بڑے استاد کو نہ تو اس کا مکمل علم ہے اور نہ اس کو گانے کا شوق۔

بہرحال شہنشاہ اکبر نے اپنے اس درباری گویّے کو گونڈ پور نام کا گاؤں بخشش میں دیا جہاں اُس کے گھرانے کے لوگ ۱۸۵۷ء تک رہتے رہے۔ پھر انگریزوں کے خلاف بغاوت یا صحیح معنوں میں جدوجہد آزادی کے دوران یہ لوگ آگرہ منتقل ہو گئے۔ اس گھرانے میں دو بہت بڑے گائیک پیدا ہوئے۔ ایک کو سرس رنگ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں گزرے ہیں، جب کہ موسیقی پر عتاب آیا ہوا تھا۔ دوسرے میاں شیام رنگ ہیں، جنھوں نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں نام پیدا کیا۔ راگ "برجو کی ملھار" میں خیال کی بندش "آئے بدرا کارے کارے" ان میاں شیام رنگ سے ہی منسوب ہے، گو کہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ خیال گائیکی کا آگرہ گھرانے میں ان دنوں کوئی چلن تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ خیال گائیکی کو آگرہ گھرانے میں متعارف کرانے کا سہرا خدا بخش نامی گویّے کو جاتا ہے، جو کہ انھی میاں شیام رنگ (اصلی نام قیوم خان) کے بیٹے تھے۔ خدا بخش نے دھرپد، دھمار اور الاپ چاری میں اپنے تین دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر زبردست محنت اور تیاری کی تھی۔ لیکن اپنی لگن اور مہارت کے باوجود بدقسمتی سے خدا بخش کی آواز اتنی کرخت اور سُر سے باہر تھی کہ مذاق میں لوگوں نے اُن کا نام "گھگھے" رکھ دیا تھا۔ پھر اپنے ہی خاندان کے لوگوں کی طعن و تشنیع سے تنگ آ کر خدا بخش گوالیار چلے آئے اور یہاں انھوں نے تھمن پیر بخش

نامی استاد کی شاگردی اختیار کرلی، جن کے والد نکھن خان اور چچا شکر خان بھی نامی گوگوئیے تھے، کیوں کہ قوال بچوں کا خاندان اٹھارویں صدی کے اواخر میں خیال کو لکھنؤ سے گوالیار لے آیا تھا، اس لیے تھن پیر بخش کا گھرانا بھی خیال گائیکی کی طرف رجحان رکھتا تھا۔

خدا بخش نے اپنے استاد سے آواز کی بُنت اور پیش کش، خیال اور ٹپہ خیال کی چودہ سال تک دن رات تربیت حاصل کی اور جب وہ آگرہ واپس پہنچے تو اُن کی آواز اتنی گمبھیر اور سُریلی ہوچکی تھی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ لوگ جب اُن سے سنتے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک جاتیں۔ یہاں تک ہوا کہ شادی، بیاہ کے موقعوں پر اُن کو بلایا نہ جاتا، کیوں کہ اُن کا پیدا کردہ غم ناک سماں کسی طرح بھی ایسے موقعوں پر نیک شگون نہیں کہلایا جاسکتا تھا۔

خدا بخش کی گائیکی کی شہرت جب جے پور کے دربار تک پہنچی تو اُس وقت مہاراجا سوائے رام سنگھ نے اپنے دربار میں پہلے ہی سے ایک سے ایک موسیقار جمع کر رکھے تھے۔ بخش ومتھر ناتھ، رجب علی بین کار، امرت سین (جو میاں تان سین کے سلسلۂ نسب میں سے تھے)، صدرالدین دہلی والے اور عظیم استاد بہرام خان بھی ان میں شامل تھے، جو شہرۂ آفاق ڈاگر بھائیوں کے آباو اجداد میں سے تھے۔

استاد فیاض خان پر مضمون کے حوالے سے ماضی کے استادانِ موسیقی اور اُن کے واقعات کا ذکر بظاہر غیر متعلق لگتا ہے، لیکن اُن کا بیان اس لیے ضروری ہے کہ ان استادوں میں بہت سے لوگ نہ صرف فیاض خان کے آگرہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، بلکہ کئی لوگ تو اُن کے آبا و اجداد میں شامل تھے۔ لہٰذا اُن کے دل چسپ ذکر کے بغیر فیاض خان اور اُن کے آگرہ گھرانے کی گائیکی کا بیان اور تجزیہ بھی ادھورا کہلائے گا۔ چنانچہ ہم خدا بخش اور بہرام خان کی داستان ایک بار پھر شروع کرتے ہیں۔ ان دونوں کا جے پور دربار میں جب ایک دوسرے سے واسطہ پڑا تو دونوں میں اتنی دوستی ہوگئی کہ ٹوپی بدل بھائی کے رشتے میں بندھ گئے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ بہرام خان موسیقی کے علم اور راگ داری کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں نمبر ایک شمار ہوتے تھے، لیکن جہاں تک حسنِ فن اور تاثیر کا سوال ہے، خدا بخش اُن سے کہیں آگے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گوالیار طرز کی خیال گائیکی میں وستار (راگ کا مفصل بیان) کی کمی تھی، جب کہ خدا بخش کیوں کہ دھرپد اور دھمار میں بھی ماہر تھے، اس لیے اُن کے ہاں اس وستار کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اُنھوں نے اس کے علاوہ دھمار سے ہی بول بانٹ اور لے کاری لے کر انھیں اپنے خیال انگ میں شامل کرلیا تھا۔ آگے چل کر استاد فیاض خان نے انھی خصوصیات کو بام عروج پر پہنچا دیا۔

جے پور گھرانے کے بانی استاد اللہ دیا خان ۱۸۵۷ء کی آزادی کی تحریک سے دو سال

پہلے پیدا ہوئے تھے اور اُن کا انتقال ہند و پاکستان کی آزادی سے کچھ ہی عرصے پہلے ہوا۔ اپنی طویل زندگی کے دوران انھوں نے ہندوستانی موسیقی کے ہر اُس آدمی سے ملاقات کی تھی اور اُس کو سنا تھا، جو کسی حوالے سے بھی موسیقی کا علم اور دسترس رکھنے کی شہرت رکھتا تھا۔ بہرام خان کے بارے میں اُن کے خیالات سنیے:

مسلمانوں کے اندر بہرام خان ایک پنڈت تھے۔ وہ بنارس محض اس لیے گئے تھے کہ سنسکرت سیکھ سکیں۔ وہاں وہ بارہ سال رہے اور موسیقی سے متعلق سنسکرت کا ایک ایک لفظ حفظ کرلیا۔ اُس دور میں ہندو برہمنوں کے علاوہ کسی کو بھی سنسکرت سکھانے کی منادی تھی۔ اس لیے بہرام خان نے نہ صرف ہندوانہ لباس اپنایا بلکہ ان کا ہر طور طریقہ بھی اختیار کیا۔ اپنی پیشانی پر وہ صندلی لیپ (تلک) لگاتے تھے اور سندھیا وندن جیسی رسومات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ لیکن بہرام خان ایمان کے بھی اتنے پکے تھے کہ انھوں نے دکھاوے کی حد تک تو یہ سب کچھ کیا، لیکن اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کبھی بھی مندر میں داخل نہیں ہوئے۔

بہرام خان نے اپنے گرو کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا، بلکہ دل جمعی سے اُن سے سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس سلسلے میں اُن کی توجہ سیکڑوں کتابوں میں سے صرف موسیقی سے متعلق قدیم ترین کتابوں پر مرکوز رہتی تھی، لیکن اس بات کو انھوں نے کبھی بھی کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ بارہ سال اسی طرح گزر گئے اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب اُن کا رخصت ہونے کا موقع آیا، تب بالآخر انھوں نے اپنے گرو پر یہ بھید ظاہر کیا اور اُن سے اس راز کو چھپائے رکھنے پر معافی کے طلب گار ہوئے۔ گرو نے اپنے چیلے کو نہ صرف معاف کیا، بلکہ موسیقی میں کامیابی حاصل کرنے کی خوب دعائیں دیں۔

دوسرے استادوں کے برعکس بہرام خان بلاتعصب مذہب، رنگ و نسل، عمر، گھرانا، موسیقی کا علم ہر ایک کو بانٹنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ حتیٰ کہ جولاہوں کے بچوں کو بھی وہ اس فن کے رموز سکھانے میں دل چسپی لیتے تھے، جب کہ مشہور تھا کہ اس پیشے کے لوگوں میں دور دور تک سُر سنگیت کا کوئی شعور نہیں۔ بہرام خان نے اس نظریے کو غلط ثابت کردیا اور ان جولاہوں میں سے ہی ایسے گویّے پیدا کیے کہ جو نہ صرف بہت اچھا گاتے تھے، بلکہ مشکل راگوں میں سرگم وغیرہ بھی تخلیق کرنا جانتے تھے۔ بہرام خان فراخ دلی سے ان کو دوسرے نامی گویّوں کے ساتھ بڑی محفلوں میں بھی گانے کا موقع دیتے تھے۔ دراصل وہ یہ ثابت بھی کرنا چاہتے تھے کہ جولاہوں

کے گھرانے تو کلاسیکی موسیقی کی طرف راغب ہیں لیکن پیشہ ور موسیقی کے گھرانوں کو اس فن کے رُو بہ زوال ہونے کا رتی بھر خیال نہیں۔

بہرام خان دھرپد اور دھمار بے انتہا خوب صورتی کے ساتھ گاتے تھے۔ صدیوں کی کمپوزیشنز اُن کو یاد تھیں۔ ہر راگ میں وہ سرگم تخلیق کرنے کا فن جانتے تھے۔ یہ ہنر اُن کے ڈاگر گھرانے میں منتقل ہوا۔ اُن سے قبل یعنی تقریباً چار سو سال پہلے تک ڈاگر، کھندار، نوہار اور گوبر بار بانیوں یا روایتوں کے علم بردار تمام گویوں میں سرگموں پر عبور ہونا لازمی خیال کیا جاتا تھا، لیکن اس کا علم تمام گویوں کو اپنے اپنے بچوں اور خاص شاگردوں تک ہی محدود رکھنے کی سختی سے تاکید کی جاتی تھی۔ بہرام خان نے یہ فن عوام الناس تک پھیلانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ بہرام خان کا متذکرہ بانیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ ڈھاڈھی قوم کے ایک فرد تھے۔ لیکن اُن کی شہرت و عزت اتنی تھی کہ کوئی بھی اُن کا کہا نہیں ٹال سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے نعمت خان کے پوتے حیدر بخش اور دوسرے نام ور استاد عالم سین سے خود اپنے پوتوں یعنی ذاکر الدین اور اللہ بندے کو الاپ، دھرپد اور دھمار سکھانے کی فرمائش کی تو انھوں نے فوری طور پر حامی بھر لی۔

بہرام خان اور خدا بخش میں سگے بھائیوں جیسی دوستی کے باوجود استادوں کی روایتی چھیڑ خانی بھی ہمیشہ رہتی تھی اور وہ بھی سرِ عام۔ ایسے موقعوں پر بہرام خان کی گفتگو کا آغاز عام طور پر اس طرح ہوتا:

اماں یار گھگھے! راگ داری میں کچھ سبق ہم سے کیوں نہیں لے لیتے ہو۔ ہر ایک جانتا ہے کہ تمھیں اتنی زندگی گزرنے کے بعد بھی گانا وانا نہیں آیا ہے۔

ایک بار خدا بخش جب گا رہے تھے تو سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان میں بہرام خان بھی شامل تھے۔ گانا ختم کرنے کے بعد خدا بخش طنزاً بہرام خان سے مخاطب ہوئے، ''ہم کو تو گانا وانا نہیں آتا۔ پھر یہ رومال جیب سے کس لیے نکل آیا ہے بہرام بھائی؟''

''اسی افسوس کے مارے تو رو رہے ہیں کہ آپ کی دن رات کی محنت اور ریاض کسی کام بھی نہیں آئی ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے!'' بہرام خان نے آنسو پونچھتے ہوئے دوستانہ شرارت سے جواب دیا۔

ایک عرصے کے بعد ۱۹۱۶ء میں بڑودہ میں پہلی گرینڈ میوزک کانفرنس کا انعقاد مہاراجا سایاجی راؤ گائیکواڑ کی سرپرستی اور وشنو نارائن بھات کھنڈے کی کوششوں کے نتیجے میں عمل میں آیا۔ استاد امین الدین ڈاگر کے دادا استاد اللہ بندے خان اور ان کے بڑے بھائی استاد

ذاکر الدین خان، جو خود بھی بڑے الاپیے تھے، اُس وقت دھرپد گا رہے تھے۔ گانے کے عین وسط میں خاندانی استادوں کی طرح استاد اللہ بندے خان ترنگ میں آ کر سننے والوں سے مخاطب ہوئے، ''افسوس کہ ہندوستان میں الاپ چاری کے فن کا خاتمہ ہو رہا ہے اور اب اس فن کا وجود ڈاگر خاندان کے علاوہ کہیں مشکل ہی سے ملتا ہے۔''

فیاض خان ان دنوں نوجوان تھے۔ جب دوسرے دن اُن کا نمبر آیا تو درباری کا الاپ شروع کیا، جو ایک گھنٹے سے زیادہ مدت تک جاری رہا، پھر کہیں وہ دھمار اور خیال پر پہنچے۔ سننے والے ششدر تھے۔ استاد اللہ بندے خاص طور پر اتنے بوکھلائے ہوئے تھے کہ دوڑے دوڑے فیاض خان کے پاس آئے اور اُن کو گلے سے لگا کر گویا ہوئے:

جب میں نے کل اپنے ڈاگر خاندان کا حوالہ دیا تھا تو اُس میں تم بھی شامل تھے۔ بھئی سب جانتے ہیں کہ تم تو ہمارے ہی ہو۔

یہ دراصل ماضی میں بہرام خان اور ڈاگر خاندان کے گھگھے خدا بخش کی ٹوپی بدل دوستی ہی کی طرف اشارہ تھا۔

مختصراً یہ کہ خدا بخش اور بہرام خان کی دوستی تاحیات رہی اور مثالی رہی۔ خدا بخش نے نوے سال کی عمر پائی، جب کہ بہرام خان نے پورے سو سال مکمل کیے۔ اپنی آخری عمر میں خدا بخش مشکل ہی سے گا پاتے تھے کیوں کہ اُن کی یادداشت انتہائی کم زور ہوگئی تھی۔ کبھی وہ راگوں کے نام بھول جاتے، لیکن دُھن اور بول یاد رہتے اور کبھی اس کا الٹ ہو جاتا۔ فیاض خان ایک واقعہ سناتے تھے کہ ایک بار پنجاب سے کوئی گویا جے پور میں خدا بخش کی رہائش گاہ پر پہنچا اور اُن سے راگ ''جیت'' سننے کی فرمائش کی۔ خدا بخش نے لاکھ کوشش کی لیکن نہ تو راگ یاد آیا اور نہ ہی اُس کی کوئی بندش۔ پنجاب کا یہ گویا اتنا ناراض ہوا کہ غصے کے عالم میں اُس نے خدا بخش کا تانپورہ اٹھا لیا اور کہنے لگا، ''استاد آپ کو شرم آنی چاہیے کہ میں تو جیت، جیت شری اور جیت کلیان اور اُن جیسے دسیوں راگوں کو آسانی سے گا سکتا ہوں، اور آپ ہیں کہ اتنے بڑے اور مشہور استاد ہو کر 'جیت' جیسے ایک راگ کو بھی نہیں گا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں آپ کا تانپورہ لے جا رہا ہوں۔''

پنجاب کا گویا حق پر بھی تھا، کیوں کہ اُن دنوں واقعی یہ دستور بھی تھا کہ اگر کوئی استاد موسیقی کے مقابلے میں ہارتا تو اُس کو جیتنے والے کو اپنا تانپورہ بھی دینا پڑتا تھا۔

بہرحال پنجاب کا گویا ابھی استاد کے گھر سے نکلا ہی تھا کہ بازار سے لوٹنے والے اُن کے دو بیٹوں، غلام عباس اور کلن خان کی اُن پر نظر پڑی۔ انھوں نے حیرت سے اپنے والد کا

تانپورہ پکڑے اس اجنبی آدمی کو دیکھا اور پوری کہانی سننے کے بعد وہ اس کو ایک بار پھر اپنے گھر لے گئے۔ یہاں انھوں نے تانپورہ ملایا اور گنگنا کر "جیت" راگ کے سُر چھیڑ دیے۔ والد صاحب کی یادداشت فوراً واپس آگئی۔ پھر تو کیا کہنا تھا، "جیت" راگ کے بیسیوں رنگ کی استھائیاں خدا بخش کے گلے سے اُمڈی پڑ رہی تھیں۔ وقت ساکت ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی پنجاب سے آئے ہوئے گلوکار کا پورا وجود بھی۔ بوڑھے خدا بخش کی جوان راگ داری کا طلسم اُس وقت ٹوٹا جب گھر کے باورچی خانے سے آواز آئی کہ پورے دو گھنٹے ہوچکے ہیں، کھانا بالکل ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پنجاب کے گویے کے منہ سے واہ وا کا شور ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ آخر میں اُس نے کہا کہ، "میں نے تو سنا تھا کہ آپ بڑے فن کار ہیں۔ لیکن یہ تو بہت چھوٹا لفظ ہے، بلکہ آپ کے بارے میں تو گُنی، پنڈت کا لقب بھی بہت چھوٹا ہے۔"

خدا بخش نے اپنے دونوں بیٹوں غلام عباس خان اور کلّن خان کے ساتھ اپنے بھتیجے شیر خان کی تربیت بھی کی۔ ان شیر خان صاحب نے اپنے فن کا ورثہ اپنے مشہور بیٹے تھمن خان کو منتقل کیا ہے جو بھاسکر بوا اور بابلی خان جیسے بڑے فن کاروں کے گرو ثابت ہوئے۔ جس طرح کرشن بوا نے گوالیار کی گائیکی کو مہاراشٹر میں پھیلایا، اسی طرح شیر خان اور تھمن خان نے آگرہ گھرانے کا پرچم بمبئی میں بلند کیا، جب کہ گوالیار بہرحال اُن کا صدر مقام رہا۔ شیر خان اور کلّن خان کے ورثا میں ولایت حسین خان، خادم حسین خان، انوار حسین خان اور لطافت حسین خان جیسے عظیم استاد پیدا ہوئے۔ جب یہ لوگ بابل بمبئی میں تھے تو جے پور/ اتراؤلی گھرانے کے بانی استاد اللہ دیا خان بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اتراؤلی اور آگرہ گھرانے کا نسلوں سے آپس میں شادی بیاہ کے بندھنی رشتوں کے علاوہ ایک خصوصی مثال منشی غلام حسین کی ذات بھی ہے، جنھوں نے اتراؤلی کے بہت سے استادوں کو تعلیم دی تھی۔ جیونت راؤ نے "ساجن پیا" کے نام سے استاد خادم حسین (جنھوں نے مصنف کی بیوی للت راؤ کو بھی تعلیم دی تھی) کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ جب استاد اللہ دیا بمبئی میں آگرے والوں کے ساتھ تھے تو خادم حسین اُس وقت بچے تھے۔ ایک دن وہ استاد کے گانے اور تان کاری سے اتنے متاثر ہوئے کہ بول اٹھے، "دادا جی مجھے بھی اتنے بڑے علمی خزانے سے کچھ عنایت کردیں، میرے لیے احسان ہوگا۔" استاد اللہ دیا نے جب یہ سنا تو حیرت زدہ لڑکے خادم حسین کے سامنے کھڑے ہوگئے اور دونوں ہاتھوں سے توبہ کرنے لگے، جس طرح کہ اپنے سے بڑے استادوں کے لیے موسیقی کے گھرانوں میں کیا جاتا ہے۔ پھر وہ منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے۔ خادم حسین اُن کے پاؤں پڑ گئے اور کہنے لگے، "دادا جی!

اگر مجھ سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے اور میں نے کوئی ایسی چیز آپ سے مانگ لی ہے جس کا میں مستحق نہیں ہوں تو میں اس کے لیے تہ دل سے معافی مانگتا ہوں۔‘‘

استاد اللہ دیا نے فوری طور پر اپنا ہاتھ خدام حسین کے سر پر رکھا اور کہنے لگے، ’’بیٹا ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تیرا تو حق ہے مجھ سے مانگنے کا۔ شاید تجھے معلوم نہیں کہ گھگھے خان کے محبوب شاگرد منشی غلام حسین، جو تمھارے دادا کے بھائی تھے، انھوں نے ہی پہلی بار میرے کاندھے پر تانپورہ رکھا تھا۔ صاحب زادے میرے لیے آگرے اور اترا ولی میں کوئی فرق نہیں۔ وہ دونوں میرے لیے ایک ہی ہیں۔‘‘

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ گزرے زمانے کے استادوں میں اپنے گروؤں اور اُن کے خاندان کے ساتھ ایمان و وفا کا ایک مضبوط رشتہ ہوا کرتا تھا اور نسل در نسل یہی وفاداری کا رشتہ گھرانا سسٹم کا بنیادی ستون ہوتا تھا۔ استاد ولایت حسین نے اپنی کتاب "Sangeet Sansmaran" میں لکھا ہے کہ اُن کے اکتالیس گرو تھے۔ ان میں انھوں نے ان لوگوں کو بھی شامل کیا تھا جن سے انھوں نے محض دو چار استھائیاں ہی سیکھی تھیں۔ بہر حال اس کا ہی نتیجہ تھا کہ آگرہ گھرانے کے ان استاد ولایت خان کے پاس استھائیوں، بندشوں کا اتنا بڑا خزانہ تھا کہ ہندوستان کے بڑے سے بڑے استادوں میں اس کی مثال ملنا مشکل تھی۔ ان میں استاد تصدق حسین خان، خادم حسین خان اور میرے (کمار پرساد مکھر جی کے) استاد عطا حسین خان بھی شامل ہیں، جو موسیقی کے علم میں رات دن اپنی ذات کو فنا کر بیٹھے تھے۔ عطا حسین خان تو مشہور استاد محبوب خان درس پیا کے صاحب زادے بھی تھے اور اپنے باپ سے انھوں نے سیکڑوں بندشیں ورثے میں حاصل کی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ اپنے بہنوئی استاد فیاض خان کے بھی انتہائی وفادار شاگرد تھے اور انھوں نے خان صاحب کی معیت میں ہی بڑودہ میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا تھا۔ آگرے کے استاد ولایت حسین خان اور اترا ولی/ جے پور گھرانے کے استاد اللہ دیا خان کا حوالہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا ہے، جب تک کہ استاد اللہ دیا خان کی مشہور گلوکارہ کیسر بائی کیرکر کا ذکر نہ آئے۔ ۱۹۶۳ء میں کیسر بائی کیرکر نے استاد ولایت خان کے انتقال کے موقعے پر استاد کے والد اور عظیم گائیک نتھن خان اور اپنے گرو استاد اللہ دیا خان کے انتہائی قریبی تعلقات کے حوالے سے کہا کہ جس طرح دونوں میں بھائی بھائی کا رشتہ تھا، اسی طرح میرے اور ولایت حسین خان کے درمیان بہن بھائی کا رشتہ تھا۔ کیسر بائی نے مزید کہا کہ ولایت حسین خان صاحب ایک اعلیٰ درجے کے پنڈت ہی نہیں، علمِ موسیقی کے ایک بڑے سمندر تھے۔ جتنا میں اُن

کو سنتی، اتنا ہی مجھے افسوس ہوتا کہ آگرہ گھرانے کے لوگوں نے اپنے درمیان رہنے والے اور اپنے ہی گھر کے اس گُنی آدمی سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے حسب لیاقت ولایت حسین خان اور فیاض خان صاحب سے خوب فیض حاصل کیا اور ان دونوں کی منفرد موسیقی کا رنگ میرے خیالوں اور ٹھمریوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ کیسر بائی کیرکر کی یہ بات درست ہے۔ آپ اُس کی بھیروی کی ٹھمری "بابل مورا" سنیے، آپ کو یقین آجائے گا۔ (یہ ٹھمری فیاض خان تو کمال کی گاتے ہی تھے لیکن کندن لال سہگل نے بھی اس کو غضب کا گایا ہے— مترجم)

پڑھنے والوں کو یقیناً اب استاد فیاض خان کے بارے میں جاننے کی بے تابی ہوگی، لیکن بس تھمن خان کا دل چسپ ذکر بھی پہلے ہوجائے۔ وہ غیر متنازع طور پر اپنے دور کے بڑے گائیک تھے۔ ولمپت استھائی کو مہارت سے گانے میں تو دور دور تک اُن کا شہرہ تھا۔ وہ جتنے بڑے گائیک تھے، اُس سے بھی کہیں بڑے ہوسکتے تھے، لیکن بدقسمتی سے بوتل کے دیوانے تھے۔ جب اُن کو میسور جیسی بڑی ریاست کے مہاراجا نے اپنے دربار میں گانے کی دعوت دی تو یہ بمبئی کے آگرہ گھرانے کے لوگوں کے لیے ایک اعزاز کی بات تھی۔ مہاراجا صاحب کرناٹکی اور ہندوستانی موسیقی کے سرپرست اور دل دادہ تھے۔ ان کے فرزند بھی ماہر پیانو نواز تھے اور اس ساز سے انھیں اتنا عشق تھا کہ وہ اس کو جنگل میں سفاری پروگرام کے دوران بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ بہرحال تھمن خان جب ٹرین کے ذریعے بمبئی سے میسور پہنچے تو مہاراجا کے خصوصی اہل کار نے اُن کا ریلوے اسٹیشن پر پُرتپاک خیرمقدم کیا اور اُن کو سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اُن کو اطلاع دی گئی کہ مہاراجا کو اُن کا گانا سننے کا شدید اشتیاق ہے اور وہ اسی شام کو خان صاحب کو زحمت دینا چاہتے ہیں، لیکن جب خان صاحب کو شام کے وقت محل میں لے جایا گیا تو وہ اس بری طرح شراب میں دُھت تھے کہ ٹھیک سے اُن سے گانے کے لیے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

دوسری صبح اُن کو صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ انھوں نے راگ کا موڈ شروع ہی کیا تھا کہ تمام درباری بلند شگاف قہقہے لگا رہے تھے۔ جلد ہی وہ اہل کار اُن کے سامنے کھڑا تھا، جس نے ایک روز پہلے ریلوے اسٹیشن پر اُن کا استقبال کیا تھا، لیکن اب کے اس کے ہاتھ میں تھمن خان صاحب کے لیے مہاراجا کی طرف سے پُرخطیر دو ہزار روپے کے نذرانے کے ساتھ یہ پروانہ حکم بھی تھا کہ وہ اسی رات کی ٹرین سے میسور چھوڑ دیں۔

تھمن خان صاحب شرم اور احساسِ ندامت سے چُور چُور تھے۔ پھر بھی انھوں نے ہمت کر کے مہاراجا کے اہل کار سے کہا کہ سرکارِ عالی کو میری طرف سے پیغام پہنچا دیجیے کہ میں

کسی ایسی کارکردگی کا نذرانہ نہیں قبول کر سکتا ہوں، جو میں نے ابھی حقیقت میں دکھائی ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اُن سے مؤدّبانہ درخواست ہے کہ مجھے دو تین روز کی مہلت کے بعد ایک بار پھر اپنے ہنر کو پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ مہاراجا کی طرف سے اُن کو خوش قسمتی سے یہ اجازت مل گئی۔ پھر آگرہ گھرانے کے ہر فرد کو معلوم ہے کہ جب نتھن خان نے عالمِ ہوش میں اپنی پرفارمنس دی تو دربار ہی لوٹ لیا۔ مہاراجا تو اُن سے اتنا خوش ہوئے کہ اُن کو سب سے بڑے درباری گوّیے کے طور پر ریاست میسور میں رکھ لیا۔

استاد اللہ دیا خان، نتھن خان کو بھائی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ انھوں نے بھی نتھن خان سے متعلق ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے:

نتھن خان ایک بار مجھ سے ملنے کولھاپور تشریف لائے۔ میں نے مہاراجا صاحب کو اطلاع دی کہ میسور سے ایک نامی گرامی گوّیا آیا ہوا ہے، جو اپنے فن میں یکتائے روزگار ہے۔ چنانچہ مہاراجا صاحب نے بھائی صاحب کے اعزاز میں اسی روز محفل کا اعلان کر دیا۔ اب ان بھائی صاحب کو پینے پلانے کی ایسی لت لگی ہوئی تھی کہ محفل کے آغاز سے پہلے یہ باہر گئے اور خوب سیراب ہو کر مہاراجا صاحب کے محل میں داخل ہوئے۔ وہاں بھی انھیں ہر میز پر ایک سے ایک اعلیٰ شراب مل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نشے میں بری طرح دُھت ہو گئے اور جب گانے بیٹھے تو شروع تو کچھ کرتے تھے، لیکن گلے سے کچھ اور نکلتا تھا۔ غرض کہ بھائی صاحب اس دن گانے میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ مہاراجا نے طنزاً مجھ سے سوال کیا کہ، ''کیا یہ وہی گائیک ہیں جن کی آپ نے اتنی تعریف کی تھی؟'' — ''قبلہ مہاراجا صاحب! معاف کیجیے گا، آپ کچھ جلدی میں تھے کہ اُن کے لیے محفل آج ہی رکھ لی۔ ابھی تو لمبے سفر کے بعد اُن کی تھکن بھی دور نہیں ہوئی ہے۔ ایک آدھ دن انھیں آرام کا موقع تو دیں، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔'' میں نے (اللہ دیا نے) خجالت کے عالم میں بات بنائی۔ چنانچہ مہاراجا نے دو دن بعد اُن کا پروگرام رکھ لیا۔ جب وہ دن آیا تو مقررہ وقت سے پہلے بھائی صاحب پھر شغل کرنے کی نیت سے گھر سے باہر جانے لگے۔ اُس وقت میں نے ذرا سختی سے اُن سے کہا، ''بھائی صاحب! میں آپ کو اس وقت گھر سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ اگر آپ گئے تو میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔'' میری دھمکی کارآمد ثابت ہوئی اور وہ رُک گئے اور پھر ہم دونوں مہاراجا کے محل میں پہنچ گئے۔ جب مہاراجا کی آمد کا اعلان ہوا تو بھائی صاحب حالتِ اضطراب میں پھر میرے قریب آ گئے اور کہنے لگے کہ اگر انھیں پینے کو کچھ نہ ملا تو اُن سے گانا بھی نہیں ہو سکے گا۔ میں نے

ترس کھا کر محل کے ایک نوکر کے ذریعے صرف ایک پیگ شراب اُن کے لیے لانے کو کہا اور تمام نوکروں کو منع کر دیا کہ اس کے بعد وہ کسی صورت بھی بھائی صاحب کو کچھ نہ دیں۔ خیر، محفل شروع ہوئی۔ بھائی صاحب نے کمال کا گایا۔ یہاں تک کہ مہاراجا صاحب بھی عش عش کر اُٹھے۔ غرض کہ بھائی تھمن خان اگر ہوش میں ہوتے تو سُر اُن کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے۔"

اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تھمن خان سے گہری اُنسیت اور دوستی کے باوجود اللہ دیا خان اُن کی شراب نوشی کے مشغلے سے دور رہتے تھے۔ اللہ دیا خان صاحب اپنا سلسلۂ نسب شندیلیہ گوترا برہموں سے جوڑتے تھے۔ وہ سچے مسلمان تھے اور شراب جیسی لعنت سے کوسوں دور تھے۔ تھمن خان پھر بھی اُن کے لیے ہمیشہ محبت اور احترام کے جذبات رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ان کو ایک بڑا گائیک بھی مانتے تھے۔ اتنا بڑا کہ نوجوان گائیکوں کو وہ نصیحت کرتے تھے کہ جب بھی اللہ دیا کا نام لو تو پہلے عرق گلاب سے اچھی طرح اپنا منہ صاف کر لیا کرو۔

اب ہم فیاض خان کے سلسلۂ نسب و فن کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، خدا بخش کے دو بیٹے غلام عباس خان اور کلّن خان تھے۔ کلّن خان نے اپنے والد کے بعد جے پور کی مسندِ سنبھالی اور کئی شاگرد پیدا کیے جنھوں نے بعد میں بڑا نام کمایا۔ ان میں سب سے زیادہ نام زہرہ بائی آگرہ والی کا ہے جس نے شیر خان اور محبوب خان سے بھی تعلیم حاصل کی۔ کلّن خان کے دو دوسرے شاگردوں میں فردوسی بائی اور بو بائی جے پور والی نے بھی بڑا نام کمایا۔ ادھر غلام عباس خان نے آگرہ میں ہی قیام کیا۔ اُن کی بڑی بیٹی عباسی بیگم سکندرا رنگیلا گھرانے کے صفدر حسین اور چھوٹی بیٹی قادری بیگم متھرا کے کالے خان (سرس پیا) سے بیاہیں۔ کالے خان کی کئی بندشیں گویّوں میں مشہور ہیں، جن میں "چتر سنگھار بتیاں" (کیدارا) اور "من موہن برج کے رسیا" (پرج) شامل ہیں۔ کالے خان کے بیٹے غلام رسول خان تھے جنھوں نے تاحیات فیاض خان کے ساتھ ہارمونیم پر سنگت کی۔ فیاض خان کے دل میں غلام رسول صاحب کے لیے صرف اسی لیے عزت نہیں تھی کہ وہ ایک بہت بڑے ہارمونیم بجانے والے تھے بلکہ اس لیے بھی وہ اُن کی قدر کرتے تھے کہ وہ اُس زمانے میں ایک موسیقی کے خاندان میں ہوتے ہوئے بھی میٹریکولیٹ تھے اور اس وجہ سے "صاحبوں" جیسی فر فر انگریزی بول سکتے تھے۔

فیاض خان کے والد صفدر حسین اُن کی پیدائش سے چند ماہ قبل ہی انتقال کر گئے۔ عباسی بیگم اپنے باپ غلام عباس کے پاس آگئیں، جنھوں نے اپنے محبوب نواسے کی تعلیم کا انتظام اپنے ذمے لے لیا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، فیاض خان کا اپنے باپ کی طرف سے رنگیلا

خاندان سے رشتہ تھا، جس کے بانی رمضان خان تھے، جن کی راگ نائیکی کا نہرا، نٹ بہاگ اور چھایا بہاگ میں کئی بندشیں اب تک گائی جاتی ہیں۔ فیاض خان نے اپنے چچا فدا حسین خان سے بھی کافی سیکھا۔ لیکن اُن کو زیادہ تر تعلیم اپنی والدہ کے حوالے سے اپنے نانا یعنی غلام عباس خان اور اُن کے بھائی کلّن خان سے ہی ملی۔ اپنے آخری دنوں میں تحسن خان نے بھی نوجوان فیاض خان کو موسیقی کے رموز سے آگاہ کیا۔ یہی نہیں، تحسن خان کے بیٹے عبداللہ خان کو تو نہ صرف فیاض خان نے استاد بنایا بلکہ انھیں اپنا ہیرو بھی قرار دیا۔ بھری محفل میں فیاض خان کا اُن کی فنی عظمت کا اعتراف کرنے کا ایک واقعہ استاد لطافت خان نے یوں بیان کیا ہے۔ ایک بار چالیس کی دہائی میں سانتا کروز سرکل میں استاد فیاض خان راگ لاچاری ٹوڑی گا رہے تھے۔ وہ شدھ گندھار پر خوب صورت انداز میں قیام کرتے، پھر کومل گندھار کے راستے رکھب کی طرف پلٹتے۔ انھوں نے اس دوران کچھ ایسا سماں باندھا کہ لوگ اُٹھ اُٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔ اچانک اپنے لیے داد و تحسین کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے وہ گانے سے رُک گئے اور خودکلامی کے انداز میں بولے، ''ہائے یہ لاچاری ٹوڑی تو بھائی عبداللہ خان گاتے تھے۔ کیا غضب کا انداز تھا اُن کا۔ میں تو اُن کا ایک ذرّہ بھی نہیں ہوں۔''

نانا اور نواسے یعنی غلام عباس خان اور فیاض خان ایک دوسرے کے ہمیشہ قریب رہے، حالانکہ فیاض خان کی والدہ عباسی بیگم نے دوسری شادی کرلی تھی۔ غلام عباس نے طویل عمر پائی اور ایک سو نو سال کے بعد انتقال کیا۔ فیاض خان اُس وقت پچاس سال سے زیادہ عمر کے ہوگئے تھے لیکن وہ اپنے نانا/ استاد کا اس قدر ادب و احترام کرتے تھے کہ جب کبھی حقہ پیتے تو اپنے دروازے اچھی طرح بند کرلیتے تاکہ اُن کی نظر نہ پڑ جائے۔ بزرگوں کا احترام ویسے بھی اُس دور کے رسم و رواج کا لازمی جزو تھا۔ غلام عباس ایک انتہائی دماغی خلجان اور اضطرابی کیفیت کے مالک تھے، اور اسی لیے فیاض خان اُن کو محفلوں میں سننے کی بجائے گھر میں ہی بیٹھ کر اُس کی تفصیل سننا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے شاگردوں مثلاً خادم حسین اور عطا حسین سے پوچھتے، ''کیسا ہوا گانا۔ امید ہے فیاض نے گانے میں کچھ گڑبڑ نہیں کی ہوگی۔ اُس نے گایا کیا تھا؟''

خیال رہے کہ یہ سوالات اُن کے ذہن میں اس وقت اٹھتے تھے، جب تیس کی دہائی میں فیاض خان فنِ موسیقی کے بے تاج بادشاہ بن چکے تھے۔ بہرحال، انھیں بتایا جاتا کہ فیاض خان نے سننے والوں پر معمول کے مطابق جادو کردیا تھا اور یہ کہ صبح تک اُن کو اٹھنے ہی نہ دیا گیا۔ پھر جا کے کہیں غلام عباس کچھ مطمئن ہوتے۔ وہ اس موقع پر خدا کا شکر ادا کرتے کہ لڑکا آخرکار

اپنے فن میں کچھ نکھر رہا ہے۔

غلام عباس خان کو اپنے آپ کو جسمانی طور پر چاق چوبند رکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ سو سال کی عمر کو پہنچ کر بھی وہ مختلف قسم کی کسرت اور ایکسرسائز سے باز نہیں آتے تھے۔ ایک بار انھوں نے گائیک دلیپ چندر ویدی سے پوچھا کہ وہ فیاض خان سے آج کل کیا سیکھ رہے ہیں؟ ''جی میں چھایانٹ میں نیوار کی جھنکار سیکھ رہا ہوں ان دنوں اُن سے۔'' فیاض خان کے نوجوان شاگرد نے جواب دیا۔

''کے سانس میں استھائی بھرتے ہو؟'' غلام عباس خان کا دوسرا سوال تھا۔ یہ دلیپ ویدی کے لیے بالکل ہی اَن ہونا سوال تھا، جس پر انھوں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

''لیو سنو'' غلام عباس خان نے ویدی کو پریشان دیکھ کر کہا۔ پھر انھوں نے انتہائی لمبی ولمپت لے میں استھائیوں کو صرف دو سانسوں میں ادا کرنے کا مظاہرہ کیا، اس وضاحت کے ساتھ کہ اپنی نوجوانی میں وہ یہ استھائیاں اسی لے میں صرف ایک سانس میں پورا کر لیتے تھے!

لطافت خان کا کہنا تھا کہ غلام عباس خان اپنی معمول کی سو اٹھک بیٹھکوں کے بعد بارہ بادام کھاتے تھے۔ اُن کے دانت تو رہے نہیں تھے، لہٰذا اُن کو یہ بادام پیس کر دیے جاتے تھے۔ ایک بار گھر میں بادام نہیں تھے، لہٰذا فیاض خان کی اہلیہ نے کچھ مونگ پھلیوں سے یہ کام چلانا چاہا۔ بڑے میاں نے تھوڑا ہی پیسٹ چکھا تھا کہ فوراً تھوک دیا۔

''بھئی میں نے زندگی بھر سچے سُروں سے کھیلا ہے۔ مجھے بادام اور مونگ پھلی کا فرق معلوم نہیں ہوگا تو کس کو ہوگا؟'' غلام عباس خان کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے غصے سے زیادہ احساسِ تفاخر چھلک رہا تھا۔ یہ سب کچھ غلام عباس کی کوئی ڈینگ نہیں تھی۔ استاد ولایت خان جیسے بڑے فن کار کا کہنا تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں صرف دو سریلے گائیکوں کو سنا ہے، ایک عبدالکریم خان صاحب تھے، دوسرے غلام عباس خان۔ اپنی کتاب میں ولایت حسین خان نے بھی بیان کیا ہے کہ غلام عباس کی باگیری اس قدر پُرسوز اور پُراثر ہوتی تھی کہ اس کو سن کر ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ غلام عباس خان کی باگیری راگ کے ذریعے لوگوں کو رُلانے کی تصدیق گوالیار گھرانے کے پرانے استاد بالا صاحب پونچھ والے نے بھی کی ہے۔

غرض کہ فیاض خان کی اپنے نانا غلام عباس خان کے ہاتھوں تربیت کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا۔ اُن کی موسیقی کی تعلیم کے دوران وقفہ ہوتا تو فیاض خان کو اٹھک بیٹھک اور پہلوانی کے لیے تیار ہونا پڑتا۔ فیاض خان نے صرف پانچ سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تھی، لیکن

اُن کو بارہ سال کی عمر تک کوئی بندش وغیرہ گانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان سات برسوں کے دوران وہ صرف شدھ اور تیور بارہ سُروں اور اُن پر مشتمل پلٹوں کو ہی گاتے رہے۔ خان صاحب نے ایک بار بتایا کہ بچپن میں انھیں راگ ایمن بہت پسند تھا اور کیوں کہ اُن دنوں اُن پر کسی بھی راگ کے گانے کی پابندی تھی، لہٰذا ایک روز وہ اپنے مکان کے پچھواڑے لگے ہوئے ایک درخت پر چڑھ گئے اور اس راگ ایمن میں مشہور بندش ''اے ری عالی، پیا بن'' گانے لگے۔ غلام عباس خان کے کانوں میں آواز پڑی تو فوراً ایک نوکر کو ''مجرم'' لڑکے کو پکڑ کے لانے کا حکم دیا۔ چنانچہ فیاض خان کو ڈنگر ڈولی کر کے غلام عباس خان کے روبرو پیش کیا گیا اور ان تین ثابت شدہ ''جرائم'' کی وجہ سے اُن کی خوب دُھنائی کی گئی:

۱۔ غلام عباس صاحب کی درخت پر نہ چڑھنے کی ہدایت کی خلاف ورزی کی گئی۔

۲۔ راگ گانے کی پابندی کو توڑا۔

۳۔ اور سب سے بڑا اور گھناؤنا یہ جرم کیا کہ خیال گائیکی میں تان اور مُرکیں استعمال کیں۔

آخری عمر میں فیاض خان اپنے گھرانے کے دوسرے بچوں کو موسیقی کی تعلیم دیا کرتے تھے، کیوں کہ خود اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ استاد غلام عباس خان کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ بچوں کو آغاز میں دھرپد ہی سکھاتے تھے۔ خیال گائیکی سے وہ اُس وقت تک بچوں کو دور رکھتے تھے جب تک کہ اُن کی آواز میں ٹھہراؤ نہ آجائے۔ پھر تانیں تو اُن کے لیے شجرِ ممنوعہ تھیں۔ البتہ شاید انھوں نے شرافت حسین کے ساتھ کچھ رعایت کی تھی، کیوں کہ چھوٹی عمر سے ہی اُن کی تانوں میں بلا کی روانی تھی۔

راقم (پرساد مکھرجی) نے فیاض خان صاحب کو پہلی بار کلکتے کی ایک نجی محفل میں سنا تھا۔ اس وقت میری عمر محض آٹھ سال کی تھی۔ فیاض خان صاحب سے پہلے استاد حفیظ علی خان نے سرود پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ میری یادداشت میں جو زیادہ بات باقی رہ گئی ہے، وہ بھشما دیو چٹرجی کی طبلے پر سنگت تھی۔ یہ بنگال کے مشہور خیال گائیک تھے، لیکن ہمارا اُن دنوں اس بات سے کیا واسطہ؟ ہم بچوں کو جس بات پر ہنسی آرہی تھی، وہ سرود پر حفیظ علی خان کے ''جھالا'' میں ان طبلہ نواز صاحب کی قابلِ رحم حالت تھی، کیوں کہ استاد کی جیٹ اسپیڈ کا ساتھ دینے کے لیے اُن کی بائیں ہاتھ کی انگلیاں تو طبلے پر موجود ہوتی تھیں، لیکن بار بار اُن کو اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کو مساج کرنا پڑ رہا تھا۔ آخر میں فیاض خان نے جونپوری میں بندش ''پھلنوا کی گیندوا'' شروع کی، جو تین گھنٹے تک جاری رہی۔ راقم کا اس چھوٹی عمر میں ظاہر ہے کہ

ٹھیٹھ کلاسیکل موسیقی کی اس ”ثقیل خوراک“ کو پورے طور پر ہضم کرنا مشکل تھا، لیکن اتنا یاد ہے کہ میں تین گھنٹے بور بھی نہیں ہوا تھا بلکہ یوں کہوں گا کہ اُن کے تار سپتک گندھار کا دل سوز نشتر میرے دل و دماغ میں ابھی تک بسا ہوا ہے۔

کئی سال پہلے کیرانہ گھرانے کے مشہور سنگر فیروز دستور نے مجھے بتایا تھا کہ استاد فیاض خان نے ایک بار راگ بہاگ میں الاپ شروع کیا تو اُن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ خود مجھے پچاس سال پہلے فیاض خان صاحب کا راگ میگھ ملہار یاد ہے، جو انھوں نے نیپال کے رانا کی اعزازی تقریب میں گایا تھا اور اس حوالے سے اب تک میرے تن بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کی آواز مندر سپتک میں جیسے جیسے اترتی جاتی تو احساس ہوتا کہ خان صاحب ہمیں بھی وسیع سمندر کی عمیق ترین گہرائیوں میں لے جا رہے ہیں۔ پھر مدھ سپتک میں اُن کی بتدریج بڑھت، کا جادوئی سماں بھی میرے دل پر نقش ہے، جب مینڈ کے ذریعے وہ دوبارہ واپس آئے تھے اور اپنے تانپورہ بردار شاگردوں کو ”رے نی سارے“ سُروں کا کورس ادا کرنے تک رُک جاتے تھے۔ کچھ دیر بعد اُن کے دھرپد الاپ کا دُرت جوڑ انگ شروع ہوا، جس میں ردھم کے سیکڑوں خوب صورت patterns ہر طرف بکھرے نظر آتے تھے۔ اُن کی گمک تانوں میں سمندر کے دھاڑنے کی آواز تھی۔ مجھے حقیقت میں احساس ہو رہا تھا کہ میں کسی بڑے سمندری طوفان میں گھر گیا ہوں۔ بہرحال جب خان صاحب نے میگھ ملہار کو آہستہ آہستہ سمیٹا تو میرا خیال درست نکلا کہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ اینٹی کلائمکس ہوگا، کیوں کہ باہر بارش کے آثار موجود تھے۔ قیصر باغ بارہ دری کے عین اوپر بادلوں سے آدھا چاند کبھی کبھی جھانکتا، پھر چھپ جاتا تھا۔ پوری فضا بھیگنے کی امید میں چٹخارے دار بن گئی تھی۔

کئی دوسروں کی طرح فطرت اور آرٹ کے دل کش ترین مظاہر سے میں بھی قلبی اور روحانی سکون حاصل کرنے کے علاوہ زندگی میں تازگی کی ایک نئی لہر بھی محسوس کرتا ہوں۔ میں نے یہ کیفیت دوستوئیفسکی کے ناول ”برادرز کراموزوف“ اور ٹولسٹوئے کے ناول ”وار اینڈ پیس“ پڑھ کر محسوس کی۔ یہی کیفیت مجھ میں ہمالیہ کے پنڈاری گلیشیر پر ٹریکنگ کے دوران پیدا ہوئی۔ پھر برما کے بارڈر کے نزدیک Tipong نامی گھاٹی میں شام کے دھندلکوں میں ہاتھیوں کے نہانے کا منظر، کانہا کے جنگلات میں ایک سرد چاندنی رات میں قد آور درختوں کے سایے، جزیرہ بالی میں ایک ناریل کے جھنڈ سے آتش فشاں پہاڑ سے لاوا پھوٹنے یا ویلی بیچ پر غروب آفتاب کا نظارا، کچھ ایسی یادداشتیں ہیں، جنھوں نے مجھے جسمانی راحت و تحیر ہی نہیں دیا، میرے احساس کو

ایک نئے تخلیقی راستے پر بھی گامزن کیا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے میرے والد کے نام ایک خط میں کیا پیاری بات لکھی تھی، ''عظیم فن صرف حیرت اور تحسین کی طرف ہی ہمیں نہیں ڈالتا ہے۔ نہ ہی یہ صرف آنکھوں میں آنسو لانے اور کسی کو شدتِ جذبات سے مغلوب کرنے کا نام ہے۔ عظیم فن کا اصلی مقصد یہ ہے کہ کسی کو تخیل اور تخلیق کی بلند ترین چوٹی تک پہنچا دے، جہاں صرف حسن کی حکمرانی ہو۔ تخلیقی عمل دراصل فطرت کی تخلیق کا ہی دوسرا نام ہے، کیوں کہ اس عمل میں سچائی کی عظیم قوت بھی شامل ہوتی ہے۔''

اس روز استاد فیاض خان سے راگ میگھ ملھار سن کر میرے اپنے ذاتی تجربات اور ٹیگور کے یہ سنہری الفاظ میرے دل و دماغ میں گونج رہے تھے، اور میرا پورا وجود اپنے کو دیوتاؤں کے قریب محسوس کر رہا تھا۔

ڈی پی دھر، جو میرے والد تھے، وہ ہندوستان میں سوشیالوجی کے علم کے بانیوں میں سے تھے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی میں معاشیات پڑھانے کے علاوہ بنگالی زبان کے نام ور ناول نگار بھی تھے۔ موسیقی پر انھوں نے لاتعداد مضامین بھی لکھے ہیں۔ انھی پیار سے پکارے جانے والے ڈی پی صاحب نے ایک جگہ لکھا کہ فیاض خان کا ماحول بنانے میں کوئی ثانی نہ تھا۔ تقریباً یہی بات طبلے نوازی کے جادوگر احمد جان تھرکوا نے بھی کہی ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ماضی میں بہت بڑے بڑے موسیقار گزرے، لیکن سننے والوں پر فیاض خان جیسا کسی کا بھی طلسماتی اثر نہیں تھا۔ اُن کا کمال تھا کہ کبھی سب کو رُلا دیتے اور کبھی اُن کے چہروں پر مسکراہٹ لے آتے۔ اُن کی محفلوں میں یہ عجیب و غریب منظر نظر آتا کہ عالمِ سرخوشی میں، دو ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی آدمی بھی ایک دوسرے سے گلے ملنے لگتے۔

موسیقی کا آگرہ گھرانا اب تیزی سے ہنرمندوں اور صلاحیت رکھنے والوں سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے بچے کھچے استادوں میں سے ایک عقیل احمد خان نے سندر بائی ہال بمبئی کی فیاض خان کی ایک ایسی محفل کا ذکر کیا ہے، جس میں استاد اللہ دیا خان بھی موجود تھے۔ عقیل احمد خان ان دنوں مشکل سے بچپن کی حدود سے نکلنے کی عمر میں تھے۔ اُن کو کچھ یاد نہیں، سوائے فیاض خان کے للت راگ میں بول بناؤ کی فسوں کاری کے۔ درجنوں بار جب بھی وہ ''بالما موسو رہو نہ جائے'' بولوں پر آئے، ایک بالکل ہی نئے انداز سے۔ جیسے ہی وہ تار کے شرج سے مدھم پر خراماں خراماں آتے، سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ جب فیاض خان نے اپنا گانا ختم کیا تو خود استاد اللہ دیا خان اپنے آنسو پونچھ کر فیاض خان صاحب سے لپٹ گئے اور کہنے لگے،

''واقعی تو فیاض ہے۔ کیا گانا گایا تو نے آج۔''

مجھے بعض وقت سوچنا پڑتا ہے کہ استاد فیاض خان کو اس مقناطیسی ماحول پیدا کرنے میں کون سی چیز مدد کرتی ہے؟ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ عبدالکریم خان اور فیاض خان جیسے عظیم موسیقاروں کے پاس کوئی ایسی غیر معمولی خصوصیت تھی، کوئی کرشماتی قوت تھی، جس کی لفظوں کے ذریعے تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔ موسیقاروں اور خاص کر میراثیوں کو کچھ نہیں سمجھ میں آتا ہے تو بڑی سہل اندازی سے کام لیتے ہوئے، وہ بس یہی کہہ کر بات کو ٹرخا دیتے ہیں، ''جی خدا کی دین تھی ان کو۔'' لیکن گہرائی میں جاکر غور کریں تو ہم فیاض خان کے حوالے سے اُن کی فنی کرشمہ سازی کی بنیادی خصوصیت کا جائزہ لے سکتے ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ آواز کی خصوصیت: فیاض خان کی خوب صورت آواز اور اُس کی تاثیر کا صحیح اندازہ پرانی، غیر معیاری ریکارڈنگ سے ہونا مشکل ہے۔ آواز کی بلندی یا گہرائی سے الگ ایک انفرادی خصوصیت یعنی Timbre، سطح (Pitch)، حجم (Volume) اور لہجے کا شوخ رنگ، ان چیزوں کے حوالے سے فیاض خان تمام گزرے ہوئے اور آج کے دور کے گائیکوں سے بالکل ہی مختلف اور حاوی نظر آتے ہیں۔ اُن کی آواز میں استاد عبدالکریم خان، امیر خان اور بڑے غلام علی خان کی سی ربر جیسی لچک نہیں تھی بلکہ فیاض خان کی آواز کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ''میجسٹک'' ہوگا۔ یہ اُن کی شاہانہ شخصیت کے عین مطابق تھی۔ شخصیت، جس نے بڑودہ کے مہاراجا سرسایا جی راؤ کے دربار کے تمام گویوں کوئی دہائیوں تک بونا ثابت کر کے رکھ دیا تھا۔

۲۔ راگ داری کا ہنر: استاد فیاض خان جیسے قبیل کے گائیک پنڈت شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پھر خان صاحب کا کمال یہ تھا کہ اُن میں گائیکی میں فن کاری، موسیقی کا علم اور سننے والوں کے مزاج سے واقفیت، پنڈت اور گنیوں سے بھی زیادہ تھی۔ ان کو مشکل ترین اور زیادہ نہ سنے جانے والے راگوں (اچھوپ راگ) پر زبردست عبور تھا۔ لیکن وہ ایسے راگوں کو کبھی بھی محفلوں میں نہیں گاتے تھے، کیوں کہ انھیں سننے والوں کی پسند، ناپسند کا بھی علم تھا۔ اُن کو یہ بھی خیال رہتا تھا کہ اچھوپ (چھپے ہوئے راگ) راگوں کی بہ نسبت بڑے اور آزمائے ہوئے مقبول راگ ہی لوگوں کے دلوں کے تار چھوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے سوُرگ باشی دیپا پرساد گارگ بہادر، راجا مہیش دل کو تنکاشری، رام گوری، کپر گوری، گیاتری، پردیپکی، پنچم وغیرہ جیسے اچھوپ اور کم مانوس راگ سکھائے تھے۔ ایسے راگوں کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ یہ ہاتھی کے دانت ہیں، جو دکھاوے کے لیے ہیں، چبانے کے لیے نہیں۔ ہمارا پیٹ تو بھرتے ہیں، یہی

ایمن، بہاگ، جے جے ونتی اور درباری۔

استاد فیاض خان کی نوجوانی کے زمانے میں پنڈت بھات کھنڈے نے ان کے لیے مہاراجا کشمیر کی جانب سے دعوت نامے کا بندوبست کرایا تھا۔ کشمیر پہنچ کر استاد فیاض خان نے اپنے دس دن کے قیام کے دوران راگ کلیان کی اٹھارہ مختلف قسموں میں گانے کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے آٹھ قسمیں صرف ایمن کلیان میں تھیں، جو انھوں نے انتہائی لطیف انداز میں دھرپد، دھمار اور خیال کی بندشوں کی صورت میں الگ الگ کر کے سنائیں۔ اُن دنوں کی روایت کے مطابق وہ ہر بندش کے ساتھ الاپ چاری بھی بدل دیتے تھے۔

راگ داری کے حوالے سے فیاض خان صاحب کی یہ بھی منفرد خصوصیت تھی کہ کسی راگ کو گاتے وقت اُس کی اپنی شخصیت کے علاوہ اُس سے قریب یا ملتے جلتے راگوں کا بھی، اُس راگ کے بیچ میں تعارف کراتے اور رخصت کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ بروا کے سُروں میں وہ دیسی، کافی اور سندھورا کا رنگ دکھا کر واپس اصلی بروا کی طرف آجاتے تھے۔ اسی طرح جھنجھوٹی میں وہ تلک کامود کی صرف معمولی جھلک دکھاتے، پھر جھنجھوٹی کی طرف لوٹ جاتے۔ پنڈت شری کرشنا رتن جھنکار نے کیا خوب کہا تھا: ''ہم تو راگ کے غلام ہیں، خان صاحب جب گاتے تھے تو راگ اُن کے غلام بن جاتے تھے۔'' اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب خان صاحب کشمیر سے واپس آئے تو پنڈت بھات کھنڈے نے انھی رتن جھنکار (بابوراؤ) کو جو اُن کے چہیتے شاگرد تھے، خان صاحب کی شاگردی میں دے دیا۔

۳۔ شروتی کی صحیح پہچان اور استعمال: استاد فیاض خان کا شروتیوں کے علم اور اُن کے استعمال کا جواب نہیں تھا۔ کومل گندھار ایک سُر ہے۔ لیکن یہ ٹوڑی، نائک کا نہڑا، درباری اور میاں کی ملہار میں مختلف صورتوں میں لگتا ہے۔ یہ بات ماضی کے استادوں کے لیے کوئی نئی نہیں تھی۔ چنانچہ اگر فیاض خان اپنی دھرپد کی روایت کی وجہ سے شروتیوں کو اچھی طرح سمجھنے اور استعمال کرنے میں مشاق تھے، تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ اس اسٹیج سے گزر کر درباری کے روایتی جھلمل کرتے گندھار کو ساکت کر دیتے تھے۔ اسی طرح وہ باگیشری میں بھی فن کارانہ آزادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندولت (کانپتا ہوا) نکھاد اور گندھار استعمال کر دیتے تھے، یہ بتاتے ہوئے کہ یہ راگ کی تکمیل کے لیے اضافی سُر ہیں۔ یہ استاد فیاض خان صاحب کی ایسی جرأت آمیز روایت شکنی ہے کہ جس سے بڑے سے بڑے استاد دنگ رہ جاتے تھے۔

فیاض خان صاحب کا ایک للت راگ میں الاپ اور خیال ابتدائی 78 RPM ریکارڈ

کی صورت میں ملتا ہے (جو یقیناً سی ڈیز پر بھی منتقل کیا گیا ہوگا)، پانچ منٹ کی مدت میں خان صاحب نے للت کا پورا نقشہ ہی نہیں کھینچا بلکہ اُس کے ہر نقش کو واضح طور پر فن کارانہ انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ ریکارڈ میں خان صاحب کی آواز کی اصلی کوالٹی تو نہیں آئی، لیکن لائیو کنسرٹ کا ضرور مزہ آتا ہے۔ خیال گانے والے عام طور پر للت میں کومل دھا لگاتے ہیں، جو بہت مشکل بھی ہے، کیوں کہ درمیان سے اوپر سُروں کو جاتے ہوئے راگ للت کے ٹوڑی میں بدل جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اسی لیے دھرپد گانے والے اس میں ساہکاری دھیوت لگاتے ہیں، جو شدھ اور کومل دھیوتوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔ الاپ میں یہ شروتی مینڈ کی شکل میں اوپر جاتی ہے اور نیچے اترتے وقت تھوڑی سی اپنی پوزیشن بدلتی ہے۔ فیاض خان اپنے الاپ میں یہ کھیل حیران کن انداز میں دُہراتے تھے۔ لیکن یہ حیرانی استادوں کی سانسیں تک روکنے تک پہنچ جاتی ہے، جب فیاض خان درت جوڑ اور تانوں میں بھی اس کو فن کارانہ انداز میں اس طرح دُہراتے ہیں کہ یہ اُن کے لیے بچوں کا کھیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استادوں کی نظر میں یہ کسی انسان کا کارنامہ نہیں لگتا ہے۔

دیسی ٹوڑی کے ذکر سے ایک واقعہ استاد فیاض خان سے منسوب ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب وہ اندور دربار میں ایک بار یہ راگ گا رہے تھے تو مہاراجا آنکھیں بند کیے ڈیڑھ گھنٹے تک سنتے رہے۔ راگ کے خاتمے پر وہ اُٹھے اور اعلان کروایا کہ دوسری صبح بھی فیاض خان گائیں گے۔ دوسری صبح ر. . ب علی خان نے ٹوڑی راگ سے آغاز کیا۔ اُن کی راگ داری کی پورے ہندوستان میں دھوم تھی اور اُس صبح بھی انھوں نے اپنے فن کا زبردست مظاہرہ کیا۔ فیاض خان صاحب، رجب علی خان صاحب سے عمر میں کچھ کم تھے اور قاعدے سے انھیں رجب علی خان سے پہلے گانا تھا، لیکن کیوں کہ وہ اندور دربار میں مہمان گائیک کے طور پر گئے تھے، اس لیے اُن کو بعد میں نمبر دیا گیا۔

خیر، فیاض خان کا جب نمبر آیا تو انھوں نے مہاراجا کی طرف دیکھا کہ وہ اپنے پسند کے راگ کا حکم دیں۔ مہاراجا نے ایک بار پھر "دیسی" گانے کا مطالبہ کیا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ فیاض خان صاحب نے پھر "دیسی" میں الاپ، دھرپد، دھمار اور خیال گانے کا مظاہرہ کیا۔ ایک بار پھر مہاراجا اُٹھے اور اعلان کیا کہ تیسرے دن بھی فیاض خان گائیں گے۔

تیسرے دن بھی محفل کا آغاز رجب علی خان سے ہوا۔ اپنی باری پر فیاض خان نے پھر مہاراجا کی طرف فرمائش کے لیے دیکھا۔ مہاراجا کے منہ سے پھر حاکمانہ انداز میں نکلا "دیسی"۔ فیاض خان نے مجبوراً پھر یہ راگ شروع کردیا۔ فیاض خان نے بعد میں اپنے برادر نسبتی

عطا حسین خان کو بتایا کہ زندگی میں انھیں ایسے حیران اور پریشان کُن لمحات سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ان کے ذہن میں اس وقت طرح طرح کے خیالات آرہے تھے کہ تین دن متواتر ایک ہی راگ کی فرمائش سے کیا، اُن کا کوئی امتحان لینا مقصود ہے؟ کیا پاس کی ریاست ریواس کے درباری گویّے رجب علی خان کے آگے ان کو بے عزت کرنا ہے، یا کیا یہ صرف شاہی مراق یا ضد کا ایک انداز ہے؟ بہرحال، اُس وقت تو طوعاً وکرہاً اُن کو دیسی ٹوڑی راگ ہی گانا تھا۔ اب کہ انھوں نے الاپ کو بالکل ہی مختلف انداز میں شروع کیا۔ بندشیں بھی ایسی تھیں جو مہاراجا اور درباریوں نے کبھی نہیں سنی تھیں۔ گانا ختم کرنے کے بعد فیاض خان ہاتھ باندھے کھڑے ہوگئے اور گویا ہوئے، ''سرکار کی اور کوئی مزید فرمائش ہے تو بندہ حاضر ہے۔'' مہاراجا نے اس بار نفی میں اپنا سر ہلایا اور کہا کہ اب کوئی گانا نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی مہاراجا نے اپنے گلے سے بیش قیمت موتیوں کا ہار اتارا اور اُس کو فیاض خان کے حوالے کردیا۔ انھوں نے اس کے علاوہ فیاض خان کے لیے گیارہ ہزار اور رجب علی خان کے لیے ڈھائی ہزار روپے کے انعام کا اعلان بھی کیا، جو ایک لحاظ سے ریواس کی ریاست کے ناتے اندور دربار کے بھی گویّے تھے۔

اُس دور کے خاندانی رئیسوں اور گائیکوں کی طرح رجب علی خان بھی عطروں کی خوشبو کے دیوانے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ریواس جانے کے لیے ایک تانگا کیا اور راستے میں ایک عطر فروش کی دکان پر رُک گئے۔ وہاں جو عطر انھوں نے پسند کیا، اس زمانے کے لحاظ سے بہت مہنگا تھا۔ دکان دار نے اُن کی حیثیت پر شک وشبہے کا اظہار کرتے ہوئے بہرحال اس ننھی منی شیشی کی قیمت ایک سو پچاس روپے بتا دی۔

''اچھا یہ قیمت ہے؟ چلیے بتائیے کہ آپ کی دکان میں اس کی کتنی شیشیاں موجود ہیں؟''

دکان دار نے گنتی کی تو سو شیشیاں نکلیں، جن کی کل قیمت پندرہ سو روپے بنتی تھی۔

''بہت خوب۔ یہ لو اُن کی قیمت۔'' رجب علی نے انعام میں ملی ہوئی رقم میں سے نئے کڑکڑاتے ہوئے نوٹ دکان دار کی طرف بڑھا دیے۔ ابھی وہ بے چارہ ان کی شکل ہی دیکھ رہا تھا کہ استاد جی نے حکم دیا، ''اب یہ تمام شیشیوں کا عطر میرے جوتوں میں خالی کردو!''

رجب علی خان نے اس طرح اندور دربار میں اپنی ہتک کا بدلہ لیا۔ اندور دربار کے اس واقعے نے رجب علی خان کے فیاض خان سے تعلقات مکدر کردیے، جب کہ اس سے پہلے دونوں میں خاصی دوستی تھی۔ اس رنجش کے بعد بھی رجب علی خان ہمیشہ کہا کرتے تھے، ''ہاں ریت کا گانا تو وہی ہے جو فیاض گاتا ہے۔'' عام لوگوں کے لیے اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ صرف

فیاض خان ہی درست، پکی اور روایت ہی جڑی گائیکی کا نمائندہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور واقعہ یہ ہے کہ لطافت خان جو فیاض خان کے دور کے رشتے دار ہونے کے علاوہ اُن کے شاگرد بھی تھے، ۵ر نومبر ۱۹۵۰ء کو ریڈیو پر فیاض خان کی رحلت کی خبر سن کر جب بڑودہ کی ٹرین میں سوار ہوئے تو انھیں اسی ٹرین میں رجب علی خان مل گئے۔ لطافت خان سے لپٹ کر وہ بولے، "ہائے، ہائے— کیا خوب فن کار تھا۔ کیسا موسیقار، کیا گویّا تھا۔ سو سال بعد بھی تم ایسی آواز نہ سن سکو گے۔ بس شراب اُن کو لے گئی۔ ہائے ہمارا تو کتنا بھاری نقصان ہوگیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے رجب علی خان نے دیسی شراب کی ایک بوتل نکالی اور غم غلط کرنے کے لیے اس کو ایک گھنٹے تک منہ سے لگائے رہے۔

دیکھا جائے تو رجب علی خان کے مفروضے میں کوئی وزن نہ تھا، کیوں کہ فیاض خان کا انتقال ذیابیطس اور ٹی بی سے ہوا تھا۔ بڑھاپے میں وہ کبھی کبھار ہی اپنی پسندیدہ اسکاچ کو منہ لگاتے تھے۔

جب فیاض خان بڑودہ دربار میں آئے تو وہ نوجوان تھے اور اُن میں مستقبل کے بڑے گائیک ہونے کے پورے پورے امکانات دیکھے جاسکتے تھے، لیکن اس وقت سپر اسٹار بننے کی منزل سے وہ چند سال دور تھے۔ یہ بھات کھنڈے جی ہی تھے جن کی سفارش پر ٹرانکور سے تعلق رکھنے والی مہارانی بڑودہ نے فیاض خان کو ریاست کے دربار میں ملازمت دی تھی۔ غلام رسول جو اُن کے چہیتے کزن تھے، وہ بھی فیاض خان کے ساتھ بڑودہ پہنچ گئے تھے۔ اُن کے مطابق فیاض خان کو کسی ریاست سے وابستگی کا خیال ہمیشہ سے تھا۔ بڑودہ میں اُن کی پذیرائی اُن کی توقعات سے بڑھ کر تھی۔ یہ بہت بڑی ریاستوں میں سے ایک تھی۔ مہاراجا سر سایاجی راؤ گائیکواڑ خود بھی ایک بہت روشن خیال اور ریاست اور اس کے عوام کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہنے والوں میں سے تھے۔ فنون کے دل دادہ تھے۔ انھوں نے ہی شمالی ہند میں پہلی آرٹ اکیڈمی قائم کی تھی۔ اپنے دور میں بھی مختلف وقتوں میں انھوں نے دو استاد عبدالکریم خان اور فیاض خان رکھے تھے، جو ہندوستانی موسیقی میں لی جنڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کا وظیفہ ۱۵۰ر روپے سے ۲۰۰ر روپے ماہانہ مقرر تھا۔ فیاض خان کو ۱۶ر روپے ماہانہ تانگا الاؤنس بھی ملتا تھا۔ فیاض خان کی تنخواہ بعد میں ۳۰۰ر روپے ماہانہ ہوگئی، جو بیس کی دہائی میں خطیر دولت شمار ہوتی تھی۔

مہاراجا سر سایاجی راؤ ہر قسم کے آرٹ کے سرپرست تھے، لیکن اوائل عمر میں کلاسیکل موسیقی سننے کا شوق یا علم ان میں کم ہی تھا۔ فیاض خان کے لیے یہ معمول مقرر کیا گیا کہ پیر کی شام آئیں اور دربار میں ماربل سے بنی ایک خوب صورت اور نفیس اسکرین کے پیچھے گائیں،

چاہے سننے والا کوئی ہو یا نہ ہو۔ غلام رسول نے ایک بار ذکر کیا کہ یہ عجیب بے ڈھنگا اور بے تکا منظر ہوتا تھا کہ اکثر خان صاحب کے گانے کے دوران طبلے والے اور میرے یعنی ہارمونیم پلیئر کے علاوہ ایک بھی آدمی نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس پہ مزید ستم ظریفی یہ کہ پارٹیوں میں جو گانے کی محفل سجائی جاتی، اُس میں بھی اعزازی مہمانوں میں پولیٹکل ایجنٹ یا انگریز سویلین ہی ہوتے۔ خدا جانتا ہے کہ وہ خان صاحب کی موسیقی کو کس طرح سمجھتے یا برداشت کرتے ہوں گے۔ ایک بار فیاض خان نے تنگ آ کر مہاراجا کو عرض داشت بھیجی جس میں اشارہ کیا گیا کہ فن کاروں کو بھی کبھی سننے والوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے، کیوں کہ ہوا میں گاتے رہنے سے اُن کی تسکین کا سامان نہیں ہوتا ہے۔ اس عرض داشت کے جواب میں فوراً شاہی فرمان جاری کیا گیا کہ درجہ چہارم کے ملازموں کے لیے ضروری ہے کہ دوپہر تک اپنے فرائض پورے کرنے کے بعد ہر پیر کی شام وہ فیاض خان صاحب کا گانا سننے کے لیے جمع ہوں۔

بعد میں مہاراجا سر سایاجی راؤ کو موسیقی سے کچھ رغبت پیدا ہوئی اور انھوں نے ہفتے میں کئی بار فیاض خان صاحب کو سننا شروع کر دیا۔ بڑودہ ریڈیو اسٹیشن جب قائم ہوا تو خان صاحب کے گانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ اکثر اسٹیشن ڈائریکٹر کو ہدایت ملتی کہ مہاراجا اور اُن کے فیملی کے افراد ابھی خان صاحب کو سن رہے ہیں، لہٰذا پروگرام جاری رکھا جائے۔ اس طرح گانے کے خاتمے کا وقت خان صاحب اور اُن کے سرپرست کی مرضی اور موڈ کے طابع تھا۔

پرنس پرتاپ سنگھ کو موسیقی کی بجائے دوسری ریاستوں کے شہزادوں کی طرح گھوڑوں کی ریس کا جنون تھا یا پھر کرکٹ اور یورپ کی سیر گشت کا۔ مہاراجا سر سایاجی راؤ کے پوتے فتح سنگھ راؤ گائیکواڑ، فیاض خان کے باقاعدہ گنڈا بندھ شاگرد ہوئے۔ راقم (کمار پرساد مکھرجی) اُن کو صرف کرکٹر اور بورڈ آف کنٹرول کے صدر کی حیثیت میں ہی جانتا تھا، لیکن ایک بار دوسروں کے ساتھ مجھے بھی ''جشن آفتاب موسیقی'' کے موقع پر بڑودہ آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ وہیں فتح سنگھ صاحب نے اپنی تقریب میں فیاض خان سے اپنے شاگرد بندھن رشتے کی اطلاع جشن کے شرکا کو دی۔ ساتھ ہی انھوں نے بتایا کہ فیاض خان کی وفات کے بعد انھوں نے اب کسی کو بھی سننا قطعی طور پر بند کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلاسیکل موسیقی سے اُن کی عدم دل چسپی کا بھی ایک حسین اور ڈپلومیٹک جواز تھا۔ بہر حال اس جشن میں غلام رسول اور آگرہ گھرانے کے دو دوسرے فن کاروں یعنی لطافت اور شرافت حسین کی شرکت سب کے لیے حوصلہ افزا بات تھی۔ ہارمونیم نواز غلام رسول نے ہم لوگوں کو وہ ماربل اسکرین بھی دکھایا، جس کے پیچھے بیٹھ کر فیاض خان صفر عدد یا

گنتی کے چند لوگوں کے سامنے اپنے عظیم فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ابتدا میں فیاض خان کو کلاسیکی روایات کے خمیر میں ہی گوندھا گیا تھا۔ اس لیے اُن کی شروع کی گائیکی میں کڑے کلاسیکی قوانین کی پابندی نظر آتی ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف اُن کے خیال کی ہیئت بدل گئی بلکہ اس کے ساتھ ہی ٹھمری کا انداز بھی مختلف ہو گیا۔ میں موسیقی میں اُن کے لیے رومان پسند کی اصطلاح نہیں استعمال کروں گا کیوں کہ رومانیت ادب، پینٹنگز اور مجسمہ سازی وغیرہ میں کلاسیکیت سے مکمل طور پر بغاوت کا نام ہے۔ فیاض خان نے موسیقی میں کلاسیکیت سے مکمل طور پر بغاوت نہیں کی، البتہ اس میں نمایاں اضافہ کیا اور نئے خوب صورت رنگ بھرے۔ اس لیے وہ romantist سے زیادہ neo-classist کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ کلاسیکیت کے دائرے میں رہتے ہوئے انھوں نے اُس میں کیا تبدیلیاں کیں اور کیا گل بوٹے تخلیق کیے، اس کی پہلی مثال تو یہ ہے کہ گوالیار گھرانے میں انھوں نے راگ کو ٹھہراؤ اور دھیمی لے میں گائے جانے کا فقدان دیکھا۔ اس لیے فیاض خان نے پہلے دھرپد الاپ چاری کا چلن اختیار کیا۔ اس کے بعد وہ دھمار پر آتے، پھر دُرت خیال پر۔ بعد میں وہ دھمار کو ترک کرنے لگے اور گوالیار طرز میں درمیانی ولمپت لے میں خیال گانے لگے۔ لیکن اس میں وستار کی بجائے بہلاوا، بول بانٹ، بول تان اور گمبھیر گرزدار تان کا زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ آخر میں پھر وہی دُرت خیال کا نمبر آتا تھا۔

پہلے الاپ چاری کا ذکر ہو جائے۔ یہ کلیتاً دھرپد الاپ ہوتا تھا اور اس میں تمام آلنکار بھی وہ ہوتے تھے جو اس الاپ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں خیال کی مُرکیوں اور کھٹکوں سے مکمل پرہیز کیا جاتا تھا۔ البتہ آگے چل کر انھوں نے اس میں کچھ ''گلے کا کام'' دکھانا شروع کر دیا، وہ بھی جب انھیں الاپ کے بعد خیال گانا ہوتا تھا۔ فیاض خان اپنے الاپ میں دھرپد کے انداز میں رفتہ رفتہ آگے بڑھتے تھے، لیکن وہ اس پیش رفت میں میکانکی یا حسابی انداز کی سُروں کی ترتیب (جن کو موسیقی کی زبان میں میر کھنڈ یا کھنڈا میرو کہا جاتا ہے) کے استعمال کی بجائے الاپ کو راگ کے بنیادی بولوں پر زور دیتے ہوئے چلتے تھے اور اس طرح راگ کے مزاج یا کردار یا ''راگ بھاؤ'' کی روح و بدن کو اُجاگر کرتے تھے۔ فیاض خان کی یہ منفرد خصوصیت تھی۔

پنڈت روی شنکر کا کہنا ہے کہ فیاض خان کے ہاتھوں میں پہنچ کر کوئی بھی راگ زندگی پا جاتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر دھرپدیا ہونے کے باوجود فیاض خان نے پورے دھرپد کی بجائے دھرپد الاپ کو جگمگایا تھا۔ خاص کر جوڑ انگ یا تیز رفتار حصے میں۔ بعینہٖ یہی کام پنڈت

روی شنکر، استاد علی اکبر خان اور استاد ولایت حسین نے بھی بعد میں کیا کہ بین الاپ کو سجایا اور اس کو بلند سطح تک پہنچا دیا۔ پنڈت روی شنکر نے اپنی بنگالی کتاب ''انوراگ'' میں فیاض خان کو یاد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اُن کا نوم توم الاپ اور جوڑ انگ نہ تو بین انگ میں تھا اور نہ رباب انگ میں، بلکہ یہ جو کچھ تھا، خود اُن کے انگ میں تھا۔ پنڈت روی شنکر کا مزید کہنا ہے کہ انھوں نے فیاض خان جیسا الاپ اور جوڑ انگ زندگی میں کسی سے بھی نہیں سنا۔ پنڈت روی شنکر کے دعوے کے ثبوت میں ہر کوئی تلاش کے بعد فیاض خان کی آواز کو ریکارڈز، کیسٹوں اور سی ڈیز میں سن سکتا ہے۔ اُن کے گائے ہوئے راگ للت، رام کلی اور درباری اس کے گواہ ہیں۔ ناقص ریکارڈنگ کے باوجود فیاض خان کے ہاں سُروں کی آب داری، چمک اور اُن کا نپا تلا وزن ہر کوئی محسوس کرسکتا ہے۔ البتہ ریکارڈ پر یہ بھی ہے کہ فیاض خان کا گانا سن کر راج ماتا نامی ایک خاتون (جو بعد کے بڑے گائیک سوُرگ باشی دینا پرساد گارگ کی والدہ تھیں) نے استاد کے منہ پر کہہ دیا تھا کہ خان صاحب آپ کی گمک تانی آپ کے نانا غلام عباس خان کے مقابلے میں چونی بھر بھی نہیں۔ یقیناً فیاض خان نے اس سفاکانہ تنقید کا برانہیں مانا ہوگا، بلکہ اپنے نانا اور گرو کی عظمت کو فخر سے تسلیم کرلیا ہوگا۔

جب فیاض خان دھمار کو چھوڑ دیتے تھے اور الاپ کے بعد خیال کی طرف آتے تھے تو خیال کے ولمپت حصے میں الاپ کی ذرا سی بھی تکرار کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ سب کی توجہ فوری طور پر اس طرف ہوتی تھی کہ خان صاحب کس طرح بندش بھر رہے ہیں۔ پہلے اُن کی بندش میں نائیکی انگ آتا تھا، صدیوں کا ایسا انگ جو اُن کے گرو کے توسط سے اُن تک پہنچا تھا۔ پھر گائیکی انگ یا ایسا انگ آتا تھا جو انھوں نے خود اختیار کر رکھا تھا۔ یہاں اُن کے بولوں کا انداز کچھ ٹھمری جیسا ہو جاتا تھا اور اُن کے اظہار میں کھلی آزادی آجاتی تھی۔ اس قسم کی تکنیک وہ دُرت خیال کے بول بنانے کے عمل میں بھی لاتے تھے۔ اس عمل سے صاف لگتا ہے کہ انھوں نے یہ طریقہ قوالی سے لیا ہے۔ اس عمل کے بعد مختصر بول تانوں اور بغیر بولوں کی تانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر اُن کے ہاں ''سَم'' پر پہنچنا ایک معمول کا عمل نہیں رہتا ہے، بلکہ ایک اہم اور انوکھا واقعہ بن جاتا ہے۔

آج کل تہائی لگانے کا عمل گانے میں تو کم ہوگیا ہے، البتہ سازوں میں باقی ہے۔ فیاض خان اس میں بھی ماہر تھے، اور اس سے بھی سننے والوں کو چونکا رکھتے تھے۔ کلائمکس البتہ اُن کے ہاں اسی وقت پیدا ہوتی تھی جب وہ ''برابر لے'' میں آتے تھے لیکن کمپوزیشن کی رفتار سے

دوگنا۔ ایسا کرنے میں انھیں حلق تان اور گمک تان استعمال کرنی پڑتی تھی۔ لیکن کیا مجال کہ محض رفتار کی خاطر ان تانوں کی فطری ساخت کو قربان کر دیں، جس طرح کہ آج کے اکثر کلاسیکل سنگر کرتے ہیں۔ خان صاحب اپنی خیال گائیکی میں بہت تیز رفتار ٹپا تان استعمال کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ گائیکی کا یہ انداز انھوں نے دہلی کے استاد تان رس خان سے لیا تھا، لیکن اب یہ اُن کا ہو کر رہ گیا تھا۔

گوالیار کی گائیکی میں جو بول بانٹ اور لے کاری کا انداز ہے، وہی آگرہ گھرانے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ وصف خاص طور پر یہاں کی بول تانوں میں نظر آتا ہے، جس کی بنیاد دھمار گانے کی اُن کی اپنی روایات ہیں، جس میں پورے ہندوستان میں منادی کے باوجود وہ اس میں تانی استعمال کرتے تھے۔ ہر گائیک میں ردھم کا کم یا زیادہ شعور ہوتا ہے۔ خان صاحب کے ہاں یہ شعور غضب کا تھا، اس لیے وہ اسے ایک بھرپور اور موٴثر ہتھیار کے طور پر اپنے دھرپد، دھمار اور خیال میں استعمال کرتے تھے۔ کہاوت ہے کہ نرتیا، ودیا اور گیت، یہ تین ملے تو سنگیت۔ چنانچہ یہ رقص، ساز اور گانے کا حسین امتزاج فیاض خان کی گائیکی میں ہمیں ملتا ہے۔

وامن راؤ دیش پانڈے نے اپنی کتاب Indian Musical Traditions میں لکھا ہے کہ آگرہ گھرانے کا سارا زور تالوں پر ہوتا ہے اور اُن کے ہاں موسیقیت کی کمی ہے۔ البتہ انھوں نے اتنی رعایت دی ہے کہ فیاض خان کے سُر کی طاقت اور اُس کی تاثیر کو مانا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ فیاض خان صاحب اصل میں آگرہ گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ اُن کا سلسلہ رنگیلا گھرانے سے تھا، جس کے بانی رمضان خان رنگیلا تھے، جو کہ باپ کی طرف سے فیاض خان کے آبا و اجداد میں سے تھے۔ لیکن دیش پانڈے صاحب یہ بات بھول گئے کہ آگرہ گھرانا فیاض خان کے بغیر ایسا ہی ہے، جیسا کہ شیکسپیئر کا ڈراما 'پرنس' ہیملٹ کے بغیر۔ یہ تو ہر ایک کو علم ہے کہ فیاض خان کی ساری موسیقی کی تعلیم اُن کے نانا غلام حسین کی ہی مرہونِ منت ہے، جن کے سُریلے پن کی چپے چپے میں دھوم تھی۔ نہ صرف اُن کی بلکہ ان کے باپ کھگھے خدا بخش کی بھی خوب صورت آواز کا پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے۔

جہاں تک آواز کا تعلق ہے تو تھمن خان کی آواز کی تعریف اللہ دیا خان بھی کرتے تھے۔ عبداللہ خان کی آواز سے بھی فیاض خان متاثر ہوئے تھے۔ فیاض خان کے بعد کے دور میں شرافت حسین کی سنہری آواز کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا۔ انھوں نے اپنے چچا عطا حسین خان اور سُر ولایت حسین خان سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اُن میں خامی یہ تھی کہ وستار یا سُروں کے پھیلاؤ

اور تکرار میں کچھ زیادہ ہی وقت لے لیتے تھے، لیکن ان میں بھی یہ خوبی تھی کہ وہ سُر کو تال پر قربان نہیں کرتے تھے۔ اُن کی شہرت اپنے وقت میں اتنی تھی کہ کوئی بھی میوزک کانفرنس اُن کے بغیر منعقد ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ افسوس کہ وقت سے پہلے اُن کی رحلت نے اُن کے گھرانے کو ایک اَن مول ہیرے سے محروم کردیا۔

یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ آگرہ گھرانے کے اکثر گائیکوں نے استاد فیاض خان کی آواز کی نقل میں خود اپنی آواز خراب کرلی، لیکن پھر بھی اس گھرانے سے پنڈت رتن جھنکار اور اُن کے شاگردوں سمیت کئی دوسرے اچھے گائیک نکلے۔ اسی طرح ولایت حسین اور خادم حسین خان کے کئی شاگرد پیدا ہوئے، جنھوں نے آگرہ گھرانے کا نام روشن کیا۔ جبن راؤ ہلڈال کر، جنھوں نے اس گھرانے پر ایک اچھی کتاب لکھی ہے، خود بھی اس گھرانے کی گائیکی کی روح کو اچھی طرح سمجھنے والے مشکل پسند گلوکار تھے، اُن کا بہلاوا (درمیانی آہستہ لے میں سُروں کا برتاؤ) اتراؤلی کے بچن خان کی یاد دلاتا تھا، جو کہ مشتاق حسین خان کے چچا اور گرو تھے۔ عقیل احمد کے مطابق وہ پندرہ منٹ تک یہ بہلاوا استعمال کرسکتے تھے۔ اس میں وہ صرف چار یا پانچ سُروں کا استعمال کرتے اور مجال ہے کہ کہیں تکرار ہوجائے۔ کسی بڑے راگ یعنی ٹوڑی یا ایمن میں تو یہ مدت پندرہ منٹ کی بجائے آدھے گھنٹے ہوجاتی۔

آگرہ گھرانے کی گائیکی کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ نسوانی آوازوں کے لیے موزوں نہیں، لیکن اسی گھرانے کی زہرہ بائی آگرہ والی تھیں، جنھوں نے بیس ویں صدی کے پہلے پچیس برسوں میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ یہ اپنے زمانے کی سب سے بڑی خاتون گائیک شمار ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ آج للت راؤ اور للیتا اوبھینکر کا نام بھی ہے۔ ان میں سے کئی خاتون گائیکوں نے لے کاری کی خاطر اپنے سُریلے پن کو کبھی قربان نہیں کیا۔ البتہ ولیش پانڈے صاحب کا یہ الزام آگرہ گھرانے کے کئی مرد استادوں پر صادق آتا ہے، جو اپنی کرخت اور بھونڈی آوازوں اور تہذیب سے عاری حرکات وسکنات کے ذریعے طبلہ نوازوں سے جنگ آزمائی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ولیش پانڈے صاحب نے اپنی گائیکی گوالیار گھرانے سے شروع کی تھی۔ پھر وہ کیرانہ گھرانے کے استاد عبدالکریم خان کے فرزند سریش بابو مانے کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد وہ جے پور گھرانے کے ہوگئے۔ اسی طرح مگھو بائی کُردیکر نے اپنے ابتدائی گرو اللہ دیا خان صاحب کے علاوہ آگرہ گھرانے کے ولایت حسین خان سے بھی تعلیم پائی۔ خود اُن کی شہرت یافتہ بیٹی کشوری امونکر، انور حسین کی گنڈا بندھ شاگرد ہوئیں، جو خادم حسین کے بھائی تھے۔ اس طرح جے پور گھرانے کا

تعلق بہرحال کسی نہ کسی طرح آگرہ گھرانے سے ملتا ہے اور اس لیے دیش پانڈے صاحب کا اس سے للّھی بیر سمجھ میں نہیں آتا۔

آگرہ گھرانے سے اب ہم واپس فیاض خان صاحب کی طرف آتے ہیں۔ مشہور موسیقی داں اور بمبئی یونی ورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر اشوک رانا دے کا خیال ہے کہ فیاض خان کے دور میں جب مائیکروفون نہیں ہوتا تھا، اس وقت ان کا ''C'' یا ''B شارپ'' جیسے نیچے سُروں سے گانا کوئی آسان نہیں تھا، لیکن یہ اُن کے پورے منہ اور کھلے سینے کی گائیکی کا انداز تھا، جو اُن کی آواز (جس میں بھرپور پھیلاؤ اور حجم پایا جاتا تھا) کو اس وقت بھی ہال کی سب سے پچھلی نشستوں پر بیٹھے لوگوں تک پہنچاتا تھا، جب کہ وہ اپنی اس آواز کو توڑتے تھے، یا باریک سے باریک تانوں سے الجھتے تھے۔ انھوں نے حقیقت میں اُن دنوں کے اسٹیج کے مشہور اداکاروں کے انداز میں اپنی آواز کی تربیت کی تھی۔ خان صاحب کی ٹھمری اور اُس کی ڈرامائی آلنکار اور پکار (جس سے اکثر سننے والوں کے آنسو چھلک پڑتے تھے) میں اس کو خاص طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر ہماری کلاسیکی موسیقی کو نیا شاستر کی ایک شاخ مانا جائے تو اس میں ڈرامے کا عنصر ملنا چاہیے نہ کہ میلو ڈرامے کا، جس کو پنڈت اوم کار ناتھ ٹھاکر، کمار گندھندرو اور کچھ عرصے سے پنڈت یسراج کے ہاں دیکھا جا رہا ہے۔ خان صاحب کی موسیقی میں ڈرامے کا عنصر اُن کے تانپورہ بردار شاگردوں کی ہم آہنگ آواز سے اور زیادہ نمایاں ہوجاتا تھا۔ خان صاحب کی گائیکی کے سیکڑوں انگ تھے اور نہ صرف انگ تھے، بلکہ وہ اپنے مخصوص انداز میں اُنھیں پیش کرنا بھی جانتے تھے۔ پھر سب سے بڑھ کر وہ سننے والوں کی نبضوں پر پورا پورا کنٹرول رکھنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ ڈاکٹر رانا دے نے صحیح کہا ہے کہ اُن کی زرہ بکتر میں کہیں بھی کوئی ہلکا سا سوراخ بھی نہ تھا۔

۱۹۲۵ء کی گرینڈ میوزک کانفرنس، جو پنڈت بھات کھنڈے نے منعقد کی تھی، اس میں خیال گائیکی پر استاد فیاض خان کو سب سے بڑا انعام یعنی گولڈ میڈل ملا۔ دھرپد میں پہلا انعام استاد ذاکر الدین خان اور اللہ بندے خان لے گئے، جب کہ دوسرا انعام اللہ بندے کے بیٹے نصیرالدین خان کے حصے میں آیا۔ ٹھمری پر کوئی انعام مقرر نہیں تھا، کیوں کہ کانفرنس میں شریک نام ور گویوں مشتاق حسین خان، چندن چوبے اور بڑے غلام علی خان کے والد علی بخش خان ٹھمری نہیں گاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیاض خان سے پہلے آگرہ گھرانے کا کوئی فرد ٹھمری، دادرا اور غزل گانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، کیوں کہ یہ چیزیں طوائفوں کی گائیکی سے منسلک تھیں۔

پانڈیچری کے شہرت یافتہ موسیقار دلیپ کمار رائے نے سادھو بننے سے پہلے پورا

ہندوستان گھوم کر اپنا خاصا وقت اور پیسا استادوں اور طوائفوں کو سننے میں صرف کیا۔ انھوں نے اپنی بنگالی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ دھرپد گائیکوں کی شیطان کی آنت کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والی الاپ چاریوں اور گمکوں سے اور مشتاق حسین خان کی حد سے گزری ہوئی تان کاریوں سے بہت مایوس ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ملتانی میں فیاض خان کے خیال سے بھی اُن کو مزہ نہیں آیا تھا، لیکن اُنھوں نے جیسے ہی ٹھمری شروع کی تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ دلیپ کمار رائے کے مطابق فیاض خان نے انھیں پہلی بار یہ بتایا کہ اصلی اور سچی موسیقی کیا ہوتی ہے اور کھوٹی کون سی۔ لکھنؤ کے فیسٹیول میں صرف دو ہی سنگروں نے مجھے متاثر کیا۔ ایک تو خان صاحب تھے، دوسرے چندن چوبے۔ چندن جی کی آواز شاید زیادہ سُریلی تھی، لیکن فیاض خان مکمل سنگر اور مجسم آرٹسٹ کا روپ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اُن کی بھیروی کی ٹھمری میں دھرپد کی گمک، خیال کی بھڑکیلی حلق تانیں، ٹپے کے دندانے دار کاٹ اور دل کو چیرنے والی ٹھمری کی مینڈیں، ان سب کا ایسا حسین امتزاج تھا کہ اُن کا گانا گانا نہیں رہا تھا، بلکہ اُن کی زندگی بھر کا وہ چھلکتا لہو تھا جو اُن کی موسیقی کو سینچ رہا تھا۔ ان سے پہلے گائیکوں میں سے نصیر الدین خان کا الاپ مجھے ایسا لگا تھا کہ شاید یہ میرے دل و دماغ میں زندگی بھر کے لیے منقش رہ جائے گا، لیکن فیاض خان کی ٹھمری نے اُس کے تمام نشانات میری یادداشت سے مٹا دیے۔

جس واقعے کا ذکر دلیپ کمار رائے نے اوپر بیان کیا ہے، اُس کی تفصیل میرے (کمار پرساد مکھرجی) والد ڈی پی مکھرجی (جو دلیپ صاحب کے نوجوانی کے دوستوں میں سے تھے) نے مجھ کو بتائی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ فیاض خان واقعی شام کو ملتانی سے انصاف نہیں کر سکے تھے، کیوں کہ بدقسمتی سے اُن کے ہاتھوں میں گانے سے پہلے شراب کی بوتل کہیں سے آگئی تھی۔ گانا خراب ہونے پر انھوں نے بعد میں کانفرنس کے منتظمین ٹھاکر نواب علی اور بھات کھنڈے جی سے دست بستہ معافی مانگی اور دوسرے دن صبح اُن کا دوبارہ پروگرام رکھنے کی التجا کی۔ اور اس میں سے بھی صرف آدھا گھنٹا مانگا، جو انھیں بڑی مشکل سے ملا۔ ڈی پی صاحب نے بتایا کہ دوسری صبح یہ آدھا گھنٹا دو گھنٹے ہو گیا، کیوں کہ سننے والے جو اکثر اشک بار تھے، خان صاحب کو بھیروی کی ٹھمری ختم کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔ خان صاحب کو اُس دن شرکائے محفل کی طرف سے نو گولڈ میڈل ملے، جس میں راجوں اور مہاراجوں کی کثرت تھی۔ نواب آف چھتاری اپنے ساتھ ناولسٹ ایلڈس ہکسلے کو بھی لائے تھے اور اس نے اس محفل کا ذکر اپنی کتاب Justing Pilate میں بھی کیا ہے۔

فیاض خان اپنے پہلے دن کے سانحے کو تو گول کر گئے۔ اُن کی بجائے انھوں نے اپنے بردار نسبتی عطا حسین سے آہستہ سے کہا کہ سننے والے لگاتار دھرپد، دھمار اور خیال سے تنگ آگئے ہیں، چنانچہ اب میرے خیال میں محفل کو کچھ ہلکا پھلکا گانا دینا چاہیے۔ چناں چہ لکھنؤ کی مناسبت سے انھوں نے ''بابل مورا نیہر چھوٹو جائے'' بولوں والی بھیروی کی ٹھمری کا انتخاب کیا جو کہ اودھ کے آخری حکمران نواب واجد علی شاہ کی تخلیق تھی (فیاض خان کے توسط سے یہ ٹھمری فلم اسٹار نرگس کی ماں جدن بائی تک پہنچی۔ پھر کندن لال سہگل نے اُن سے حاصل کر کے اُس کا جادو جگایا) واجد علی شاہ کا تاج و سلطنت چھین کر انگریزوں نے اُن کو مٹیا برج کلکتے میں قید کر دیا تھا۔ جہاں گانا ہو رہا تھا، وہ بارہ دری انھی کی تھی۔ بوڑھے سامعین میں ایسے بہت سے لوگ تھے، جنھیں ان نواب صاحب کے موسیقی، شاعری کی سرپرستی اور خوب صورت عورتوں پر لطف و کرم کے قصے ازبر تھے۔ پھر فیاض خان کو بھی عادت تھی کہ اپنی ٹھمریوں اور دادروں میں اردو کے شعرا کے اشعار بھی جوڑ دیتے تھے۔ اس موقعے پر انھوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے شعر:

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں☆

کا انتخاب کیا۔ غرض کہ ماحول بھی کچھ ایسا بنا کہ خان صاحب کی ٹھمری سن کر سننے والوں کا صرف سینہ کوٹنا باقی رہ گیا تھا۔ عطا حسین خان پیچھے تانپورہ پکڑے ہوئے تھے، اُن کے آنسو بھی مشکل سے تھم رہے تھے۔ ''بھائی صاحب نے مجھے پلٹ کر اس ارادے سے دیکھا تھا کہ پوچھیں کہ میرا تانپورہ کیوں خاموش ہے۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو کیا کہتے۔'' عطا حسین خان نے مجھ کو بتایا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری، ''ہائے وہ سب کیا دن تھے۔''

ٹھمری گائیکی کے حوالے سے بنارس کے معیز الدین کا نام بھی بہت بڑا ہے۔ جن لوگوں نے اُن کو سنا تھا، وہ قسم کھانے کو تیار تھے کہ معیز الدین کے بعد محفل میں بڑے سے بڑے گائیک کا جمنا مشکل تھا۔ گوالیار کے عظیم استاد حدّو خان کے نامی گرامی صاحب زادے رحمت خان نے جب اُن کا گانا سنا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیے اور یہاں تک ہوا کہ گانا چھوڑنے کا ارادہ کر بیٹھے تھے۔ یاد رہے کہ یہ وہی رحمت خان ہیں جن کی نقل عبدالکریم خان صاحب کرتے تھے اور بھاسکر بُوا جیسا فن کار بھی اُن کی تانوں کی مشق کرتا تھا۔ فیاض خان صاحب کا بھی کہنا تھا کہ معیز الدین سے پہلے آگرہ گھرانے کے کسی بھی شخص نے ٹھمری، دادرا یا غزل گانے کی ہمت نہیں

☆ (بحوالہ پروفیسر سحر انصاری، یہ شعر نواب واجد علی شاہ اختر پیا کا ہے۔ مترجم)

کی تھی۔ اللہ دیا خان کی یادداشتوں کے مطابق فیاض خان کے خسر محبوب خان (درس پیا) خیال کے علاوہ ٹھمریاں بھی کمپوز کرتے تھے، لیکن وہ کھلے دام کبھی بھی اُن کو نہیں گاتے تھے، بلکہ یہ بندشیں زہرہ بائی آگرہ والی کو دے دیتے تھے۔ اُن دنوں خاندانی استاد اگر اپنی آل، اولاد میں سے موسیقی کی یہ اصناف گاتے ہوئے سن لیتے تو شرم سے ڈوب مرنے کا سوچتے، کیوں کہ یہ چیزیں اُن کے خیال میں داشتاؤں اور طوائفوں کے لیے تھیں۔ لیکن گوالیار کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے بھیا گنپت راؤ اور اُن کے انتہائی ذہین شاگرد معیز الدین خان نے اس صنف کو ایک نئی عزت و تکریم کے جامے سے آراستہ کر ڈالا۔ فیاض خان نے تسلیم کیا ہے کہ معیز الدین اور اُن کی شاگرد وہ ملکہ جن (جن کے ساتھ فیاض خان کے دل لگی کے معاملات بھی ہو گئے تھے) کی گائیکی سے متاثر ہو کر وہ ٹھمری کی طرف راغب ہوئے تھے۔ لیکن معیز الدین کے 78 RPM کے دستیاب ریکارڈز اور کیسٹوں کو سن کر اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ اُن کی ٹھمری بندشوں "بازو بند کھل کھل جائے" (بھیروی)، "بندے نندا کمارم" (کافی) یا "میرے جوبنا پہ آئے بہار" (دادرا) کے انداز اور انھی چیزوں کے گائیک فیاض خان کے انداز میں کوئی مماثلت ہے۔

یہاں ایک بات تو رہ گئی کہ لکھنؤ میں تاریخ ساز کامیابی سے پہلے فیاض خان نے میسور میں بھی ایک زبردست معرکہ جیتا تھا۔ پورا واقعہ یہ ہے کہ اُن دنوں میسور دربار میں کرناٹک کے نام ور گائیک ششو دیا موہیا بھگت کے علاوہ کیرانہ گھرانے کے حافظ خان اور بشیر خان بھی موجود تھے، جن کی تان کاری کا دور دور تک شہرہ تھا۔ مہاراجا میسور کو ایک روز کچھ ٹھیک ٹھاک انداز کی دل چسپی کا خیال آیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے درباری گویّے حافظ خان اور فیاض خان کے مابین گائیکی کے مقابلے کا اعلان کر دیا۔ جیتنے والے کے لیے بیش قیمت ہیروں سے مزین ایک گولڈ میڈل کا انعام مقرر ہوا۔ ان دو مشہور ترین گائیکوں کے درمیان مقابلے کے دوران ایک بہت معیاری موسیقی سننے کی توقع میں ہندوستان بھر سے بڑے بڑے استاد میسور پہنچ گئے، جن میں نتھن خان اور اُن کے فرزند عبداللہ خان اور ولایت حسین خان بھی شامل تھے۔ بانوے سالہ غلام عباس نے فیاض خان کو تانپورے کو آدھا سُر اونچا اور حافظ صاحب کو آدھا سُر نیچا رکھنے کا مشورہ دیا۔ اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو تھیں۔

لیجیے مقابلہ شروع ہوا۔ دھرپد اور خیال میں دونوں استادوں نے وہ داؤ پیچ دکھائے کہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون کم تر ہے اور کون برتر اور کون شاہی انعام کا حق دار۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، لیجیے پلک جھپکتے اتنے دن گزر گئے۔ ساتویں دن تنگ آ کر مہاراجا نے دونوں سے

ٹھمری سننے کی فرمائش کر ڈالی۔ بدقسمتی سے گھرانوں کے سینئر استادوں کی روایات اور مزاج کے احترام میں حافظ خان ٹھمری جیسی ''ناپاک چیز'' کو چھوتے تک نہ تھے، جب کہ فیاض خان اس طرف آچکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مقابلے میں واحد فریق رہ گئے اور اُنھوں نے ایسی ٹھمری گائی کہ سننے والے پاگل ہوگئے۔ مہاراجا تو خوشی سے اتنے جذباتی ہوئے کہ انھوں نے فوری طور پر فیاض خان کے لیے گولڈ میڈل کے ساتھ چار شالوں، دو بڑے تھالوں اور کئی ہزار روپوں کا اعلان کر دیا۔

کئی سال کے بعد استاد عبدالکریم خان کی وفات کے نتیجے میں ۱۹۳۸ء میں اسی ریاست میسور نے فیاض خان کو ''آفتابِ موسیقی'' کا لقب دیا۔ مہاراجا بروودہ سرسایا جی راؤ گائیکواڑ اس بات سے خوش ہوئے کہ اُن کے درباری گویّے کو دوسری ریاست میسور نے اتنے بڑے لقب اور انعامات سے نوازا، لیکن ان کو یہ بھی خیال آیا کہ خود اُن کی ریاست اپنے گائیک کی قدر کرنے میں پیچھے رہ گئی ہے۔ چنانچہ کچھ مہینوں بعد انھوں نے اعلان کیا کہ فیاض خان اپنے مخصوص لباس میں میڈلز اور قیمتی ہیرے جواہرات سجائے دربار میں اُن کے ساتھ بیٹھا کریں گے۔ پھر اپنی سال گرہ کے موقعے پر مہاراجا گائیکواڑ نے خان صاحب کو گیارہ ہزار روپے کا انعام بھی دیا اور اس کے ساتھ ہی اُن کو ''سنگیت رتن'' کے خطاب سے بھی نوازا۔ اس خوشی کے موقعے پر اُن کی تنخواہ میں بھی پچیس روپے کے اضافے کا اعلان کیا گیا، جو اُن دنوں کچھ برا بھی نہ تھا۔ فیاض خان اپنی زندگی میں ہی لی جنڈ بن چکے تھے۔ اُن کی سحر انگیز گائیکی، سجی سجائی مونچھیں، شاہانہ انداز، فراخ دلانہ طور پر ہر استاد کی تعریف اور کھل کر ہر ضرورت مند کی مدد، ایسی چیزیں تھیں، جن سے وہ عوام و خواص میں حد درجہ مقبول تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں کے علاوہ غریبوں کے ساتھ یکساں طور پر اُٹھنا بیٹھنا اُن کے معمول میں شامل تھا۔ وہ کسی قسم کے اختلافی مسئلے میں پڑنے سے اجتناب کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دوسروں کے مؤقف کا بھی احترام کرو، کیوں کہ ضروری نہیں کہ آپ ہی کا کہا ہوا درست ہو۔ یقین نہیں آتا کہ یہ خیالات ایک عظیم ترین پیشہ ور گائیک کے ہوسکتے ہیں، کیوں کہ عام طور پر بالکل آج کے دور کی طرح ماضی کے پیشہ ور گائیکوں میں بھی یہ ریت تھی کہ منہ پر تو ماشاء اللہ، سبحان اللہ کا ورد کرو اور پیٹھ مڑی تو توبہ توبہ کہنے لگو۔

فیاض خان کی فراخ دلی اور نیکیوں کی سیکڑوں داستانیں مشہور ہیں۔ اُن میں سے چند کا ذکر ہو جائے۔ راقم (کمار پرساد مکھرجی) کے لکھنؤ کالج کے دوستوں نے ایک سرکل بنایا تھا جس کے تحت ایک موسیقی کا فنکشن منعقد کیا گیا۔ فیاض خان کی خواہش پر اس محفل کا آغاز انھوں نے ہی کیا۔ بعد میں بسم اللہ خان شہنائی نواز اور شری کرشن رتن جھنکار نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس

فنکشن میں شرافت حسین، جو اُن دنوں بارہ تیرہ سال کی عمر کے تھے، نے راگ کیدارا گایا۔ یہ تازہ تازہ منڈے ہوئے سر پر خوب صورت اور چمک دار زری کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اُس روز ایمن کے الاپ میں خان صاحب نے تیور مدھم کو مشکل ہی سے چھُوا تھا۔ الاپ کے بعد اس سے مطابقت رکھتی ہوئی انھوں نے ''گوری صورت من بھائی رے'' استھائی گائی، جو پھر آگرہ گھرانے کے کسی فرد سے آج تک میں نے نہیں سنی۔ خان صاحب نے محفل میں راگ درباری بھی گایا۔ اُس کی تار سپتک سے نیچے آتی ہوئی خوب صورت حلق تان سب لوگوں کے ساتھ میرے دل و دماغ میں بھی ہمیشہ کے لیے پیوست ہوگئی۔ محفل کے شرکا میں سے ہر ایک نے ہی کھڑے ہوکر اس تان پر صرف واہ وا کا شور بلند کردیا تھا۔ اُدھر فیاض خان کا فوری ردِعمل یہ تھا کہ مسکرا کر کہنے لگے، ''بھئی یہ درباری کی تان نہیں۔ بندرابنی سارنگ کی ہے۔ اس کو کبھی مت لینا۔''

دوسری صبح میں سہمے سہمے انداز میں ایمپائر ہوٹل میں داخل ہوا، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے خان صاحب کو ایک سو ایک روپے معاوضے پر بلایا تھا، جو اُن دنوں اُن کے معمول کے معاوضے سے کہیں کم تھا، لیکن ہم یہ رقم بھی چندہ جمع کرکے پوری نہیں کرسکے تھے۔ چنانچہ بہت ہی معذرت کرتے ہوئے میں نے جمع شدہ رقم اُنہتر روپے اُنھیں پیش کی۔ خان صاحب ہماری مجبوری کی داستان شاید میرے چہرے ہی سے پڑھ چکے تھے، لہٰذا انھوں نے اپنا بٹوا نکالا اور میری دی ہوئی رقم میں اکتیس روپے شامل کرتے ہوئے پورے ایک سو روپے مجھے واپس کرتے ہوئے توبہ کرنے لگے، یہ کہتے ہوئے کہ، ''بچوں کے جیب خرچ پر بھی میں نے اس طرح ڈاکا ڈالا تو اللہ مجھے جہنم میں نہیں ڈالے گا تو کہاں ڈالے گا۔''

خان صاحب کی دردمندی اور سخاوت کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک لکھنؤ، کانپور لائن پر واقع اناؤ ریلوے اسٹیشن ماسٹر تھے جو خان صاحب کے فن کے بڑے دل دادہ تھے۔ انھوں نے کہیں خواب میں دیکھا کہ انھوں نے خان صاحب کے اعزاز میں موسیقی کی محفل منعقد کی ہے۔ بس پھر کیا تھا، اپنے بچے کے دھاگا بندھائی کی رسم کے موقعے پر انھوں نے خان صاحب کو بلا کر اور اُن کو سن کر اپنے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ چنانچہ یہ اسٹیشن ماسٹر صاحب ٹھاکر جے دیو سنگھ کے پاس پہنچے جو کانپور میں ڈی اے وی کالج میں پڑھاتے تھے اور جن کے خان صاحب سے تعلقات تھے۔ انھوں نے اسٹیشن ماسٹر کو یقین دلایا کہ آٹھ سو روپے فیس پر جس میں بڑودہ سے اُناؤ آنے کا کرایہ بھی شامل ہے، خان صاحب کو بلایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مقررہ دن صبح، صبح واقعی فیاض خان صاحب اپنے میزبان کے پاس پہنچ گئے، لیکن اُن کے گھر کا جائزہ لینے

کے بعد ٹھاکر صاحب کو کونے میں لے جا کر آہستہ سے کہنے لگے کہ اُن کے میزبان اپنے حلیے اور گھر کے حالات سے تو کسی طور پر بھی پیسے والے نہیں لگتے ہیں۔ ان کی تنخواہ کیا ہوگی؟

''مشکل سے ایک سو پچاس روپے مہینا۔'' ٹھاکر صاحب نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''استغفر اللہ! اس کا مطلب ہے کہ غریب کی چھ مہینے سے زیادہ کی تنخواہ مجھ پر چند گھنٹوں میں خرچ ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر خان صاحب بازار کی سیر کے بہانے گھر سے چل دیے۔

ٹھاکر صاحب نے بیان کیا کہ رات کو محفل بھی تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ فیاض خان ہر بار میزبان سے اس ملتجیانہ انداز میں فرمائش دریافت کرتے جیسے کہ وہ کسی راجا، مہاراجا سے کرتے تھے۔ صبح جب ہوئی تو خان صاحب نے سوائے بڑودہ کے واپسی ٹکٹ کے میزبان سے ایک پیسا بھی نہیں لیا۔ پھر انھوں نے چلتے چلتے اُس بچے کو بلایا جس کی دھاگا بندھائی کی خوشی میں یہ محفلِ موسیقی سجائی گئی تھی اور بڑے پیار سے اُس کو ایک کم خوابی ڈبیا تھما دی۔ اُس نے حیرت سے اُس کو کھولا تو اس میں سونے کی ایک خوب صورت انگوٹھی جھلملا رہی تھی۔

ٹھاکر صاحب جس وقت مجھے یہ واقعہ سنا رہے تھے، بانوے سال کی عمر کے تھے اور اُن کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو جھلملا رہے تھے۔

فیاض خان سے وابستہ ایک واقعے کے راوی لطافت حسین خان ہیں۔ اُن کے مطابق خان صاحب ریاست ہمت نگر کے راجا کی سال گرہ کے موقعے پر راجا صاحب کا سالانہ درشن ہوتا تھا اور ایک چاندی کی بڑی سی تھال میں رعیت اپنا ''نذرانہ'' ڈالتی تھی۔ اب کے راجا صاحب نے یہ التزام کیا کہ خان صاحب کی پرفارمنس سے پہلے دربار میں اس تھال کو سب کے نظارے کے لیے رکھ دیا گیا۔ پھر فیاض خان کے گانے کے بعد تھال کی پوری رقم، جو استاد لطافت حسین خان کے خیال میں بیس ہزار روپے سے کم نہیں تھی، فیاض خان کے حوالے کر دی گئی۔ فیاض خان نے بڑے مؤدبانہ انداز میں یہ نذرانہ قبول تو کر لیا، لیکن پھر راجا سے درخواست کی کہ دربار کے اہل کاروں کو جمع کیا جائے۔ راجا کے لیے یہ درخواست عجیب و غریب تھی، لیکن بہر حال انھوں نے تمام ایک سو پچاس نوکروں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب یہ نوکر جمع ہو گئے تو خان صاحب اُن کے سردار کے پاس پہنچے اور اُس کے ہاتھ میں نذرانے کی پوری تھالی دیتے ہوئے کہنے لگے، ''یہ نذرانہ آپ کی ریاست کے راجا صاحب کی طرف سے اُن کی سال گرہ کے موقعے پر پیش کیا جاتا ہے۔ مہربانی کر کے اس کو اپنے تمام ساتھیوں میں تقسیم کر لیجیے۔''

لطافت حسین خان کی کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ انھوں نے اس کو جاری رکھتے

ہوئے کہا کہ رات کو جب ڈنر کا وقت ہوا تو خان صاحب اور راجا صاحب کے تمام معزز مہمان اور اہل کار یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ہیڈ ویٹر کی وردی میں راجا صاحب سب مہمانوں کی میز پر فرداً فرداً جا کر سب کو مسکرا مسکرا کر بتا رہے ہیں کہ میں تو خان صاحب کا ایک ادنیٰ ویٹر ہوں۔ خان صاحب نہ صرف ہندوستان کی موسیقی کے سرتاج ہیں، بلکہ صحیح معنوں میں ایک شہنشاہ ہیں جب کہ میں تو اس فن کی ایک چھوٹی سی ریاست کا معمولی سا راجا ہوں۔

پیسوں کے معاملے میں استاد فیاض خان نہ صرف نہایت کھلے ہاتھ کے تھے، بلکہ بہت حد تک لاپروا بھی تھے۔ کلکتے میں انڈیا میوزک کانفرنس کے آرگنائزر دامودر داس کھنہ کے بھتیجے اور رئیس موہن کپور ایک زمانے میں بمبئی میں رہتے تھے۔ وہ ایکٹریس نرگس کی والدہ جدن بائی کے گھر اکثر جاتے تھے اور مہینے میں ایک بار فیاض خان کا پروگرام بھی وہاں رکھواتے تھے۔ یہ موہن کپور صاحب، فیاض خان سے ایسی نئی بندشوں کی فرمائش کرتے جس میں اُن کے نام یعنی ''موہن'' کا ذکر ہو۔ چنانچہ خان صاحب نے ''نادان انکھیاں لاگی موہن سو'' (راگ جے جے ونتی میں) اور ''نین سو دیکھی ایک جھلک موہن سو'' (راگ سگھرئی میں) جیسی بندشیں انھی کی فرمائش پر تخلیق کیں، جن کو بعد میں ہندوستان ریکارڈنگ کمپنی نے ریکارڈ بھی کیا۔ ایسی ہی پہلی پہلی بندشوں کو جب موہن کپور کی کسی محفل میں استاد فیاض خان نے گایا تو اُنھوں نے ایک بند لفافہ خان صاحب کو پیش کیا، جسے انھوں نے سلک کی شیروانی کی جیب میں ڈال دیا اور اس کو بالکل بھول گئے۔ جب دھوبی نے یہ لفافہ واپس کیا اور انھوں نے اُس کو کھولا تو اس میں صرف ایک کرنسی نوٹ رکھا تھا، جو انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے غلام رسول کو آواز دی اور پوچھا کہ یہ کتنے کا نوٹ ہے تو میٹریکولیٹ غلام رسول نے جواب دیا کہ یہ ایک ہزار کا نوٹ ہے، جو دھوبی کے کپڑوں کی دھلائی سے بال بال بچ گیا تھا۔ خان صاحب اس نوٹ کو صحیح سالم ملنے کی خوشی میں مبتلا ہونے کی بجائے حیرت اور استعجاب میں پڑ گئے کہ موہن کپور نے تو گانے کی پوری فیس پہلے ہی دے دی تھی، پھر اس نے اتنی بھاری رقم کیوں دی ہے۔ لیکن کیوں کہ یہ کھلی حقیقت تھی، اس لیے وہ صرف نوٹ کو تکتے رہے۔ پھر غلام رسول سے مخاطب ہوئے، ''بھائی، ایک رئیس مجھے ایک بندش پر ایک ہزار دے رہا ہے۔ کاش کہ میرے سسر محبوب خان درس پیا ہوتے تو اُن کی تو پیسوں کی ٹکسال ہوتی!'' اس واقعے سے خان صاحب کی روپے پیسوں سے بے نیازی کے علاوہ اپنے استادوں کا احترام اور اُن کو اپنے سے برتر سمجھنے کا احساس بھی ملتا ہے۔

فیاض خان کی سرگزشت ایک اور دل چسپ واقعے کے بغیر نامکمل کہلائے گی، جو یہ

ہے: استاد جگت گُرو ملک کا تعلق کلکتے سے تھا۔ یہ اتفاق سے فیاض خان صاحب کے دو دوستوں یعنی استاد حافظ علی خان اور استاد عنایت خان کے بھی گُرو تھے، جن کا موجودہ نسل سے یہ تعارف ہے کہ یہ دونوں بتدریج استاد امجد علی خان اور استاد ولایت خان کے والد تھے۔ ان جگت گُرو ملک صاحب کی گائیکوں کے لیے ایک بڑی اہمیت یہ بھی تھی کہ یہ دھرم تلا کلکتے میں ایک شراب خانے کے بھی مالک تھے۔ ان جگت گُرو صاحب کو ایسی تانیں سنانے کا خبط تھا جو پہلی سپتک سے لے کر پانچ سپتک پار کر جائیں۔ چنانچہ جب بھی شراب کے رسیا گائیکوں کو اس کی طلب ہوتی تو وہ اُن سے یہ تانیں سننے پہنچ جاتے۔ فیاض خان اور اُن کے دونوں ساتھیوں، حافظ علی خان اور عنایت خان کا اس معاملے میں ''طریقۂ واردات'' کچھ دل چسپ تھا۔ پہلے تو یہ تینوں گھوڑا گاڑی میں بار کے قریب پہنچتے اور اس کو باہر کھڑا کر دیتے۔ اب یہ تینوں باجماعت فیاض خان کی رہنمائی میں بار کے اندر داخل ہوتے۔ فیاض خان کے چوڑے چکلے جسم کے پیچھے حافظ علی خان ایک خالی ٹوکری لیے ہوئے دبکے کھڑے ہوتے۔ پروگرام کے مطابق فیاض خان جگت گُرو سے مخاطب ہوتے کہ، ''استاد جی آپ نے تین روز پہلے جو تان مجھے سکھائی تھی، لاکھ کوشش کے مجھ سے ادا نہیں ہو رہی۔ ایک بار پھر سکھا دیجیے۔'' اور جتنے عرصے میں جگت گُرو تان کو کئی بار دُہراتے اور فیاض خان جان بوجھ کر اُسے غلط پیش کرتے جاتے، حافظ علی خان اتنے عرصے میں جتنی بھی شراب کی بوتلیں ہاتھ لگتیں اور ٹوکری میں سماتیں، پار کر کے باہر نکل جاتے۔ ان بھولے بھالے جگت گُرو صاحب کی آواز کے ٹیپ اب بھی کولکتہ کے ITC Sangeet Research Academy کے آرکائیوز میں مل سکتے ہیں۔

اور دوسری زبردست خوبیوں کے علاوہ استاد فیاض خان میں حسِ مذاق بھی بلا کی تھی۔ نواب چھتاری کے دوسرے صاحب زادے فرحت سعید خان میرے بھی اچھے دوستوں میں سے تھے۔ یہ کبھی نہیں گاتے تھے، لیکن نہ معلوم کیا جی میں آئی کہ خان صاحب کے گنڈا بندھ شاگرد بن بیٹھے۔ سب کو معلوم ہے کہ اُن کی فیملی تقریباً آدھے علی گڑھ شہر کی مالک تھی اور ان لوگوں کی ''راحت منزل''، جس میں فیاض خان کا گانا ہوا تھا، کسی پُرشکوہ محل سے کم نہیں تھی۔ خان صاحب کی پرفارمنس بھی اُمید کے مطابق جاہ و جلال کی بولتی تصویر سے کم نہیں تھی۔ جب خان صاحب کا گانا ختم ہوا تو ایک معزز مہمان اُن کی تعریف میں اتنے بڑھے کہ ان کو بیس ویں صدی کا میاں تان سین قرار دے ڈالا۔ اُن کے منہ سے یہ جملہ ادا ہی ہوا تھا کہ ان لوگوں کے سامنے سے ایک چوہیا کا بچہ گزرا اور دروازے کے راستے تیزی سے باہر نکل گیا۔ فیاض خان نے یہ منظر دیکھا تو

مسکرا کے اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''سرکار! آپ کی عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ لیکن میاں جی میں کس قابل ہوں۔ میں تو بس کام چلانے کی حد تک گا لیتا ہوں۔ جب میاں تان سین، اُن کے گرو سوامی ہری داس اور بیجو باورا گاتے تھے تو ہرنوں کے غول کے غول اُن کا گانا سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ اور میں گاتا ہوں تو میری آواز سے ایک چوہیا کا بچہ بھی گھبرا کے بھاگ جاتا ہے۔''

ادھر تو خان صاحب کا اپنے بارے میں، مذاق میں ہی سہی، یہ تبصرہ تھا لیکن اُدھر یہ حال تھا کہ رابندر ناتھ ٹیگور جو دھرپد کے آگے کسی بھی موسیقی کی صنف، اور خاص کر خیال کو ہیچ سمجھتے تھے، انھیں ایک روز فیاض خان کو سننے کا اتفاق ہوا۔ فیاض خان نے پہلے تو دھرپد اور خیال راگ رام کلی میں پیش کیا۔ پھر انھوں نے بھیروی میں ٹھمری سنائی۔ ٹیگور صاحب کا یہ حال تھا کہ اُن کی آنکھیں بند ہو کے رہ گئیں۔ پھر جب ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کو ہوش آیا تو انھوں نے اکیس سونے کی مہریں خان صاحب کو نذرانے کے طور پر عطا کیں، لیکن اُس سے بھی زیادہ قیمتی اور تاریخی جملہ بھی اُن کی شان میں یہ دُہرایا، ''اس شخص کو دیکھو، صرف ایک لمحے میں اس نے میری عمر کے پچاس سال گھٹا دیے۔''

اب میں خان صاحب کی ذات اور فن سے جُڑے ہوئے آخری واقعے کی طرف آتا ہوں۔ سید مجتبیٰ علی، بنگالی کے نام ور ادیب ہونے کے ساتھ ایک بزرگ، پیر قسم کی چیز بھی تھے۔ ایک زمانے میں انھوں نے ٹیگور کی شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ قاہرہ کی الازہر یونی ورسٹی میں انھوں نے ایک سال گزارا تھا۔ کئی سال کابل میں پڑھایا۔ بون یونی ورسٹی سے انھوں نے تقابلِ مذاہب میں ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی۔ کچھ سال انھوں نے بڑودہ کالج میں اُس وقت گزارے جب فیاض خان بھی وہاں تھے۔ انھوں نے اپنی بنگالی زبان کی کتاب میں فیاض خان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے: میرے واقف کار چودھری صاحب، فیاض خان کے شاگرد تھے۔ انھوں نے میرا ان سے نہ معلوم کس انداز میں تعارف کرایا کہ ایک روز وہ اپنے قوی ہیکل اور پُرشکوہ ڈیل ڈول کے ساتھ میرے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میری گھگھی بندھ گئی کہ کس طرح اُن سے ملوں، کہاں اُن کو بٹھاؤں؟ مجھ سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اگر مہاراجا سایاجی راؤ خود میرے پاس اس طرح تشریف لے آتے تو مجھے اتنی خوشی اور احساسِ فخر نہیں ہوتا، اور ساتھ ہی خود کو اُن کی میزبانی میں اتنا لاچار محسوس نہ کرتا۔

اور استاد جی! اُن کا یہ حال تھا کہ کسی جاں نثار مرید کی طرح میرے ہاتھ عقیدت سے تھام کر اپنی چھاتی سے لگائے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ چودھری صاحب یا کسی دوسرے آدمی

نے خان صاحب کے دل میں یہ بٹھا دیا تھا کہ میں کوئی زبردست عالم فاضل اور الازہر یونی ورسٹی کا فارغ التحصیل ہوں اور مذاہب کے بارے میں میری معلومات کا اس قدر دنیا میں ڈنکا بجتا ہے کہ مہاراجا صاحب مجھے بڑودہ لانے پر مجبور ہوگئے۔ اب میں لاکھ اُن کو سمجھا رہا ہوں کہ بھائی اُن کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نہ کوئی نام ور آدمی ہوں اور نہ مجھ میں اتنی خوبیاں اور صلاحیتیں ہیں۔ لیکن شہنشاہِ موسیقی مجھ جیسے ایک ادنیٰ سے آدمی کی بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ دراصل مجھے بعد میں سمجھ میں آیا کہ کسی کے کہنے کے بجائے خود انھوں نے میرے بارے میں سوچا کہ جس شخص کو اُن کی ریاست کا اتنا پڑھا لکھا اور سوچ سمجھ اور شعور رکھنے والا راجا الازہر یونی ورسٹی سے کھینچ کر بڑودہ لایا، وہ ایک معمولی صلاحیت اور علم رکھنے والا آدمی تو ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

غرض یہ کہ اس کے بعد ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوگیا، لیکن اُن کا میرے ساتھ انکسار اور احترام کا یہ انداز کبھی نہیں گیا۔ تنگ آکر مجھے ایک دن اُن سے کہنا پڑ گیا، استاد صاحب، میری بات غور سے سنیے۔ بادشاہ آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے، پتا نہیں کتنے شمس العلما، عالم، فاضل پیدا ہوں گے اور دنیا سے چلے جائیں گے، ہماری ریاست کے دیوان صاحب (چیف منسٹر) جو اتراتے ہوئے منڈلاتے پھرتے ہیں، گزر جائیں گے اور اُن کا بدل بھی آجائے گا۔ اسی طرح تمام بادشاہوں اور راجوں، مہاراجوں کا میں بدل دیکھتا رہوں گا، لیکن خدا گواہ ہے استاد جی کہ آپ کا بدل مجھے یا کسی کو بھی نہیں ملے گا۔ فیاض خان نے میری باتوں کو سنا اور محض ہاتھ جوڑ کر مسکرا کے رہ گئے۔ اُن دنوں فیاض خان ادھیڑ عمر میں داخل ہوگئے تھے لیکن اُن میں بلا کی خوب صورتی اب بھی باقی تھی۔ اُن کے چہرے کی رنگت اور مونچھوں کے مجموعی تأثر سے میں سوچا کرتا تھا کہ اپنی ٹھمری ''نند کمار'' کے یہی نند کمار (شری کرشن) ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اسطوری نند کمار کا رنگ سیاہی مائل تھا، جب کہ استاد جی بالکل گورے چٹے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے میرے گھر آکر اپنا گانا سنانے پر بضد ہوتے، لیکن مجھے شرمندگی ہوتی اور میں کہتا کہ خان صاحب قاعدے سے مجھے ہی آپ کے پاس جانا چاہیے۔ بہرحال میرے ہی گھر پر اُن کا گانا شروع ہوگیا۔ کئی دوسرے لوگ بھی سننے آجاتے۔ کبھی یہ سلسلہ شام کو شروع ہوتا اور اگلی صبح پانچ بجے ختم ہوجاتا۔ جھوٹ نہیں بولوں گا، کئی موقعوں پر اُن کے گانے سے مسحور ہوکر میں خیالوں ہی میں بہشت کا نظارہ کر آیا۔ ایک بار صرف میں اکیلا تھا۔ انھوں نے مجھے میری من پسند بندش ''نند کمار'' ڈیڑھ گھنٹے تک سنائی۔

انھی دنوں ایک روز بڑودہ کی ایک معزز خاتون نے میرے گھر پر خان صاحب کو سننے کی فرمائش کی۔ خان صاحب زبردست فارم میں تھے۔ بڑودہ میں اُس دن دوپہر کو ٹمپریچر بھی ۱۱۴

ڈگری فارن ہائٹ تھا۔ رات کو محفل کے وقت بھی سخت گرمی اور حبس کا عالم تھا۔ مون سون کا موسم بھی دو مہینے دور تھا۔ بہرحال خان صاحب نے کوئی تین گھنٹے گانا گایا۔ اس کے بعد خاتون سے اُس کی فرمائش پوچھی۔ اوروں کی طرح پسینے میں شرابور خاتون کے منہ سے جھجکتے انداز میں نکلا، ''میگھ ملھار۔'' غالباً اُن کا خیال تھا کہ استاد جی اس بن موسم گیت کی فرمائش کو طنز و مذاق اور اُن کا امتحان سمجھ کر برا نہ مان جائیں، لیکن خان صاحب نے بلاتکلف گلے سے اسی ''میگھ ملھار'' راگ کے سُر چھیڑ دیے۔

ایسا لگتا تھا کہ اُس وقت فیاض خان نے ''میگھ ملھار'' گاتے وقت اپنی پوری عمر کی فنی تربیت اور ریاض، اپنی گائیکی کے ورثے، اپنے آبا و اجداد کی ہنرمندی اور خود اپنی آواز کے دبدبے اور اُس کی جادوئی تاثیر و کشش کے ذریعے دو مہینے بعد برسنے والے بادلوں کو آج ہی بڑودہ کے اُفق پر چھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ سننے والوں نے دیکھا کہ باہر ٹپ ٹپ بوندیں گرنی شروع ہوگئیں۔ محفل میں شور مچ گیا۔ کچھ لوگ استاد کو مبارک باد دینے کے لیے اُن کی طرف بھاگے۔ کچھ لوگوں کی نظریں اس آواز کے ''جادوگر'' پر ساکت ہوکر رہ گئیں۔ کچھ لوگوں کا اُن کو داد دینے کا یہ انداز تھا کہ فرش پر لوٹ گئے۔ غرض کہ عجیب وغریب سماں تھا۔ میرے قلم میں اتنی طاقت نہیں کہ صحیح طور پر اُس کی منظرکشی کرسکوں۔ خلافِ توقع اُس وقت فیاض خان اس قدر تعریف وتوصیف کا جواب فرشی سلام کے ذریعے دینے کے موڈ میں نہیں تھے، جو اُن کا معمول تھا، بلکہ انھوں نے دوسرا راگ چھیڑ دیا۔ اس طرح صبح ہوگئی اور اُنھوں نے بھیروی کے ذریعے محفل کے اختتام کا اعلان کردیا۔ پھر وہ مجھ سے جانے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ ساری رات گاتے رہے ہیں، اس لیے کچھ دیر آرام کرلیں، لیکن جواب دینے کی بجائے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ پھر وہ بولے، ''سیّد صاحب میرا عقیدہ ہے کہ کسی راگ سے بارش وارش نہیں ہوسکتی ہے، پھر میرے 'میگھ ملھار' گاتے وقت بے موسم یہ کس طرح ہوگئی؟ آپ کو اپنا بزرگ مانتا ہوں، میری الجھن دور کیجیے۔''

میرے پاس اُن کی تشفی کے لیے فوری جواب یہ تھا، ''خان صاحب آپ کے سوال کا جواب اللہ ہی دے سکتا ہے۔ البتہ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اللہ رات کو آپ کے ساتھ تھا۔''

یہ تھے داستان کے راوی سیّد مجتبیٰ علی۔ اب ہم فیاض خان کی داستان سمیٹ چکے ہیں، کیوں کہ ۵رنومبر ۱۹۵۰ء کو وہ دنیا سے کوچ کر گئے۔

اُن کی موت کے تقریباً پندرہ سال بعد راقم (کمار پرساد مکھرجی) کا ایک کام کے سلسلے

میں بڑودہ جانا ہوا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد وہاں کے مہاراجا اب ہماری آپ کی طرح ایک عام شہری بن چکے تھے، حالانکہ اپنی کثیر دولت اور خصوصی مراعات کے وہ ابھی تک اتنے ہی مالک تھے کہ ہم لوگ ان کی قسمت پر رشک کریں۔ وہاں میرا کام تو ایک دن میں ہی مکمل ہوگیا اور اب دوسرے دن صبح میری وہاں سے روانگی تھی۔ شام کو مجھے فرصت ملی تو خیال آیا کہ استاد جی کی قبر پر کچھ پھول نچھاور کرنے کے علاوہ کچھ موم بتیاں بھی روشن کر آؤں۔ بڑودہ اب ریاست گجرات کا حصہ تھا۔ فرانسیسیوں کی طرح گجراتی لوگ اپنی گجراتی زبان کے علاوہ دوسروں سے کسی زبان میں گفتگو کرنے کے نہ تو عادی ہیں اور نہ اس کو سمجھنے کے روادار۔ چنانچہ میرے لیے موم بتیاں خریدنا مسئلہ ہوگیا۔ چھوٹے دکان داروں کو بالکل ہی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا مانگ رہا ہوں۔ وہ تو شکر کرو کہ ایک گاہک مجھے ٹکرا گیا، جو میری زبان سمجھتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گجرات میں جو چیز آپ ''موم بتی'' کے نام سے مانگ رہے ہیں، وہ یہاں دراصل ''میم بتی'' کہلاتی ہے۔ شاید اپنی سفید رنگت کی وجہ سے۔ میں دل میں سوچ کر مسکرایا۔

پھولوں اور موم بتیوں کا مسئلہ حل ہوا تو فیاض خان صاحب کی قبر کو تلاش کرنے کا کٹھن مسئلہ باقی تھا۔ یہ مسئلہ حل کرنا میرے لیے تو ناممکن ہوجاتا، کیوں کہ اُن کی قبر کا پتا تو دور کی بات، شاید یہاں لوگوں نے استاد فیاض خان کا نام تک نہیں سنا تھا۔ لیکن قسمت اچھی تھی کہ غلام رسول خان وہاں موجود تھے۔ انھوں نے ایک لڑکا میرے ساتھ کردیا کہ وہ استاد جی کی قبر تک مجھے لے جائے۔

میری کار مختلف چھوٹی اور پیچیدہ گلیوں سے گزرتی ہوئی ایک چھوٹی سڑک پر بنے ہوئے ایک گیراج کے سامنے رُک گئی۔ اس گیراج میں کالک اور گریز میں لتھڑے، نیکر پہنے دو لڑکے ایک کار کے ڈھانچے پر ہتھوڑے اور چھینی سے ٹھوکا پیٹی کررہے تھے۔ اُن کے چاروں طرف لاتعداد اوزار اور پرانے ٹائر بکھرے پڑے تھے۔ ہم ان رکاوٹوں کو پار کرتے ہوئے گیراج کے عقبی حصے میں پہنچ گئے اور وہاں لگے ہوئے ایک دروازے سے پار ہوگئے۔ یہاں چھوٹا سا کھلا میدان تھا۔ اس کے ایک طرف چند قبریں تھیں، جن پر لگی جنگلی گھاس کو کچھ بکریاں چر رہی تھیں۔ تمام خستہ حال اور بے کتبہ قبریں اپنے مکینوں کے نام بتانے سے قاصر تھیں۔ البتہ ایک قبر غنیمت ہے کہ کونے میں ایسی بھی تھی جس پر ماربل کی چھتری بنی ہوئی تھی۔

اس قبر میں دائمی سکون سے آرام کر رہے تھے، ہمارے آفتاب موسیقی استاد فیاض خان۔ ہندوستانی موسیقی کے سنہری دور کے آخری بادشاہ سلامت۔

○○○

راجیش کھنّہ — کچھ تو لوگ کہیں گے

عدیل انصاری

انڈین سنیما اپنے سو برس مکمل کر چکا ہے۔ ان سو برسوں میں کتنے ہی ستارے سلور اسکرین پر چمکے اور پھر ٹوٹ کے گم نامی کے سمندر میں جا گرے مگر کچھ ستارے ایسے بھی تھے جو سلور اسکرین پر کچھ اس تب وتاب کے ساتھ جگمگائے کہ اُن کے ڈوب جانے کے بعد بھی ایک روشن لکیر اسکرین پر نمایاں رہی اور ان کی موجودگی کا احساس دلاتی رہی جیسے ''راجیش کھنہ''۔

۲۹ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو جنم لینے والے جتن کھنہ ۱۹۶۶ء میں راجیش کھنہ کے نام سے فلم ''آخری خط'' میں سلور اسکرین پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح چھا گئے کہ انڈین سنیما کے پہلے ''سپر اسٹار'' بن بیٹھے۔ اُجلا، ہنستا چہرہ اور بولتی مسکراتی آنکھیں، ہر دیکھنے والے کے دل میں گھر کر گئیں۔ ۱۹۶۹ء میں بلاک بسٹر فلم ''ارادھنا'' سے شروع ہونے والا سفر آنے والی ہر نئی فلم کے ساتھ انھیں مزید بلندیوں پر لے گیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت فلم یہاں تک کہ لگاتار پندرہ بلاک بسٹر فلمیں دے کر انھوں نے انڈین باکس آفس کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ اور یہ ریکارڈ آج تک کوئی نہیں توڑ سکا۔ ان فلموں میں ''کٹی پتنگ''، ''امر پریم''، ''باورچی''، ''آنند'' اور ''نمک حرام'' جیسی لازوال فلمیں شامل ہیں جنھوں نے اُس وقت ریکارڈ بزنس کیا تھا۔ یہ خوبرو ہیرو ہر فلم میں اپنے کردار میں اس طرح ڈوب جاتا کہ دیکھنے والوں کو اس کی اداکاری پر حقیقت کا

گماں ہوتا۔ یہ البیلا اپنے انداز و ادا میں بالکل مختلف اور منفرد تھا۔ لہٰذا دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند جیسے لی جنڈ اداکاروں کے ہوتے ہوئے اس کا رومانی انداز اور نیچرل ایکٹنگ کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اس کے ہر ہر انداز پر سیکڑوں دل دھڑکتے، لاکھوں لڑکیاں اسے اپنے سپنوں کا دیوتا سمجھنے لگیں اور عورتیں اپنے بیمار بچوں کو اس کے پاس لے کر آتیں کہ وہ بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ لڑکیاں اس کی تصویر سے شادی کرنے کو تیار تھیں۔ ایک مرتبہ فلم کی شوٹنگ کے بعد جب وہ اور ممتاز مدراس کے ایک ہوٹل پہنچے تو ممتاز کے بقول چھ سو لڑکیاں ان کو دیکھنے کے لیے قطار لگائے کھڑی تھیں۔ فین ان کی کار چومتے اور پوری کار لپ اسٹک کے نشانات سے ڈھک جاتی۔ لڑکیاں خون سے خط لکھ کر انھیں بھیجتیں تو لڑکے ان کا ہیئر اسٹائل اور ان کا ''گرو کرتا'' کاپی کرتے نظر آتے۔ راجیش کھنہ کی شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فلم ''امر پریم'' کا ایک منظر Howrah bridge کے نیچے اس لیے فلمانے کی اجازت نہیں ملی کہ خطرہ تھا کہ راجیش کھنہ کو دیکھنے اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے کہ برج ٹوٹ سکتا ہے۔

راجیش کھنہ کی اس بے پناہ مقبولیت نے نہ صرف فلم انڈسٹری میں بلکہ ان کی ذاتی زندگی میں بھی نت نئی کہانیوں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

آئے دن کوئی نہ کوئی افواہ یا خبر راجیش کھنہ کے حوالے سے اخبار کی سرخی بننے لگی، اور ان کا نام ایک ماڈل، فیشن ڈیزائنر انجو مہیندرو کے ساتھ آنے لگا۔ ان دونوں کی طوفانی محبت تمام اخبارات کی خبروں کا موضوع بن گئی۔ ان خبروں میں ایک خبر یہ بھی تھی کہ راجیش کھنہ اپنی گرل فرینڈ انجو مہیندرو سے سگائی کر چکے ہیں اور بہت جلد یہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھنے والے ہیں۔ راجیش کھنہ کے بارے میں یہ خبر ان کی چاہنے والی لڑکیوں کے دل پر بجلی بن کر گری۔ مگر اصل بجلی تو راجیش کھنہ نے گرائی، جب ۱۹۷۲ء کی ایک رات کو تین بجے انھوں نے دیویانی چوبل نامی ایک بہت معروف gossip columnist کو فون کیا، یہ کالم نگار راجیش کی دوست بھی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس وقت راجیش نے چودہ پیگ پیے ہوئے تھے اور وہ نشے میں دُھت تھے۔ انھوں نے رات کو تین بجے فون یہ بتانے کے لیے کیا تھا کہ وہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی سے شادی کر رہے ہیں۔ چونکہ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی شادی کریں گے، اس کی اطلاع سب سے پہلے دیویانی کو دیں گے، لہٰذا انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

یہ پندرہ سالہ لڑکی کون تھی؟ جس سے تیس سالہ سپر اسٹار شادی کرنے جا رہے تھے، کوئی معروف ہیروئن یا ان کی گرل فرینڈ انجو؟ جی نہیں! یہ سارے قیاس غلط ثابت ہوئے اور پتا چلا کہ راجیش کھنہ جیسے سپر اسٹار راج کپور کی نئی دریافت اور فلم انڈسٹری میں نو وارد ڈمپل کپاڈیا سے شادی کر رہے ہیں۔ دراصل ۱۹۷۲ء میں احمد آباد میں ایک فلمی فنکشن منعقد کیا گیا۔ اس فنکشن میں ممبئی کے کئی نامور اسٹارز مدعو تھے اور ایک چارٹر طیارے سے احمد آباد جا رہے تھے۔ اس طیارے میں راجیش کھنہ کئی معروف اداکاراؤں کو چھوڑ کر ڈمپل کے برابر والی سیٹ پر جا بیٹھے اور کیوپڈ کا تیر اپنا کام کر گیا۔ یہ دونوں اس تقریب میں ساتھ ساتھ رہے اور ان سے پہلے ان کی پریم کہانیاں ممبئی پہنچ گئیں یوں وقتی مسافرت تا عمر ہم سفری میں ڈھلتی نظر آنے لگی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان دونوں کی شادی کا کوئی امکان نہیں، کیوں کہ راجیش کھنہ کی زندگی میں انجو موجود ہے اور ڈمپل کے ساتھ رشی کپور کا نام لیا جا رہا تھا جو فلم ''بوبی'' میں ڈمپل کے ہیرو تھے۔ رشی کپور نوعمر تھے، جب کہ راجیش ڈمپل سے دگنی عمر کے تھے۔ عمروں کے علاوہ ان دونوں کے درمیان ایک اور چیز حائل تھی اور وہ تھی راجیش کھنہ کی بے پناہ شہرت۔ راجیش کھنہ وہ سپر اسٹار تھے جو کئی بے حد کامیاب فلمیں اپنے نام کے ساتھ جوڑ چکے تھے، جب کہ ڈمپل کی پہلی فلم بھی ابھی ریلیز نہیں ہوئی تھی مگر محبت وہ قوت ہے جو ہر رکاوٹ کو پار کر جاتی ہے، سو اسی قوت نے اَن ہونی کو ہونی کر دکھایا اور مارچ ۱۹۷۳ء میں راجیش کھنہ کی شادی ڈمپل کپاڈیا سے ہوگئی اور راجیش کھنہ کا بنگلہ ''ڈمپل ہاؤس'' بن گیا۔

ڈمپل یقیناً اس وقت ہواؤں میں اُڑ رہی تھیں۔ انھوں نے نہ تو یہ سوچا کہ ایک بالکل نو وارد لڑکی کی شادی کے بعد اس کا فلمی کیریئر بطور ہیروئن کیا رہ جائے گا اور نہ انھیں اس کی پروا تھی کہ اپنی پہلی ہی فلم ''بوبی'' کے ریلیز ہونے سے صرف چھ ماہ پہلے اُٹھایا گیا یہ قدم اس فلم کے بزنس پر کیا اثر ڈالے گا۔ وہ تو بس اپنی محبت کی سرشاری میں تھیں، لیکن اس سب کے باوجود ڈمپل کی پہلی فلم ''بوبی'' نے فلمی شائقین کے دل جیت لیے اور ڈمپل راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئیں۔ انھوں نے انڈین فلم انڈسٹری کو ایک نیا ڈریسنگ ٹرینڈ بھی دیا۔ ظاہر ہے کہ قسمت کی دیوی ڈمپل پر پوری طرح مہربان تھی مگر انھوں نے سولہ سال کی نہایت جذباتی عمر میں کوئی جذباتی فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہوئے پردۂ سیمیں کو سجانے کے بجائے گھر بسانے کا فیصلہ کیا اور سب کی ہوجانے کے بجائے صرف راجیش کھنہ کی ہو کر رہ گئیں۔ شادی کے بعد راجیش کھنہ نے ڈمپل کو فلموں میں کام کرنے سے روک دیا اور وہ سترہ سال کی عمر سے پہلے ہی ایک بیٹی کی ماں بن گئیں۔ ڈمپل کے لیے ان کا گھر اور دو بیٹیاں ٹوئنکل کھنہ اور رنکی کھنہ ہی کُل کائنات تھی۔ مگر پھر جیسے اس

خوب صورت خواب کی مدت تمام ہوئی اور بھیانک حقیقت اپنے پر پھیلانے لگی۔

انسانی فطرت ہے کہ جب اُسے دیوتا بنا کر پوجا جانے لگے تو وہ خود کو دیوتا ہی سمجھنے لگتا ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ یہ بلندی، یہ محبت اور عقیدت ہمیشہ ہمیشہ اس کے پاس رہے گی۔ اس احساس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک طرف تو وہ غرور اور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور دوسری طرف حقیقت سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ اور یہ بھول جاتا ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے، کیوں کہ:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

راجیش کھنہ اپنی کامیابیوں اور مقبولیت کے نشے میں اس قدر چُور تھے کہ انھوں نے تغیر کی واضح آہٹ سنی ہی نہیں جو ۱۹۷۱ء کی فلم ''آنند'' میں بابو موشائے کے روپ میں ان کے روبرو تھا۔ ظاہر ہے کہ راجیش کھنہ، جو فلم انڈسٹری میں ''کاکا'' کے نام سے مشہور تھے، اُس وقت کامیابی کی جس بلندی پر کھڑے تھے، وہاں سے سب بہت نیچے اور چھوٹے نظر آتے ہیں۔

اس وقت راجیش کھنہ انڈین فلم انڈسٹری کے سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے ہیرو تھے اور پروڈیوسرز کی گاڑیوں کی قطار ان کے بنگلے کے باہر کھڑی رہتی تھی، ہر آنے والی فلم گولڈن جوبلی ہٹ ثابت ہو رہی تھی۔

فلم ''آنند'' نے بھی آج کے حساب سے ایک سو آٹھ کروڑ کا بزنس کیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے ابھرتے ہوئے ''اینگری ینگ مین'' کی اداکاری کے تیور دیکھ لینے کے باوجود اُسے خوش دلی سے خوش آمدید نہیں کہا بلکہ انھوں نے جیا بھادری کو بھی امیتابھ بچن سے دُور رہنے کا مشورہ دیا۔ جیا بھادری اور راجیش کھنہ میں اچھی دوستی تھی مگر جب جیا نے امیتابھ بچن کے ساتھ فلم ''زنجیر'' میں کام کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تو راجیش نے انھیں challenge کیا کہ امیتابھ کبھی ہیرو نہیں بن سکتے اور وہ اس آدمی کے ساتھ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ امیتابھ جب جیا بھادری سے ملنے ''باورچی'' کے سیٹ پر آتے تو راجیش کھنہ کا سلوک نہایت غیر شائستہ ہوتا۔ وہ امیتابھ کو ایسے نظر انداز کر دیتے جیسے وہ اُسے پہچانتے ہی نہیں ہیں۔ جیا کو راجیش کے اس سلوک سے اتنا صدمہ پہنچا کہ اُنھوں نے اپنے دوست راجیش سے یہاں تک کہہ دیا کہ ''ایک دن دیکھنا، یہ کہاں ہوگا اور تم کہاں ہو گے۔'' جیا نے اپنے دل کی سنی اور جیت گئیں جب کہ راجیش کے اطراف پرستاروں کا اتنا ہجوم تھا کہ نہ وہ دل کی سن سکے اور نہ دماغ کی۔

راجیش کھنہ انڈین فلم انڈسٹری کی تقریباً تمام حسین اداکاراؤں [illegible] جلوہ گر ہو رہے تھے اور ہر ہیروئن کے ساتھ ان کی کیمسٹری قابلِ دید تھی۔ سلور اسکرین [illegible] بار کیمرہ ہو یا ڈریم گرل

ہیما مالنی، mesmirizing ممتاز ہو یا گلیمرس ایکٹریس شرمیلا ٹیگور، سبھی کے ساتھ راجیش کھنہ کو پسند کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے سے بہت کم عمر ٹینا منیم کے ساتھ بھی راجیش کھنہ نے کام کیا۔

ان دنوں ممتاز اور شرمیلا کے ساتھ راجیش کی جوڑی بے حد کامیاب سمجھی جاتی تھی اور ان ہیروئنز کے ساتھ ہر فلم سپر ہٹ ہوتی بلکہ اس وقت فلمیں ممتاز اور راجیش یا شرمیلا اور راجیش کی جوڑی کے نام سے ہی چلتی تھیں۔ راجیش پر جو گانا فلمایا جاتا، وہ گیت بھی سپر ہٹ ہو جاتا۔ تاہم گانوں کی مقبولیت میں اُس وقت کے گلوکاروں، خاص کر کشور کمار کی لازوال اور منفرد گائیکی کو نظرانداز کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ راجیش کا خیال تھا کہ کشور کمار کی آواز ان کے لیے سب سے مناسب ہے، لہٰذا راجیش پر فلمائے جانے والے بیشتر گیت کشور نے اپنی آواز سے امر کر دیے۔ یوں بھی کشور دا اور راجیش کھنہ میں بہت گہری دوستی تھی۔

۱۹۷۲ء سے منظر نامہ تبدیل ہونا شروع ہوگیا۔ ملکی حالات کے پیشِ نظر لوگ ایکشن ہیرو کی طرف ملتفت ہونے لگے جس سے فلموں کا مزاج بدلنے لگا۔ نہ صرف فلمی مزاج بلکہ اور بھی بہت کچھ۔ ایک طرف تو بابو مشائے، راجیش کھنہ کے دیے گئے چیلنج کے برعکس ہیرو کے طور پر اُبھرنے لگے اور دوسری طرف ٹینا منیم راجیش کی زندگی میں داخل ہوئیں۔ ٹینا نے فلم انڈسٹری میں آتے ہی اعلان کیا کہ وہ کاکا کی دیوانی ہیں مگر ہوا یوں کہ ہوش کاکا کھو بیٹھے۔ ڈمپل جیسی بیوی اور دو بچیوں کے ہوتے ہوئے وہ ایک بار پھر اپنے سے کہیں کم عمر لڑکی سے محبت کے دعوے دار ہوئے۔ ان دونوں کی ملاقاتوں کی افواہیں سنائی دینے لگیں۔ میڈیا نے بھی ان خبروں کو خوب اُچھالا، کاکا اور ٹینا نے اپنے نہایت قریبی تعلقات کا اعتراف بھی کیا اور تسلیم کیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور ایک ہی ٹوتھ برش share کرتے ہیں۔ اس جوڑی نے بیک وقت چار فلموں میں ساتھ کام کیا جو کامیاب رہیں، ان میں "سوتن"، "بے وفائی"، "ففٹی ففٹی" اور "سراغ" شامل ہیں۔ مگر دیکھا جائے تو ان فلموں کی کم عمر ہیروئن نے فلمی ناقدین کے اس احساس کو اور تقویت بخشی کہ اب کاکا کی عمر ڈھل رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کا وقت بھی۔

وقت بدلنے کا احساس سب کو تھا، سوائے راجیش کھنہ کے۔ وہ اب تک اسی زعم میں تھے کہ وہ انڈین سنیما کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ان کے حوالے سے نت نئی افواہیں گردش میں تھیں، کبھی سننے میں آتا کہ کاکا نے ایک فلم میکر کو تھپڑ مار دیا کہ اُس نے جس رول کی پیش کش کی تھی، وہ ان کے سپر اسٹار اسٹیٹس کے مطابق نہیں تھا۔ کبھی کہا جاتا کہ کاکا نے اینگری ینگ مین کے لیے کہا ہے کہ "ایسے اَین مَین آتے جاتے رہیں گے لیکن راجیش کھنہ کو کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔ میں کیا ایسے

ایرے غیرے لوگوں سے ڈر جاؤں گا؟ آپ لوگ اگر ایسا سوچتے بھی ہوں تو آپ کو ہمارا دربار چھوڑنا پڑے گا۔'' لیکن درحقیقت وہ ایسے ''ایرے غیرے'' سے ڈر گئے تھے۔ ''نمک حرام'' میں امیتابھ کی کامیابی نے انھیں خوف زدہ کردیا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے خود کو امیتابھ سے بڑا اداکار ثابت کرنے کے لیے امیتابھ کے پروڈیوسرز سے کہا کہ وہ انھیں فلم میں سائن کریں۔

ان تمام باتوں سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ راجیش کھنہ کس ذہنی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ یقیناً ہم سب اندازہ ہی لگا سکتے ہیں مگر اس ذہنی کیفیت کو بھگتا اُن کی بیوی ڈمپل نے۔ جن پر وہ اپنا تمام فرسٹریشن نکالنے لگے۔ یہی سبب ہے کہ شادی کے ابتدائی برسوں میں ہی یہ خبر گردش کرنے لگی کہ راجیش کے سُسر چنّی بھائی کپاڈیہ انھیں پاگل قرار دے رہے ہیں اور اُن کے خیال میں انھیں نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ راجیش میں ایک حیوان چھپا ہوا ہے۔ انھیں اپنی خواہشوں پر قابو نہیں ہے اور وہ کبھی کبھی انسان سے زیادہ ایک درندہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ انسان جسے کبھی دیوتا کا درجہ دیا جاتا تھا، آج اُسے حیوان اور درندہ کہا جارہا تھا۔ شاید اسی کو گردشِ زمانہ کہتے ہیں۔

بہرحال یہ گردش کا کا پر ہر طرف سے آرہی تھی۔ ایک طرف اُن کی سات فلمیں بری طرح فلاپ ہوئیں تو دوسری طرف ڈمپل ۱۹۸۴ء میں اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ راجیش سے علاحدہ ہوگئیں۔ بنگلے کا نام ''آشیرواد'' رکھ دیا گیا۔ لیکن راجیش آشیرواد دینے کے لیے تنہا رہ گئے۔ راجیش کی مقبولیت اُن کی ازدواجی زندگی کی سب سے بڑی خامی بن گئی۔ وہ اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہ تھے اور جگہ تھی کہ اُن کے ہاتھ سے چھوٹی جارہی تھی۔ نتیجتاً وہ کثرت سے شراب پینے لگے۔ ان تمام باتوں نے مل کر ان کی ازدواجی زندگی کا جو نقشہ ترتیب دیا، اُسے ڈمپل کے اس کرب ناک جملے میں دیکھا جاسکتا ہے کہ:

> The life and happiness in our house came to an end the day I and Rajesh got married.

لیکن خوشی اور زندگی سے تہی رفاقت کو ڈمپل نے دس سال نبھایا اور واقفِ حال لوگوں نے کہا کہ ڈمپل اب بھی علاحدگی اختیار نہ کرتیں، اگر راجیش اُن کے ساتھ مخلص ہوتے۔ لیکن یہ شاید راجیش کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کیوں کہ اس قدر چاہے جانے والے شخص کا دوسرے کو چاہنے کی صلاحیت سے محروم ہوجانا کچھ ایسی اَن ہونی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راجیش کی دیوانی ہونے کی دعوے دار ٹینا کو دیر سے سہی، یہ احساس بہرحال ہوگیا کہ کا کا کا پیار کا وعدہ فقط فقط ہی ہوتا

ہے۔لہٰذا یہ محبت بھی اختتام پذیر ہوئی اور ٹینا نے شوبھا کو دیے گئے ایک انٹرویو میں اس کی وجہ یوں بیان کی کہ:

Kaka was incapable of loving anyone. He was only ever in love with himself.

افسوس ناک بات ہے کہ پردۂ سیمیں پر رومانی سپر اسٹار بن کر لاکھوں دلوں کو موہ لینے والا اپنی زندگی کے پردے پر محبت میں پوری طرح ناکام نظر آتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ راجیش کھنہ کا down fall شروع ہو چکا تھا اور وہ انڈین فلم انڈسٹری میں اس بلندی پر نہیں رہے تھے جو کبھی ان کی ملکیت تھی۔ مگر وہ اب بھی لوگوں کے دلوں پر راج کر رہے تھے۔ اس حقیقت کا بھرپور اظہار راجیش کی سیاسی سرگرمیوں سے سامنے آتا ہے۔ راجیش، گاندھی خاندان کے بھی پسندیدہ اسٹار تھے۔ لہٰذا راجیو گاندھی کی خواہش پر انھوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی۔ راجیش کھنہ کی مقبولیت سے کانگریس کو خاطرخواہ فائدہ ہوا۔ کیوں کہ وہ کانگریس کی انتخابی مہم کے لیے پورے ملک میں گھومے، ریلیاں نکالیں۔ وہ جہاں جاتے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوجاتے، یہ سب لوگ راجیش کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آتے۔ راجیش نے یہاں بھی اپنا سحر جمایا اور لوگ ان کے ہندی اور انگریزی بھاشن سن کر خود فراموشی کی کیفیت میں گرفتار ہوجاتے تھے۔ بالآخر ۱۹۹۱ء میں کاکا نے لوک سبھا کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ شومیِ قسمت کہ ان کے مقابل ان کے روایتی حریف شتروگھن سنہا تھے۔ ایک بار پھر افواہوں کا بازار گرم ہوا اور وہ میڈیا جو ہمیشہ کاکا اور امیتابھ بچن کو ایک دوسرے کے مقابل کرتا رہا، اُس نے یہ موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور کہا کہ راجیش نے سیاست میں آنے کا فیصلہ محض امیتابھ کو تکلیف دینے کے لیے کیا ہے۔ حقیقت تو معلوم نہیں کہ کیا تھی مگر یہ معلوم ہے کہ اس مشکل وقت میں کافی برسوں کی علاحدگی کے باوجود ڈمپل اُن کا ساتھ دینے اُن کے ساتھ آکھڑی ہوئیں۔ ڈمپل نے راجیش سے صلح کرلی۔ اُن کی انتخابی مہم میں سرگرمی سے حصہ لیا اور راجیش کی فلم ''جے شیو شنکر'' میں کام بھی کیا۔ راجیش کھنہ یہ انتخاب شتروگھن سنہا کو ہرا کر نئی دہلی سے جیت گئے اور پانچ سال تک لوک سبھا کا حصہ رہے۔ ۱۹۹۶ء میں راجیش سیاست میں منظرِ عام سے تو ہٹ گئے مگر سونیا گاندھی کا داہنا ہاتھ بنے رہے اور ۲۰۰۲ء میں اترپردیش کے انتخابات میں کانگریس کا پرچار بھی کیا۔

کہنے کو تو راجیش کھنہ ۱۶۳ فلموں میں کام کر کے (جن میں ۱۰۱ فلموں میں وہ بطور سولو ہیرو سامنے آئے)، اور ۶ فلمیں پروڈیوس کر کے اپنا سنہرا دور گزار گئے مگر اس کے بعد بھی تمام عمر

کسی نہ کسی حوالے سے اخبارات کی زینت بنے رہے۔ ویسے تو فلم نگری کے باسی خود کو خبروں میں ''ان'' رکھنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے ہیں، بھارت کی حالیہ فلم ''ہیروئن'' سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ وہ اس کے لیے کسی بھی حد تک چلے جاتے ہیں، مگر یہ بھی ہے کہ نہ صرف بھارت بلکہ پاکستان میں بھی فلمی شائقین راجیش کھنہ کے بارے میں جاننا چاہتے تھے اور میڈیا یہ کام بخوبی انجام دیتا رہا۔ کبھی راجیش کھنہ کے گھر میں آنے والی انیتا ایڈوانی کا کھوج لگانے کی کوشش ہوتی تو کبھی چودہ، پندرہ سالہ سابیا نامی اس لڑکی کے حوالے سے راجیش کھنہ کی جوانی کو شرم ناک بتایا جاتا جس کے بارے میں کہا گیا کہ انھوں نے اس لڑکی کو ''انوکھا رشتہ'' نامی فلم میں ہیروئن کا رول دینے کا جھانسا دے کر اپنی نفسانی خواہشات کے آگے سر جھکانے پر مجبور کردیا اور کچھ عرصہ کھلونے کی طرح کھیل کر چلتا کیا۔ سابیا کو اس حد تک لانے کے لیے کاکا نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا، نہایت افسوس ناک ہے۔

اسی دوران کاکا نے خود ایک دھماکا کیا اور فلم ''وفا'' میں سارا خان کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ اس فلم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کاکا ستر سال کی عمر میں بھی ذاتی طور پر اُسی پرانے رومانی امیج میں زندہ تھے، مگر فلمی شائقین نے اس عمر میں انھیں اس انداز میں پسند نہ کیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ فلمی شائقین امیتابھ کی بھی ایسی ایک بولڈ فلم ''نشبد'' کو مسترد کر چکے ہیں۔

پھر افواہ اُڑی کہ آنند اور بابو موشائے ایک بار پھر آمنے سامنے ہوں گے، جب کاکا بگ بی کی میزبانی میں پیش کیے جانے والے ریئلیٹی شو ''بگ باس'' میں وائلڈ کارڈ انٹری کے ذریعے داخل ہوں گے مگر پھر خبر آئی کہ کاکا کے ذہین داماد اکشے کمار نے اپنے اثر ورسوخ سے ایسا کچھ نہ ہونے دیا جس سے کھنہ فیملی کو پھر خفت اُٹھانی پڑے۔

پھر خبر آئی کہ وہ پہلی بار کسی الیکٹرونک برانڈ کو indorse کرنے جا رہے ہیں۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ یہ سب لائم اینڈ لائٹ میں رہنے کی ہوس ہے جو کاکا کو نت نئے راستے سجھاتی ہے۔

پھر پتا چلا کہ کاکا نے اشوک تیاگی کی فلم ''ریاست'' سائن کرلی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس فلم میں بھی راجیش کھنہ کے بارے میں کہا گیا کہ انھوں نے امیتابھ کی فلم ''سرکار'' کئی بار دیکھ دیکھ کر اُن سے انسپریشن حاصل کی ہے۔ اور ''ریاست'' میں اپنایا راجیش کھنہ کا گیٹ اپ بھی امیتابھ کی ''سرکار'' والی look سے مماثل ہے۔ گویا امیتابھ کا عفریت ساری زندگی ان کے ساتھ رہا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ کاکا ساری عمر اپنی زندگی کے سنہرے دور سے باہر نہیں نکل پائے۔

مگر اس فلم کے ریلیز ہونے سے قبل راجیش کھنہ کی علالت کی خبریں آنے لگیں۔ وہ

اسپتال کے چکر لگانے لگے مگر ان کی دوست انیتا ایڈوانی میڈیا کو یقین دلاتی رہیں کہ راجیش بالکل ٹھیک ہیں، مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ واقعی بیمار تھے اور انھیں دیکھ بھال کی ضرورت تھی، ایسے میں ایک بار پھر ان کی مونس و غم خوار ڈمپل اُن کا ساتھ دینے آ پہنچیں۔ ڈمپل کے اس اقدام کو جہاں ان کے مداحوں نے سراہا، وہاں راجیش کے مداحوں نے سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ ان مداحوں کا کہنا تھا کہ ڈمپل ایک نہایت لاپروا اور خود غرض، بدتہذیب عورت ہیں جو ۲۸ سال بعد صرف کاکا کی جائیداد کی لالچ میں واپس ان کے پاس آئی ہیں۔

یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے راجیش اور ڈمپل کی شادی کی ناکامی کی ذمے داری بھی ڈمپل پر ڈال دی تھی کہ ڈمپل کو راجیش سے شادی کے وقت خود اندازہ نہیں تھا کہ ان کی آنے والی فلم ''بوبی'' اس قدر ہٹ ہوجائے گی اور وہ شہرت کے آسمان کو چھولیں گی۔ مگر فلم کی غیر معمولی کامیابی نے انھیں اس احساس میں مبتلا کردیا کہ انھوں نے شادی کے فیصلے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ ان کے کچھ ''بہی خواہ'' بار بار انھیں احساس دلاتے کہ اگر انھوں نے شادی نہ کی ہوتی یا کاکا نے ان پر پابندی عائد نہ کی ہوتی تو وہ اس وقت بامِ عروج پر ہوتیں۔ اس احساس نے ان کے اور کاکا کے درمیان شادی کے آغاز سے ہی دُوری پیدا کردی جسے کاکا دوسری محبتوں اور دوستیوں سے پُر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ''کاکا'' کے بامِ عروج سے نیچے آنے میں ان کے شادی کرلینے کا اہم ہاتھ تھا، کیوں کہ وہ ایک رومانی ہیرو تھے، جب کہ ان کے مشکل وقت میں ڈمپل نے علاحدگی اختیار کرتے ہی نہ صرف خود فلموں میں کام کرنا شروع کردیا بلکہ بعد میں کاکا کی خواہش کے خلاف اپنی بیٹیوں کو بھی فلم میں کام کرنے کی اجازت دی جس سے کاکا کو شدید تکلیف پہنچی۔

ڈمپل ان تمام افواہوں اور باتوں کو نظرانداز کر کے دن رات راجیش کے ساتھ رہیں۔ انھوں نے کوشش کی کہ راجیش کھنہ کی ہر خواہش پوری کریں۔ اُنھوں نے کاکا کی فیملی کو یک جا کیا اور ان کی تیمارداری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ اس موقعے پر کاکا کی دوست انیتا نے بھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر ۱۸ر جولائی ۲۰۱۲، کو راجیش کھنہ سب کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ڈمپل کے مطابق کاکا کے آخری الفاظ تھے کہ .Pack up, the show is over۔

راجیش کھنہ کے دیہانت کی خبر بھارت اور پاکستان میں نہایت دُکھ کے ساتھ سنی گئی اور دونوں ملکوں کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے اس خبر کو نمایاں جگہ دی۔

راجیش کے condolences میں پہلے پہنچنے والے اسٹارز میں امیتابھ بچن بھی شامل

تھے۔ جن کے بارے میں راجیش کی شدید علالت کے دنوں میں یہ خبر گرم رہی کہ وہ کاکا کے بارے میں کیے گئے سوال تک سے بغیر چلے گئے مگر اب امیتابھ نے آکر نم آنکھوں سے کاکا کے پیر چھوئے۔ ادھر کاکا نے اپنے خصوصی پیغام میں اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کی محبتوں کو سلام پیش کیا۔

راجیش کھنہ اپنے تئیں تو یہ کہہ گئے کہ Pack up, the show is over، مگر میڈیا ابھی راجیش کھنہ کی کہانی pack up کرنے کے موڈ میں نہیں ہے اور ان کے دیہانت کے بعد بھی نت نئی خبروں کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔

سب سے حیران کن خبر تو یہ ہے کہ راجیش کھنہ نے اپنا بنگلہ، بینک بیلنس اور تمام جائیداد اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دی ہے اور اس میں ان کی قانونی بیوی ڈمپل کپاڈیہ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ راجیش کے اس اقدام پر سب حیران ہیں، جب کہ راجیش کے پرستار ان کی اس وصیت پر بے حد خوش ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں ڈمپل اسی سلوک کی مستحق تھیں۔ مگر اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اپنی موت سے چند ہفتے قبل تیار کی گئی اس وصیت میں ڈمپل کی مرضی شامل رہی ہو اور انھوں نے عملاً یہ ثابت کیا ہو کہ وہ راجیش سے محبت کا تعلق رکھتی تھیں، دولت کا نہیں۔ دوسری طرف خبر تو یہ بھی رہی کہ انیتا ایڈوانی بھی جائیداد میں حصے دار بننے کی خواہاں نہیں۔ مگر پھر معلوم ہوا کہ انھوں نے جائیداد میں حصے کے لیے کھنہ فیملی کو نوٹس بھیجا جو جھوٹا ثابت ہوا جب کہ ڈمپل نے تاحال ایسی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

راجیش کھنہ کی بڑی بیٹی ٹوئنکل کھنہ فلمی دنیا میں بطور ہیروئن کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اپنی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے معروف اداکار اکشے کمار سے شادی کر کے گھر بسانے میں لگ گئی ہیں اور اب دو بچوں کی ماں ہیں جب کہ رینکی کھنہ نے سمیر سران نامی بزنس مین سے شادی کی ہے اور دونوں بیٹیاں کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔

اسی طرح یہ خبر بھی اخبارات اور چینلز کی زینت ہے کہ راجیش اپنے بنگلے کا نام ''آشیرواد'' سے ''وردان آشیرواد'' کرنے کی خواہش رکھتے تھے اور اب اس کا نام یہی رکھ کر ان کے خاندان والے اس بنگلے کو میوزیم میں تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک خبر یہ بھی گرم ہے کہ کاکا نے رازوں سے بھرا ایک خط اپنی آخری فلم ''ریاست'' کے ڈائریکٹر اشوک تیاگی کو سونپ دیا ہے۔ یہ خط ایک لفافے میں بند ہے اور اسے راجیش کی آخری خواہش کے مطابق ۲۸ دسمبر کو ہونے والی فلم ریلیز کے موقعے پر پڑھا جائے گا۔ سب کو انتظار ہے

اس ''آخری خط'' کے کھلنے کا۔ یعنی راجیش کھنہ کا سفر ''آخری خط'' سے ''آخری خط'' تک رہا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ فلم کی کامیابی کے لیے استعمال کیا جانے والا کوئی حربہ ہو۔

مگر سب سے دل چسپ افواہ یہ ہے کہ ''ہندی فلم جگت'' کے پہلے سپر اسٹار راجیش کھنہ امرتسر میں نہیں بلکہ پاکستان کے شہر فیصل آباد کے قریب ''بورے والا'' میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اُن کے والد لالہ ہرآنند کھنہ المعروف بہ جتن نواس، ایم سی ماڈل گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور راجیش کھنہ اسی کے پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔ راجیش کھنہ کا گھر بھی وہاں موجود ہے جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اس دومنزلہ مکان میں راجیش کھنہ نے اپنی عمر کے ابتدائی پانچ سال گزارے تھے، پھر ۱۹۴۷ء میں ان کے والد ریٹائر ہوگئے اور ۱۹۴۸ء میں امرتسر (بھارت) ہجرت کر گئے۔ کہا جارہا ہے کہ وہاں راجیش کے اسکول رجسٹر اور دیگر ثبوت موجود ہیں اور ان کے ہم جماعت اور ہم محلہ جلد ایک فلم فیسٹول منعقد کریں گے جو راجیش کھنہ کی یاد میں ہوگا۔ ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ راجیش کھنہ اپنی طبعی عمر کے اختتام کے بعد بھی ایک ایسا منفرد مقام رکھتے ہیں جسے پانا کسی کا خواب ہی ہوسکتا ہے۔

ان کے بارے میں داستانیں تراشی جاتی رہی ہیں اور اب بھی ان داستانوں کا سلسلہ جاری ہے۔ راجیش کھنہ سے متعلق تمام عمر کی باتوں میں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا تو مشکل ہے مگر ایک بات طے ہے کہ راجیش کھنہ انڈین فلم انڈسٹری کے پہلے سپر اسٹار تھے اور انھوں نے آخر سانس تک اپنی زندگی اسی طمطراق کے ساتھ گزاری۔

○○○

فلمی مزاح کا بے تاج بادشاہ — لہری

سیّد حسیب احمد

''میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہنسنے سے سفید بال کالے ہوجاتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ پھر وہ اتنے بُرے نہیں معلوم ہوتے۔'' عہدِ حاضر کے ممتاز ترین مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کے اس جملے سے انسانی زندگی میں مزاح کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ خصوصاً آج کے دور میں جب بقولِ شاعر انسان کا یہ حال ہوچکا ہے کہ:

سوچتے سوچتے سوالوں پر
برف جمنے لگی ہے بالوں پر

مسکرانے یا ہنسنے کا کوئی ایک لمحہ بھی اس کے لیے کسی متاعِ جاں سے کم نہیں۔ ایک عام انسان کے لیے اس زمانے میں تفریح کا سب سے بڑا اور ہمہ وقت ذریعہ ٹیلی وژن اور فلمیں ہیں۔ اگرچہ اب سینماؤں میں جاکر فلم دیکھنے کا رواج تقریباً ختم ہوچکا ہے اور پاکستانی فلم انڈسٹری تباہ ہوچکی ہے، تاہم بعض پاکستانی چینلز پر پرانی پاکستانی فلموں کی نمائش اس سنہرے دور کے اداکار اور اداکاراؤں کو زندہ رکھے ہوئے ہے، جنھوں نے فنِ اداکاری کو لازوال بنا دیا۔ ان فلموں میں ہیرو، ہیروئن کے بعد کامیڈین وہ کردار ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز ٹھہرتا ہے۔

فلموں میں طنز و مزاح کے حوالے سے تین مکاتبِ فکر موجود ہیں، اوّل مکتبِ فکر وہ ہے جس میں سوانگ رچا کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس میں منور ظریف، عمر شریف اور اسماعیل تارا وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ دوسرے مکتبِ فکر میں اداکار اپنے خط و خال اور حرکات و سکنات سے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں، ان میں نذر، آصف جاہ، رنگیلا اور جان ریمبو

وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ تیسرا مکتبِ فکر اس لحاظ سے سب سے مشکل ہے کہ اس کے پیروکاروں میں ذہانت اور برجستگی کا ہونا لازمی ہے۔ اس میں اداکار محض اپنے برجستہ اور چبھتے ہوئے جملوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اس طرزِ اسلوب میں یعقوب اور لہری نمایاں ترین ہیں۔ مگر لہری کو جو دائمی مقبولیت، احترام اور عزت حاصل ہوئی، وہ ایک مثال ہے۔

چھریرے بدن کے خوش شکل سفیر اللہ، جنھیں دنیا مشہور کامیڈین لہری کے نام سے جانتی ہے، نے ۱۹۵۵ء میں فلم ''انوکھی'' سے پاکستانی فلم نگری میں قدم رکھا اور پھر ظریف، نذر، آصف جاہ اور ان کے بعد منور ظریف، نرالا اور ننھا جیسے منجھے ہوئے مزاحیہ اداکاروں کی موجودگی میں اپنے منفرد طرزِ ادا کے باعث بلندی کی تمام منزلیں سر کرتے چلے گئے۔

لہری نے تقریباً تین سو فلموں میں کام کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ انھوں نے یہ بلندی ایسے ملک میں حاصل کی جہاں فلم بین طبقہ عموماً کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث سوانگ اور حرکات وسکنات سے پیدا کی جانے والی کامیڈی سے زیادہ محظوظ ہوتا ہے۔ لہری نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں ایک خود ساختہ، شگفتہ پیرایے میں، کمالِ اداکاری سے فلم بینوں کے دل جیتے۔ لہری سیٹ پر جا کر اسسٹنٹ سے دریافت کرتے، ''ہماری اسٹارٹ کی لائن کیا ہے؟'' اور اس لائن سے پورا سین یاد کر لیتے۔ اور بعد میں تو وہ فی البدیہہ جملے کہنے لگے جن پر فلم بین تالیاں بجاتے۔ اُن کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے حسنِ کمال وفن کی بدولت وہ نہ صرف ہر دوسری فلم میں کاسٹ ہوتے بلکہ کہانی کے ہیرو بھی بنے اور روزینہ، صاعقہ جیسی فلموں میں سائیڈ ہیرو کے مزاحیہ کردار بھی خوب صورتی سے ادا کیے۔ لہری کے لیے بطورِ خاص گیت بھی لکھوائے گئے جن میں احمد رُشدی کا ''یہ ادا، یہ ناز، یہ انداز'' (روڈ ٹو سوات) بہت مقبول ہوا۔ ان کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پنجابی فلم کے معروف ہدایت کار ایس سلیمان نے انھیں اپنی پنجابی فلم ''یار دوست'' میں کاسٹ کیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ فلم پنجابی زبان میں تھی مگر لہری کے تمام مکالمے اردو زبان ہی میں تھے۔ مگر لہری نے صرف تین پنجابی فلموں میں کام کیا۔ اپنی کی آخری پنجابی فلم میں وہ سولو ہیرو تھے اور اس وقت کے سپر اسٹارز سنتوش کمار اور محمد علی نے فلم میں سائیڈ رول ادا کیے تھے۔

لہری کے جملوں میں معاشرے کی بدلتی اقدار اور بے ڈھنگے طریقہ کار پر لطیف طنز ملتا تھا۔ جیسے:

> آج کل لوگوں نے روایات کا جنازہ اُٹھا کر قبرستان میں رکھ دیا ہے، مگر اُسے دفن نہیں کرتے۔ (شمع اور پروانہ)

آج کل لڑکیاں دل سے پہلے جیب دیکھتی ہیں اور خالی جیب میں نہ اُن کا
دل سماتا ہے اور نہ اُن کا بل۔ (دل لگی)

کیا زمانہ آ گیا ہے! کار چل رہی تھی تو پیار چل رہا تھا۔ کار بند ہوئی تو پیار
بھی بند ہو گیا۔ (دل میرا، دھڑکن تیری)

لہری کی سب سے عمدہ چیز ان کی comic timing تھی جس کا اظہار انھوں نے پہلے سنتوش کمار، درپن، رتن کمال اور سیّد کمال کے ساتھ اور پھر محمد علی، وحید مراد اور ندیم کے ساتھ کیا۔

اُن کا ذاتی خیال تھا کہ ان کی سب سے زیادہ ذہنی ہم آہنگی محمد علی کے ساتھ تھی۔ ویسے وہ وحید مراد، ندیم اور نیر سلطانہ کو بھی پسند کرتے تھے۔ جب کہ مزاحیہ اداکاروں میں اپنے علاوہ منور ظریف اور معین اختر کو بہت پسند کرتے تھے۔

لہری ڈائیلاگ کی ادائی کے وقت اپنا چہرہ سپاٹ رکھتے مگر ان کی اداکاری سے دیکھنے والے کو ہنسی آ جاتی۔ تاہم وہ فلم بینوں کو زبردستی ہنسانے کی کوشش کبھی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا اصول تھا کہ ''آپ کا جی چاہے تو ہنسیں، نہ جی چاہے تو نہ ہنسیں۔ بجائے اس کے کہ انسان ہنسانے کے لیے عجیب و غریب حرکات و سکنات یا غیر شائستہ گفتگو کرے۔'' وہ مزاحیہ اداکار کی dignity سے واقف تھے اور کہتے تھے کہ ''ایک مسخرے یا کارٹون بالفاظ دیگر جوکر اور کامیڈین میں فرق ہونا چاہیے۔ ہم نے زیادہ تر اپنی فلموں میں کامیڈین کو جوکر کے روپ میں پیش کیا، حالانکہ جوکر اور کامیڈین میں بہت فرق ہے اور اسے ہمارے فلم سازوں کو سمجھنا چاہیے۔'' لہری نے خود اس فرق کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا اور شہرت کے ساتھ ساتھ عزت اور احترام بھی حاصل کیا۔

لہری نے اپنی فلموں میں بڑے متنوع اور مختلف یادگار کردار ادا کیے۔ انھوں نے عین جوانی میں بوڑھے آدمی کا کردار بھی بڑی خوب صورتی سے نبھایا، ''دل میرا دھڑکن تیری'' اور ''نورین'' کے کردار کون فراموش کر سکتا ہے؟ فلم ''نورین'' میں لہری نے المیہ کردار بڑی مہارت سے ادا کیا تھا مگر فلم بینوں نے انھیں صرف کامیڈین کے رول میں دیکھنا چاہا، اسی لیے یہ فلم کامیاب نہیں ہو سکی۔

لہری کی اداکاری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے جتنے کردار بھی کیے، ان میں فطری اور بنیادی تقاضوں کو ضرور مدِنظر رکھا۔ چاہے وہ ''آج اور کل'' کا لالچی باپ سیٹھ دولت

علی ہو، ''دل لگی'' کا موٹر مکینک بیجو استاد ہو، ''دل میرا دھڑکن تیری'' کا شاہد ہو یا ''انجمن'' کا نواب محبوب یا ''پھول مرے گلشن کا'' کا کنجوس باپ۔ وہ ہر کردار کی ادائی میں کامیاب نظر آئے۔ اسی لیے بہترین مزاحیہ اداکاری کے بے شمار اعزازات حاصل کیے۔

لہری کو ۱۹۹۶ء میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے جب صدارتی ایوارڈ تمغۂ حسنِ کارکردگی ملا تو کسی نے پوچھا کہ صدارتی ایوارڈ حاصل کر کے کیسا لگ رہا ہے؟ انھوں نے برجستہ جواب دیا، ''صدارتی ایوارڈ اس وقت ملا جب حسن باقی ہے اور نہ کارکردگی۔'' یہ تھی اُن کی ذہانت اور بذلہ سنجی جو آخر تک ان کے ساتھ رہی۔

یہ لہری کی ذہانت ہی تھی کہ انھوں نے وقت سے پہلے پاکستانی فلم انڈسٹری کے زوال کا اندازہ لگا لیا تھا اور فلموں سے دور ہوگئے تھے۔ وہ پاکستانی فلم انڈسٹری کی تباہی کا سبب VCR کو قرار دیتے تھے، کیوں کہ VCR نے گھر بیٹھے لوگوں کو سستی تفریح مہیا کردی تھی۔ بقول اُن کے ''کم خرچ بالانشین والی بات ہوگئی تھی۔''

فلموں سے دوری میں انھوں نے ''لہری ان ٹربل'' اسٹیج پلے کیا جو اسلام آباد، شکاگو اور ٹورنٹو میں ہوا اور پسند کیا گیا۔

ایک فلم میں کام کے دوران پروڈیوسر کی لاپرواہی نے لہری کی صحت کو سخت نقصان پہنچایا۔ وہ اپنی قوت ارادی سے اس تکلیف سے نکل آئے مگر پے در پے مختلف عارضوں نے انھیں صاحبِ فراش کردیا۔ وہ آہستہ آہستہ دین کی طرف راغب ہوتے چلے گئے اور دنیا کی بے مروّتی یا بے ثباتی ان کا مسئلہ کبھی نہیں بنی۔ وہ بے حد صابر، حوصلہ مند اور پُرسکون انسان ثابت ہوئے۔

بیماری اور ٹانگ کٹ جانے کے باوجود وہ اطمینان کی دولت سے مالا مال تھے۔ پاکستانی فلم انڈسٹری نے حسبِ معمول انھیں فراموش کردیا تھا، صرف معین اختر ان سے ملنے جاتے رہتے تھے۔ لیکن گزشتہ سال جب ماضی کی مقبول اداکارہ شبنم بنگلہ دیش سے پاکستان تشریف لائیں تو اپنے مختصر دورے میں بھی لہری سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئیں۔ شاید اُس وقت ہمارے دیگر فن کاروں کو کوئی ندامت محسوس ہوئی ہو۔ تاہم لہری کسی سے کوئی شکوہ یا گلہ نہیں رکھتے تھے اور اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔

۱۳ر ستمبر ۲۰۱۲ء کو لہری کا انتقال ہوگیا اور ان کے ساتھ سنجیدہ اور باوقار مزاح کا سنہرا دور ختم ہوا۔

○○○

اردو کی چند ویب سائٹس

www.urdupoint.com
www.urduadab.wetpaint.com
www.urdunet.com
www.urdupages.com
www.theurdu.com
www.urduplus.com
www.gahwara-e-adab.com
www.urdustar.com
www.urdupoetry.com
www.ilmedunya.com
www.urdumanzil.com
www.urdu123.com
www.bbc.com/urdu
www.urduworld.com
www.dastak.com
www.urdustan.com
www.kitabghar.com
www.urducorner.com
www.u_hoo.com
www.urdudunya.tk
www.haroof.com
www.loveurdu.com
http://alqlm.org
www.urdudost.com
www.urdughar.com
www.newurdustuff.com
www.pakistaniadab.wordpress.com
www.urdunovels.webs.com
www.urdukorner.net
www.urdumaza.com

رضیہ فصیح احمد—
مطالعے کے چند پہلو

رضیہ فصیح احمد اردو دنیا میں ایک افسانہ نگار، ناول نویس، شاعرہ اور طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔ "اسالیب" کے سال نامے میں ہم نے رضیہ فصیح احمد کے فن و شخصیت پر ایک خصوصی گوشہ ترتیب دیا ہے۔ مضامین کے علاوہ چند مشاہیر کے خطوط بنام رضیہ فصیح احمد بھی شامل اشاعت ہیں۔ ان خطوط کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں جہاں ایک خاص عہد کی ادبی فضا کا عکس ملتا ہے، وہیں بعض ایسے ادبی مباحث بھی نمایاں ہوئے ہیں جنھیں آج بھی یقیناً دل چسپی اور توجہ سے پڑھا جائے گا۔ (ادارہ)

رضیہ فصیح احمد سے گفتگو

عنبریں حسیب عنبر

عنبر: کچھ برسوں سے دیکھا گیا ہے کہ آپ اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی بہت تواتر کے ساتھ اسٹوریز لکھ رہی ہیں، اس کا بنیادی سبب کیا ہے؟ کیا یہ، کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے ___ والا معاملہ ہے یا اردو میں واقعی تشفی نہیں ہو پاتی؟

رضیہ فصیح احمد نہیں بھئی عنبریں! یہ بات نہیں ہے۔ میں انگریزی میں تواتر سے بالکل نہیں لکھ رہی۔ اصل بات یہ تھی کہ امریکا میں ایک رائٹنگ ورکشاپ میں جانے لگی تھی۔ اس میں ضروری تھا کہ ہر شخص دو صفحے لکھ کر لائے۔ میں نے دو صفحے کا مزاح لکھنا شروع کر دیا۔ یہ مضامین ڈان میں کئی مہینے تک چھپے۔ بہت عرصے پہلے میں نے پاکستان سے دو ایک کہانیاں انگریزی میں بی بی سی کو بھیجی تھیں جو وہاں کی ورلڈ سروس سے نشر ہوئیں۔ بس یہ سبب رہا انگریزی میں لکھنے کا، اس کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے۔

عنبر: حال ہی میں برطانیہ کے ایک مشہور ادبی میگزین Granta نے پاکستانی ادب، صحافت، کلچر اور خاص طور پر مصوری کے حوالے سے ایک پورا شمارہ نکالا، کیا وہ آپ کی نظر سے گزرا۔ آپ کے خیال میں یہ جو پاکستانی ادب اور جو انتخاب اس میں کیا گیا ہے، خاص طور پر ہم عصر قلم کاروں کا، کیا وہ ایک نمائندہ انتخاب ہے؟

رضیہ فصیح احمد: اتفاق ہے کہ وہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ لندن سے چھپنے والی کتاب Loops of Fire میں نے دیکھی ہے جس میں ساری کہانیاں آگ کے حوالے سے ہیں اور میری بھی کہانی Inferno مجھے بتائے بغیر اس میں شامل کی گئی ہے۔ جس رسالے کا آپ نے

ذکر کیا اس میں نمائندہ انتخاب ہو نہ ہو، جو بھی اس طرح کا کام ہو، وہ اچھا ہی ہوتا ہے کیوں کہ میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں ہمارے ادب اور فن کی وہ نمائندگی نہیں ہے کہ جو ہونی چاہیے۔ میں جس زمانے میں مصوری کے بارے میں تفصیل سے پڑھ رہی تھی مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ عالمی پینٹنگز میں چغتائی تک کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اس کا کوئی جواز نہیں تھا کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ تصویروں کی زبان عالمی زبان ہے۔

عنبر: چلیے ہم اپنے ادب کے دو نمائندہ ناموں کے بارے میں بات کیے لیتے ہیں، قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی سے آپ کی ملاقاتیں رہی ہیں، ان دونوں کے تخلیقی وژن اور شخصی انفرادیت کو کیسے بیان کریں گی، یعنی موازنہ نہیں بلکہ ان دونوں کے بارے میں جو یقیناً اردو ادب کی رجحان ساز شخصیات ہیں، ان دونوں اہم فکشن رائٹرز کا جداگانہ تجزیہ کیسے کریں گی؟

رضیہ فصیح احمد: عصمت چغتائی سے میری ملاقاتیں کراچی ہی میں رہیں۔ وہ مجھے سادہ، بے باک ہونے کے ساتھ مہربان بھی لگیں۔ جب کہ ایک افسانہ نگار نے کہا کہ ماضی میں جب وہ بمبئی میں رہتی تھیں وہ اتنی ملنسار نہیں تھیں۔ میں نے جو سوال پوچھے ان کا جواب انھوں نے سادگی اور بے باکی سے دیا۔ عصمت آپا بے تکان لکھتی تھیں۔ افسانوں میں ان کے کردار جان دار ہوتے تھے اور زبان کا چٹخارہ ان میں اور بھی جان ڈال دیتا تھا۔ اس کی مثالیں ان کی بہت سی کہانیوں میں مل جائیں گی۔ مجھے اس وقت بطورِ خاص ان کی کہانی ''بچھو پھوپی'' یاد آرہی ہے۔ میں نے ان کی تحریر میں مارواڑی زبان کے الفاظ بھی دیکھے کیوں کہ وہ بہت عرصے جودھ پور ریاست میں رہی تھیں۔ مختار زمن نے ادا جعفری کے گھر ان سے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے ڈبلیو زیڈ احمد نے آپ کے شوہر سے یہ شرط لگائی تھی کہ آپ ان سے شادی نہیں کریں گی۔ عصمت آپا نے نہایت بھول پن سے کہا، ''بھئی! ہمیں اس کی خبر نہیں۔ شاہد نے پروپوز کیا تو ہم نے کہا، ہمیں الگ ایک فلیٹ لے کر دو گے۔ انھوں نے کہا، 'ہاں' تو ہم نے ان سے شادی کرلی۔'' اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ ایک رات کسی شادی میں وہ رات کو اپنی دوست کے گھر رہ گئیں تھیں جس پر ان کے بھائی غالباً جسیم بیگ نے بہت ہنگامہ کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جن دنوں عصمت یہاں آئی تھیں انھیں نسیان کا مرض شروع ہو چکا تھا، اس بات کی تحقیق کی ضرورت ہے۔

قرۃ العین حیدر سے میں ایک بار کراچی، پھر امریکا اور پھر دلّی میں ملی۔ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ کچھ لوگوں سے وہ بے تکلفی سے ملتی تھیں اور کچھ سے لیے دیے رہتی تھیں۔ لباس کو خاص اہمیت دیتی تھیں۔ سنسناٹی میں صبح چائے پیتے ہوئے میں نے ان کی تصویر کھینچی تو انھوں نے برا مانا

اور کہا کہ یوں تصویر نہیں لینی چاہیے کہ آدمی کے کچھ نجی لمحات بھی ہوتے ہیں۔ میں یہ بتادوں کہ وہ اس وقت شلوار قمیص میں تھیں۔ وہ status conscious تھیں۔ اس بات کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا ان کی تحریروں سے، خاص طور پر ان کی وہ کتاب ''کار جہاں دراز ہے'' سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا تخلیقی وژن وسیع تھا۔ وہ تحقیق بھی کرتی تھیں، کہیں کہیں شبہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی تحقیق کے وہ حصے بھی ناول میں ڈال دیتی تھیں جن کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے یہ بات غلط ہو۔

عنبر: ایک بات جو ہم اکثر سوچتے ہیں کہ پاکستان میں اردو کے ساتھ انگریزی میں فکشن لکھنے والی ایک تازہ نسل بھی ادھر پندرہ بیس برس میں نمایاں ہوئی ہے، کچھ لوگ پہلے سے بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ رہے ہیں، تو ان لوگوں کے تخلیقی کاموں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

رضیہ فصیح احمد: میں نے ایسے کئی ناول پڑھے ہیں جو انگریزی میں لکھے گئے اور غیر ممالک میں چھپے۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کو زیادہ پبلسٹی تو ملی، بکے بھی زیادہ ہوں گے مگر ضروری نہیں کہ ان لکھنے والوں کی تخلیقات ان سے بہتر ہوں جو اردو میں لکھی گئیں یا لکھی جارہی ہیں۔

عنبر: اچھا اسی تناظر میں یہ بتایئے کہ قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین نے اپنے اپنے رجحان ساز ناولوں ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' کے ترجمے خود کیے اور دونوں اردو کے ساتھ انگریزی پر مکمل عبور بھی رکھتے تھے، اس کے باوجود ان کے اپنے انگریزی کے ترجمے کوئی خاص رنگ نہ جما سکے، آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟

رضیہ فصیح احمد: میں نے ان دونوں کے ناول اردو ہی میں پڑھے اور انھیں انگریزی میں پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انگریزی میں رنگ نہ جمنے کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ غیر ممالک میں تبصرے ان ہی کتابوں پر ہوتے ہیں جو وہاں چھپیں۔ پھر یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کتابوں کی زبان اس زبان سے مختلف ہو جو آج کل وہاں رائج ہے اور اسی لیے وہاں پرورش پانے اور انگریزی میں لکھنے والوں کو فوقیت حاصل ہے۔

عنبر: یقیناً دونوں وجوہات اہم ہیں۔ یہ بتایئے کہ کہا جاتا ہے کہ اردو ناول کے مقابلے میں ہمارے ہاں اردو افسانے نے غیر معمولی ترقی کی ہے، کیا آپ اس رائے سے متفق ہیں؟

رضیہ فصیح احمد: میرے خیال میں اردو ناول نے بھی خاصی ترقی کی ہے، مگر ناول چونکہ ضخیم ہوتے ہیں، اس لیے کم لوگ ان کو پڑھتے اور ان پر تبصرہ کرتے ہیں جب کہ افسانے رسالوں میں چھپنے کی وجہ سے فوری طور پر نظروں میں آجاتے ہیں۔ میری مثال لے لیجیے۔ فرداً فرداً ان پر اچھے

تبصرے ہوئے مگر کم پڑھے گئے اور اب بھی جب نام گنوائے جاتے ہیں تو میرا نام کم لیا جاتا ہے، خاص طور پر ہندوستان میں یہ صورتِ حال موجود ہے۔

عنبر: نام لیے جانے پر سوال ذہن میں آیا کہ خواتین کے حوالے سے فکشن کی شاید سب سے اہم نقاد ممتاز شیریں کے بارے میں، ان کے کام کے بارے میں اور ان کی شخصیت کے بارے میں کیا کہیں گی؟

رضیہ فصیح احمد: میں ممتاز شیریں سے کبھی نہیں ملی۔ ان کی تحریریں پڑھی ہیں۔ خواتین نقادوں میں شاید وہ اوّل بھی تھیں اور ممتاز بھی۔ ان کے افسانوں میں جدت تھی، ان کا ایک افسانہ ٹین ایجر کرش پر یاد ہے اور دوسرا غالباً ''دیپک راگ'' پر تھا۔ خواتین تنقید نگار، مردوں کے مقابلے میں اب بھی کم کم نظر آتی ہیں۔

عنبر: اب آپ کی بابت بات کرتے ہیں۔ آپ نے افسانے بھی لکھے ناول بھی، بچوں کے لیے بھی لکھا، شاعری بھی کی، انگریزی میں بھی الگ سے لکھا، ترجمے بھی کیے— تو اتنا سب کچھ کرنے کے بعد، اب پلٹ کر دیکھیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے، آپ نے جو کام کیا اُسے کیسے دیکھتی ہیں؟

رضیہ فصیح احمد: ایک تو مختلف اصناف میں لکھتے رہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ نویں جماعت سے اب تک لکھنے کے باوجود میرے ہاں بلاک نہیں آیا۔ ترجمے میں نے کم کیے ہیں۔ ویسے کام بہت کیا ہے مگر اپنے بارے میں کبھی خوش فہمی نہیں رہی۔ میں چھاؤنیوں میں رہتی تھی۔ جب کبھی کراچی آتی تو دوچار لکھنے والوں سے ملاقات ہوجاتی۔ بڑے لکھنے والے جب میرے کسی افسانے کا ذکر کرتے یا خط لکھ کر تعریف کرتے تو مجھے بہت حیرت ہوتی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں آدم جی انعام لینے گئی تو بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہوئی اور تعجب ہوا کہ یہ لوگ میرے افسانے پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرح جب مبین مرزا میرے ناول ''صدیوں کی زنجیر'' کی تعریف کرتے ہیں یا جیسے ایک بار انھوں نے میرے افسانے ''کھوج'' کے بارے میں کہا کہ یہ اردو کے ان افسانوں میں ہے جن کو ترجمہ کرکے عالمی سطح پر پیش کیا جانا چاہیے تو مجھے یقین نہیں آتا۔ میں اس سلسلے میں آپ کی رائے بھی چاہوں گی۔ ویسے یہ ہے کہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ میں نے اپنی بساط بھر اچھا کام کیا ہے۔

عنبر: خیر ''کھوج'' تو واقعی بہت خوب صورت افسانہ ہے۔ may be or may be not کے فلسفے کو نہایت عمدگی سے افسانے میں ڈھالا گیا ہے اور ازل و ابد تو آپ کے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک ہے۔ اچھا یہ بتایئے! کن اوقات میں لکھتی ہیں، کرداروں کا انتخاب کیسے کرتی ہیں، کہانیوں کا پلاٹ کیسے ذہن میں تخلیق پاتا ہے؟

رضیہ فصیح احمد: لکھنے کے اوقات کبھی مقرر نہیں کیے۔ شروع میں پورا افسانہ ذہن میں مرتب ہو جاتا تھا، اس کے بعد قلم اٹھاتی تھی۔ اب بعض اوقات خاص نکتے لکھ لیتی ہوں اور پھر کمپیوٹر پر۔ پورا افسانہ لکھتے وقت تبدیلی بھی آتی جاتی ہے۔ بعض مرتبہ کہانی کسی کردار سے شروع ہوتی ہے، اس کھوج سے کہ یہ ایسا کیوں ہے، کبھی کسی واقعے سے اور کبھی کسی ایسے جملے سے، جو سوچ میں ڈال دیتا ہے۔

عنبر: کہتے ہیں، کسی بھی رائٹر کے اسٹائل میں اس کے بہت سے پسندیدہ رائٹرز کی انفرادیت کا شعوری یا لاشعوری عکس ہوتا ہے، آپ اپنی تحریروں پر ایسے کن رائٹرز کے اثرات محسوس کرتی ہیں؟

رضیہ فصیح احمد: میں خود کسی لکھنے والے کا اثر اپنی تحریر میں نہیں پاتی، پڑھنے والے شاید نشان دہی کر سکیں۔

عنبر: اردو کی نئی بستیوں میں آباد، ادب کے بڑے بڑے نام، وہاں پرورش پانے والی نسل کو ادب سے جوڑنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی اپنی اولاد، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، اُن کی تحریریں اردو میں پڑھنے تک سے قاصر ہیں۔ اس کے کیا اسباب ہیں؟

رضیہ فصیح احمد: اس کا جواب مشکل ہے۔ میں نے از خود اس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی کہ کوئی ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس سے صورت حال تبدیل ہو مگر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی۔ اسکول جانے سے پہلے وہاں بچے اردو بولتے ہیں۔ اس کے بعد انگریزی بولنا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اردو بولنا مشکل لگتا ہے۔ اصل میں ان کو اردو سیکھنے اور بولنے میں افادیت نظر نہیں آتی۔ انگریزی میڈیم میں پڑھنے والوں کا پاکستان میں بھی یہی رویہ ہے۔

عنبر: آج کے ادیبوں کو ان مسائل سے نپٹنے کے لیے کیا اقدام کرنے چاہئیں اور کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

رضیہ فصیح احمد: بات وہی ہے، یہاں بھی اگر زبان کی افادیت ختم ہو جائے گی تو پھر اس کا چلن بھی ختم ہونے لگے گا۔ دوسری بات یہ کہ ماں باپ کو گھروں میں بچوں کو اردو کی کتابیں اور رسائل پڑھنے کی ترغیب دینا چاہیے۔

عنبر: بالکل دُرست! اچھا یہ بتائیں کہ آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کو اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کم سراہا گیا اور کیا کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ امریکا جانے اور وہاں رہنے کے باعث، آپ پاکستان کی مین اسٹریم سے کٹ کے رہ گئیں اور آپ کے لیے یہاں ایسی کوئی لابی موجود نہیں جو آپ کے تخلیقی کاموں کے بارے میں ادبی حلقوں کو کسی حد تک آشنا رکھ سکے؟

رضیہ فصیح احمد: یقیناً محسوس ہوتا ہے اور دوسرے بھی یہ بات کہتے رہتے ہیں۔ رہی لابی کی بات تو جب میں پاکستان میں تھی تب بھی میری کوئی لابی نہیں تھی۔

آس ہے کہ میرا کام ہی لابی کا کام دے تو دے ورنہ صبر۔ ہاں ایک مزے کی بات سنیے۔ حالیہ اردو کانفرنس میں کتابوں کے اسٹالز کے پاس سلیم اختر ملے۔ بولے آپ کو انعام مل گیا۔ میں نے پوچھا کون سا انعام مجھے تو ۱۹۶۶ء کے بعد سے کوئی انعام نہیں ملا۔ بولے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ باقاعدہ آپ کے نام کا اعلان ہوا ہے۔ میں نے کہا مجھے نہ اعلان کی خبر، نہ انعام کی۔ کوئی نام بتا کر کہنے لگے ان صاحبہ سے پوچھیے۔ پھر بعد میں ایک دن فاطمہ حسن نے بتایا کہ ایک ادیبہ اور شاعرہ ہیں فرحت پروین، وہ یہ ایوارڈ ہر سال دیتی ہیں، ان کی طرف سے میرے لیے بھی اس ایوارڈ کا اعلان ہوا ہے۔ فاطمہ حسن نے ان سے رابطہ کر کے بتایا کہ یہ ایوارڈ مجھے ۲۰۱۱ء کے مارچ میں دیا جائے گا۔ ایک بار خوب لطیفہ ہوا، ایک اور انعام یافتہ صاحب نے اپنے انعام پانے کی اطلاع جب مجھے امریکا میں دی تو رحم کھا کر یہ بھی کہا کہ ویسے یہ آپ کا حق تھا۔

عنبر: یہ بھی خوب ہے! ہماری طرف سے ایوارڈ ملنے کی مبارک باد قبول کیجیے اور یہ بتائیے کہ کہا جاتا ہے کہ خواتین ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعرات کی راہ ہموار کرنے میں ترقی پسند تحریک کا بنیادی کردار رہا ہے، آپ اس خیال سے کس حد تک متفق ہیں؟

رضیہ فصیح احمد: ترقی پسند تحریک عورتوں کی آزادی کے حق میں تھی۔ اس سے پہلے ادب میں زنانہ مردانہ خانے تھے۔ رسالے بھی الگ تھے۔ اس تحریک نے اس حد بندی کو توڑا۔ نئی لکھنے والی کئی خواتین خود اس تحریک میں شامل بھی تھیں۔

عنبر: نئی لکھنے والیوں کے ذکر سے سوال ذہن میں آیا کہ اس وقت جو نئے لوگ لکھ رہے ہیں، افسانے اور تنقید اور جو لوگ شاعری کر رہے ہیں، اُن کے کام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

رضیہ فصیح احمد: امریکا میں مجھے یہاں کے لکھنے والوں کی زیادہ چیزیں نہیں ملتیں۔ جب سے یہاں آئی ہوں بہت سے نئے اور معیاری رسائل دیکھے ہیں اور اندازہ ہوا ہے کہ افسانے، شاعری اور تنقید میں بہت کام ہو رہا ہے، جب کہ امریکا میں میرا تاثر یہ تھا کہ اب صرف لکھنے والے ہی پڑھنے والے رہ گئے ہیں۔

عنبر: اچھا، اردو زبان اور اردو ادب کے مستقبل کو آپ کیسا دیکھتی ہیں؟

رضیہ فصیح احمد: میرا خیال ہے کہ ہر ملک کا ادب اس کے ملکی حالات کا کچھ نہ کچھ تابع ہوتا ہے۔ اردو زبان باہر کے ممالک میں یونی ورسٹیوں میں پڑھائی جارہی ہے مگر جب میں پڑھانے والوں

سے پوچھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اردو بولنے اور لکھنے والوں کے بچے اردو کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ جب دوسرے ملکوں میں آپ کے ملک کی عزت نہ ہو تو زبان کی کیا ہوگی۔ انگریزی اپنے عروج پر اس وقت پہنچی جب سلطنتِ برطانیہ کا سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ ہم اپنے ادب کو دوسروں تک پہنچانے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کررہے ہیں۔ دوسرے ممالک اپنے ادب کے ترجموں کے لیے ادارے بناتے ہیں، ہمارے ہاں انفرادی طور پر لوگ تراجم کررہے ہیں۔ پھر بھی زیادہ زور دوسری زبانوں کے تراجم اردو میں کرنے پر ہے، اپنا ادب پھیلانے پر کم ہے۔

عنبر: یہ واقعی اہم باتیں ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اچھا پھر یہ بتائیے کہ موجودہ ادب اور اس کی معاشرے میں صورتِ حال سے آپ مطمئن ہیں؟

رضیہ فصیح احمد: یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے تھا۔ ملک سے باہر رہتے ہوئے میں اس سلسلے میں نہ کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ مجھے کہنا چاہیے۔ میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ کام کرنے والے کام کررہے ہیں۔ یہ بھی دیکھتی ہوں کہ اب اردو زبان میں بہت تواتر سے آدھے الفاظ انگریزی کے بولے جاتے ہیں۔ یہ شاید بڑے شہروں کا المیہ ہوتا مگر میڈیا اب اسے ہر جگہ پہنچانے کی شعوری یا غیرشعوری کوشش کررہا ہے۔

○○○
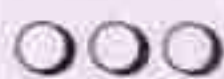
رضیہ فصیح احمد کی افسانہ نگاری پر ایک نظر

پروفیسر سحر انصاری

ادب کی دنیا میں نام پیدا کرنے والوں کی ادبی اور ذہنی نشوونما کے بارے میں کوئی ایک بات کلیے کے طور پر کہنا ممکن نہیں، لیکن اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچپن اور لڑکپن ہی سے ایسے آثار نمایاں ہوتے ہیں کہ آئندہ کی تخلیقی ذہانت اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد کو بھی بچپن ہی سے ایسا ماحول میسر آیا کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد وہ ہجرت کرکے ایک نئے ماحول میں سانس لینے لگیں۔ ایک جمی جمائی فضا سے نکل کر وہ ایک ایسی سرزمین پر آگئیں جو انھیں بوجوہ عزیز تو تھی لیکن اُس وقت کی افراتفری، مالی مشکلات، ترکِ سکونت نے ناگوار حد تک نفسانفسی کی فضا پیدا کردی تھی، اُس وقت بھی رضیہ فصیح احمد کے لیے کتابیں ہی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں نویں جماعت کا امتحان دینے کے بعد پہلا افسانہ لکھا۔ دیکھا جائے تو اُس وقت سے اب تک وہ ایک تخلیقی عمل کے طویل دورانیے سے گزری ہیں اور ہنوز تازہ دم ہیں۔

گوتم بدھ کے رنج گزیدہ افکار و خیالات نے رضیہ فصیح احمد کو بھی انسانوں کی بیماری، بڑھاپا اور ہلاکت جیسے مسائل پر سوچنے کی راہ دکھائی۔ لیکن ان عوامل کو فطری جبر اور زمینی حقائق کے طور پر تسلیم کرنے کے بعد وہ ایک اور بڑے دائرۂ فکر میں داخل ہوگئیں۔ وہ خود کہتی ہیں، ''میری کوشش ہوتی ہے کہ میں عام زندگی کے نیچے چھپی ہوئی زیریں لہریں دکھاؤں۔'' رضیہ فصیح احمد کے پیش نظر انسانی معاشرے کی سچی اور جھوٹی قدریں اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ موجود رہتی ہیں۔ اس تضاد اور کش مکش میں وہ اپنے کرداروں کو سچائی کے ساتھ پیش کردیتی ہیں اور اس عمل میں انھیں

آفاقی قدروں سے ہم رشتہ کر کے انسان شناسی کا ایک زاویہ پیدا کرتی ہیں۔

گرد و پیش کی زندگی اور اپنے عہد کے تغیرات سے واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ رضیہ فصیح احمد کو ماضی کا ملبہ کریدنے اور تاریخ میں دور تک سفر کرنے کا بھی حوصلہ ہے۔ وہ فکشن کی دنیا میں اپنا ایک تسلیم شدہ مقام بنا چکی ہیں۔ وہ اس لحاظ سے یقیناً اہمیت رکھتی ہیں کہ اُن کے پہلے ناول ''آبلہ پا'' کو جامعہ کی سطح پر نصاب میں شامل کیا گیا اور اُسے ایک ممتاز ادبی انعام کا مستحق بھی ٹھہرایا گیا۔

رضیہ فصیح احمد کا سرمایۂ تخلیق، کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے خاصا وقیع ہے اور شاید اپنے معاصرین میں حجم کے لحاظ سے کسی سے کم بھی نہیں اور اس میں خاص پہلو یہ ہے کہ اُن کی تحریر کی کوالٹی کہیں متاثر نہیں ہوئی۔

اس وقت اُن کے فنِ افسانہ نگاری پر کچھ کہنا مقصود ہے۔ رضیہ کے افسانوی مجموعے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں ایسے کردار ہیں جنھیں زندگی کے تناظر میں رکھ کر لکھا گیا ہے۔ رضیہ کا یہ کہنا بالکل سچ نظر آتا ہے کہ وہ بعض کرداروں کو اتنا پسند کرتی ہیں کہ اُن سے سچ مچ کی دنیا میں ملنے کے لیے طبیعت بے چین ہوجاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے حقائق انھیں اپنی گرفت ہی میں رکھتے ہیں۔

رضیہ فصیح احمد کے افسانے طویل بھی ہیں، مختصر بھی، انھوں نے چند علامتی افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دو پاٹن کے بیچ'' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اُن کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ وہ اپنے موضوعات جہاں تاریخ سے اخذ کرتی ہیں، وہیں گرد و پیش کی زندگی میں رونما واقعات کو بھی کامیابی سے تخلیقی سطح پر اجاگر کرتی ہیں۔ اُن کا طویل افسانہ ''آگ اور پانی'' کراچی کی شدید بارشوں کی یادگار ہے۔ اسی طرح ''ایکلی دراز'' اور ''آشیاں گم کردہ'' میں کرداروں کے عام لیکن انتہائی حقیقت پسندانہ رویے پائے جاتے ہیں، ''بے سمت مسافر'' ایسے افراد کی کہانی ہے جن کی سفید پوشی تغیرات زمانہ کے ہاتھوں ختم ہوجاتی ہے اور انھیں زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد نے دنیا کے کئی ممالک کی سیر و سیاحت کی ہے اور خاصی مدت سے امریکا میں مقیم ہیں۔ چناں چہ بعض افسانوں کی فضا اور کردار مغربی حوالوں کو بھی سمیٹے ہوئے ہیں۔ جیسے ''گھر'' اور ''بند گھڑی'' یا ''پائلٹ'' — رضیہ فصیح احمد اپنی کہانیوں سے مخلصانہ تعلق رکھتی ہیں۔ کسی کہانی کو بھی پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اسے سرسری طور پر لکھا گیا ہے۔ ان کے بعض افسانے مثلاً

''مگر ایک شاخ نہالِ غم''، ''ذم''، ''عوامِ متحدہ موت کا کنواں''، ''مجھی''، ''شہرزاد''، ''گم نصیب'' بطورِ خاص حوالے کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں کوٹھیوں، بنگلوں اور کاروں کی وہ فضا بھی ہے جس پر کبھی کبھی رضیہ نکتہ چینی کا شکار بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ''گم نصیب'' جیسے افسانے میں تو ایسے ادنیٰ کردار بھی ہیں جن کا سارا مکالمہ ش ق کے بغیر ہی ہوا ہے۔ وہ کردار خوب کو ''کھوب'' اور زبان کو ''جبان'' کہہ کر اپنی کلاس کا خود ہی تعین کر دیتا ہے۔ اسی طرح اُن کے کردار نہ شہروں تک محدود ہیں، نہ مذہب و عقیدے تک۔ شہر کے ساتھ ساتھ گاؤں اور دیہات بھی سانس لیتے نظر آتے ہیں اور مسلم کرداروں کے ساتھ ساتھ بعض افسانوں میں عیسائی اور ہندو کردار بھی پوری سچائی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

رضیہ فصیح احمد اُن افسانہ نگاروں میں ہیں جن پر اُن کی اپنی انفرادیت کے سوا کوئی اور چھاپ لگانا مشکل ہے۔ اُن کے اسلوب میں تاریخی شعور اور فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ دل چسپ بیانیہ بھی قائم رہتا ہے اور اسے برقرار رکھنے میں وہ کہیں کہیں طنز و مزاح اور ڈرامائی کیفیات سے بھی کام لیتی ہیں۔ رضیہ فصیح احمد کی حیثیت افسانہ نگار اور ناول نویس کے طور پر جدید ادب کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان کے یہاں وقت کے لامتناہی بہاؤ کے باوجود زندگی کا ایک تسلسل ملتا ہے، یہ تسلسل خطِ مستقیم میں ہے اور نہ دائرے میں بلکہ اس میں عہدِ گزشتہ، دورِ حاضر اور آئندہ ایک گراف کی صورت نشیب و فراز سے آشنا کرتے رہتے ہیں اور کسی لمحے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم حقائقِ زیست سے دور ہو گئے ہیں۔ یہ رضیہ فصیح احمد کے فن کی بڑی پہچان بھی ہے اور اُن کی کامیابی کا نشان بھی۔

○○○

رضیہ فصیح احمد کے دو ناول

مبین مرزا

انسانوں کی طرح کتابیں بھی اپنی تقدیر اپنے ساتھ لے کر آتی ہیں۔ جس طرح کچھ لوگوں کی قسمت ہر قدم پر یاوری نہیں کرتی اور انھیں زندگی کے سفر میں بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے، اسی طرح کا مسئلہ بعض کتابوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ انھیں اپنا آپ منوانے کے لیے وقت کی کٹھن مسافت بڑی ثابت قدمی سے طے کرنی پڑتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ایسا ہی مسئلہ رضیہ فصیح احمد کے ناول ''صدیوں کی زنجیر'' کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اردو کے سنجیدہ فکشن قارئین کے حلقوں میں اس ناول کا ذکر تو اس کی اشاعت کے بعد سے ہی رہا ہے لیکن حقیقتاً اس کی جتنی پذیرائی بجا طور پر ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہوئی ہے۔ اس کے کئی اسباب رہے ہیں، آئندہ سطور میں ہم پہلے ذرا انھی کی بابت کچھ گفتگو کریں گے۔

ہم نے یہ ناول اشاعت (۱۹۸۸ء) کے فوری بعد کے دنوں میں پہلی بار پڑھا تھا اور اس اولین قرأت نے ہی دل و دماغ پر اس کا ایک نقش چھوڑا تھا۔ رُبع صدی کے زمانی فاصلے سے چیزوں، لوگوں اور واقعات کو پلٹ کر دیکھنا بجائے خود ایک دل چسپ تجربہ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تجربہ ہر بار اور ہر شخص کے لیے خوش گوار ثابت نہ ہو، لیکن یہ طے ہے کہ اس کے توسط سے حقائقِ حیات پر غور کرنے کا کوئی ایسا پہلو ضرور سامنے آتا ہے جو ہمیں سوچنے اور سمجھنے کا کچھ الگ ہی سامان فراہم کرتا ہے۔ بہرحال ہم بات کر رہے تھے رضیہ فصیح احمد کے ناول ''صدیوں کی زنجیر'' کی۔ جن دنوں ہم نے یہ ناول پڑھا، اتفاق یہ ہے کہ اس سے کچھ پہلے قرۃ العین حیدر کا ناول ''گردشِ رنگِ چمن'' شائع ہوا تھا اور اُس زمانے میں اس کی خاصی گونج تھی۔ اس کی دو وجہیں تھیں: اول یہ کہ کئی برس کے وقفے کے

بعد قرۃ العین حیدر کا کوئی ناول چھپا تھا۔ دوم یہ کہ اس ناول نے پہلی بار ہمارے فکشن میں تشخص کے بحران کے مسئلے کو چھیڑا تھا اور نتیجتاً انگریزی استعمار کے زیر نگیں نوے برس گزارنے والے برصغیر کی لوئر کلاس ہی نہیں بلکہ مڈل اور اپر کلاس کی نسلوں تک کے آگے بڑا سا سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے جس طرح اس عہد کے بعد کے برصغیر کی تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی قدروں کی تبدیلی کا منظرنامہ اس ناول میں ابھارا تھا اور پھر اُسے جس طرح اپنے عہد سے لا جوڑا تھا، اُس نے اس سوالیہ نشان کو مزید سنجیدہ اور غور طلب بنا دیا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے سوالوں کو تہذیب سے معاشرت اور سیاست سے تصوف تک برصغیر کی زندگی کے ابعاد میں پھیلا کر دیکھا تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں ہمارے ادبی حلقوں میں اس ناول اور اس کے تخلیقی پیراڈائم کے اٹھائے ہوئے سوالوں کی بڑی بازگشت سنائی دیتی تھی اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ رضیہ فصیح احمد کا ناول ”صدیوں کی زنجیر“ منظرِ عام پر آ گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُنھی دنوں اردو اکادمی، ملتان اور حلقہ ارباب ذوق، لاہور کے بعض اجلاسوں میں رضیہ فصیح احمد کے اس ناول کا تذکرہ ہوا اور اس پر گفتگو رہی۔ پاکستان کی سیاسی صورتِ حال کے سیاق و سباق میں یہ ناول جو سوال اُٹھاتا ہے اور مشرقی و مغربی متحدہ پاکستان اور پھر اس کے دولخت ہونے کے حوالے سے فکری، سیاسی، سماجی اور معاشی حقائق پر جس طرح کلام کرتا ہے، اس کی بابت ایک سنجیدہ مکالمے کا آغاز ہو رہا تھا۔ گفتگو کا جو ماحول ہمارے ادبی حلقوں میں اُس وقت تھا، اس کی رَو میں عین ممکن تھا کہ جو مسئلے اُس وقت ”گردشِ رنگِ چمن“ اور ”صدیوں کی زنجیر“ کے حوالے سے چھڑے تھے، اور جن سوالوں پر سنجیدگی سے بات کی ضرورت محسوس کی گئی تھی، ان پر تسلسل سے بات جاری رہتی تو اپنے ادب و سماج کی بابت کچھ اور اہم مباحث ہمارے سامنے آتے — لیکن عین اُسی موسم میں قومی سطح پر ہمیں ایک ماجرا پیش آ گیا۔ ہوا یوں کہ سیاسی تبدیلیوں نے عوام و خواص کی ساری توجہ ایک بار پھر اپنی جانب مبذول کرا لی۔ فضائی حادثے کے باعث جنرل ضیاء الحق کا گیارہ سال سے زیادہ طویل دورِ حکومت اختتام کو پہنچا۔ ملک ایک بار پھر سیاسی گٹھ جوڑ، الیکشن کی تیاری اور دائیں بائیں بازوؤں کی آویزش کی وجوہات کی بنا پر ایک طرح کے انتشار کی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ ادیب، شاعر اور نقاد بھی معاشرے ہی کا حصہ ہوتے ہیں، لہٰذا بدلتے ہوئے حالات سے ان کا اثر پذیر ہونا فطری بات ہے۔ تو یوں ہوا کہ اس زمانے میں ادبی حلقے جن سوالوں سے گونجتے اور جن کتابوں سے بحث کرتے تھے، وہ سب کے سب متغیر ہوتے ہوئے ملکی حالات کے زیرِ اثر ماند پڑتے چلے گئے۔

درج بالا سطور میں مختصراً بیان کی گئی یہ صورت حال اصل میں ایک پس منظر فراہم کرنے کے لیے ہے۔ قصہ یہ ہے کہ رضیہ فصیح احمد کے دو ناولوں ''صدیوں کی زنجیر'' اور ''یہ خواب سارے'' پر اجمالاً اس وقت اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے ''صدیوں کی زنجیر'' کی اولین قرأت کے بعد اُنھی دنوں اور بعدازاں بھی اس کے حوالے سے سوچی گئی کچھ اور باتیں ازخود ذہن میں تازہ ہونے لگیں۔ اب یہ کہنا کہ رضیہ فصیح احمد ایک طویل عرصے سے دیارِ غیر میں مقیم ہیں، اس لیے ادبی حلقوں اور خصوصاً ناقدین کرام کی محفلوں تک ان کی رسائی نہیں ہے۔ اور یوں وہ عصری ادب کی مین اسٹریم میں اس طرح شامل نظر نہیں آتیں جیسی کہ بعض دوسری شخصیات، جنھوں نے ان کی بہ نسبت کیفیت و کمیت ہر دولحاظ سے کہیں کم کام کیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ حق ہے لیکن کسی بھی جینوئن ادیب کے کام کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ایسی پیش پا اُفتادہ باتوں اور ایسے غیر ادبی معیارات کو درخورِ اعتنا نہیں جاننا چاہیے۔ اس لیے کہ جلد نہ سہی بدیر ہی سہی، توجہ طلب نگارشاتِ ادب اور سنجیدگی سے اپنا کام کیے چلے جانے والے ادیب بہرحال اپنا critical acclaim حاصل کر کے رہتے ہیں۔

''صدیوں کی زنجیر'' مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ اس ناول کا پہلا تعارف تو اسی طور ہوتا ہے یا ہونا چاہیے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے صرف اور صرف مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کی کہانی کے طور پر سمجھنے کی کوشش قطعی درست نہ ہوگی، بلکہ اس کی فکری و فنی تفہیم کے ضمن میں یہ بات گم راہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ اس ناول میں مصنفہ نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی مسائل کو تو پیشِ نظر رکھا ہی ہے، اور ان کے جغرافیائی تفاوت کو بھی اُجاگر کیا ہے اور ان کی معاشی تفریق کی نشان دہی بھی ضرور کی ہے لیکن وہ سارا کھیل تماشا جو اس ناول کے کینوس پر رچایا گیا ہے، وہ محض ایک مملکت کے دو سیاسی دھاروں میں بٹنے اور ٹوٹ کر دو ریاستیں بننے سے عبارت نہیں ہے۔ اگر بات بس اتنی ہی ہوتی تو آج رُبع صدی بعد اس کتاب کو یوں دوبارہ اٹھا کر دیکھنے کی مجھے بھلا کیا ضرورت تھی۔ ایسے تو نہ جانے کتنے ہی تخلیقی کام نقش و نگارِ ماضی ہو کر رہ گئے — اس طرح کہ اب ان کی یاد بھی باقی نہیں۔ اس ناول میں المیہ تو بے شک مشرقی پاکستان ہی کا پیش کیا گیا ہے لیکن رضیہ فصیح احمد نے ذمے داری اور غیر معمولی حد تک معروضیت کے ساتھ اس پورے مسئلے کی نوعیت کو کہانی کے بدلتے ہوئے پیٹرن میں اس طرح آشکار کیا ہے کہ یہ صرف مشرقی یا مغربی پاکستان کا مسئلہ نہیں رہتا بلکہ اس سطح سے کہیں بلند ہو کر تاریخ کے دوراہے پر آئے ہوئے قومیت کے تصور اور اس کے تحت زخم کھاتی انسانی زندگی کا المیہ بن جاتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے اس المیے کو انسانی اعمال اور تقدیر کے مناسبات کے باہمی تال میل کے ساتھ دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کے رنگ بدلتے

ہوئے کردار، بل کھاتی ہوئی کہانی، منقلب ہوتی ہوئی زندگی، مسخ ہوتی قدریں، منہدم ہوتی ہوئی تہذیب اور مفلوج ہوتے ہوئے آدرش اپنی رفتار اور سمت کا تعین اپنی ہی کسی داخلی قوت کے تحت کرتے ہیں۔

کسی زندگی کے ظاہر میں، کسی قوم کے خارج میں یا کسی تہذیب کے شہود میں جو کچھ رونما ہوتا ہے، وہ تو محض اظہار ہے، لیکن وہ جو رمز ہے اور وہ جو اصل ہے، وہ تو کہیں باطن میں، کہیں داخل میں کارفرما ہوتی ہے۔ تو جب کوئی زیرک ادیب، کوئی بڑا فن کار افراد کے واقعات، قوم کے حادثات اور تہذیب کے سانحات پر قلم اٹھاتا ہے تو اصل میں وہ انھیں عنوان بنا کر ان کی اسی بنیاد اور سرچشمے تک پہنچنے کی جستجو کرتا ہے۔ یہ کاوش اور یہ تڑپ ہر اس فن کار کے اندر ہوتی ہے جو زندگی، موت اور تقدیر کے سوالوں کا سامنا کرنے کی جرأت تخلیقی سطح پر پالیتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ سچائی کیا ہے، کہاں ہے، کیسی ہے اور وہ اپنا اظہار کب کب اور کس کس شکل میں کرتی ہے؟ زندگی تو نہ ختم ہونے والے سوالوں کا سلسلہ ہے— جیسے خلا کا سفر، جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی کہ ہر منزل سے آگے نئی منزلیں دریافت ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لکھنے والا اپنے کرداروں کی کہانی کہتے ہوئے اپنے سوالوں کے جواب پانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ایک جواب کے آخری سرے پر پھر کوئی نیا سوال اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ فن کا سفر جاری رہتا ہے، لیکن کسی ایک مرحلے پر آ کر کردار رخصت طلب کر لیتے ہیں یا پھر خود لکھنے والا اپنے سوالوں کو آگے سرکا کر خود کہیں چلا جاتا ہے— عدم کے پردے میں— کسی بڑی حقیقت کی طرف۔

ہمارے یہاں برصغیر کی تقسیم کے موضوع پر بہت لکھا گیا اور اس کے بعد مشرقی پاکستان کے حوالے سے بھی خاصی کہانیاں لکھی گئی ہیں، ناول بھی شائع ہوئے ہیں۔ بیشتر لکھنے والوں نے اس قضیے کو خاص جغرافیائی اور سیاسی سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا ہے۔ کہانیاں وہ بھی کم زور نہیں ہیں۔ ان میں سوالوں کا سامنا بھی کیا گیا ہے، حقائق سے رُوگردانی بھی نہیں کی گئی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے بالعموم بنگال کے مسئلے کے صرف ایک رُخ کو کھولتے یا پھر زیادہ سے زیادہ دوسرے کی طرف محض اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس رضیہ فصیح احمد نے ''صدیوں کی زنجیر'' میں اس مسئلے کو اُن خطوط پر دیکھا ہے جو کبھی متوازی نظر آتے ہیں، کبھی متخالف سمتوں میں اور کبھی ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے۔ اس ناول کی کہانی بنگال کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دوسرے صوبوں سندھ اور پنجاب ہی نہیں بلکہ قبائلی علاقوں کے مخصوص مسائل اور رویوں کو پیش کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ یہ سب علاقے مصنفہ کی سیر و سیاحت اور ناول کی وسیع جغرافیائی حدود کو ہی بیان نہیں کرتے بلکہ کہانی کی معنویت اور کرداروں کی زندگی اور مسائل سے اس طور وابستہ و پیوستہ ہیں کہ ان

کے بغیر نہ تو اس کہانی کا تصور قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے کرداروں کی معنویت واضح ہو سکتی ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں اور باہم مل کر ایک نامیاتی وحدت تشکیل دیتے ہیں۔

یہاں ہمارے ذہن میں ایک سوال آتا ہے کہ پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے وہ لوگ جو مشرقی پاکستان کے مسئلے سے علاقائی، لسانی، سماجی، نظریاتی، تہذیبی یا مذہبی کسی بھی طرح کا ربط رکھتے ہیں، اُن کے لیے رضیہ فصیح احمد کے اس ناول کی قدر و قیمت قائم ہے لیکن وہ لوگ جو ان ملکوں میں نہیں امریکا، کینیڈا، برطانیہ یا امارات میں کسی جگہ آباد ہیں اور اس سارے معاملے کو کسی بھی طرح کی جذباتی وابستگی کے بغیر دیکھتے ہیں، کیا یہ کہانی ان کے لیے بھی کسی گہری معنویت کی حامل ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ وہ یوں کہ گو اس ناول میں علاقائی حوالے بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن اُن پر تقدم حاصل ہے اُس انسانی صورتِ حال کو جو الم و نشاط، وصال و ہجر اور نیکی بدی کی ماہیت کو جاننے کے لیے رضیہ فصیح احمد نے ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ اب اگر ایک لمحے کو یہ کہا جائے کہ اس ناول میں جغرافیائی حوالوں میں مصنفہ سے بعض جگہ فروگزاشت ہوئی ہے تو بھی ناول کی قدر و منزلت میں فرق نہیں آتا۔ اس لیے کہ یہ ناول ہے، جغرافیہ سمجھانے والی گائیڈ بک یا تاریخ پڑھانے والی کتاب نہیں۔ اگر اسے تاریخی ناول تسلیم کیا جائے تو اور کسی نہ کسی وجہ سے اگر ایسا نہ کیا جائے تو بھی، یعنی دونوں ہی صورتوں میں اس کی ادبی قدر و قیمت کا تعین ادبی اصولوں کی رُو سے ہوگا۔ یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ تمام تر نظریاتی اتفاق کے باوجود تاریخ کی پوری کتاب بسا اوقات انسانی احساس کے اُس تار میں معمولی سے معمولی درجے کی صرف ایک لرزش تک پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہے جو ادبی پیرایے میں لکھے گئے کسی ایک انسانی واقعے سے لرزتی ہی نہیں، بلکہ پوری شدت کے ساتھ جھنجھنا اُٹھتی ہے — اور پھر انسانی جذبہ و فکر کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔

ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ ایک دل چسپ صورتِ حال اس ناول کے کرداروں کی ہے، جو مختلف علاقوں، مختلف زبانوں، مختلف طبقوں اور مختلف نظریات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کی بابت سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کچھ عرصہ قبل ایک بار پھر ہمارے یہاں کے ادبی حلقوں اور بعض ادیبوں کے ذہن میں پاکستانی ادب کا سوال جو پہلے پہل محمد حسن عسکری نے پاکستان بننے کے بعد اٹھایا تھا، تازہ ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو ''صدیوں کی زنجیر'' کو اس اعتبار سے خالص پاکستانی ناول قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس میں پاکستانی معاشرت کے جتنے رنگوں کو سمیٹا گیا ہے اور وہ جیسی زندہ اور باہمی تعامل کی کیفیات کو پیش کرتے ہیں، وہ کسی دوسرے اردو ناول میں اتنے وسیع کینوس پر شاذ ہی نظر آئے گی اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ رضیہ فصیح احمد نے اوپری محنت سے ایک

خارجی سانچا بنا کر یہ کہانی اور اس کے کردار اس میں جما جما کر بٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ انھوں نے جس مسئلے کو اس ناول کے لیے اپنا موضوع بنایا اور اُسے جتنے وسیع تناظر میں دکھانے کی کوشش کی ہے، وہ اتنا پیچیدہ اور ہمہ گیر تھا کہ کرداروں کی اس رنگارنگی اور وسیع و عریض علاقائی حوالوں کے بغیر اس انداز کی پختہ فنی گرفت میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ بات نہایت ذمے داری اور وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ رضیہ فصیح احمد کا یہ تجربہ معنوی اور فنی دونوں لحاظ سے بے حد کامیاب نظر آتا ہے۔

دوسرا ناول جس پر یہاں اپنا تاثر بیان کرنا مقصود ہے، وہ ہے ''یہ خواب سارے۔'' اپنی کہانی، مزاج، اسلوب اور فنی سانچے یعنی ہر اعتبار سے یہ ناول ''صدیوں کی زنجیر'' سے بالکل مختلف ہے۔

یہ ناول ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا تھا۔ آج ہم جس گلوبل دنیا میں رہتے ہیں، اُس کا تذکرہ چودہ پندرہ برس پہلے اتنا عام نہیں تھا۔ نئی دنیا اور جدید طرزِ زندگی کی بیشتر باتیں خواص تک محدود تھیں، عوام میں ان کا چرچا نہیں ہوا تھا۔ بدلتی دنیا اور اُس میں آنے والی تبدیلیوں کے تذکرے ضرور ہونے لگے تھے لیکن ان تبدیلیوں کا ذکر بڑی حد تک محض تخیلاتی قسم کا تھا، لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ لکھنے والا اگر اپنے عہد کا گہرا ادراک رکھتا ہے تو اس کی چشمِ تخیل آنے والے زمانے کے کچھ نہ کچھ خط و خال کا شعور بھی پا لیتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا کلام اور اس کے خطوط پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ اس کا تخلیقی وجدان آئندہ کی بدلی ہوئی دنیا کے نقشے کو صاف دیکھ رہا تھا۔ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' اور خصوصاً اس کے آخری حصے میں اور اسی طرح ان کے ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں انسانی رویوں کی کایا کلپ کا جو احوال ہمارے سامنے آتا ہے، آئندہ زمانوں میں ہمارے معاشرے کی صورتِ حال سے اس کی مماثلت واضح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مثال کے طور پر غور کیجیے دوستوئیفسکی کا ناول ''برادرز کراموزوف'' تین بھائیوں کے اچھے برے کرداروں کی کہانی ہے جو اُن کی تاریخ اور روایات کے سیاق و سباق میں لکھی گئی ہے، لیکن جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں بھائی تو دراصل آئندہ زمانے کے روس کی قلبِ ماہیت کے بعد نمایاں ہونے والے انسانی رویوں کا استعارہ ہیں۔ یہاں ہمیں کسی طرح کی تطبیق یا تقابل مقصود نہیں، یہ حوالے صرف اور صرف اپنے نقطۂ نظر کی صراحت کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد نے بھی ''یہ خواب سارے'' میں اپنے کرداروں کے احوال اور کہانی کے بہاؤ میں صرف ان کے عہد کے حوالے اور سوالوں کو نہیں دیکھا ہے بلکہ مستقبل کے انسانی رویوں اور انسانی صورتِ حال کی تبدیلیوں کو بھی ادراک کی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ کوشش کس درجہ کامیاب رہی ہے، اس کا اندازہ عصرِ حاضر کے تناظر میں بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ نئے انسان کا اپنی جڑوں سے کٹنا، مختلف مذاہب کے لڑکے لڑکیوں کی آپس میں

شادی، پرانی اور نئی نسلوں کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ، زندگی کی تیز رفتاری اور مادیت کا روز افزوں رجحان— پندرہ بیس سال پہلے یہ باتیں ہمارے یہاں کے بہت سے لوگوں کے لیے محض افسانہ و افسوں یا پھر حکایتیں رہی ہوں گی لیکن آج کتنے ہی لوگ ان حقائق کو اپنے تجربے سے جان چکے ہیں۔ یہ سب ہماری دنیا اور ہماری اپنی زندگی کا روزمرہ چاہے ابھی نہ بنا ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب ان میں سے کچھ بھی ہمارے لیے اجنبی نہیں رہا ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے ان سارے مسائل کو اپنے ناول میں فن کارانہ سلیقے سے گوندھا ہے، اس طرح کہ ان کرداروں اور ان کی بپتا سے ہمیں کوئی لاتعلقی اور ذہنی بُعد محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ہم اُن سے اپنا رشتہ دریافت کرتے اور پھر اسی نسبت سے انھیں سمجھتے چلے جاتے ہیں۔

ہنری گلارج نے ''وار اینڈ پیس'' کے ضمن میں ایک جگہ کہا ہے کہ ''ٹولسٹوئے کے نزدیک ناول کے لیے پلاٹ بنیادی چیز نہیں، بلکہ اصل شے کہانی ہے اور یہاں جو کہانی وہ ہمیں سناتا ہے، وہ نہایت عمدگی کے ساتھ سادگی کے اُس معیار پر پوری اترتی ہے جو اُس کے خیال میں حقیقی دانش کو آگے بڑھاتی ہے۔'' یہ بڑی اہم بات ہے۔ ناول میں پلاٹ، کردار اور زمان مکان سب کی اپنی ایک جگہ اور اہمیت ہوتی ہے لیکن ان سب پر مقدم ہے کہانی— جو اپنی ساری پیچیدگی اور گمبھیرتا کے باوجود ایک ایسی سادگی بھی رکھتی ہے کہ اُس کے بہاؤ میں حقیقی دانش و بصیرت کی موجِ رواں پڑھنے والے تک پہنچ کر رہتی ہے۔ ''یہ خواب سارے'' میں رضیہ فصیح احمد نے تکنیک کا ایک الگ تجربہ کیا ہے۔ یہ تجربہ کہانی کی معنویت کی ترسیل و تفہیم میں کیا کردار ادا کرتا ہے، یہ اپنی جگہ غور طلب بات ہے لیکن اس تکنیک کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کرداروں کی وسعت، ان کے زمانی سیاق اور مکانی پھیلاؤ کو جس طرح باہم مربوط کیا ہے، وہ اس ناول کو ایک ایسی کہانی بنا دیتا ہے جس کے سارے داخلی و خارجی حوالے ہنرمندی کے ساتھ منضبط ہوئے ہیں۔ کہانی کے سانچے میں اس کے سارے اجزا اس طرح جڑے ہیں کہ ان میں کوئی ایک بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ جس کے بغیر کہانی کو اس شکل میں سوچا جا سکے۔

اس ناول میں معاشرے کے ادنیٰ طبقے کے افراد سے اعلیٰ طبقے کے نمائندوں تک اور جہانِ سوم سے لے کر جہانِ اول تک سب کے سب اپنی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ کہانی کی بنت میں سموئے گئے ہیں۔ اپنے اپنے طبقاتی احساس، اخلاقی اقدار اور سماجی شعور سے بہرہ مند یہ افراد ناول نگار کی وسعتِ نظر، عمیق مشاہدے اور فنی شعور کا بیّن ثبوت ہیں۔ یہاں افراد کی خواہشیں، حسرتیں، محرومیاں اور معذوریاں بساطِ حیات پر ان کی تگ و تاز کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ انسانوں کی دنیا کے مختلف طبقات کے پروٹوٹائپ بن جاتے ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ بات بھی اہمیت کی

حامل ہے کہ ناول نگار نے ان کرداروں اور زندگی میں ان کی خواہش و جستجو کو ان کی طبعی اور فطری کیفیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کسی طرح کی غیر حقیقی اور مصنوعی صورتِ حال میں رکھ کر ان کو معنی پہنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں ایک سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر اس ناول کے کردار، معاشرتی طبقات اور انسانی صورت حال کا پورا نقشہ اصل کے ایسا ہی مماثل ہے تو پھر کیا اس ناول اور اس کہانی میں وہ جو ماورائے حقیقتِ حال یا حسی تجربے سے بلند و برتر معنی ہوتے ہیں اور جو فن کو larger than life بناتے ہیں، ان کی کیا گنجائش رہی ہوگی؟ بات یہ ہے کہ حقیقتِ حال یا حسی تجربے سے ماورا معانی کا تعین کرداروں کی جمع تفریق یا ان کے باہمی تعامل سے نہیں ہوتا بلکہ وہ متعین ہوتے ہیں، اُس تصورِ حقیقت سے جو کہانی کار کے تخلیقی وفنی شعور کے باطن میں کارفرما ہوتا ہے۔ فن کار اسی تصورِ حقیقت سے زندگی کی ماہیت کو جانتا اور اسی کی بنیاد پر اپنے کرداروں کی باطنی کیفیات اور ان کی تقدیر کو اُجاگر کرتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے اس ناول میں بلکہ اپنے ان دونوں ناولوں میں کرداروں کو بنانے اور پیش کرنے میں تصورِ حقیقت کے اصول ہی سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار اپنی اپنی الگ معنویت بھی رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ناول کے مجموعی تناظر میں اپنی تقدیر کے ساتھ وہ معنویت بھی تشکیل دینے میں بخوبی کامیاب رہتے ہیں جو ہمارے حسی تجربے سے ماورا ہوتی ہے۔

آخر میں ان دونوں ناولوں کے حوالے سے ہمیں ایک بات اور کہے جانے کے لائق محسوس ہوتی ہے۔ گزشتہ برسوں میں ہمارے یہاں نسائی ادب اور نسائی شعور کی بابت گفتگو نمایاں موضوعات میں نظر آتی ہے۔ ہم ادب میں زنانہ مردانہ کمپارٹمنٹس کی علاحدگی کا قائل نہیں ہیں۔ لکھنے والا بنیادی طور پر انسانی تجربے اور انسانی احساس کو بیان کرتا ہے اور اس کے فن کی قدر و قیمت کا فیصلہ بھی محض اسی اصول کے تحت ہونا چاہیے۔ عورت کے باغیانہ خیالات اور صنفی برابری/ برتری کے تصور کو نسائی شعور سے جو مربوط کیا گیا ہے، اس کا تعلق ادب سے نہیں، بعض سیاسی اور سماجی مسائل سے ہے اور اس کے حاصلات بھی سیاسیات و سماجیات کے دائروں ہی میں ممکن ہیں، ادب میں نہیں۔ جہاں تک ادب میں نسائی شعور کا تعلق ہے، وہ اگر کسی خارجی ایجنڈے کے تحت نہیں ہے اور ادب کے جمالیاتی معیارات کے ساتھ رونما ہوتا ہے تو یقیناً اہمیت کا حامل ہے اور ادب کی تفہیم میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے ان دونوں ناولوں میں نسوانی کرداروں کو جن صورتوں میں پیش کیا ہے، ان کی داخلی کیفیات، اُن کے مخصوص رویوں کی جیسی ترجمانی کی ہے اور ان پر گزرنے والی سرد و گرم لہروں، بیتنے والی ابتلاؤں اور صدیوں کی تاریخ کے سفر میں ان کی تقدیر کا احوال جس عمدگی، فن کارانہ

پختگی اور تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ صحیح معنوں میں گہرے اور بلیغ نسوانی احساس کا حامل ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے یہاں مشرقی عورت اپنی وارفتگی، ایثار، وفاداری کے ساتھ عمر کے مختلف حصوں میں اپنی مخصوص کیفیات کے ساتھ نظر آتی ہے۔ نظریاتی یا سیاسی نعرے بازی کے بغیر انھوں نے اپنے نسائی کرداروں میں ہماری تہذیب و معاشرت کی ساخت اور اُس کے اقداری مزاج کو خوب صورتی سے سمویا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کے ان دونوں ناولوں کی بابت اپنے اجمالی تاثرات کا اظہار تو ہم نے کر دیا لیکن سچائی کے ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ناولوں اور خصوصاً "صدیوں کی زنجیر" کا الگ اور باضابطہ سنجیدہ تنقیدی مطالعہ ہونا چاہیے تاکہ دیکھا جا سکے کہ ان کا فنی و ادبی سفر اب کس منزل پہ ہے اور عصری اردو فکشن میں ان کا کیا مقام ہے؟ ہمیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ رضیہ فصیح احمد نے اپنے ادبی کیریئر کا جو آغاز "آبلہ پا" سے کیا تھا، اب وہ اس سے کہیں آگے کی منزلوں میں ہیں۔

○○○

رضیہ فصیح احمد کا ناول ''زخمِ تنہائی''

آصف فرخی

رضیہ فصیح احمد کی افسانوی سرائے میں تنوع اور پھیلاؤ نے بسا اوقات گہرائی کی کمی کی اچھی تلافی کی ہے۔ ان کی طویل تحریروں میں ''تپتی چھاؤں'' جیسی اثر انگیز طویل کہانی (یا اردو تنقید کی مروّجہ اصطلاح میں ناولٹ) بھی شامل ہے اور ''صدیوں کی زنجیر'' جیسا panoramic ناول بھی۔ ایک عجیب دل چسپ اتفاق یہ ہوا کہ ان کا ناول ''زخمِ تنہائی'' مجھے اشاعت سے پہلے پڑھنے کو مل گیا اور میں اس کے موضوع کے سحر میں اس حد تک آ گیا کہ اس کی اشاعت سے involve ہوتا چلا گیا۔ موضوع کی دل کشی اس ناول کی پہلی خصوصیت ہے جو پڑھنے والے پر اپنا تاثر قائم کرتی ہے۔ اس لیے میں سب سے پہلے ان دو مختصر تحریروں کی طرف توجہ مبذول کراؤں گا جو دو brackets کی طرح ناول کے سرِ آغاز اور اختتام پر موجود ہیں۔ ان تحریروں سے جہاں اس fascination کا اندازہ ہوتا ہے جو ناول نگار کو اپنے موضوع سے ہے اور اسے ایک عرصے سے مبتلائے حیرت رکھے ہوئے ہے، وہاں ان دونوں تحریروں کو ملا کر پڑھنے سے ناول کے تخلیقی عمل کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو انسپیریشن کے اوّلین اور ابتدائی لمحوں سے لے کر کاری گری کے ان جان لیوا مراحل تک پھیلا ہوا ہے جن کو بڑھئی کے کام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اپنے موضوع کو لکڑی کے ٹکڑے کی طرح کاٹنا، چھیلنا، تراشنا، رنگ روغن کرنا اور اس کے بعد سنوار کر دنیا کے سامنے پیش کرنا۔ ان تحریروں میں دل چسپی اس وجہ سے آتی ہے کہ ہم writer at work کو دیکھ سکتے ہیں۔ پیش لفظ کے آغاز میں مصنفہ نے لکھا ہے:

برانے خاندان کو کسی ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ لفظ تنہائی ہے۔ بہت

سے لوگ ان کے نام کے ساتھ genius لگانا پسند کرتے ہیں، مگر میں سمجھتی ہوں کہ ان کی genius کا تعلق بھی ان کی تنہائی سے بہت زیادہ ہے...

اس کی وضاحت وہ آگے چل کر کرتی ہیں:

اس ناول کا نام تنہائی پر ہے، ایسی تنہائی جو قابلِ رشک ہو اور جس پر بہ قولِ فیض، ہزاروں جلوتیں قربان ہوں...

اس سے زیادہ دل چسپ اور حیران کن یہ انکشاف ہے کہ:

میں نے ان کی زندگیوں میں اپنی زندگی کی کچھ جھلک دیکھی اور یہ ناول لکھا...

اور یہ جھلک انھوں نے سال ہا سال پہلے دیکھی، پھر متواتر دیکھتی رہیں۔ اس ناول کی کہانی سناتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

۱۹۷۰ء کی دہائی میں مجھے مسز گیسکل کی لکھی ہوئی شارلٹ برانٹے اور اس کی بہنوں کی سوانح پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے بچپن کے حالات پڑھ کر لگا کہ کچھ اپنے سے حالات ہیں کہ بچپن میں ہم بھی اسی طرح کھیتوں کھیتوں پھرا کرتے تھے، کتابیں پڑھا کرتے تھے اور تصویریں بنایا کرتے تھے۔ سوچا، کیوں نہ ان کی زندگیوں پر ناول لکھا جائے۔ اسی وقت سے نوٹ لینے شروع کیے...

اس طرح موضوع کی شناخت کے بعد یہ تفہیم ناول نگار کے ذہن میں پختہ ہوتی چلی گئی اور مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد اس ناول کی شکل اختیار کی۔ مصنفہ نے بہت سادگی کے ساتھ اس ناول کے سلسلے میں اپنی سعی و تلاش اور پھر محنت کا ذکر کیا ہے اور آخر میں بہت انکسار کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ:

اتنی محنت اور دردسری کے بعد چاہتی ہوں کہ لوگ اس ناول کو پڑھیں۔
اب پڑھنے والے ہی بتائیں گے کہ محنت سوارت ہوئی یا نہیں...

گویا، ناول نگار کا کام ختم ہوا اور سپردم بتو مایۂ خویش را۔

بہر حال، پڑھنے والے جو بھی فیصلہ کریں، مصنفہ کی محنت کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ مگر میں محنت سے بھی پہلے، موضوع کے انتخاب کی داد دینا چاہوں گا۔ تنہائی کی رو کی شناخت اور اپنی مماثلت کی ایک جھلک سی دیکھنے کے بعد مصنفہ نے تنہائی کے پُرہول صحرا میں داخل ہونے کی

ہمت کی ہے اور اس دشت کو ماضی کی چند شبیہوں سے آباد پایا ہے، یہ شبیہیں وکٹورین دور کی ان معروف ناول نگار بہنوں کی ہیں جن کا ورود اب تک ایک تخلیقی معما سا لگتا ہے کہ ایک نیم خوابیدہ قصباتی ماحول سے اچانک سامنے آئیں اور اپنی غیر معمولی کتابوں کا سرمایہ چھوڑ کر بساطِ عالمِ فانی سے اسی شتابی سے رخصت ہوگئیں کہ جس طرح وہ آئی تھیں اور تب سے لے کر اب تک ان تمام لوگوں کو حیرت زدہ رکھے ہوئے ہیں جو ان کی کتابوں سے تعارف حاصل کرتے ہیں۔ انگریزی فکشن میں اسی طرح ایک حیران کن معجزۂ فن اس وقت ظہور پذیر ہوا جب انیسویں صدی کے آغاز میں اسی طرح کی قصباتی، گھریلو فضا میں بظاہر بہت معمولی سی زندگی گزارنے والی ایک لڑکی نے یکے بعد دیگرے ایسے ناول لکھ ڈالے کہ جن میں عشق و محبت کے قصوں کے پیچھے اپنے عہد کا پورا مرقع بھی پیش کر دیا مگر اپنا نام پوری طرح ظاہر نہ کیا اور یہ راز بعد میں کھلا کہ ان کی مصنفہ کا نام جین آسٹن ہے۔ جین آسٹن کے بعد انگریزی فکشن میں یہ دوسرا ماجرائے حیرت ہے۔ وہ ایک تھی، یہاں تین ہیں اور تینوں بہنوں، جن کا تخلیقی مرتبہ و انداز ایک دوسرے سے جدا ہے اور علاحدہ مطالعے کا متقاضی ہے، کے اس تخلیقی اسرار کو قریب سے دیکھنے اور اسے جاننے سمجھنے کے عمل سے ہی ''زخمِ تنہائی'' نام کا یہ ناول عبارت ہے، جو اپنے موضوع کے انتخاب میں اور اس موضوع کے اندازِ پیش کش میں اپنی جگہ منفرد ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کو اعتراض ہو کہ سوانحی ناول آخر کیا بلا ہوتا ہے اور حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے انسانوں کے احوالِ واقعی کو تاریخ کیوں نہ کہا جائے، اس کو ناول بھلا کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول کی یہ اہمیت بھی ہے کہ یہ اس طرح کے بنیادی سوالات اٹھانے پر اکساتا ہے اور اپنے طور پر ان کا جواب بھی فراہم کرتا ہے۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نقاد ان کتابوں سے گھبرا جاتے ہیں جو ان کے نظریاتی مفروضات کو چیلنج کریں اور اصناف کی جکڑ بندی یا بندھے ٹکے حوالوں کو نئے سرے سے سوچنے اور تعریف متعین کرنے پر مجبور کریں۔ کچھ عرصہ قبل اسی طرح کی کتاب شمس الرحمٰن فاروقی کی ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' سامنے آئی تھی۔ اس کتاب کو دیکھ کر بعض ثقہ نقاد شش و پنج میں پڑ گئے کہ اسے ناول کہیں یا سماجی دستاویز یا کچھ اور — سوال یہ ہے کہ ناول کو ناول کیوں نہ کہیں، کچھ اور کیوں کہیں۔ ظاہر ہے کہ ناول کی صنف نے اپنے اندر اتنی گنجائش پیدا کی ہے کہ وہ بندھے ٹکے اصولوں یا روایتی ڈھانچوں پر کار بند نہیں رہ سکتی۔ ہمارے نقاد، ناول کو ابھی تک وکٹورین دور کے نمونوں کے مطابق دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ ملکۂ معظمہ کی وفات حسرت آیات کو پوری صدی

گزر گئی تو وہ اقلیم ادب میں آخر کب تک براجمان رہیں؟ فاروقی صاحب کا ناول بالکل مختلف انداز کی کتاب ہے لیکن ہمیں ناول کی صنف کو نئے سرے سے پڑھنے اور اس کی تعریف و معیار متعین کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ خود انگریزی میں، جہاں سے ہم نے ناول کا ماڈل اور اسٹرکچر حاصل کیا، ناول نے سوانحی انداز کو اس کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ اس کے بارے میں نقادوں کو یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ اسے ناول کہیں یا کچھ اور۔ معاصر ناول نگاروں میں A.S. Byatt کی مثال سامنے کی ہے جس نے تاریخ، سماجی تجزیہ اور سوانحی انداز کو سمو کر کامیاب ناول تخلیق کیے ہیں۔ ابھی حال ہی میں Colim Tuibin نے ہنری جیمز کو موضوع بنا کر "The Master" اور اس سے ذرا پہلے J. M. Coetzee نے دوستوئیفسکی کو موضوع بنا کر ناول لکھے ہیں۔ یہ مسلّم الثبوت ناول نگار ہیں اور انھوں نے ناول نگاری کا جو ڈھنگ ان کتابوں میں اختیار کیا ہے، اس پر کسی کو شبہ نہیں۔ مجھے تو یہ کتاب بھی اسی تسلسل میں نظر آتی ہے اور اصل اشخاص کے تاریخی خدوخال سے گزر کر افسانوی انداز کا روپ اختیار کرتی ہے کہ جو سمجھ لے سو افسانہ، نہ سمجھے تو اناڑی۔

رچے بسے احساسِ ملال و حزن، نا آسودہ محبت کی فکشن اور تندیِ جذبات کے بیان اور نوعمری و قدرے ناپختگی کے رومان نے برانٹے بہنوں اور ان کی تحریروں کو محض ایک ثقافتی Icon نہیں بلکہ اسطورہ (Myth) بنا دیا۔ ہر متھ کی طرح برانٹے بہنوں کی بھی اسطورہ شکن یا de-bunkers موجود ہیں اور تو اور، ان کے قدرے کم عمر معاصر ہنری جیمز نے، کہ جس سے بہتر صاحبِ نظر انگریزی فکشن کو بھلا کہاں میسر آیا ہوگا، ان بہنوں کی شہرت کو گھڑا ہوا افسانہ قرار دیا۔ لیکن یہ رائے بہرحال اقلیت کی رائے ہے۔ برانٹے بہنوں کا یہ اسطورہ اردو میں بھی کارفرما رہا ہے۔ احمد فراز نے ایک مرتبہ مجھ سے انٹرویو کے دوران ایملی برانٹے کو اپنے پسندیدہ ناول نگاروں میں شمار کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ناول پڑھ کر ان کے ذہن پر ایسا نقش مرتب ہوا کہ انھوں نے اصلی زندگی میں ہیتھ کلف جیسا کردار بننا چاہا۔ یہی ناول نیر مسعود کی پسندیدہ کتابوں میں سے بھی ہے جو خود اس وقت اردو کے اہم ترین اور بے حد خلاق افسانہ نگاروں کی صف میں اپنے لیے جگہ بنا چکے ہیں۔ ایملی برانٹے، ممتاز شیریں کی پسندیدہ شخصیات میں سے ایک تھی اور انھوں نے اس کے بارے میں انگریزی میں ایک مونوگراف بھی لکھا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان ادیبوں نے زیادہ توجہ ایملی پر مرتکز کی ہے جب کہ رضیہ فصیح احمد کے ناول میں زیادہ گہرا اور مؤثر نقش شارلٹ کا قائم ہوا ہے، گویا ان کو اس سے ایک گونہ ہم دردی اور احساسِ قرابت ہو۔ شارلٹ سے زیادہ دل چسپی ظاہر کرنے والوں میں ایک اہم نام محمد حسن عسکری کا ہے۔ ان کی زندگی کے آخری دنوں

میں، جب مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو وہ ڈی ایچ لارنس کے بعد اپنے کسی شاگرد کو شارلٹ برانٹے پر تحقیقی کام کی رہ نمائی کر رہے تھے۔ یہ تحقیقی کام کسی غیر ملکی یونی ورسٹی کے لیے تھا۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ میں ان سے ملنے کے لیے پہنچا تو وہ شارلٹ برانٹے کا ناول ''شرلے'' پڑھ رہے تھے اور پھر اسی کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ مجھے نہیں معلوم کہ عسکری صاحب کے شاگرد کا یہ مقالہ مکمل ہوا کہ نہیں۔ اگر کہیں سے دستیاب ہوجائے تو خاصے کی چیز ہوگی۔ اس کی اہمیت تو اپنی جگہ، تخلیقی سطح پر رضیہ فصیح احمد نے برانٹے بہنوں کے اسطورے کو ان سے کہیں زیادہ sustained treatment کیا ہے اور ایک مرقعے کی شکل بنا کر پیش کردیا ہے۔

''زخمِ تنہائی'' برانٹے بہنوں کے اسطورے کا ایک اسیر رہنے کے باوجود ناول ہی رہتا ہے اور میرے خیال میں یہی اس کی اہمیت کی اصل اساس ہے۔ شاید اسی لیے مجھے یہ ناول اپنی حیثیت سے بڑھ کر اردو ناول کی پوری تاریخ میں ایک اعتبار سے منفرد نظر آتا ہے۔ اردو ناول کے بیشتر نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ ناول کی صنف اردو میں مروج ہوئی تو یورپ کے اثر سے اور یہ پودا دساور سے منگوا کر یہاں لگایا گیا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اس کو یہاں کی آب و ہوا راس آگئی اور یہ خوب پھلا پھولا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تنقیدی بیانات کتنے ہی عام کیوں نہ ہوجائیں، محض جزوی صداقت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ کہانی کہنے کی روایت، کسی نہ کسی شکل میں تمام انسانی میراث کا حصہ ہے، اصناف کی شکلیں اور اسالیب بدلتے رہتے ہیں۔ بہرحال، اردو میں ناول کا چلن انگریزی کے تحت عام ہوا اور اردو کے لیے مثالیں اور عملی نمونے انگریزی ناول نے ہی فراہم کیے۔ چنانچہ اردو کے اچھے سے اچھے ناول نگار کے لیے یہ لازم تھا کہ اسے کسی انگریزی ناول نگار کا دیسی روپ قرار دیا جائے۔ عبدالحلیم شرر اردو کے والٹر اسکاٹ تھے تو قرۃ العین حیدر، ایک دیسی اور home-grown ورجینیا ولف۔ ''زخمِ تنہائی'' تک آتے آتے سکہ بدل گیا ہے۔ انگریزی ناول اب محض مثالی نمونہ نہیں بلکہ کہانی کا موضوع بن گیا ہے، اردو متن کی ساخت کا ایک حصہ۔ گویا the tables have turned۔ اس اعتبار سے ''زخمِ تنہائی'' مجھے اردو ناول کی خودشناسی میں ایک لمحۂ عرفان نظر آتا ہے۔ داستان اب ایک نئی منزل میں داخل ہوگئی ہے، ایسی منزل جو صدیوں پرانے دکھ درد سے عبارت ہے لیکن اپنی اساس میں پوری طرح ہم عصر اور اپنے رویوں میں جدید بلکہ جدید تر۔

یہاں یہ ذکر مناسب ہوگا کہ ''آبلہ پا'' سے لے کر ''صدیوں کی زنجیر'' اور پھر اپنی تازہ ترین کتاب ''آدھی سچائیاں'' تک رضیہ فصیح احمد ناول نگاری کے روایتی انداز کی دل دادہ و گرویدہ رہی

ہیں۔ لیکن یہ شاید برانٹے بہنوں کا فیضان ہے یا موضوع کا فنی مطالبہ کہ وہ اپنے مخصوص انداز سے الگ ہوکر آگے نکل آئی ہیں اور وہ بھی اس سادگی کے ساتھ کہ بات بھی بن جائے اور معلوم بھی نہ ہو۔

ایک کے بعد ایک تین لڑکیاں ناول کے آغاز پر نمودار ہوتی ہیں اور ہمیں رفتہ رفتہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کون ہے، اس کہر آلودہ فضا میں مصنفہ کی اپنی شخصیت بھی سائے کی طرح نظر آتی ہے اور پھر برانٹے سسٹرز کے مہابیانیے (grand narrative) میں ذیلی متن (subtext) بن کر جیسے تحلیل ہو جاتی ہے۔ ناول کے آغاز میں مصنفہ کی شخصیت جس طرح سامنے آتی ہے اور پھر متن میں شامل ہوجاتی ہے، وہ مابعدِ جدید (post-modernist) انداز کا حامل ہے اور مصنفہ بیانیہ قائم کرنے کے لیے چوکھٹے کو توڑنے یا breaking the frame کا عمل بڑی کامیابی کے ساتھ سرانجام دے رہی ہے جو اس وقت پورا ہو جاتا ہے، جب ناول کے اختتام تک آتے آتے اور برانٹے بہنوں کا قصہ انجام کو پہنچتے پہنچتے، مصنفہ کو خود اس کے الفاظ میں وقت کی سرنگ سے گزرتے ہوئے اور صدیوں کی دہلیز کو پار کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ شارلٹ برانٹے کی روح یا اس کی شبیہ سے کلام کرتی ہے:

''آپ اور میں... ہم لکھنے والے بھرے پُرے گھر میں، بھری پُری دنیا میں بھی تنہا ہوسکتے ہیں۔ اس دل کی تنہائی کا کوئی علاج نہیں...''

ناول کا آخری سین پڑھنے والوں کے دل میں ایک خلش اور بہت سے سوال چھوڑ جاتا ہے اور یہ احساس کہ صدیوں پر محیط اس تنہائی کا جز مرگ کوئی علاج نہیں ہے اور اگر مداوا ہے تو ناول... جس سے تنہائی میں انجمن آباد ہوسکتی ہے اور اُجاڑ گھر میں بھی چہرے اُگ آتے ہیں، وہ چہرے جو صدیوں سے مانوس ہیں۔

○○○

رضیہ فصیح احمد — ''آبلہ پا'' سے ''زخمِ تنہائی'' تک

ڈاکٹر فاطمہ حسن

رضیہ فصیح احمد وہ خوش قسمت ناول نگار ہیں جن کے پہلے ہی ناول نے خاص و عام میں مقبولیت حاصل کی۔ ان کا ناول ''آبلہ پا'' جو انھوں نے ۶۲۔۱۹۶۱ء کے دوران لکھا تھا، اسے ۱۹۶۶ء میں آدم جی ایوارڈ ملا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے دیا جانے والا یہ ایوارڈ جہاں ناول کے معیار کو اعتبار کی سند دے گیا، وہاں مصنفہ کے لیے مشکل بھی پیدا کر گیا۔ یہ مشکل وہ چیلنج تھا جو آئندہ اپنی ہی تحریر سے مقابلے کی دعوت دے رہا تھا۔ ایک ایسا ناول جو ان کے پہلے ناول سے بہتر ہو اور مختلف بھی۔

ناول لکھنا مشکل کام ہے۔ وسیع کینوس پر کئی جہتی تصویریں اس طرح بنانا کہ منظر، پس منظر اور کردار ظاہر و باطن کے ساتھ موجود ہوں، مربوط بھی ہوں، متحرک نظر آئیں اور قاری کی ذہنی رو سے بھی ہم آہنگ ہوں۔ ایک اچھے ناول نگار کی خوبی یہ ہے کہ جب ناول شروع ہو جائے تو وہ قاری اور کرداروں کے درمیان سے غائب ہو جائے۔ اس کے تبصرے اور تشریح کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ ناول کی کہانی اپنے کرداروں کے ذریعے انجام تک پہنچتی ہے۔ کردار پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ وہ خود اپنے محسوسات کو بتائیں اور قدم اٹھاتے نظر آئیں۔ کوئی رسی، کوئی دھاگہ ایسا نہ دکھائی دے جو مصنف نے اپنے ہاتھ میں تھام کر ان کرداروں کو کٹھ پتلی بنا دیا ہو۔ یہ نزاکت اور ایسی بہت سی نزاکتیں ناول نگار کے پیشِ نظر رہتی ہیں، تاہم داستانوں سے ناول تک کہانیوں کے بیان نے ایک طویل سفر بڑی تیزی سے طے کیا ہے۔ اردو ناول نگاری تجربے کی راہ سے گزر کر مہارت کے مقام تک پہنچ گئی ہے۔ اردو میں اچھے ناول کی مثالیں پیش کرنے کے لیے

متعدد نام ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ ان ناموں میں خواتین کے نام نمایاں ہیں۔ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر وہ خواتین ہیں جنھوں نے بالکل ابتدا میں ایسے ناول تخلیق کیے جن کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ ان کے بعد خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد اور جمیلہ ہاشمی کا نام آتا ہے۔ بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ، زاہدہ حنا، خالدہ حسین متعدد ناول نگار خواتین سنجیدہ اور معیاری ناولوں کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں۔

رضیہ فصیح احمد کا ناول ''آبلہ پا'' ۶۰ء کی دہائی میں شائع ہوا۔ اس وقت ایک طرف قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی کے معرکۃ الآرا ناول ''آگ کا دریا'' اور ''ٹیڑھی لکیر'' زیر بحث تھے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' ان قارئین میں مقبول ہو چکا تھا جن کی ذہنی رسائی ''آگ کا دریا'' تک مشکل تھی یا جنھیں بوجوہ عصمت کی ''ٹیڑھی لکیر'' پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

دوسری طرف ناول نگار خواتین کی ایک کھیپ تھی جو کچھ تو جین آسٹن کے زیر اثر اور کچھ بنے بنائے سماجی رویوں کی وجہ سے ایسے ناول لکھ رہی تھی جن میں پورا ناول لکھنے کا مقصد ہیروئن کو ہر مرحلے اور آزمائش سے گزار کر شادی کی منزل تک پہنچانا تھا۔ اس کے لیے اسے خوب صورت، سلیقہ شعار، خوش لباس، صوم و صلوٰۃ کا پابند، بے زبان، خود رحمی کی حد تک اطاعت گزار ہونا پڑتا تھا۔ ان ہیروئنوں کی ذہنی سطح یہ ہوتی تھی کہ جو بھی جوان نہا دھو کر صاف ستھرے لباس میں سامنے آجائے، وہ شہزادہ لگتا تھا اور وہ اس سے شادی کے خواب دیکھنے لگتی تھیں۔ ایسے ناولوں کی بہتات میں جب ''آبلہ پا'' آئی تو اس ناول کے آغاز میں ہی ہیرو، ہیروئن کی شادی ہوگئی اور شادی کے فوراً بعد دونوں کی شخصیتوں کی پرتیں کھلنے لگیں۔ ہیروئن صرف گوشت پوست کی گڑیا نہیں بلکہ حساس اور ذہین ہونے کے ساتھ مکمل وجود رکھنے والی عورت نکلی، جب کہ ہیرو اپنی مصلحتوں اور خواہشوں کے جال میں اس کیڑے کی طرح محبوس ہوتا گیا جو ریشم بناتا ہے اور کوکون میں بند ہو جاتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کی کردار نگاری میں انسانی نفسیات تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد سوچنے والا ذہن رکھتی ہیں۔ ان کا سماجی شعور پختہ اور مشاہدہ تیز ہے جس کی جھلک پہلے ناول میں ہی نظر آنے لگتی ہے اور آگے چل کر واضح ہوتی چلی گئی ہے۔ ان کے دیگر ناول بھی اپنا موضوعاتی پس منظر رکھتے ہیں۔ مثلاً ناول ''انتظارِ موسم گل'' میں ایک جاگیردار، ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر لیتا ہے مگر اس کی جاگیردارانہ ذہنیت اور ماحول ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ ''ایک جہاں اور بھی ہے'' ایک ایسے شخص

کی کہانی ہے جس میں جوان لڑکوں کے باپ نے کم عمر لڑکی سے دوسری شادی کر لی۔ وہ لڑکے اس عورت کو اتنا تنگ کرتے ہیں کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔ ناول ''متاعِ درد'' کا پس منظر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہے، جب کہ ''صدیوں کی زنجیر'' بہت اہم ناول ہے جس میں بنگال تاریخی پس منظر سے ابھرتا ہے، اپنے حسن کی جھلکیاں اور آئندہ کی تصویریں دکھاتا ہے، کرداروں کی نفسیات کی گتھیوں سے الجھتا ہے۔ سیاسی سماجی داؤ پیچ کو سامنے لاتے ہوئے سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے تک تحقیقی مرحلوں کو ناول کی صورت میں قارئین کے لیے آسان بناتا چلا جاتا ہے۔

ان کا ناول ''زخمِ تنہائی'' بھی ایک منفرد تجربہ ہے۔ اس ناول میں انھوں نے برانٹے خاندان کو ان کے اصلی ناموں کے ساتھ کردار بنایا ہے۔ پورا ناول اسی خاندان کے گرد گھومتا ہے۔ ایملی برونٹے اور شارلٹ برانٹے اس ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ یہ دونوں بہنیں جو خود نام ور لکھنے والی تھیں، ان کو کردار میں ڈھال کر ناول لکھنا مشکل کام تھا جسے رضیہ فصیح احمد نے بڑی دل سوزی سے انجام دیا ہے۔ ڈیڑھ سو سال قبل انگلستان کے معاشرے میں ان لڑکیوں کے ساتھ وہی سلوک روا رہا جو ہمارے معاشرے میں اب بھی رائج ہے۔ شارلٹ برانٹے کا مشہور اور مقبول ناول ''جین آئیر'' شائع ہوا تو اس پر فرضی نام کرربیل لکھا گیا تھا۔ ایسا خود شارلٹ نے کیا تھا۔ جب مصنفہ کی اصلی شخصیت سامنے آئی تو اسے سخت منافقانہ رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ ایملی برانٹے اپنی بہت خوب صورت شاعری گھر والوں سے بھی چھپاتی رہی۔ یورپ میں یہ وسط انیس ویں صدی کا معاشرہ تھا جس میں برانٹے خاندان کے باصلاحیت، حساس بچوں نے علم و ادب کو اپنایا تو معاشرے سے کٹ کر تنہائی کے حصار میں قید ہو گئے۔ رضیہ فصیح احمد ''زخمِ تنہائی'' کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

> برانٹے خاندان کو کسی ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ لفظ ''تنہائی'' ہے۔ بہت سے لوگ ان کے نام کے ساتھ جینئس لگانا پسند کرتے ہیں، مگر میں سمجھتی ہوں کہ ان کی جینئس کا تعلق بھی ان کی تنہائی سے بہت زیادہ ہے۔ کیا کبھی کسی سوشل ماحول میں رہنے والی لڑکی کے بارے میں سنا ہے کہ وہ سات سال کی عمر میں پورا اخبار پڑھے اور باپ سے سیاست پر بحث کرے۔ کوئی لڑکا آٹھ نو سال کی عمر میں کلاسیکی تعلیم حاصل کرے، دونوں ہاتھوں سے یکساں لکھ سکتا ہو۔ کوئی گیارہ سال کی عمر میں ایسی نظمیں لکھے جیسی ایملی نے لکھیں اور پل پل کا نقشہ کھینچے جیسے اس نے کھینچا اور اپن

ایک لڑکی کی خیالی مکمل تصویر بنائے جو سمندر کے کنارے افق کو تک رہی ہو اور اپنے سب بہن بھائیوں کی سوچ کی عکاسی کرے۔

باپ آئر لینڈ سے تو بہن بھائی کو چھوڑ کر آئے اور کبھی واپس نہیں گئے۔ ان کے لیے ان کی دنیا ان کا گھر تھی جس میں بیوی بھی سات سال میں داغِ مفارقت دے گئی۔ پورے خاندان کی ہاورتھ میں کسی سے دوستی نہیں تھی۔ برین ویل نے اور شارلٹ نے دوستیاں کیں مگر وہ دور دور کی تھیں جو کبھی کبھی تنہائی کی انتہائی شدت کو کم کر دیتی تھیں۔ شارلٹ کی ایلن سے دوستی ایسی تھی کہ سال ہا سال کی خط و کتابت کے باوجود اپنے ناول لکھنے کا راز اس پر نہ کھولا۔ برسلز میں شارلٹ کی تنہائی کا کلائمکس تھا اور واپسی میں ہاورتھ میں اس کا اینٹی کلائمکس، جہاں وہ سارے بہن بھائیوں اور باپ کے ہوتے ہوئے بھی بے حد تنہا رہی اور خطوں کا آسرا ڈھونڈتی رہی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر میں بھی ایسا ہی خاندان موجود تھا جب گیارہ سالہ زاہدہ خاتون شروانیہ اور اس سے ایک سال بڑی احمدی بیگم اپنے نام بدل کر شاعری کر رہی تھیں، مضامین لکھ رہی تھیں۔ یہ بھی دو بہنوں، ایک بھائی، ایک پھوپھی زاد بھائی اور دو پھوپھی زاد بہنوں پر مشتمل نوخیز لکھنے والے تھے جو حیرت انگیز طور پر برانٹے فیملی سے مماثلت رکھتے تھے، جنھوں نے بہت کم سنی میں سنجیدگی سے بہترین ادب تخلیق کیا اور ان کا انجام بھی برانٹے فیملی جیسا ہی ہوا۔ تنہائی اور جوانی میں انتقال۔ شارلٹ کے خطوط اور ڈائری کی طرح ز خ ش کے خطوط اور ڈائری کی حفاظت بھی اس کی بچپن کی سہیلی پھوپھی زاد بہن نے کی اور اس پر مشتمل کتاب لکھی۔ رضیہ فصیح احمد نے ''زخمِ تنہائی'' میں صرف برانٹے فیملی کو ہی نہیں لکھا ہے بلکہ اس پورے سماجی رویے کو بے نقاب کیا ہے جو لکھنے والیوں کو دُہرے استبداد میں مبتلا رکھتا ہے۔ ایک طرف شعور و آگہی کا زخم، دوسری طرف معاشرتی جبر اور مردانہ سماج کے مطالبے۔ یہ دُہرے عذاب جھیلتے ہوئے شارلٹ ایملی، زاہدہ خاتون، احمدی بیگم اور بہت سی لکھنے والیاں ایک جیسے دکھوں سے گزری ہیں۔ رضیہ فصیح احمد کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ نسائی شعور کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ شعور ان کے پہلے ناول ''آبلہ پا'' سے ''زخمِ تنہائی'' تک یکساں نظر آتا ہے۔ ناول ''آبلہ پا'' میں ایک جگہ وہ ناول کے مرکزی کردار سے ہیروئن کے بارے میں یہ الفاظ ادا کراتی ہیں۔

وہ بڑی آئیڈیالسٹ قسم کی لڑکی ہے اور عورتوں اور مردوں کے لیے علاحدہ

اخلاقی معیار کی قائل نہیں ہے۔

اس طرح وہ ہمارے معاشرتی رویوں پر کڑی تنقید کرتی ہیں۔

> اس ہستی کا بھی ماتم کر جو تیرے بیٹے کو گرما گرم روٹیاں دیتی تھی اور بدلے میں اس کی گرم گرم جوتیاں کھاتی تھی۔ مگر وہ بڑھیا زمین پر بیٹھی اسی مونوٹونس انداز میں بین کرتی رہی۔ کیوں کہ وہ بھی اسی معاشرے کی پیداوار تھی جہاں مرا ہوا لڑکا جواں سال لڑکی سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۔

ان کا یہی انداز افسانوں میں بھی برقرار ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے افسانوں کے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعہ ''ورثہ'' میں اکیس افسانے اور چند افسانچے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں بھی وہی باریک بینی، نفسیاتی مطالعہ اور اطراف کا مشاہدہ موجود ہے جن سے کردار ابھرتے ہیں۔ یہ کردار خواہ پاکستانی ہوں، ہندوستانی ہوں، بنگالی ہوں، یورپ اور امریکا سے تعلق رکھتے ہوں، متنوع جزیات کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور اپنے حالات کے مطابق ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں وہ کرداروں کے ذہنی رویوں پر زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ چنانچہ افسانہ ''کھوج'' میں جہاں کرداروں کے مکالمے موجود ہیں وہاں ایک مسلسل خود کلامی بھی کہانی کی کڑیاں ملاتی ہے اور مرکزی کردار کے محسوسات کو واضح کرتی ہے۔

افسانہ ''ورثہ'' محبت اور مثبت انسانی جذبوں کی خوب صورت کہانی ہے جو پڑھنے والے کو محسوساتی سطح پر متاثر کرتی ہے۔ افسانہ ''نیا جنم'' انسانی نفسیات کی بہت خوب صورت کہانی ہے جس میں دو مختلف گھروں سے آئے ہوئے مرد اور عورت ملتے ہیں اور تیزی سے قریب آتے ہیں مگر ایک حادثہ انھیں پھر اپنی پرانی زندگی میں بھیج دیتا ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس دیکھیے:

> تم نہیں جانتیں شیریں، اس عورت نے اس ایک سال سے بھی کم عرصے میں مجھے ناچیز ریت کا ذرہ بنادیا ہے۔ وہ سب کچھ ہے، میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کا کام اہم ہے، اس کے دوست بہتر ہیں، اگلی دفعہ وہ مجھے سیر کرائے گی۔ سارے پیسے خرچ کرے گی۔ شروع میں یہ بات محسوس ہوتی تھی، اب احساس بھی ختم ہوتا جارہا ہے۔ تم سے ملا ہوں تو یہ دوبارہ سوچ رہا ہوں، میں کون ہوں۔ میں مالک ہوں یا اپنی بیوی کا رکھیلا ہوں۔ تمھیں دیکھ کر سوچتا ہوں کہ ایسی بھی لڑکیاں ہوتی ہیں جو دوسروں کی انا کو جھنڈے پر چڑھا ئیں اور خود نیچے کھڑے ہوکر تالیاں بجائیں اور خوش

ہوں۔ کیا تم بھی اپنے شوہر کے ساتھ یہی کرتی ہو؟
شیرن نے کہا، ''کیا کروں، کرنا پڑتا ہے۔ تمھاری انا کو تمھاری بیوی دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے اور میرا میاں بچپن سے ہزاروں کمپلیکسز کا شکار ہے۔''

رضیہ فصیح احمد ایسی ہی سچائیوں کو اپنی گرفت میں لاتی ہیں اور پڑھنے والا ان کی تحریر میں محو ہو جاتا ہے۔ ان کے ناول اور افسانے خود کو پڑھوا لیتے ہیں۔ خصوصاً ''آبلہ پا'' ایک ایسا ناول ہے جس پر وقت اثر انداز نہیں ہوا ہے۔ اس ناول نے مجھے آج بھی اتنا ہی متاثر کیا جتنا پہلی بار پڑھتے ہوئے۔

○○○

مشاہیر کے خطوط بنام رضیہ فصیح احمد

ڈاکٹر جمیل جالبی — لاہور

13-9-73

محترمہ، تسلیم

گرامی نامہ ملا، کرم فرمائی کا شکریہ۔

میں پندرہ دن کی چھٹی لے کر لاہور سے باہر چلا گیا تھا۔ بیوی آئی ہوئی تھیں۔ واپسی پر آپ کا خط ملا۔ تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ تھوڑے سے ٹکٹ لفافے میں نے واللہ خلوص دل کے ساتھ اس لیے بھیج دیے تھے کہ یہاں آسانی سے مل رہے تھے اور وہاں ان کی قلت تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

شب افسانہ کا پروگرام یہ ہے کہ ہفتے کی شب کو رکھیں گے تاکہ آنے والوں کو زحمت نہ ہو۔ ایک آدھ دن کی چھٹی سے بھی کام چل سکتا ہے۔ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ نہ آئیں اور افسانہ نہ پڑھیں۔ آپ کے نہ ہونے سے بہت فرق پڑے گا۔ آخر "نیا دور" کی طرف سے ہے۔ پھر ہم سب مل کر ہی تو یہ پروگرام بنا رہے ہیں۔ آپ تشریف لائیں گی تو انتظام بھی آپ ہی کے سپرد ہوگا۔ اب بتائیے کہ آپ کے بغیر شب افسانہ کیسے ہوسکے گی؟ "نیا دور" کی تیاری کر رہا ہوں۔ "پہلی دراڑ" کی کتابت ہوگئی ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ شب افسانہ کے سارے افسانے بیک وقت "نیا دور" میں شائع کردیے جائیں۔

میں نے کل ایک ناشر سے گفتگو کی تھی۔ وہ کہنے لگے کہ افسانوں کے مجموعے اس لیے ناشر نہیں چھاپتے کہ کتابیں خریدنے والے حضرات ان افسانوں کو پہلے سے رسالوں میں پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ پھر کاغذ کی گرانی نے سب کو پریشان کر رکھا ہے۔ ایک آدھ دن میں کسی اور سے بھی بات کروں گا۔ جمیلہ بی بھی آجائیں، گاؤں گئی ہوئی ہیں۔ شاید ۲۰ر ستمبر تک آجائیں گی۔ اُن سے بھی مشورہ ہوگا۔ بیمار ہوگئی تھیں۔ اب اچھی ہیں۔

فوک لور ریسرچ سینٹر میں آپ کا یہ سوال کہ اردو دھنوں پر بھی آپ نے کوئی کام کیا ہے؟ بالکل صحیح تھا۔ اس وقت جو لوگ اس مرکز کے سربراہ ہیں، ان کے ذہن میں چار قومیتوں کا نظریہ کارفرما ہے۔ علاقائی کلچر کم زور اور بے جان ہیں لیکن مریض کلچروں کو طاقت کے انجکشن دے کر وہ اتنے عرصے کے لیے ضرور زندہ رکھنا چاہتے ہیں کہ اُن کا اپنا مقصد پورا ہوجائے۔ صرف سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی فوک لور وغیرہ کو اس لیے مروّج کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان زبانوں کے علاقوں کے خدوخال اُجاگر ہوجائیں اور وہ دُور سے ایک الگ، نمایاں شخصیت نظر آنے لگیں۔ ساتھ ساتھ قومی سطح کم زور ہوجائے۔ اردو کسی علاقے کی (سندھ کے شہروں کو چھوڑ کر) زبان نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ سب علاقوں کو ایک دوسرے سے پیوست کرنے کے لیے ایک لازمی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا اس زبان کا مزاج ملک گیر مزاج ہے، اسی طرح اس زبان کے کلچر کا مزاج بھی ملک گیر ہے۔ وہ دُھنیں یا لوک کہانیاں جو اس زبان میں عام و مروّج ہیں اور جو ہم نے اپنے بچپن میں سنی ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قومی سطح پر زیادہ مقبولیت حاصل کریں اور چپکے سے قوم کے ذہن میں جم جائیں، مثلاً ''سونی دھرتی اللہ رکھے'' کی دھن پاکستان کے کسی علاقے کی لوک دھن نہیں تھی۔ سہیل رعنا نے اکبرآباد کے جوگیوں سے یہ دُھن سُنی تھی۔ آج یہ دھن سب دھنوں سے زیادہ مقبول ہے۔ ساتھ ساتھ اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہے بلکہ نہایت ضروری ہے کہ علاقائی دھنوں کو سارے ملک میں پھیلا کر عام کردیا جائے اور دھنیں (ساری تو نہیں لیکن ان میں سے چند) قومی سطح پر باقی و زندہ رہ جائیں گی، مثلاً ''جنگ کھیل نہیں زنانیاں دی'' کی دھن پنجاب کی دُھن تھی اور آج وہ قومی سطح پر مقبول ہے۔ اگر دھنوں یا لوک ریسرچ کے سلسلے میں نقطۂ نظر یہ ہو کہ علاقوں کو قومی سطح پر ایک دوسرے سے پیوست کرنے کے لیے ان علاقوں کے زندہ و صحت مند تہذیبی عناصر ایک دوسرے میں پیوست کردیے جائیں تو یہ ایک اچھی بات ہے لیکن اگر یہ کام صرف اس لیے کیا جائے کہ قومی سطح کم زور ہو اور علاقوں کی شخصیت نمایاں ہو تو یہ ایک خطرناک بات ہے۔ قوم بننے کے لیے ضروری ہے کہ علاقے نہ تو اتنے کم زور ہوں کہ ایک علاقہ دوسرے کو

کھا جائے اور نہ اتنے قوی کہ ان کو ملا کر ایک کرنا یا رکھنا مشکل ہوجائے۔ یہ توازن کا عمل ہے۔ ۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو پاکستان کوئی ملک نہیں تھا، ہمیں اُسے ملک بنانا تھا۔ پاکستانی کوئی قوم نہیں تھی، ہمیں اسے قوم بنانا تھا۔ لیکن جب ملک وقوم کے تصور پر ہی اعتماد نہ ہوتو پھر علاقے ملک بن جاتے ہیں۔ یہ تو ملک وتہذیب کی تاریخ کی ہر اچھی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

اصل میں کلچر کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ یہ لوگوں کے ساتھ ہجرت کرتا ہے اور اپنے زندہ عناصر کے ساتھ پردیس میں بھی مقبول و مروّج ہوتا ہے۔ امریکا اس کی مثال ہے۔ کناڈا بھی اس کی مثال ہے، نیوزی لینڈ بھی۔ اتنی بڑی تعداد میں اتنے کم عرصے میں ہجرت کا عمل تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس ہجرت کے ساتھ ہی یادوں نے بھی ہجرت کی ہے، لباس، کہانیوں اور گیتوں نے بھی ہجرت کی ہے، کھانے پکانے اور کھانے کے طریقوں نے بھی ہجرت کی ہے اور گزشتہ ۲۵ سال میں ان طریقوں نے ہر طرف مقبولیت بھی حاصل کی ہے اور سب علاقوں نے انھیں اپنے اپنے طور پر قبول کیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شکل میں ایک نئی یکسانیت پیدا ہوگی لیکن اس سے قبل کہ تہذیبی یکسانیت کا عمل پیدا ہو، اُسے توڑنے، روکنے کا عمل عمداً کیا جارہا ہے۔

یقیناً یہ اب سوال ہے کہ اسے رسالوں میں اُٹھایا جائے۔ اگر آپ کہیں گی تو اگلے شمارے میں اس موضوع پر آٹھ دس دانش وروں کو دعوت دی جائے گی۔

بی بی پرسوں چلی گئی ہیں۔ آپ کی طرف بھی آنے کا پروگرام تھا لیکن ریلوں کی آمدورفت کے تعطل کی وجہ سے یہ پروگرام آئندہ کے لیے ملتوی کردیا۔

انجم ماشاء اللہ ہونہار بچہ ہے، جہاں جائے گا، کامیاب ہوگا۔ خدا عمر دے اور ہر نعمت سے سرفراز کرے۔

آپ کا یہ جملہ بہت پسند آیا، ''مستقبل ان کا ہے، ہمارا حصہ ان کا ماضی ہے،'' سچ ہے۔ فصیح احمد صاحب سے سلام کہیے۔ چھوٹے میاں کو دُعا۔

نیاز مند
جمیل

(اگر فوک اور ریسرچ سینٹر کے کام کی نوعیت، مقصد وغیرہ کا پتا چل جائے تو اس سے بحث کے لیے سوال بنانے میں سہولت ہوگی۔ چونکہ آپ تشریف لے گئی ہیں، بات نئی ہے اور ذہن میں الجھن ہے اس لیے کیا یہ

ممکن نہیں ہے کہ سوال آپ ہی بنا دیں تا کہ سوال کے ساتھ لوگوں کو دعوتِ فکر دی جائے۔ جمیل)

رام لعل— لکھنؤ

رضیہ جی، آداب!

آپ سے کراچی میں ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اپنے کسی بھی ہم قلم ساتھی اور ذہنی ہم سفر کو دیکھ کر خوشی ہی ہوتی ہے۔ لیکن سرحد پار جا کر آپ سے ملنا نصیب ہوا تو خوشی دوبالا ہوگئی۔ آپ کا ایک افسانہ ''بارھواں آدمی'' ابھی حال ہی میں کسی رسالے میں پڑھا۔ شاید ''معاصر'' میں اور پھر وہی ہندوستان میں بھی کسی رسالے میں دیکھا۔ بہت اچھا لگا۔ اس میں ایک بڑے شہر کی روز افزوں بڑھتی ہوئی آبادی کا کرب بھی ہے اور اُس پر بہت ہی خوب صورت طنز بھی۔ میں نے اپنے سفرنامے میں اس افسانے پر چند سطور لکھی ہیں۔ یہ سفرنامہ ''افکار'' میں اگلے ماہ سے قسط وار شائع ہو رہا ہے۔

میرے پاس ایک اور کتاب ش فرخ کی ''نئی دنیا پرانی دنیا'' بھی ہے جس کا دیباچہ آپ نے تحریر کیا ہے۔ اسی دیباچے کو پڑھ کر میں نے ش کا سفرنامہ پڑھنا شروع کیا اور بس پڑھتا چلا گیا۔ بہت ہی شان دار طرزِ تحریر اور گہرا مشاہدہ ہے۔ جو کچھ اُنھوں نے دیکھا اُسے تو وہ بیان کرتی چلی گئیں، لیکن جتنا کچھ اُنھوں نے وہاں کی کتابوں سے مطالعہ کیا، اُسے بھی اپنی observations کا بڑی خوبی سے حصہ بنا دیا۔ مجھے یاد نہیں آتا، یہ کتاب مجھے کس نے عنایت کی تھی۔ اس پر ش فرخ کے دستخط اور چند سطور بھی لکھی ہوئی ہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ اُن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ شاید یہ کتاب اُنھوں نے آپ ہی کی وساطت سے مجھ تک پہنچائی ہو۔ بہرکیف آپ سے استدعا کروں گا، آپ ان تک میری مبارک باد پہنچا دیں۔ جہاں لندن کا ذکر ہے، اُس سے وہ لطف دوبالا ہوگیا کیوں کہ میں بھی اُسی لندن کو (صرف لندن کو) ۱۹۷۸ء میں دیکھ آیا تھا اور میرے یورپ کے سفرنامے کی ایک قسط لندن سے متعلق ''اوراق'' سال نامہ ۱۹۸۰ء میں حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ میڈم تساؤ، پکاڈلی، ہائیڈ پارک، ٹرافلگر پارک، ٹیوب ریلویز کا جال، یہ سب مجھے بھی حیرت زدہ کرتے رہے تھے۔

آپ کے ساتھ ایک تصویر جو جمیل جالبی کے گھر پر لی گئی ہے، مجھے مل چکی ہے اور

میرے البم کی زینت بنی ہوئی ہے۔ میری پاکستان کی یاترا بہت ہی کامیاب رہی۔ مجھے وہ سب لوگ یاد آتے ہیں جن جن سے ملاقاتیں رہیں۔

جناب فصیح احمد صاحب سے میرا آداب کہیے گا۔

آپ کا مخلص
رام لعل

جیلانی بانو— حیدرآباد دکن

۱۰ر اگست ۸۴ء

ڈیئر رضیہ!

معاف کرنا کہ آپ کو بہت دنوں کے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ آپ سب کے خلوص و محبت کا خمار اترتے بہت دیر لگی۔ اس بار آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے اب وہ منزل سر کر لی ہے کہ ایک دوسرے کو دوست کہہ سکیں، اور دوست کہنے کے بعد میرے اوپر بہت سے قرض ہو جاتے ہیں جو مجھ جیسی لاپروا نادہندہ سے ادا ہونا مشکل ہیں۔

اس لیے تھوڑے لکھے کو بہت جانیے۔

آپ لوگوں پر رشک آتا ہے کہ اتنا اچھا لکھتی ہیں اور اتنے اچھے لکھنے والوں کے بیچ رہتی ہیں۔

میں نے آپ کی طویل کہانی ''آتش کدہ''، ''تخلیقی ادب'' میں پڑھی۔ مجھے اس کہانی نے بہت متاثر کیا۔ اگر یہ ناول کا ایک حصہ ہے تو خدا کے لیے پہلے اس ناول کو مکمل کیجیے۔ (زاہدہ حنا کے ساتھ لمبی ڈرائیونگ تو ہو رہی ہوگی!)

وہ وقت کتنا اچھا تھا جو میں نے آپ اور زاہدہ کے ساتھ آپ کے گھر گزارا— اب پھر وہی مصروفیت شروع ہو گئی ہے۔

آتے ہی کرشن چندر کے فن پر ایک کتاب مکمل کی۔ یہ ساہتیہ اکیڈمی کے لیے لکھی ہے۔ جب ''سلسلہ'' کے احباب جمع ہوں تو میں بھی وہیں موجود ہوں گی۔ یاد کر لیجیے اور

''سلسلہ'' کے تمام احباب کو سلام کہیے۔ خاص طور سے مختار زمن صاحب، آدا بہن، مشفق خواجہ صاحب سے۔ مختار زمن صاحب نے ''جنم کنڈلی'' پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ ''تخلیقی ادب'' کا نیا شمارہ نہیں ملا۔ فصیح بھائی سے سلام کہیے۔

میرے پاس زاہدہ کا پتا نہیں ہے، اس کے لیے ایک خط بھیج رہی ہوں، ملے تو دے دینا۔

آپ کی

بانو

قدرت اللہ شہاب — اسلام آباد

۱۳ر نومبر ۱۹۷۹ء

محترمہ، السلام علیکم!

آپ کا نوازش نامہ مل گیا تھا۔ نیشنل بک کونسل اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے اصحاب باہر گئے ہوئے تھے۔ میں منتظر رہا کہ وہ لوگ واپس آئیں تو صحیح صورتِ حال معلوم کر کے آپ کو لکھوں۔ اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

نیشنل بک کونسل نے ابھی تک ناول شائع کرنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا۔ ان کا اشاعتی دائرۂ کار بک ڈیولپمنٹ کے متعلق مواد شائع کرنے تک ہی محدود ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے البتہ ماضی میں عام دل چسپی کی چند کتابیں شائع کی تھیں۔ لیکن اب ان کا پروگرام بھی زیادہ تر text books اور متعلقہ کتابیں شائع اور reprint کرنے پر مرکوز ہے۔ فی الحال وہ ادبی کتابوں کی اشاعت کی طرف متوجہ نہیں۔ اس لیے آپ کے ناول کی اشاعت کے لیے ان دو اداروں سے توقع رکھنی بے کار ہے۔

لیکن اس صورتِ حال سے بددل ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ آپ بڑا قابلِ قدر تخلیقی اور تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ جب آپ کی کتاب مکمل ہو جائے تو پبلشر بھی ان شاء اللہ مل ہی جائیں گے۔ اس کے متعلق قبل از وقت فکرمندی کی کوئی ضرورت نہیں۔ وقت آنے پر ہم سب مل کر اس کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اہمیت اس وقت اس بات کی ہے کہ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔

میں پرسوں کچھ عرصے کے لیے جنیوا اور پیرس جا رہا ہوں۔ خالد کے پاس لندن بھی جاؤں گا۔ امید ہے کہ انجم سے بھی ملاقات ہوگی۔ واپسی پر اگر کراچی سے گزرا، تو ضرور حاضر ہوں گا۔

والسلام

نیازمند

قدرت اللہ شہاب

جمیلہ ہاشمی —لاہور کینٹ

نہایت عزیز رضیہ بیگم!

دعائیں

بھائی تمھاری محبت و مہربانی اور عنایتِ بے نہایت کا شکریہ ادا کرنے کا وقت بھی نہیں مل سکا۔ اس لیے کہ کچھ تو لاپرواہی تھی اور کچھ تساہل — پھر ہماری ایک سسرالی رشتے دار، جو ہمیں بطورِ خاص عزیز تھیں اور جن سے محبت کا ناتا زیادہ گہرا تھا، چل بسیں۔ وہاں پُرسے میں جاکر کے میں پرسوں ہی لوٹ کر آئی ہوں۔ پھر خانساماں بیمار ہے اور میں ہنڈیا چولھا بھی کرتی ہوں (ہاجرہ بیگم کی طرح کا نہیں بھائی)، پھر کمرے میں گھستی ہوں کہ خط لکھوں تو کتابیں (کرشمہ دامنِ دل سے کشید) کہیں کبھی ایک پرزہ اُٹھایا، کبھی دوسرا، فون کی گھنٹی، گئے دنوں کی محبتوں کے سراغ اور ایسی ہی اور بہت سی مصروفیتیں ہیں مگر یہ مت سمجھ لینا کہ تم کو بھولی ہوئی تھی۔ تم برابر یاد ہو، آج میں نے سوچا یہ کام کر ہی ڈالوں۔ (دیکھا تم نے، کتنا لمبا جملۂ معترضہ تھا) اب جناب نہ لکھنا لکھانا، نہ پڑھنا پڑھانا۔ سردار احمد صبح ناشتہ کیے بنا عاشی کو پہنچانے چلے گئے۔ سخت خفا ہوکر آئے اور ہر شے میں مین میخ نکالنے لگے۔ میں نے کہا، ہم اگر نوکروں کو کبھی ایسے ڈانٹیں تو آپ خفا ہوتے ہیں اور آپ اُسی طرح ہمیں ڈانٹ رہے ہیں۔ اب کمرے میں کتابیں بکھری ہیں، کتابیں، رسالے، پرچے ایک بکواس بھرا پڑا ہے۔ تمھیں خط لکھ کر امرتا پریتم کو اور اپنی کو خط لکھنے کا ارادہ ہے اور پھر ہنڈیا چولھا۔ آج شام خالدہ کے ہاں میلاد ہے، وہاں جائیں گے اور دن بہر حال ختم ہو جائے گا۔ یونہی زندگی کے دن گزرے چلے جاتے ہیں۔

سردی کچھ کم ہو رہی ہے، آسمان (حجاب امتیاز علی کے) کی طرح گہرا نیلا ہے۔ بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا بہت خوب صورت لگتا ہے۔ ہوا میں سردی کے باوجود بہار کی مہک سی ہے۔ بدن سے چھو کر خوش گوار لگتی ہے۔ بسنت کی آمد کے لیے لوگوں نے پتنگوں کی ڈوروں میں مانجھا لگانا شروع کر دیا ہے۔ نہایت عمدہ موسم ہے، لکھنے لکھانے اور یادوں کو تازہ کرنے کا موسم۔ تم تو کراچی کے رہنے والوں کی طرح سمندر کی گھن گرج اور جھاگ اُڑاتی موجوں کے سے بے قرار pattern میں اب set ہوگئی ہو۔ نوک پلک سے درست لکھنے پڑھنے اور تصویریں بنانے میں لگی ہوئیں۔ سنو ایک بات کہوں، تم رضیہ فصیح احمد ہونا، یہ جو ساحری طاقتیں اور قوتیں بکھیر کر اِدھر اُدھر مختلف محاذوں پر بیٹھی ہوئی ہو، کیوں نہیں ایک ہی محاذ پر اپنا سارا زور لگا تیں؟ آدمی آخر ایک اکائی ہی تو ہوتا ہے (اور تم بخدا بوعلی سینا نہیں ہو)۔ یہ میری آرزو ہے کہ تم ''لینڈ سلائڈ'' سے بھی بڑھیا کہانیاں لکھو اور خوب صورت ناولوں سے اردو ادب کا دامن بھرو۔ مصوری کے لیے بقول شاعرہ ''اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق''، اور تمھارے پاس کیا اتنی فرصتِ زندگی ہے؟ (میں نے اپنی سی کہی ہے تم برا نہ منا لینا)۔

بچوں سے پیار کہنا اور دعائیں۔ فصیح بھائی سے سلام کہو۔

دعا گو
تمھاری
جمیلہ

ابن انشا — کراچی

(۱)

10-4-63

رضیہ بیگم، آداب!

میں تو ڈھاکے میں پھنس گیا۔ حاجی لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم گنہ گاروں کو سیٹ ہی نہیں مل رہی تھی۔ ہزار خرابی، اس اتوار کو جیٹ کی بجائے سپر کانسٹلیشن میں آیا جو ڈھائی تین گھنٹے کی جگہ چھ ساڑھے چھ گھنٹے لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے حد کوفت ہوئی۔ ہاں ڈھاکے میں مزے رہے۔

آپ اونچے اکنامک گروپ کا لطیفہ بھول جائیں تو عرض کروں کہ شاہ باغ میں پڑا اینڈتا تھا۔ شہاب صاحب بھی وہیں تھے۔ صبح پانچ بجے اٹھا کے مجھے رمنا کے ریس کورس کی سیر کو لے جاتے تھے۔ میں نے بارہا عذر کیا کہ اس سیر اور صبح کی ورزش اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے خاکسار کی صحت خراب ہو جائے گی جو مدت العمر سے شہر کی دھواں دھار فضا میں رہنے اور ساڑھے سات آٹھ بجے اٹھنے کا عادی ہے، لیکن نہیں۔ پھر شاد باغ والے ہمیشہ کے کھانے میں ٹھونسم ٹھانس کے عادی ہیں۔ اور کراچی اور لاہور کی اونچی دکانوں کے بخلاف یچی بات یہ ہے کہ سستے بھی ہیں اور اچھے بھی ہیں۔ حتیٰ کہ بااخلاق بھی۔ اگر وہ بعد میں بل لینا بھی چھوڑ دیں تو ساری دنیا ان کی گرویدہ ہو جائے۔

آپ کا پارسل میری غیر موجودگی میں آیا تھا۔ ریاض میری ڈاک اس اثنا میں لے گئے تھے۔ ناول اور خط ان کا آدمی آج دے کر گیا ہے۔ ناول تو اب میں ذرا فرصت سے ڈھاکے کی لنگی اور گنجی پہن کر دیکھوں گا۔ ہاں خط کا جواب دینا واجب ہے۔ آپ سے ملاقات مختصر رہی لیکن جی خوش ہوا۔ آپ ہمارے ڈھب کی آدمی ہیں۔ سادگی اور تکلف اور تملق سے عاری۔ خدا فصیح احمد صاحب کو جلد سچ مچ کا میجر جنرل بنائے۔ امید ہے، اس کے بعد بھی آپ یہی رہیں گی۔ ایک بات ہے، آپ کی تحریروں میں جو شرارت بلکہ فتنہ پردازی پائی جاتی ہے اس کا گفتگو میں مظاہرہ نہیں ہونے پایا۔ گہرے دریا ہمیشہ دھیما بہتے ہیں۔ لیکن پھر اپنی برائی کرنی ضروری ہو جائے گی کہ اپنی شخصیت کو ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں۔ خیر، اس وقت خاکساری اور خود مذمتی کا موڈ بھی نہیں۔ ہم بھی اچھے آپ بھی اچھے۔ میں نے تو جو کچھ گفتنی تھا، ابیات میں کہہ دیا۔ سچ یہ ہے کہ وہی اصل زندگی ہے۔ بس اس زندگی میں کہ کہنے کو سوز ہی سوز ہے، کامران اور بامراد ہونے کی دعا دیجیے۔

دیکھا آپ نے قلم کو ذرا سی ڈھیل دی اور رقت طاری ہونے لگی۔ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے افسانے کہنے کو جی چاہنے لگا۔ آپ کیا جانیں اس بستی کے اک کوچے میں کیا کیا نیرنگ ہیں۔ لیکن اب اے قلم، حد ادب۔

آپ کا ایک ایک سنگ میل گنے جانا اچھے خاصے سفرنامے کو تحریک دے سکتا ہے اور اس میں الحاقی کلام شامل کرنے کی بہت کم ضرورت ہوگی۔ ''درد کے فاصلے'' آپ نے ناول کا بہت اچھا نام سوچا ہے۔ باقی باتیں ناول اور افسانوں کے متعلق آپ کو ریاض خود لکھ دے گا۔ آپ کے شعر بھی دیکھے۔ اگر یہ اشعار بے اختیاری میں سرزد ہوئے ہیں تو:

کیا جانیں کیا کرے جو خدا اختیار دے

کہیں بھیجنے سے پہلے اسے ایک نظر ضرور دیکھ لیجیے۔ میں ذاتی طور پر عروضی آزادیوں کی

بجائے صوتی خوب صورتی کو ترجیح دیتا ہوں۔ 'جاں' ہی سے جھٹکا لگتا ہے، آپ 'جان' پڑھیے، مطلب وہی رہے گا۔

ناوکِ دشنام ایک مرکب لفظ، ساری غزل کے مزاج سے بے آہنگ ہوگیا ہے۔ میں تو غمِ دوراں کا مضمون کم باندھتا ہوں۔ آپ نے باندھا ہے تو ذرا کس کر باندھیے۔ آپ کی میں نے بہت بہت اچھی غزلیں پڑھی ہیں، یہ ان سے نکلتی ہوئی نہیں۔ آپ میجر جنرل صاحب کو ایک اوسط قاری فرض کر کے ان کو اپنی غزلیں پڑھایا کیجیے اور ذرا ان کو آزادیِ اظہار کا حق بھی دیجیے۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن کبھی کسی موقعے پر آپ کے گھریلو تعلقات میں کوئی بدمزگی آئی تو میں ذمے دار نہ ہوں گا۔

بہت لکھ گیا۔ اس وقت سات بج رہے ہیں۔ ظاہر ہے شام کے۔ صبح کو تو میں سو رہا ہوتا ہوں۔

چل خسرو گھر اپنے، سانجھ بھئی چو دیس

نیاز کیش

ابنِ انشا

(۲)

۱۴ رمئی ۱۹۶۳ء

آداب رضیہ بیگم!

میں گیا تھا لاہور، واپس آیا کل۔ اب عیدِ قرباں مبارک۔ خدا آپ کو قربانی کی توفیق دے، آمین۔ کبھی آپ نے سوچا کہ قربانی دینے والا تو جنت میں جاتا ہے لیکن بکرا کہاں جاتا ہے؟ کہنے والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ پلِ صراط پر گزرتے وقت وہی قربانی کا بکرا کام آتا ہے۔ اول تو جس قسم کے بیمار اور مریل بکرے آج کل آتے ہیں، وہ خود بھی قعرِ جہنم میں گریں گے، سوار کو بھی گرائیں گے۔ پھر جو لوگ آتے سال قربانی دیتے ہیں، وہ بیک وقت اتنے بکروں اور مینڈھوں پر کیسے سوار ہوں گے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دینے کے لیے اتنی ہی بار پلِ صراط پر سے گزارنے کا حکم دے (سلامت ہی سہی لیکن ڈر سے جان نکلنے کا اور قوی امکان ہے)۔ بہر حال میں تو بکرے مینڈھے کسی بھی جانور کی سواری پسند نہیں کرتا اگر آپ کا شمار مفتیانِ شرعِ متین میں ہے تو بیچ اس مسئلے کے، رائے کا اظہار کیجیے۔ خط و کتابت صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔ مولانا

مودودی مدظلہ یا ان کے کسی چیلے چانٹے کو نہیں دکھائی جائے گی۔

لاہور میں پورے پندرہ روز رہا لیکن یہ سارے دن ایک ذاتی ابتلا اور پریشانی کے تھے۔ اندیشہ ہائے دور و دراز کی ضرورت نہیں۔ ہمسایہ ماں جایا مشہور ہے، سو ایک ہمسایے نے کہ، سفید و سیاہ کا مالک ہے، ہماری ایک دیوار ڈھا دی تھی۔ اور کچھ فوج داری وغیرہ بھی کی تھی۔ خیر، اب وہ معاملہ رفت گزشت۔ آپ کے ناول کا ذکر ڈھاکے میں بھی آیا تھا، لاہور میں بھی۔ مفتی بھی ملے تھے لاہور میں — وعدہ کر گئے کہ میں ناول بھجوا دوں گا۔ سو، وہ پنڈی میں تادمِ تحریر ان کے بستے میں ہے۔ اب میں پھر ان کو لکھتا ہوں۔ اس کے چھپنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہیے۔ باقی رہا ''درد کے فاصلے۔'' یہ بھی مجھے تو اچھا لگا۔ کوشش یہ ہوگی کہ گلڈ کا ناول پہلے نہیں تو اس کے ساتھ ساتھ چھپے۔ ریاض سے کہہ دوں گا کہ آپ کو خط لکھے۔

شہاب خود ایک پریشانی میں تھے۔ ان کی بیگم کا ہر بار سیزیرین آپریشن ہوتا ہے۔ اب کے جو بچہ ہوا، اس کا ایک پھیپھڑا پورا نہ کھل پایا، پچاس گھنٹے کے بعد انتقال کر گیا۔ بیگم کا میجر آپریشن الگ۔ سو، ہم دونوں پریشان اکٹھے تھے اور ایک دوسرے کا درد بانٹتے تھے۔ اس ابتلا کے چکر سے قطع نظر لاہور میں بھی 'عیش' کرتے تھے۔ وہ مجھے صبح ساڑھے پانچ بجے گھر سے اٹھاتے تھے اور ہم دو گھنٹے لارنس باغ میں گھومتے اور گپ زنی کرتے اور تازہ شہتوت خرید کے کھاتے تھے۔ اب جس شخص کی قسمت میں عیش لکھا ہو، وہ کیا کرے۔

آپ نے مجھ پر بھی رشک کیا ہے، اس پر میں بہت محظوظ ہوا۔ اونچی کرسی اور اقتدار تو آپ نے چڑانے کو لکھا ہے۔ میں ان باتوں میں نہیں آتا۔ چائے، 7 up اور پان البتہ وہ تعیش ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جائز کر رکھی ہیں۔ دوست احباب بھی بس ہیں۔ اب رہا چاروں طرف کتابوں کا معاملہ سو، اس میں آپ کو رشک کرنے کی اجازت ہے۔

ایک بیٹے کو اس کی ماں نے دعا دی تھی کہ تیرے چاروں طرف کاروں کی ریل پیل ہوگی۔ سو، وہ سعادت مند بڑا ہو کر ٹریفک کا کانسٹیبل بنا۔ بایں ہمہ آپ کے رشک کا شکریہ۔ یوں بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔ باقی رہا سیر و سفر کا معاملہ! وہ بہت ہے لیکن میں کراچی سے نکلتے گھبراتا ہوں ڈھاکے آپ جائیں تو سامان تو زود یا بدیر (بلکہ زود ہو جائے گا) لیکن آپ تنہا جا بھی سکیں گی۔ اس طرح بیرون ملک وفدوں کے نقطۂ نظر سے بھی بتائیے کہ کیا صورت حال ہے۔ آپ میں اتنی قوت، جان اور خود اعتمادی ہے (علاوہ لیاقت کے) کہ کوئی پرابلم نہ ہونا چاہیے۔ دونوں لوازم کا

ذکر اس لیے کر دیا کہ کارکنانِ قضا و قدر بالعموم—

آناں را کہ بایں دہند، آں نہ دہند

یہ بھی سن کے خوشی ہوئی کہ میں گہرا آدمی ہوں اور میرا رعب بیٹھ سکتا ہے۔ آئندہ میں بچوں کو ڈرانے کا کام (پارٹ ٹائم) بھی کیا کروں گا۔ میجر جنرل صاحب کو سلام۔

دعا گو

ابنِ انشا

انور سدید— سرگودھا

۱۶ر فروری ۱۹۶۷ء

محترمہ رضیہ فصیح صاحبہ!

کئی دنوں سے آپ کو عریضہ ارسالِ خدمت کرنے کی سوچ رہا تھا۔ ''اردو زبان'' جس باقاعدگی سے چھپ رہا ہے، اسی باقاعدگی سے آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ جنوری ۱۹۶۷ء سے تو یہ ماہ بہ ماہ شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ فروری کا پرچہ آج آپ کو ارسالِ خدمت ہو رہا ہے۔

آپ کو تو شاید اس بات کا علم نہ ہو مگر مجھے ضرور احساس ہے، کہ ''اردو زبان'' آپ کی توجہات سے ابھی تک محروم ہے۔ کچھ قصور میرا بھی ہے کہ میں نے ''اردو زبان'' کی ترسیل کو ہی دعوت سمجھا۔ از راہِ کرم آئندہ پرچے کے لیے افسانہ عطا کر کے ممنونِ کرم کیجیے۔

فنون میں آپ کا انشائیہ— پچھلے دنوں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے ہاں ایک محفل میں گفتگو کا موضوع بنا رہا۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ اس کا محرک ڈاکٹر سہیل بخاری کا وہ مضمون ہے جو ''اوراق'' میں شائع ہوا۔ بہر حال سب نے اُس انشائیے کو بے حد دل چسپ پایا۔ آپ نے ''ماہرِ لسانیات'' کا شگفتہ خاکہ کھینچا ہے۔ اور اگر اسے پڑھ کر سہیل بخاری صاحب یا شوکت سبزواری سامنے آجاتے ہیں تو غالباً یہی اس کی کامیابی ہے۔

فروری کے پرچے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مقالہ ''آزاد کا اسلوب فکر'' چھپ رہا ہے۔ یہ مقالہ بعض حلقوں میں شدید ردِ عمل کا باعث ہوا۔ دوسری مندرجات کے ساتھ ساتھ اس مقالے پر آپ کی گراں قدر رائے کا منتظر رہوں گا۔

امید ہے کہ آپ مزاج بخیر ہوں گی۔
ڈاکٹر وزیر آغا اور رحمت اللہ صاحب کا سلام عرض ہے۔
جواب سے جلدی نوازیے گا۔

مخلص
انور سدید

جمیل الدین عالی— کراچی

۲۵ر اکتوبر

محترمہ رضیہ بیگم!
السلام علیکم!

آپ کا خط مورخہ ۲۳ر اکتوبر ملا۔ یہ ذاتی سا ہے، اس لیے ذاتی جواب ہی کافی ہے۔ اختصار معاف کیجیے گا۔

آدم جی انعام

جب تک یہ خط آپ کو پہنچے، شاید ایک اعلان ہو چکا ہو۔ امید ہے کہ ۷ر نومبر کو تقسیم بدست مسٹر جسٹس کارنیلیو، ڈھاکے میں ہوگی۔ آپ کو خط اور ٹکٹ وغیرہ پہنچے گا۔ اگر تاریخ مقرر نہ ہوئی تو ایک بار آپ کو اور سب متعلقہ انعام یافتگان کو ایک وضاحتی خط بھیج دیا جائے گا۔ اس وقت تک مزید صبر کرنا پڑے گا۔ آپ کو معلوم نہیں، نہ ابھی کچھ مزید دن ہو سکتا ہے کہ ہم کو ان تین برس میں کن مشکلات اور حالات سے گزرنا پڑا ہے۔

بہرحال ایک ادیبہ ہوتے ہوئے آپ کم از کم یہ گزارش سن لیجے کہ آخری فتح ادب اور ادیب کی ہوئی ہے۔

آپ کی کراچی میں آمد وغیرہ

مجھے آپ کی آمد یا واپسی کا کوئی علم نہیں۔ آپ نے از خود ایک طرح کی خفگی اختیار کر لی

ہوگی یا اپنے راست استفسار کی شرمندگی یا لوگوں کے کہنے میں آکر خود ہی کچھ سوچ لیا ہوگا۔ مجھے کاموں سے اتنی فرصت نہیں کہ ایسی باتوں میں پڑوں۔ آپ ادیب لوگ جذباتی ہوتے ہیں (ہونا بھی چاہیے) طرح طرح کی خوش گمانیوں اور بدگمانیوں میں بہت جلد مبتلا ہوجاتے ہیں اور بہت جلد ان سے بری بھی ہوجاتے ہیں— میں زیادہ مختلف نہیں ہوں— اس معاملے میں تاخیر ہی اتنی ہوئی کہ نہ صرف آپ بلکہ دوسرے انعام یافتگان کو بھی طرح طرح کے اندیشے (بجا) ستانے لگے تھے۔

مگر گلڈ اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ہر ادارے کو چند آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک آزمائش یہ تھی جس سے اب تک گلڈ گزر رہا ہے۔ کبھی آپ نے گلڈ میں گہری دل چسپی لی تو بہت کچھ معلوم ہوجائے گا۔ مگر فی الحال یقین رکھیے کہ میں جوابی خفگی یا بدگمانی کا متحمل ہی نہیں ہوسکتا۔ پندرہ سو نازک مزاج انا دوست ادیبوں سے گزارا کرنا پڑتا ہے۔

پنبہ کجا کجا نہم دل ہمہ داغ داغ شد

آپ آئندہ کراچی آئیں تو مجھے یا میری بیوی کو ضرور فون کریں۔ جو سماجی رشتہ ہمارا آپ کا قائم ہوا ہے، اس پر ایسی باتوں سے ہماری حد تک کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

امید ہے کہ آپ ڈھاکے جائیں گی، میرا جانا ابھی ممکن نظر نہیں آتا۔ شاید میں دفتری کام سے باہر جاؤں۔ اگر نہ گیا تو ڈھاکے آؤں گا۔ وہاں آپ ہوں گی تو اس تاخیر کا مجمل حال بتا سکوں گا۔ اور آپ کے باہر جاتے کیا ہوا ہے، پر بات چیت ہوسکے گی۔ فی الحال یہ سمجھ لیجیے کہ اب تک میں نے کسی خاتون کو کسی وفد میں نہیں بھیجا۔ ایک خاتون کا مردوں کے وفد میں جانا میں بوجوہ مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر ہارورڈ کا ذکر ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے گزشتہ بار آپ کے نام کی سفارش ہارورڈ بھیجی تھی۔ آخری انتخاب ان کے ہاتھ میں ضرور ہے لیکن پہلے حکومت (وزارتِ تعلیم) کئی امیدواروں کی فہرست انھیں بھیجتی ہے جس میں سے وہ انتخاب کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ حکومت کی فہرست میں آپ کا نام نہیں تھا لیکن چونکہ میں اب حکومت سے غیر متعلق ہوں اس لیے کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا، نہ کسی کے کہے کی تردید یا تائید کرسکتا ہوں۔ آئندہ بار آپ درخواست دیں تو یہ کوشش کی جاسکتی ہے، مگر یاد رہے کہ وہ گلڈ کا وفد نہیں ہوتا بلکہ ایک پاکستانی مندوب ہوتا ہے جس کے انتخاب میں ہارورڈ والے مجھ سے ایک سابق ہارورڈیے کی حیثیت سے مشورہ کرتے ہیں۔ رہا وفد کا معاملہ تو غالباً ایک وفد نہیں جائے گا۔ اس کے بارے میں بہت کچھ سوچنا ہے۔ میں صفائی سے بات کرنے کا عادی ہوں، اس لیے اس ذیل میں ابھی آپ سے کوئی حتمی وعدہ نہیں کرتا، اصلی سوال تو خواتین کو وفد میں شامل کرنے یا نہ کرنے کا ہے۔ یہی ہوگا کہ

ہوں تو کون کون ہوں۔

بہر حال، چلتے چلاتے اپنا دل بھی صاف رکھیے اور ہماری طرف سے ایک شعر سنتی چلیے:

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
کہ در طریقتِ ما کافریست رنجیدن

(میری بیگم سلام کہتی ہیں، فصیح صاحب کی خدمت میں میرا آداب)۔

○○○

خصوصی مطالعہ

احفاظ الرحمٰن کی نئی نظمیں

پروفیسر سحر انصاری

دنیا کے بعض مفکر مورخین نے تاریخ کا ایک رُخ یہ بھی پیش کیا ہے کہ تاریخ بادشاہوں اور فاتحین ممالک کی داستانوں کا نام ہی نہیں، اسے کسی بھی انسانی سماج سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ تاریخ ادھوری اور جزوی طور پر لائقِ توجہ ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تاریخ کے صفحات پر عام آدمی کا چہرہ نظر نہیں آتا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عام آدمی اور اس کے گرد و پیش کی دنیا تاریخ کا حصہ نہیں ہوتی؟ شاید اسی نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کئی مورخوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی عہد کی صحیح تاریخ کشی کی جا سکتی ہے۔ اور ایسی ہی سماجی تاریخ میں عام آدمی کا چہرہ اُس کے خوابوں اور خوابوں کی شکست کے ساتھ دکھائی دے سکتا ہے۔

دورِ حاضر میں سماجی آگہی گزشتہ ادوار کے مقابلے میں زیادہ واضح رنگوں میں نمایاں ہوئی ہے، اس میں جدید ذرائع ابلاغ کا خاص حصہ ہے۔ اب یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی حساس اور تخلیقی ذہن اپنے مقامی اور عالمی منظرنامے پر نظر ڈالے اور اُسے خوب صورت باغوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں بھری جھاڑیاں اور بنجر راستے نظر نہ آئیں۔ شاعری کا دائرہ وہیں مکمل ہوتا ہے جہاں سنہری شاموں اور حنا آلود شفق کے ساتھ ساتھ ڈیزل کے دھوئیں اور ایمبولینس کی چیخیں بھی سنائی دیں۔

آج کی شاعری میں جو تخلیق کار ان زاویوں سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو دیکھتے ہیں، ان میں ایک اہم نام احفاظ الرحمٰن کا بھی ہے۔ حسنِ اتفاق سے میں احفاظ الرحمٰن کو اُس وقت سے جانتا ہوں، جب انھوں نے ایک نو وارد کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا اور اب کئی دہائیوں کے گزران کے بعد اُن کی تخلیقی زندگی میں جو تجربے شامل ہوئے ہیں، اُن کا فن کارانہ

اظہار ہی اُن کی شاعری کی پہچان بن گیا ہے۔

احفاظ الرحمٰن سماجی شعور اور تاریخ کے جدلیاتی عمل کے ساتھ ساتھ انسانی شعور کے ارتقا پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اس کا اظہار اُن کی تحریروں میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ وہ ایک نظریاتی انسان ہیں اور اس نظریے کی خاطر انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی سہی ہیں۔ ایک اور اہم رُخ ان کی شخصیت کا یہ ہے کہ وہ ایک سینئر اور کامیاب صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ ورنہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ صحافت کی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ ذمے داریوں میں تخلیقی فن کار کہیں گم ہوجاتا ہے لیکن احفاظ الرحمٰن نے صحافت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ شاعری کے زندہ عمل کو بھی برقرار رکھا ہے۔ اور اس طرح کہ شروع میں ہم نے جو تاریخ اور سماج کی بات کی تھی، احفاظ الرحمٰن کی شاعری سے بھی ہم عصر تاریخ کے کئی سماجی گوشے اخذ ہیے جاسکتے ہیں۔

ایک طرف احفاظ الرحمٰن اگر بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے مجروح انسانوں کا حال لکھتے ہیں تو دوسری طرف انھیں داتا دربار کی اہمیت بھی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور یہ رُخ نمایاں ہوتا ہے کہ داتا صاحب جیسے بزرگوں نے ہی صحیح معنوں میں اونچ نیچ اور ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق مٹا کر انسان دوستی اور وسیع المشربی کی بنیاد رکھی۔

انھوں نے ایک طرف اگر بھوک ننگی پر جا کے چھوٹے سے سنسار کا دُکھڑا بیان کیا ہے تو دوسری طرف ایسی رجائیت بھی ہے کہ جس میں غم کو بھی زندگی کا ایسا راگ بنا دیا ہے کہ جو ہر آمر کے نام ایک موت کا پیغام لکھے گا لیکن شرط یہ ہے:

اُسے قوت میں ڈھلنے دو
یہ اپنا غم ہے، اس غم کو کبھی مدھم نہ ہونے دو

احفاظ الرحمٰن کی نظموں کا ایک نمایاں اسلوب یہ بھی ہے کہ وہ مجرد یا abstract اشیا کو جیتے جاگتے پیکروں میں ڈھال دیتے ہیں جیسے:

کہانی کیسے چلتی ہے، یہ کس دھارے میں بہتی ہے
کسی کی گود میں پلتی ہے یا خود ساز ہوتی ہے
یہ کیا ارمان رکھتی ہے
یہ کن خوابوں میں رہتی ہے

یا زندگی کے بارے میں اُن کی نظم کے یہ مصرعے:

زندگی ننھے بچوں کی مسکان میں

مامتا کے سمندر کی للکار میں
پھول پتوں کی معصوم گفتار میں
خالی ہاتھوں کے دل کش سوالات میں
ریگ زاروں کی جلتی مناجات میں
زندہ ہے زندگی
زندہ ہے زندگی

احفاظ الرحمٰن لکھتے تو شاید اپنی جذباتی اور ذہنی کیفیات کے مطابق خاصی وسعت کے ساتھ ہیں لیکن نشر و اشاعت اور صحافت و طباعت کے شعبوں میں ذمے دار حیثیت رکھنے کے باوجود ان کا کلام کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا کہ عنبریں حسیب عنبر نے احفاظ الرحمٰن کی تازہ نظمیں شاملِ اشاعت کیں، اس طرح احفاظ الرحمٰن کے شاعرانہ اسلوب اور اُن کے خاص خاص موضوعات سے تھوڑا بہت تعارف یقیناً ہو جائے گا۔

○○○

چھوٹا سا سنسار

احفاظ الرحمٰن

تنکا تنکا جوڑ بنایا چھوٹا سا سنسار
پاپی پیٹ کی بپتا پل پل ساتھ رہی مہاراج!
سپنوں کے پیچھے ہم بھاگے، ہاتھ نہ آیا کوئی
رُوکھی سوکھی روٹی کا بھی کال پڑا ہے آج
چھوٹا سا سنسار تھا، وہ بھی بکھر گیا مہاراج!
بکھر گیا سب باسن بھانڈا، بکھر گیا کھلیان
پانی میں ہم ڈھونڈتے ہیں پُرکھوں کا گورستان
چھوٹا سا سنسار ہمارا مٹی ہوگیا آج
سنتے ہو مہاراج!

آنسو پیتے پیتے جل گئے بچوں کے ارمان
ننھے ننھے دیپ تھے جن کو ڈس گئی کالی رات
محل تمھارے روز منائیں دیوالی، شبرات
روز تمھاری ڈیوڑھی پر ہو خوشیوں کی برسات
اونچی گدّی رہے تمھاری، اونچا ٹھاٹ اور باٹ
چاروں اور تمھاری جے جے کار مچی مہاراج!

چاروں اور تمھاری نوبت باج رہی مہاراج
پیرس سے لندن تک گونجے نام تمھارا سائیں
اونچی گدی رہے تمھاری، اونچا ٹھاٹ اور باٹ
چھوٹی سی ہے ارج ہماری، چھوٹا سا سنسار

بھوکی ننگی پرجا پر بھی کرپا ہو سرکار
چھوٹا سا سنسار ہمارا بکھر گیا مہاراج!
سنتے ہو مہاراج!

○○○

آنکھیں پتھرا گئیں، کان بنجر ہو گئے

احفاظ الرحمٰن

روز سینہ زنی، روز غم پروری
روز لاشوں کے پیغام پڑھتے ہوئے اور سنتے ہوئے
آنکھیں پتھرا گئیں، کان بنجر ہوئے

ہم رہیں نا رہیں
پھول جیسے مہکتے ہوئے لفظ
زندہ رہیں
پیار کی چاہ میں مسکراتے ہوئے لفظ
زندہ رہیں
نفرتوں کو مٹانے کی دُھن میں مگن لفظ
زندہ رہیں

امن کی آرزو آدمیت کے سینے میں زندہ رہے
ننھے بچے کی کلکاریوں میں دمکتی انوکھی خوشی
رنگ اپنے جہاں پر لٹاتی رہے
اک طرف آگ ہے،

اک طرف میٹھی شبنم کی مہکار ہے
اک طرف حسن ہے،
اک طرف خوف و دہشت کی للکار ہے
زندگی کے لیے، آشتی کے لیے
ننھے بچوں کی کلکاریوں میں دمکتی
انوکھی خوشی کے لیے
غم سے بے حال آنکھوں کی دل بستگی کے لیے
اپنے سینوں میں پیوست
نفرت کی ہر شکل کو
نوچ کر لاؤ باہر اور اک قبر کھودو،
جو پاتال سے جا لگے
اور پھر ساری نفرت کی لاشوں کو اس قبر میں ڈال دو

روز سینہ زنی، روز غم پروری
روز لاشوں کے پیغام پڑھتے ہوئے اور سنتے ہوئے
آنکھیں پتھرا گئیں، کان بنجر ہوئے!

○○○

خواب سب خواب رہے

احفاظ الرحمٰن

ہم نے چاہا تھا کہ
آ جاؤ تو کچھ ساتھ رہے
ہاتھ میں ہاتھ رہے
بات سے بات چلے
بیتی گھڑیوں سے ملاقات کا در کھولیں ہم
لہر من میں جو اٹھے، اس سے لپٹ جائیں ہم
دیر تک بارشِ اکرام کا پیغام رہے
دیر تک قلقلِ مینا کی صدا ساتھ رہے
الجھی سلجھی ہوئی یادوں کے چمن میں گھومیں
غمِ دنیا کی حکایات، غمِ جاں کا فسوں
دھوپ میں ہم سفری، آبلہ پائی کا جنوں
شبنمیں چھاؤں کے قصے، شفقِ دل کا نکھار
رنج کا عکس کبھی اور کبھی خوشیوں کی بہار
رنگ سارے تھے محبت کی مہک سے سرشار
کیسے چاؤ سے گزارے تھے وہ لمحے ہم نے
ایک لمحے میں سمٹ آئی ہوں صدیاں جیسے

ہم نے چاہا تو بہت کچھ تھا، مگر آئے نہ تم
سارے ارمان پسِ گردِ تغافل ہوئے گم
جلتی آنکھوں میں کوئی دید کا منظر نہ کھلا
خواب سب خواب رہے، خواب کا پیکر نہ کھلا

○○○

یہ غم مدھم نہ ہونے دو!

احفاظ الرحمٰن

یہ کس کا غم ہے
جس کی آنچ میں
ہر دل سلگتا ہے
یہ کیسا غم ہے
جس کا عکس ہر ذرّے کے سینے میں سسکتا ہے
زمیں کی گود میں سمٹا ہوا
چھپ چھپ کے روتا ہے، بلکتا ہے
فلک بھی جس کی فریادوں کو سن کر
تھرتھراتا ہے
ہوا بھی سوگ میں ڈوبی ہوئی تھم تھم کے چلتی ہے
شجر بھی سر جھکائے
سانس گھٹنے کے مناظر پیش کرتے ہیں

یہ اپنا غم ہے
محکوموں کا، مجبوروں کا ماتم ہے
دل افگاروں کا ماتم ہے

گریباں چاک دیوانوں کا، ناداروں کا ماتم ہے
گریباں چاک رہنے دو
یہ غم مدّھم نہ ہونے دو
یہ اپنا غم ہے، اس غم کا علَم اب خم نہ ہونے دو
اسی غم کے شراروں سے کھنڈر یہ گلستاں ہوگا
جو مجبوروں کو، محکوموں کو، دل افگار روحوں کو
نئی منزل کی دل کش چاہ میں بیدار رکھے گا
یہ ہر آمر کے نام ایک موت کا پیغام لکّھے گا
اسے قوّت میں ڈھلنے دو
یہ اپنا غم ہے، اس غم کو کبھی مدّھم نہ ہونے دو

○○○

کہانی کیسے چلتی ہے؟

احفاظ الرحمٰن

کہانی کیسے بنتی ہے، یہ کس مٹی میں اُگتی ہے
کہاں سے سر اٹھاتی ہے
کہانی کیسے چلتی ہے، یہ کس دھارے پہ بہتی ہے
کسی کی گود میں پلتی ہے یا خود ساز ہوتی ہے
یہ کیا ارمان رکھتی ہے، یہ کن خوابوں میں رہتی ہے

یہ کیسے خوش گمانی کی فضا میں
سانس لیتی ہے،
یہ کیسے بدگمانی کی گھٹن میں آہ بھرتی ہے
زمیں سے آسماں کو دیکھ کر حیران ہوتی ہے
کھنکتی، کھلکھلاتی ہے،
کسی اَلھڑ سی دوشیزہ کی صورت مسکراتی ہے
چمکتے آئنوں کے ساتھ پیہم رقص کرتی ہے
چھنا چھن چھن، چھنا چھن چھن
حسیں انجام میرا منتظر ہے ہاتھ پھیلائے
حسیں منزل پہ میرے حسن کا قصہ رقم ہوگا!

سفر کتنے پہ جشنِ عام کا قصہ رقم ہوگا!!

قدم جب آگے بڑھتے ہیں
ہوا کے مہرباں ہاتھوں کی نرمی پیار کرتی ہے
قدم جب آگے بڑھتے ہیں
تو پھر سورج کی حدّت سے پرِ پرواز جلتے ہیں
نئے کردار ملتے ہیں، نئے عنوان کھلتے ہیں
کبھی رنگوں کی بارش تو کبھی بے نام سی سازش
عنایات وحوادث کے نئے اسباب کھلتے ہیں
پرانے رنگ سورج کی تپش میں آب کھوتے ہیں
تحیّر کی نئی دنیا کے منظر جھلملاتے ہیں
تو بینائی نہ ہونے اور ہونے کے گماں کا
وار سہتی ہے
کہانی لڑکھڑاتی ہے، جھجکتی ہے، سنبھلتی ہے،
سنبھل کر سانس لیتی ہے،
شکستہ آرزو کی کرچیاں سینے میں چبھتی ہیں
گرجتا ہے اندھیرا، چیختا ہے، کف اڑاتا ہے
گرجتا ہے اندھیرا...
گرجتا ہے اندھیرا....تو...
اچانک خوش گمانی دل پہ اس کے ہاتھ رکھتی ہے

جو دیکھا تھا، جو گزرا تھا، وہ شاید ایک دھوکا تھا
کہ دل پر وہم کی یورش سے انساں ماورا کب ہے؟
کہانی سوچتی ہے اور قدم آگے بڑھاتی ہے،
کبھی گرتی ہے، اٹھتی ہے، سسکتی ہے، بکھرتی ہے
سراب راہ کی گردش میں ہوش اپنا گنواتی ہے
جب آئے تجربے کی زد پہ، کچھ کردار بے دم تھے
تھکے الفاظ تھے کچھ اور کچھ خالی تماشا تھے

کہانی جب بنے، جیسے بنے، اس کو تو بننا ہے
سو، وہ چلتی ہی رہتی ہے
اب آخر میں یہ منہ کے بل گرے گی
یا حسیں منزل پہ اس کے حسن کا قصہ رقم ہوگا
سفر کٹنے پہ جشنِ عام کا قصہ رقم ہوگا،
سوالوں کے بھنور میں پھنس کے رہ جانے سے کیا حاصل؟
کہانی کو ذرا چلنے دو، منصف وقت کو انصاف کرنے دو
کوئی تو موڑ آئے گا،
جو خود اعلان کر دے گا
کہانی بن گئی ہے یا کسی اندھے کنویں میں
گر کے اندھی ہو گئی ہے
○○○

سدا رہے آباد
(داتا دربار پر دہشت گردی — ایک تاثر)

احفاظ الرحمٰن

سدا رہے آباد ترا دربار
تری سرکار
سدا تری چھاؤں میں پائے
دکھیا چین قرار
سدا رہے ترا چشمہ میٹھا
سدا رہے ترا پیار
سدا رہے آباد ترا دربار
تری سرکار

پیار کیا دھرتی سے تو نے
دھرتی تیری یار
پیار کیا انساں سے تو نے
انساں تیرا یار
مرہم جیسے ہاتھ ترے
ترے بولوں میں مہکار
سدا رہے آباد ترا دربار
تری سرکار

نفرت کی سب دیواروں سے
نفرت تو نے کی
انسانوں کے بیچ کھلایا
رحمت کا گل زار
سدا رہے آباد ترا دربار
تری سرکار

کس کے اندر دم ہے روکے
تیرے پریم کا راگ
بھوکے ننگے پاتے ہیں
اس پریم سے داد مراد
وحشی، قاتل، غارت گر
اندھے، خونی، جلاّد
ہو جائیں برباد
خوش بو تیری جاگے ہر سو
ہر سو تری پکار
سدا رہے آباد ترا دربار
تری سرکار

○○○

صبح ہوگی؟

احفاظ الرحمٰن

شہرِ بے درد و بے اماں کی رات
سوگ میں ڈوبی، بلبلاتی رات
ہر صدا ہے سیاہ پوش یہاں
غم گزیدہ ہر ایک ساز یہاں
کوئی تارا، نہ کوئی جگنو ہے
کوئی چاہت، نہ کوئی خوشبو ہے
نفرتوں کی زمیں پہ سرگشتہ
سو رہے ہیں تمام دل کش خواب
نیکیاں چاک دامن ولرزاں
ظلم سر زور، سرکش وشاداں
خوف سینے میں سرسراتا ہے
زہر سانسوں میں بھرتا جاتا ہے
پھیلتا جارہا ہے سناٹا
رنگِ اشجار سارے مہر بہ لب
حسن کی آرزو بھی مہر بہ لب
سب مکان و مکین سہمے ہوئے

آسمان و زمین سہمے ہوئے
شہر کے ایک ایک گوشے میں
آنسو ارزاں ہیں، موت سستی ہے
راکھ اڑتی ہے پیار کی ہر سو
قید ہیں سنگ وخشت وسگ آزاد
ہے اندھیروں کی راگنی ہر سو
صبح ہوگی کہ اب نہیں ہوگی؟

○○○

زندہ ہے زندگی

احفاظ الرحمٰن

ایک آنسو کا رشتہ، پھسلتا ہوا
مصلحت کے اندھیرے میں گر جائے گا
خود فریبی کی دلدل میں گر جائے گا؟

ایک چاہت کی خوشبو مہکتی ہوئی
آگ اگلتی خباثت سے ڈر جائے گی
خون کی بو میں ڈوبے گی، مر جائے گی؟

روشنی کا سندیسا
ہمکتا ہوا
چار سو خوش ادا گیت گاتا ہوا
زخم کھائے گا، تڑپے گا، مر جائے گا؟

خواب انسان کا اتنا بے جان ہے
جیبِ دل اتنی کم تر، فرومایہ ہے
زندگی کی لگن اتنی بے نام ہے

حسن کی آرزو اتنی کم مایہ ہے
بدصفت لوگ اسے مرگھٹوں میں
بھٹکنے کو چھوڑ آئیں گے؟

کون کہتا ہے، چاہت نہ ہوگی یہاں
حسن کی آرزو
زردیوں کے کھنڈر میں بکھر جائے گی
روشنی کا سندیسا نہ ہوگا یہاں

وقت کے ہاتھ نے اتنا کم زور قصہ
لکھا ہے کبھی؟
وقت صدیوں سے یوں ہی
مچلتا ہوا، گنگناتا ہوا، رقص کرتا ہوا
ایک پیغام لکھتا رہا ہے سدا
یہ زمیں سانس لیتی رہے گی سدا
یہ ہوا، آب و گل، روشنی کا سحر
رنگ اپنا لٹاتا رہے گا سدا
زندگی کا ترانہ تو سرسبز ہے
کچھ رہے نا رہے، زندہ ہے زندگی
زندگی ننھے بچوں کی مسکان میں

ممتا کے سمندر کی للکار میں
پھول پتوں کی معصوم گفتار میں
خالی ہاتھوں کے بے کس سوالات میں
ریگ زاروں کی جلتی مناجات میں
زندہ ہے زندگی،
زندہ ہے زندگی!
خون کے سامنے
موت کے سامنے
آگ اگلتے ہوئے جہل کے سامنے
زندہ ہے زندگی،
زندہ ہے زندگی!!

○○○

ان جھاڑیوں کے درمیاں، اِن بستیوں کے درمیاں

احفاظ الرحمٰن

زندگی کی کرچیاں
بکھری ہوئی تھیں
خون میں لتھڑی ہوئی، سفاک کانٹوں سے بھری
ان جھاڑیوں کے درمیاں
زندگی کی کرچیاں،
کچھ ہڈیوں کی کرچیاں
اور گوشت کی کچھ دھجیاں
ننھے بچوں کی مہکتی، رس بھری کلکاریاں
بکھری ہوئی تھیں
خون میں لتھڑی ہوئی،
سفاک کانٹوں سے بھری
ان جھاڑیوں کے درمیاں

خواب کی سرسبز دنیا پل میں مٹی ہوگئی
قہقہوں کے سارے منظر سرخ خوں میں جل گئے
خوب صورت آرزوؤں کا دمکتا کارواں

راکھ بن کر بلبلاتی خاک کا حصہ بنا
نرم و نازک عورتوں کی جگمگاتی خواہشیں
نیچے گر کر رہزنوں کی حرص کا لقمہ بنیں
ایک چادر آنسوؤں کی چار جانب تن گئی
ہو گئے سب قتل امّیدوں کی آنکھوں کے دیے
رہ گئے غارت گری کے کالے پنجوں کے نشاں
ان جھاڑیوں کے درمیاں
خون میں لتھڑی ہوئی، سفاک کانٹوں سے بھری
ان جھاڑیوں کے درمیاں

ہر طرف ہے پیار کی خوشبو تہِ خنجر یہاں
چاہتوں کی آرزو کی کوکھ ہے بنجر یہاں
اِن بستیوں کے درمیاں
رنگ و نسل و فرقہ و ماں بولیوں کے نام پر
کتنی ماؤں کے جگر گوشے ہوئے صیدِ اجل
زہر اگلتے
دار کی صورت کھنچے
دیوار و در کے درمیاں
زندگی کی کرچیاں بکھری ہوئی
اِن بستیوں کے درمیاں

مرگ نامہ کس نے لکھا، دستِ قاتل ہے کہاں؟
ان جھاڑیوں کے درمیاں
اِن بستیوں کے درمیاں

○○○

خارزارِ بے ثمر

احفاظ الرحمٰن

خارزارِ بے ثمر کی آبیاری کا ثمر
کچھ نہیں ملتا، بجز داغِ جگر، زخمِ نظر
خارِ کم اوقات اپنی اصل کا پابند ہے
ظرف جو بھی ہے، وہ اپنے ناپ کا پابند ہے
پیاس اس کی کم نہیں ہوتی
کسی بھی حال میں
کوئی بھی موسم ہو، رہتا ہے وہ اپنے حال میں
ڈنک اس کا اپنی فطرت سے جدا ہوتا نہیں
زہر اگلنا کام ہے اس کا، سو وہ سوتا نہیں
رات دن ایذا رسانی، رات دن نشتر زنی
پھول بن سکتا نہیں، یہ دکھ ستاتا ہے اسے
اس کی زہر افشانیاں
اس دکھ سے ہی منسوب ہیں
خارزارِ بے ثمر کی آبیاری کا ثمر؟
قول ہے حضرت علیؓ کا برحق و عین الیقیں

"جس پہ تم احساں کرو،
اس شخص کے شر سے بچو!"

خارزارِ بے ثمر کی آبیاری کا ثمر
کچھ نہیں ملتا بجز داغِ جگر، زخمِ نظر

○○○

قاتل للکارتا ہے

(ریمنڈ ڈیوس کی واپسی کے بارے میں ایک مکالمہ)

احفاظ الرحمٰن

''تیری پیشانی پہ کندہ ہے غلامی کا نشاں
تیری مٹی کا ہر اک ذرّہ مرا منت کش
تیری ہر سانس مرے لطف و کرم کی محتاج
ہے شکم تیرا مرے نان و نمک کا شیدا
تو سبک سر، مرا احساں ترے سر پر ہے دراز
جوڑ کر ہاتھ مرے سامنے روتا کیوں ہے؟
عذر تیرا مجھے منظور نہیں
حکم میرا جو نہ مانے گا، بکھر جائے گا
خاک بن جائے گا، بے گور و کفن جائے گا!''

''مائی باپ......
جان بخشی ہو تو کچھ عرض کروں
پاؤں پہ گر کے یہ فریاد کروں
یہ رعایا مری نافہم ہے میرے مالک
عقل کے پیچھے لیے پھرتی ہے ڈنڈا اپنا

کہتی ہے خون کا بدلہ لے گی
عدل کا رنگِ وفا دیکھے گی
اپنی غیرت کو سرِ بامِ جہاں دیکھے گی"

"بے ادب، نا ہنجار......
پر نہیں، نیتِ پرواز مگر رکھتا ہے؟
بے نوا ذوقِ نوا رکھتا ہے؟
کوئی کشکول بھی پندار کا دم بھرتا ہے؟"

"مائی باپ......
ہم سمجھتے ہیں یہ نکتہ، لیکن......
ان کا کیا ہو جو یہاں شور بپا کرتے ہیں؟
اک ذرا مہلتِ دو چند ہمیں مل جائے
راہ پر ان کو لگا لائیں گے ہم آخرِ کار
شور تھم جائے ذرا......"

"نہیں تاخیر کا یہ عذر گوارا ہم کو
اپنے انجام سے ڈر
سر اٹھائے گا تو بن جائے گا عبرت کا نشاں!"

''مائی با...پ....'

''ہشت......
آتشِ غیظ ہماری جو بھڑک اٹھے گی
راکھ ہوجائے گا سب ٹھاٹھ کا ساماں تیرا''

''ما...ئی با.....پ........''

''ہشت.....''

''ما...ئی با....پ.......!

ما......ئی....با....پ.........!!''

○○○

کہیں سے کوئی روشنی، کہیں سے کوئی راگنی

احفاظ الرحمٰن

ستم، الم کے زخم سب
فریب خوردہ شہر کے
نصیب میں لکھے گئے
ہر ایک رنگ خارزارِ جبر
میں اُگا ہوا
لہو میں تر، عذابِ جان کی سند بنا ہوا
ہر ایک در ہے دہشتوں کی مہر سے ڈھکا ہوا
ہر ایک لب شگفتگی کی رونقوں سے ہے تہی
ہر ایک آنکھ سیل اشک کی خبر بنی ہوئی

یہ جنگلوں کا ماجرا، درندگی کی داستاں
یہ خوں کی بو، یہ وحشتوں کی قہرناک داستاں
حیاتِ آدمی کی پیش رفت پر کمند ہے
کہاں ہے پیار کی دھنک، خوشی کی دل رُبا کھنک
کہاں ہے وہ تمدنوں کے عطر کی جواں مہک
جو آدمی کی بے بہا سفر کی کائنات ہے

یہ کائنات حسن ہے، یہ کائنات عشق ہے
یہ چاہتوں کے سائباں کی نرم، میٹھی چھاؤں ہے
یہ سائباں جلے نہ یوں، یہ چھاؤں تا ابد رہے
کہیں سے کوئی روشنی
کہیں سے کوئی راگنی
امڈ کے آئے اور
ملال کی رگوں سے کلفتیں نچوڑ لے
فریب خوردہ شہر کو صلیب سے اتار لے

○○○

یہ خوشبو مر نہیں سکتی

احفاظ الرحمٰن

سمٹتا جائے گا یہ قافلہ
ہم راہیوں کا
پگھلتی جائیں گی
دل دار یادیں ساتھیوں کی؟
وہ یادیں، جو فضا میں
گونجتے نعروں کے گلشن میں اُگی تھیں
محبت کی ظفر مندی کے نعرے
غریبوں کی طرف داری کے نعرے
دکھے دل کی ظفر مندی کے نعرے
ہر اک مظلوم سے الفت کے نعرے

جو لمحے گل بہ داماں تھے سفر میں
بکھر جائیں گے برگِ خشک بن کر
لکیریں جو ہتھیلی پر لکھی تھیں
کسی تفسیر کا عنوان بن کر
جھلستی خاک کا حصہ بنیں گی؟

نہیں، ایسا نہیں ہوگا
محبت کی ظفر مندی کے نعرے
کبھی مرجھا نہیں پائیں گے یارو
یہ یادیں مر نہیں پائیں گی یارو
کہ ان میں جاگتے خوابوں کی
دھڑکن سرسراتی ہے
یہ خوشبو مر نہیں سکتی!
یہ چاہت مر نہیں سکتی!!

○○○

صابر وسیم کی نئی غزلیں

پروفیسر سحر انصاری

شیشے کا منشور جسے "پرزم" بھی کہا جاتا ہے، یہ صفت رکھتا ہے کہ اگر اس میں سے سورج کی کوئی کرن گزاری جائے تو ایک ست رنگی دھنک نمودار ہو جاتی ہے۔ لیکن غزل وہ منشور ہے جس میں سات سے کہیں زیادہ رنگ اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور اگر کوئی ان رنگوں کو سمیٹ کر دوبارہ سورج کی کرن بنانا چاہے تو یہ تجربہ محال اور ناممکن ٹھہرتا ہے۔ اس صورت حال میں کسی ایک رنگ کی غزل کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا اتنا آسان نہیں۔ غزل کی ایک طویل روایت ہے جس میں اسالیب کی ان گنت لہریں مدوجزر سے گزرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ایک مدت تک تو غزل کی کسی نئی آواز کو پہچاننا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اور اکثر کسی بھی حوالے سے حسرت موہانی کا یہ مصرع کانوں میں گونجنے لگتا ہے۔

طبع حسرتؔ نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اس زمانے کے غزل گو شعرا میں صابر وسیم اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ وہ غزل کے پیرایے میں جو بھی بات کہتے ہیں، اُسے دھیمے پن کے ساتھ زیر لب اظہار میں بدل دیتے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ نہ تخلیقِ شعر کے معاملے میں loud ہیں اور نہ شہرت طلبی کا انھیں کوئی چسکا لگا ہوا ہے۔ انھیں غزل کے اسالیب میں وہی اساتذہ اور ہنرمند شاعر پسند ہیں جو گھن گرج سے ہٹ کر دھیمے انداز میں اپنی داخلی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک غزل ناصرؔ کاظمی کی نذر بھی کی ہے، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خود ناصرؔ کاظمی، میر تقی میرؔ کے اسیر تھے اور میرؔ بھی اگرچہ اپنی شاعری میں ہزار رنگ اور ہزار لہجے رکھتے تھے لیکن زیر لب اظہار کے بھی کئی پیرایے اُن

کے کلام میں مل جاتے ہیں۔

آج کل کی زبان پر ایک عموی رائے یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ چند استعارے شعرا نے منتخب کر لیے ہیں اور انھی کو دُہراتے رہتے ہیں۔ صابر وسیم امکانی حد تک اس تن آسانی سے اپنے کلام کو بچاتے رہے ہیں، اسی لیے ان کی غزل اپنے اندر سچائی کی رمق لیے ہوئے ہے اور اگر چند غزلیں مجموعی طور پر زیر مطالعہ آئیں تو صابر وسیم کے لہجے اور ڈکشن کی انفرادیت واضح ہو سکتی ہے۔

○○○

صابر وسیم

جو خواب میرے نہیں تھے میں اُن کو دیکھتا تھا
اسی لیے آنکھ کُھل گئی تھی اسی لیے دل دُکھا ہوا تھا

اداسیوں سے بھری ہوئی التجا سنی تھی
کسی نگر میں کوئی کسی کو پکارتا تھا

وہ اک صدا تھی کہ ہفت عالم میں گونجتی تھی
نجانے کیسے کوئی کسی سے بچھڑ گیا تھا

عجیب حیرت بکھیرتے تھے وہ داستاں گو
کہ شب نے جانے سے صاف انکار کردیا تھا

گُزشتگاں کو بھی یہ گلہ تھا، سنا ہے میں نے
سنا ہے اُن کو بھی اسمِ اعظم نہیں ملا تھا

فضا سنہری تھی رنگ پھیلا تھا چار جانب
کہ چاند سے وہ زمیں پہ جیسے اُتر رہا تھا

سفر کے آخر یہ شمعیں روشن سی ہوگئی تھیں
کوئی مسرت کی سب حدوں سے گزر گیا تھا

صابر وسیم

کھیل رچایا اُس نے سارا، ورنہ پھر کیوں ہوتا میں
اُس نے ہی یہ بھیڑ لگائی، بنا ہوں صرف تماشا میں

اُس نے اپنے دَم کو پھونکا اور مجھے بیدار کیا
میں پانی تھا، میں ذرّہ تھا، لمبی نیند سے جاگا میں

اُس نے پہلے روپ دیا، پھر رنگ دیا، پھر اذن دیا
بحر و بر میں، برگ و ثمر میں، نئے سفر پر نکلا میں

آئینے کی خواہش کرکے خود کو بھی آزار دیے
دیکھ لیا اب آئینے میں، کب ہوں تیرے جیسا میں

قتل و غارت کے ہنگامے، شور شرابا تو ہوگا
مجھ کو یہاں پر بھیجنے والے، وہاں نہ رہتا اچھا میں

صابر وسیم

لوگو یہ عجیب سانحہ ہے
مجھ میں کوئی قتل ہو رہا ہے

کس کی ہے تلاش کیا بتائیں
اپنا ہی وجود کھو گیا ہے

سوئیں گے ازل میں جا کے ہم سب
دنیا تو عظیم رت جگا ہے

سچ کو ہے دوام اس جہاں میں
مجھ سے تو یہی کہا گیا ہے

مرنا ہے یہاں بہت غنیمت
جینا تو محال ہو چکا ہے

دے گا وہ ضرور سنگ مجھ کو
جس نے تجھے آئنہ کیا ہے

آئی ہے طویل ہجر کی شب
یہ دل سرِ شام جل گیا ہے

صابر وسیم

کرتا ہے کوئی اور بھی گریہ مرے دل میں
رہتا ہے کوئی اور بھی مجھ سا مرے دل میں

وہ مل گیا پھر بھی یہ لگاتار اُداسی
شاید ہے کوئی اور بھی دھڑکا مرے دل میں

اک رنج میں ڈوبا ہوا بے نام مسافر
آیا تھا بڑی دور سے ٹھیرا مرے دل میں

جس شام کو بھولے ہوئے اک عمر ہوئی تھی
چمکا ہے اُسی شام کا تارا مرے دل میں

اک ہوک سی اٹھتی ہے سرِ بامِ تمنا
وہ میری خوشی سے کبھی رہتا مرے دل میں

آئے ہیں یہاں تک تو چلو اُس سے بھی مل لیں
یہ دھیان بھی اک بار تو آیا مرے دل میں

جس آگ کو کہتے ہیں قیامت سے نہیں کم
بہتا ہے اُسی آگ کا دریا مرے دل میں

صابر وسیم

کھلے ہوئے ہیں پھول ستارے دریا کے اُس پار
اچھے لوگ بسے ہیں سارے دریا کے اُس پار

مہکی راتیں، دوست ہوائیں، پچھلی شب کا چاند
رہ گئے سب خوش خواب نظارے دریا کے اُس پار

بس یہ سوچ کے سرشاری ہے اب بھی اپنے لیے
بہتے ہیں خوشبو کے دھارے دریا کے اُس پار

شام کو زندہ کرنے والے رنگ برنگے پھول
پھول وہ سارے رہ گئے پیارے دریا کے اُس پار

یوں لگتا ہے جیسے اب بھی رستہ تکتے ہیں
گئے زمانے، ریت کنارے دریا کے اُس پار

گونجتی ہے اور لوٹ آتی ہے اپنی ہی آواز
آخر کب تک کوئی پکارے دریا کے اُس پار

دہکی ہوئی اک آگ ہے صابرؔ اپنے سینے میں
جاتے نہیں پر اس کے شرارے دریا کے اُس پار

صابر وسیم

گُل و مہتاب لکھنا چاہتا ہوں
میں اپنے خواب لکھنا چاہتا ہوں

محبت سے بھرا ہے دل کا دریا
مگر پایاب لکھنا چاہتا ہوں

لکھوں کیسے کہ سارے شعر تم پر
بہت نایاب لکھنا چاہتا ہوں

میں اپنا اور تمھارا نام اک دن
کنارِ آب لکھنا چاہتا ہوں

میں خود کو بادشاہ عشق لکھ کر
تمھیں بے تاب لکھنا چاہتا ہوں

میں سارے زخم جو تم سے ملے ہیں
اُنھیں شاداب لکھنا چاہتا ہوں

میں صابرؔ زندگی کے سارے منظر
پسِ گرداب لکھنا چاہتا ہوں

صابر وسیم

خواب تمھارے آتے ہیں
نیند اُڑا لے جاتے ہیں
آج لکھیں گے حال اپنا
سوچتے ہیں ڈر جاتے ہیں
عشق بہت سچا ہے ہم
تارے توڑ کے لاتے ہیں
رسوائی کا خوف نہیں
شہرت سے گھبراتے ہیں
نام تمھارا آتا ہے
یادوں میں کھو جاتے ہیں
دل میں درد سا اٹھتا ہے
درد میں ڈوبے جاتے ہیں
اُس کا دھیان جب آتا ہے
ایک سکون سا پاتے ہیں
باغوں میں وہ جاتا ہے
پھول بہت شرماتے ہیں
اپنے گھر وہ چین سے ہے
ہم بھی ہنستے گاتے ہیں
مرگِ مسلسل ہے لیکن
ہم زندہ کہلاتے ہیں

صابر وسیم

مرے دھیان میں ہے اک محل کہیں چوباروں کا
وہاں جاؤں کیسے رستہ ہے انگاروں کا

وہاں ہریالی کے کُنج میں ایک بسیرا ہے
وہاں دریا بہتا رہتا ہے مہکاروں کا

تم دل کا دریچہ کھول کے باہر دیکھو تو
انبوہ گزرنے والا ہے دل داروں کا

مری خلوت کو یہ انسانوں کا جنگل ہے
مری وحشت کو یہ صحرا ہے دیواروں کا

اک پیلے رنگ کی دھند جمی ہے چہروں پر
کوئی آ کے دیکھے حال ترے بیماروں کا

ہم قریہ قریہ ملکوں ملکوں پھرتے ہیں
دنیا میں کوئی دیس نہیں بنجاروں کا

خواب کی دولت چین سے سونے والوں کی
تارے گننا کام ہے ہم بیداروں کا

صابر وسیم

اک سفر پر اُسے بھیج کر آ گئے
یہ گماں ہے کہ ہم جیسے گھر آ گئے

وہ گیا ہے تو خوشیاں بھی ساری گئیں
شاخِ دل پر خزاں کے ثمر آ گئے

لاکھ چاہو مگر پھر وہ رُکتے نہیں
جن پرندوں کے بھی بال و پر آ گئے

ہم تو رستے پہ بیٹھے ہیں، یہ سوچ کر
جو گئے تھے اگر لوٹ کر آ گئے

اُس سے مل کے بھی کب اُس سے مل پائے ہم
بیچ میں خواہشوں کے شجر آ گئے

اُس نے اُس پار اپنا بسیرا کیا
ہم نے دریا کو چھوڑا اِدھر آ گئے

ایک دشمن سے ملنے گئے تھے مگر
اک محبت کے زیرِ اثر آ گئے

صابر وسیم

(نذرِ ناصر کاظمی)

راہ میں شہرِ طرب یاد آیا
جو بھلایا تھا وہ سب یاد آیا

جانے اب صبح کا عالم کیا ہو
آج وہ آخرِ شب یاد آیا

ہم پہ گزرا ہے وہ لمحہ اک دن
کچھ نہیں یاد تھا، رب یاد آیا

جب نہیں عمر تو وہ پھول کھلا
کب کا بچھڑا ہوا کب یاد آیا

رقص کرنے لگی تاروں بھری شب
تُو بھی اُس رات عجب یاد آیا

کتنا اقرار چھپا تھا اُس میں
تیرے انکار کا ڈھب یاد آیا

ہوش اڑنے لگے ناصر☆ کی طرح
آج وہ یار غضب یاد آیا

☆ ناصر کاظمی

علمی و تحقیقی مجلہ

بنیاد

مدیران: یاسمین حمید، معین نظامی

پہلا شمارہ — خصوصی شمارہ: ن م راشد

ناشر: گورمانی مرکزِ زبان و ادب، لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، لاہور

برتولت بریخت کے شہرۂ آفاق ڈرامے

گالیلیو کی داستان

اردو ترجمہ — منصور سعید

قیمت: ۱۲۰ روپے

ناشر: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، H-8/4، اسلام آباد

ممتاز شاعر مجید امجد کے فکر و فن کا مطالعہ ایک نئے تناظر میں

مجید امجد کی شاعری اور فلسفۂ وجودیت

مصنف: ڈاکٹر افتخار بیگ

قیمت: ۲۵۰ روپے

ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

بے مثال انشا پرداز محمد حسین آزاد کے صد سالہ یومِ وفات پر سیمینار کے مقالات کی تدوین

آزاد صدی مقالات

مرتبین: ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر ناصر عباس نیر

قیمت: ۵۰۰ روپے

ناشر: پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

کتابوں پر تبصرے

تبصرے

منٹو کا اسلوب
مصنفہ: طاہرہ اقبال
مبصر: پروفیسر سحر انصاری

ضخامت: ۳۹۳ صفحات
قیمت: ۶۰۰ روپے
ناشر: فکشن ہاؤس، بک اسٹریٹ، ۳۹۔ مزنگ روڈ، لاہور
فون: ۰۴۲۔۳۷۲۴۹۲۱۸۔۳۷۲۳۷۴۳۰

سعادت حسن منٹو اردو افسانے کی تاریخ میں وہ مقام حاصل کر چکے ہیں جو بہت کم کسی کے حصے میں آتا ہے۔ اس مقبولیت اور اہمیت میں منٹو کی شخصیت، ذہانت، اسلوب اور موضوعات کی حقیقت پسندانہ ندرت چند ایسے زاویے رکھتی ہے کہ جس کے بارے میں مختلف نقطۂ نظر سے سوچا اور لکھا جا سکتا ہے۔ یہ عمل منٹو کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا اور اب جب کہ ۲۰۱۲ء منٹو کی ولادت کی صد سالہ تقریبات سے عبارت ہے تو نہ صرف منٹو کی تحریریں از سرِ نو شائع ہو رہی ہیں بلکہ منٹو کے فن اور شخصیت کے بارے میں مقالات اور کتابیں مسلسل منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔

منٹو شناسی کی ایک اچھی مثال معروف افسانہ نگار طاہرہ اقبال کی تازہ ترین تصنیف ''منٹو کا اسلوب'' ہے۔ منٹو نے افسانوں کے علاوہ خاکے، خطوط، ڈرامے، فلمی کہانیاں، تراجم اور تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے منٹو کے اسلوب کا مطالعہ منٹو کے افسانوں کے حوالے سے کیا ہے۔ طاہرہ اقبال خود ایک صاحبِ اسلوب افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے سفر نگاری بھی کی ہے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں، تاہم ان کی کتاب ''منٹو کا اسلوب'' خود ان کی تحریروں میں اور منٹو شناسی کے باب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

طاہرہ اقبال سماجی زندگی کو جس زاویے سے دیکھتی اور اس کے کرداروں کو جس جرأت

اور سچائی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس روایت کو عصمت چغتائی اور منٹو نے پایۂ کمال تک پہنچایا ہے، کوئی تنقیدی یا تحقیقی مطالعہ اس وقت زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہو جاتا ہے جب صاحبِ تحریر کا ذاتی اور ذہنی رجحان بھی ان موضوعات سے تعلق رکھتا ہو جو اس کے پیش رووں کی پہچان رہے ہیں۔

طاہرہ اقبال کا انتساب ہی ان کے نقطۂ نظر اور زاویۂ تحریر کو اجاگر کر دیتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں، ''منٹو کے اسلوبیاتی تنوع کے نام۔'' اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ منٹو کا اسلوب ان کی پہچان ضرور ہے لیکن وہ یک رُخا یا یک سطحی نہیں ہے، بلکہ اس میں غیر معمولی تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ اس تنوع کو طاہرہ اقبال نے تحقیق اور دقتِ نظر کے ساتھ تلاش کیا ہے۔ یہ کتاب ایک افسانہ نگار کا رواں دواں تاثر نامہ بھی ہو سکتی تھی لیکن طاہرہ اقبال نے اپنی اس کتاب کو تحقیقی منہاج اور اسالیبِ منٹو کے مختلف گوشوں کو مثالوں اور ایک خاص بصیرت کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ کتاب کے چار ابواب ہیں، باب اوّل، اردو نثر کے نمایاں اسالیب جو یقیناً اسلوب کی تعریف اور اردو نثر اور اردو افسانے کے اسالیب کی تفہیم کے لیے ضروری تھا۔ بابِ دوم میں منٹو کو بحیثیت افسانہ نگار اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس میں منٹو کے حالاتِ زندگی اور افسانوں کے مجموعوں کا زمانی ترتیب سے جائزہ شامل کیا گیا ہے۔ پھر جن شخصیات، رجحانات اور تحریکات نے منٹو کے اسلوب پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں ان کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ اسی باب میں طاہرہ اقبال نے منٹو کی افسانہ نگاری کے اسلوبی ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے اُسے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ باب سوم منٹو کے منفرد اسلوب اور اس کے تشکیلی عناصر پر بہت محنت اور حوالہ جات کی تکمیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ یہ باب ہر لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس میں منٹو کے بیانیہ، خطابیہ اور علامتی افسانوں کو پیشِ نظر رکھ کر اسلوبیاتی جائزہ مکمل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مصنفہ نے منٹو کے اسلوب اور موضوعات سے کہیں بھی سرسری گزرنے کی کوشش نہیں کی، پوری توجہ اور انہماک سے منٹو کی علامتی، تمثیلی اور طنزیہ تکنیک کو ان کے معاصر افسانہ نگاروں کے تناظر میں اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ یہ خود ایک کتاب بن گئی ہے۔ اس میں طاہرہ اقبال نے کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اُپندر ناتھ اشک سے بھی منٹو کے افسانوی اسلوب کا تقابل کیا ہے۔ اور ان اہم افسانہ نگاروں کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے منٹو کے جداگانہ اسلوب کا تعین بڑے سلیقے سے کیا ہے۔

طاہرہ اقبال کے پیشِ نظر منٹو کا افسانوی ادب ہی نہیں رہا بلکہ انھوں نے تقریباً ان تمام ناقدین اور مبصرین کی آرا کو بھی اپنے مطالعے میں شامل کیا جو منٹو پر منفی یا مثبت انداز میں اظہارِ رائے کرتے رہے ہیں۔ ان میں طاہرہ اقبال کی عقیدت کہیں بھی سایہ فگن نہیں بلکہ ایک نوع کی

معروضیت کو انھوں نے اوّل سے آخر تک برقرار رکھا ہے۔

''منٹو کا اسلوب'' ایک تحقیقی مقالے کا کتابی روپ ہے لیکن اسے بے جان حوالوں کی پیوندکاری سے تیار نہیں کیا گیا ہے۔ اسے طاہرہ اقبال نے تحقیق کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک تخلیقی افسانہ نگار کی حیثیت سے دل چسپ پیرایے میں تحریر کیا ہے جس میں تازگی اور زندگی پوری طرح موجود ہے۔ انھیں اردو فکشن اور منٹو کے فن سے جو گہرا لگاؤ ہے، اس کے پیشِ نظر ''منٹو کا اسلوب'' جیسی کاوش کو labour of love ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

نوبیل امن کے سو برس
مؤلف: باقر نقوی
مبصر: پروفیسر سحر انصاری

ضخامت: ۱۱۰۴ صفحات
قیمت: ۳۰۰۰ روپے
ناشر: اکادمی بازیافت، آفس نمبر ۱۸، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی۔
فون: ۰۲۱-۳۲۷۵۱۴۲۸-۳۲۷۵۱۳۴۴

کسی بھی زبان کی اہمیت کسی ایک زاویے سے متعین نہیں ہوسکتی۔ اس میں اگر تخلیقی سطح پر شاعری، ناول نگاری، افسانہ نویسی اور تمثیلی کاوشیں شامل ہوں تو یقیناً اس زبان کے وسیع تر حلقوں تک اس کی اہمیت روزِ روشن کی طرح عیاں رہتی ہے۔ لیکن جب تک کسی زبان میں علمی اور تحقیقی سرمایہ فکری بنیادوں پر موجود نہ ہو اس کی قدر و قیمت کو محض ایک ہی رُخ کا حامل کہا جائے گا، لسانی تنوع، فکر و فلسفہ، تاریخ و حکمت اور انسانی دانش کی ارتقائی منازل سے عبارت ہو تب اُسے ہمہ جہت لسانی سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔

اردو کی حد تک اس ضرورت اور حقیقت کو سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے محسوس کیا۔ انھوں نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے اردو میں علومِ جدید کو تراجم اور طبع زاد تحریروں کے ذریعے شامل کیا۔ یہ کام کسی فردِ واحد سے مکمل نہیں ہوسکتا تھا، چنانچہ ان کے حلقے میں ایسے اہلِ فکر و نظر شامل ہوئے کہ جنھوں نے اردو نثر کو تخلیقی سطح کے ساتھ ساتھ ایک علمی معیار سے بھی ہم کنار کردیا۔ اس کے بعد متعدد اداروں اور افراد نے پورے برصغیر پاک و ہند میں علمی کاوشوں کی بہترین مثالیں قائم کیں اور یہ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے اور آئندہ بھی زیادہ سے زیادہ چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔

ہمارے زمانے میں علمی اور فکری کاوشوں پر جس شخصیت نے تخلیقی کارناموں کے ساتھ ساتھ بھرپور توجہ دی ہے، وہ باقر نقوی کے نام سے ادبی اور علمی دنیا میں اپنی ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔

باقر نقوی شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ انھوں نے سائنسی موضوعات پر اب تک کئی اہم کتابیں اردو دنیا کے سپرد کی ہیں۔ ''خلیے کی دنیا''، ''برقیات کی تاریخ''، ''مصنوعی ذہانت'' جیسی کتابیں ان کے وقیع کارناموں میں شمار کرنے کے لائق ہیں۔ طبع زاد تحریروں کے علاوہ ترجمے سے بھی باقر نقوی کو خاص لگاؤ ہے۔ اس ضمن میں ان کا کام کسی تجارتی ضرورت یا شہرت طلبی کے تحت نہیں ہوا۔ یہ خالصتاً علم، اپنی زبان اور انسانی دانش سے ان کی ذہنی رغبت کا حاصل ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''نوبیل امن کے سو برس'' اکادمی بازیافت نے شائع کی ہے جو گیارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں باقر نقوی نے ان اکابر اعلیٰ کے خطبات کا ترجمہ پیش کیا ہے جنھیں امنِ عالم کی کاوشوں کے صلے میں نوبیل انعام کی کمیٹی نے امن کے نوبیل انعامات سے سرفراز کیا اور جس میں ایک صدی کی شخصیات شامل ہیں۔

باقر نقوی کی اس سے قبل ''نوبیل ادبیات'' کے عنوان سے ایک اہم کتاب اکادمی بازیافت کے زیر اہتمام منصۂ شہود پر آچکی ہے۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن اس کی مقبولیت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ کام بجائے خود وقت طلب اور دشوار ترین تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ادبی انعام حاصل کرنے والی شخصیتیں کسی ایک ملک یا ایک لسانی معاشرے سے تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ دوسرے ان میں شاعری سمیت مختلف اصناف ادب کی تخلیق کا ایک نگارخانہ معرضِ وجود میں آچکا تھا۔ ہر خطبے میں نوبیل لاریٹ کا اسلوب، ادبی نظریہ اور فکری اور تخلیقی جہات کے رنگ موجود ہیں۔ ان کو باقر نقوی نے ایک خاص سطح سے اردو زبان میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ اصل خطبے کا معیار اور صاحب خطبہ کے افکار کہیں مجروح نہیں ہوئے۔

باقر نقوی کی ''نوبیل ادبیات'' پر لوگ ابھی داد و تحسین کے پھول برسا ہی رہے تھے کہ انھوں نے ایک اور اہم کارنامہ اسی ضمن میں سرانجام دے دیا۔ ''نوبیل امن کے سو برس'' کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نقش ثانی کو مصور نے نقشِ اوّل سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ سو برس کے اس فکر انگیز سرمایے میں انسان دوستی، امنِ عالم، حقوقِ بشر کے کیسے کیسے خیال انگیز اور فراست آمیز نکتے موجود ہیں اور کیسی کیسی شخصیتیں اپنے خطبات میں اقوامِ عالم سے خطاب کر رہی ہیں۔ اس پوری کتاب سے ایک رُخ یہ اُبھرتا ہے کہ امنِ عالم کے لیے تن من دھن سے کام کر کے اور قربانیوں اور ایثار کی کٹھن راہوں سے گزر کر ان شخصیتوں نے تو مثال قائم کر دی لیکن موجودہ دنیا کا منظرنامہ امن کے ان پیامبروں سے اس قدر بے نیاز اور لاتعلق کیوں ہے؟ اس کتاب کو اردو دنیا

کی ہر لائبریری میں ہونا چاہیے تاکہ سن و سال کے تفاوت کے باوجود ان شخصیتوں کے اثرات ایسے ذہنوں کو اور بھی روشن اور کشادہ کرسکیں جو امنِ عالم کو خواب کی دُنیا سے نکال کر ایک حقیقت آمیز بشارت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں باقر نقوی کی یہ علمی کاوش ایک دائمی روشنی کو عام کرنے والی مشعل سے کم نہیں۔

فانی بدایونی — شخصیت اور شاعری مصنف: اکرام بریلوی مبصر: پروفیسر سحر انصاری	ضخامت: ۲۴۰ قیمت: ۳۰۰ روپے ناشر: بختیار اکیڈمی، گلشنِ اقبال، کراچی

اکرام بریلوی نے ناولوں، ڈراموں اور خودنوشت کے ساتھ ساتھ ادیبوں اور شاعروں پر اپنے تجزیاتی مطالعے بھی کتابی شکل میں شائع کیے ہیں۔ اس ضمن میں فانی بدایونی اور عشرت آفریں کے بارے میں اُن کی کتابیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر اُن کی کتاب ''فانی بدایونی — شخصیت اور شاعری'' ہے۔ فانی بدایونی بیسویں صدی کے غزل گو شعرا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے بارے میں ان کے معاصرین مثلاً حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، مجنوں گورکھ پوری، قاضی عبدالغفار اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے عمدہ اور یادگار مضامین لکھے ہیں۔ مخمور اکبرآبادی اور ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے بھی فانی پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پاک و ہند کی مختلف جامعات میں فانی کی شاعری اور شخصیت پر تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ اُن کے ایک عزیز شاگرد تابش دہلوی نے اُن کی وفات کے بعد ایک تاثراتی مضمون ''یادِ ایامِ عشرتِ فانی'' کے عنوان سے لکھا تھا جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا۔ فانی کا کلام اعلیٰ جماعتوں میں داخلِ نصاب بھی ہے۔ تاہم ان سب حقائق کے باوجود یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فانی پر اس قدر توجہ نہیں دی گئی جتنی کے وہ مستحق ہیں۔ فانی کے کلام میں زیادہ تر یاسیت کے مضامین ہی تلاش کیے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے اور اُن کی شاعری کو بعض اور زاویوں سے بھی دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے، مثلاً شان الحق حقی نے اُن کی شاعری پر بدھ مت کے اثرات بھی تلاش کیے ہیں۔ مجھے اکرام بریلوی کی کتاب ''فانی بدایونی — شخصیت اور شاعری'' جب مطالعے کے لیے ملی تو اُن کی اس کاوش پر میں نے صد آفریں کہا۔ اکرام بریلوی کو اپنی اور فانی کی زندگی میں کچھ مماثلتیں نظر آئیں جو بقول اُن کے فانی پر لکھنے کا حیلہ اور حوالہ بن گئیں۔

ابتدا میں اکرام بریلوی نے فانی کی تعلیم و تربیت اور ادب و شعر سے اُن کی ابتدائی وابستگی اور محبت میں اُن کی ناکامی جیسے واقعات کو پس منظر کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں دستاویزی تحقیق کے علاوہ ایسے واقعات بھی ریکارڈ پر آگئے ہیں جنھیں اکرام بریلوی کی ذاتی واقفیت پر محمول کرنا چاہیے۔ بریلی، لکھنؤ، بدایوں اور حیدرآباد دکن میں فانی کے قیام کا بھی جائزہ اہمیت رکھتا ہے۔

اکرام بریلوی نے فانی کے کوائف جس طرح بیان کیے ہیں، اُس کی روشنی میں کلامِ فانی کے حزن و ملال تک رسائی میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اسی ضمن میں فانی نے بعض جلیل القدر پیغمبروں، اماموں اور اہلِ علم و حکمت کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ انھوں نے اپنے غم کو ایک زندگی آمیز قوت بنا دیا تھا۔ فانی کی شاعری میں موضوعات کا تنوع اپنے معاصرین سے زیادہ نظر آتا ہے۔ اکرام بریلوی نے اس حوالے سے بھی فانی کا اچھا انتخاب بطور مثال پیش کیا ہے۔ تنقید و تحقیق کے مراحل سے اپنی کتاب کو گزارنے کے بعد اکرام بریلوی نے آخر میں فانی بدایونی کے کلام کا اچھا انتخاب بھی شامل کر دیا ہے، جس میں اُن کی غزلیات کے علاوہ رباعیات بھی شامل ہیں۔ یقیناً مطالعۂ فانی کے ضمن میں اکرام بریلوی کی یہ کتاب ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

سرسری تم جہان سے گزرے

مصنف: اکرام بریلوی

مبصر: پروفیسر سحر انصاری

ضخامت: ۲۰۸

قیمت: ۴۰۰ روپے

ناشر: بختیار اکیڈمی، گلشنِ اقبال، کراچی

اکرام بریلوی ایک معروف ادیب، نقاد، ڈراما نگار اور مترجم کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ انھوں نے زندگی کا ابتدائی حصہ ہندوستان میں گزارا۔ پاکستان آنے کے بعد اُن کے ڈرامے ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہے۔ ۱۹۷۸ء میں اُن کا ناول ''لاوا'' شائع ہوا۔ اکرام بریلوی نے ماشاء اللہ طویل عمر پائی ہے اور ادھر کئی سال سے کینیڈا میں مقیم ہیں اور وہاں بھی ادبی زندگی کا ایک فعال حصہ ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اکرام بریلوی سے ملنے کا موقع پاکستان اور کینیڈا دونوں جگہ میسر آیا۔ وہ ایک مخلص اور مہذب انسان ہیں۔ یادش بخیر، جب مدیر ''افکار'' صہبا لکھنوی نے اپنے رسالے میں مختلف ادیبوں سے ان کی آپ بیتیاں لکھوائیں اور قسط وار اپنے رسالے میں شائع کیں تو اکرام صاحب سے بھی انھوں نے فرمائش کی، لیکن بقول خود ''یہ وہ دن تھے جب میرے اپنے بڑے ڈراموں کے ساتھ ناولوں کا نزول تھا۔ اس لیے معاملہ التوا میں پڑتا گیا۔ اب میرے

احباب (خصوصاً پروفیسر پرویز پروازی) کا خیال ہے کہ اگر میں نے اس عمر کو پہنچ کر بھی خودنوشت سوانح نہیں لکھی تو یہ ایک طرح کی ادبی ناانصافی ہوگی... چناں چہ خیال خاطرِ احباب کے پیش نظر خودنوشت سوانح حاضر ہے۔" پوری سوانح عمری میں دل چسپ واقعات ہیں جنھیں اکرام بریلوی نے جرأتِ رندانہ کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ چنانچہ کتاب کا پہلا صفحہ ہی اپنے والد اقبال حسین کاظمی جو شہر کے کوتوال تھے اور ایک ڈیرے دار طوائف لکشمی بائی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ اور خود اپنی ایک جرأتِ رندانہ کا ذکر بھی کیا ہے، اُس وقت اکرام بریلوی کی عمر سات سال تھی۔ اکرام بریلوی نے اپنے تمام احباب کا، خواہ وہ کسی مذہب اور عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں، بڑی محبت سے تذکرہ کیا ہے اور اس ضمن میں اپنی رندانہ زندگی کو بھی چھپایا نہیں ہے، خواہ بھنگ نوشی کا ذکر ہو یا مے نوشی کا۔ اسی طرح جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، اختر شیرانی، مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر کی صحبتوں کا بھی دل چسپ تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے۔ خودنوشت کیا ہے، تقریباً ایک صدی کا تہذیبی اور ادبی مرقع ہے، جگہ جگہ موقع محل کی مناسبت سے شاعروں، مصوروں اور مختلف ادیبوں اور نقادوں کے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ اس وقت جو ادبا اور شعرا شمالی امریکا میں ادبی فضا کو یادگار بنا رہے ہیں، اُن کا تذکرہ خاصے کی چیز ہے۔ آخر میں "جشنِ اکرام بریلوی" کا بھی تذکرہ ہے جو اُن کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں کینیڈین اردو رائٹرز فورم نے منعقد کیا تھا۔ اس ضمن میں سلطان جمیل نسیم، عشرت آفریں، نسیم سید، شکیلہ رفیق، تسلیم الٰہی زلفی، اشفاق حسین، اطہر رضوی اور شاہد ہاشمی کی محبتوں اور مخلصانہ پذیرائی کا تذکرہ کیا ہے۔ خوشی ہوئی کہ اپنی بیٹی انجم کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے دوست شبنم رومانی اور اُن کے صاحب زادے فیصل عظیم کا بھی محبت سے تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح ۲۹ر جون ۲۰۰۸ء کو اکرام بریلوی نے عمر کے نوے سال مکمل کیے۔ اور اس خودنوشت میں، جس کا عنوان میر تقی میر کے شعر سے ماخوذ ہے:

سرسری تم جہان سے گزرے

اپنے بچپن یعنی سات سال کی عمر سے لے کر نوے سال تک کی نجی اور ادبی زندگی کا بے کم و کاست تذکرہ کر دیا ہے۔ اور یہ تذکرہ کسی ڈائری، روزنامچے یا نوٹس کے بغیر محض حافظے کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اکرام بریلوی کی اس خودنوشت کو ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

بجھے رنگوں کی رونق

(شاعری)

شاعر: آصف رضا

مبصر: خالد معین

ضخامت: ۲۴۶ صفحات
قیمت: ۲۵۰ روپے
ناشر: اکادمی بازیافت، آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی
فون: ۳۲۷۵۱۴۲۸

وہ وقت جب مردہ ستارے کو جنم
دیتی تھی شب اور شاخ بن کر پھوٹتا گمبھیر غم
تھا اک شجر کا راز کہ جس کے امیں
آنکھوں میں آنکھوں میں ڈال کر اندوہ گیں
تو اور میں اک دوسرے پر منکشف—
دو بے جلا اور سرنگوں موتی—صدف
آ سر اُٹھا کر مسکرائیں، جھاڑ کے پلکوں کی دھول
ہم سوکھتی اک شاخ کے دو زرد پھول (جنم کا رشتہ)

یہ نظم ہے معروف شاعر آصف رضا کی اور یہ نظم انھوں نے اپنے بڑے بھائی رضی مجتبیٰ کے نام معنون کی ہے۔ اس نظم کی بُنت، اس کے ڈکشن اور اس کے اسلوب سے تخلیق کار کی شعری لغت، اندازِ نظر اور مجموعی تخلیقی بصارت کا ایک ہلکا سا اشارہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس مختصر سی نظم میں جو گہری اداسی اور رائگانی کے باطن سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ایک عجب پُراسرار اور نم ناک فضا تشکیل دی ہے۔ اپنی پوری زندگی کے نمود کو جتنے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس سے بڑھ کر اپنے بڑے بھائی کو جس طرح اپنا ہم زاد بنایا ہے اور ایک شاخ کے دو زرد پھول کا استعارہ تو، یہ واقعی ایک بڑا کمال ہے۔ یہ نظم حال ہی میں شائع ہونے والے آصف رضا کے شعری مجموعے ''بجھے رنگوں کی رونق'' سے لی گئی ہے۔ اس سے قبل آصف رضا اور ان کے بڑے بھائی رضی مجتبیٰ کا ایک مشترکہ شعری مجموعہ ''دو سخنہ'' سامنے آ چکا ہے۔ اتفاق سے اس مجموعے کو بھی پڑھنے کا موقع مل چکا ہے۔ اس مجموعے کا نام اور دو شاعر بھائیوں کا اشتراک یقیناً بڑا کشش انگیز تھا۔ ہمیں اس کتاب کو دیکھ کے قمر جمیل، محبّ عارفی اور محبوب خزاں کا مشترکہ شعری مجموعہ یاد آ گیا، یعنی ایک کتاب میں تین کتابیں۔ یہ کتابیں ''چہار خواب''، ''چھلنی کی پیاس'' اور ''اکیلی بستیاں'' تھیں جو بعد میں الگ الگ بھی شائع ہوئیں۔ اسی طرح ''دو سخنہ'' بھی اپنے اندر ایک جداگانہ طرز رکھتی تھی۔

اس حوالے سے آصف رضا کے پیش لفظ سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ''میں اپنے اس مجموعے میں 'دوسخنہ' کی نظموں کو ضم کر کے 'دوسخنہ' کے سقوط کو مکمل کر رہا ہوں۔ اس اقدام کا محرک یہ احساس بھی ہے کہ اپنی امریکا میں رہائش کے سبب میں اس کی اشاعت وترسیل میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکا۔''

آصف رضا نے اپنے نئے مجموعے میں نظموں کے ساتھ جو ان کا بنیادی مسئلہ ہیں، کچھ بلکہ مناسب تعداد میں غزلیں بھی شامل کی ہیں۔ اب ایک دو باتیں ان کے فن اور ابلاغ فن کے حوالے سے بھی ہو جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میرا ایمان ہے کہ شاعری کی تعینِ قدر کا کوئی میکانکی اصول نہیں۔ تاہم میں قاری اور شاعر میں اس رشتے کا قائل ہوں، جسے کسی نقاد نے sympathetic contract کہا ہے۔'' یہ ہے ایک رخ آصف رضا کی شاعری اور اس کے ابلاغ کے حوالے سے لیکن اس کے ساتھ وہ صدقِ جذبات کی توانائی کے تحقق کے ساتھ قائل اور گھائل بھی ہیں، ورنہ وہ شاعر کو شاعر نہیں ایک بہروپیا جانتے ہیں جو اپنے تجربات کا افلاس چھپا کے لسانی شعبدہ گری میں مصروف ہے۔ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے اور اس میں کسی دعویٰ گزاری سے زیادہ اپنے تخلیقی وجدان واحساس کو برتنے کا معاملہ ہے۔ اس صورتِ حال میں بہتر لگتا ہے کہ آصف رضا کی کچھ نظموں کا مختصر انتخاب پیش کر دیا جائے تاکہ ان کے شاعرانہ تیور اور ان کے تخلیقی وژن اور جداگانہ شعری اسلوب سے زیادہ آگاہی ہو سکے۔

آغشتۂ خوں شام شیشے میں نشاں
لغزیدہ قدموں کی روش
اک شکن
جو قرمزی قالین پر سرخیز
مفقود الخبر!
تلخابۂ محبوب کا تشنہ
تپائی پر دھرا خالی گلاس (ویٹنگ روم)

ایک اور نظم دیکھتے ہیں:

شیشے کے یہ آفاق ہیں کیا ان کا بھروسا
کس روز چٹخ جائیں!
خیمے جو خلاؤں کے طنابوں پہ تنے ہیں
کس روز اکھڑ جائیں

روشن ہیں رگیں رات کی جن سے وہ شعاعیں
نیزے کی طرح
رات کے سینے میں اتر جائیں
چلتی ہوئی سانسوں میں ہواؤں کی ہمارے
یہ خواب بکھر جائیں
کیا ان کا بھروسا (کیا اُن کا بھروسا)

''بجھے رنگوں کی رونق'' میں آصف رضا نے جا بہ جا اپنی ذات اور اپنے اطراف پھیلی ہوئی کائنات کو نت نئے ذائقوں کے ساتھ ایک تخلیقی وارفتگی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ یہ نظمیں کسی رسمی اظہار کے بغیر اپنے خاص اسلوب کے ساتھ قاری سے ہم کلام ہوتی ہیں۔ اب کچھ پڑھنے والے ان نظموں کی پیچیدگی، ایک سطح پر ان کے ابلاغ اور واضح معنوی ترسیل کا سوال ضرور اٹھاسکتے ہیں، اس کا جواب آصف رضا کی نظموں ہی میں موجود ہے اور ان نظموں کے علاوہ ں نے اپنے پیش لفظ اور ''دوسخنہ'' کے دوبارہ دیے گئے مشترکہ پیش لفظ میں بھی خاصی تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔ تاہم یہاں یہ بات کہنی چاہیے کہ واقعی آصف رضا کی پوری شاعری اور خاص طور پر ان کی نظمیں عام مزاج اور عام روش سے قدرے ہٹ کر ہیں اور ان کی معنوی ترسیل کے لیے تربیت یافتہ قاری کی ضرورت ہے۔ میراجی، ن م راشد، عزیز حامد مدنی، اختر الایمان، مجید امجد اور ساقی فاروقی کے ساتھ جدید نظم نگاروں کے مجموعی مزاج اور تخلیقات کو سمجھے بغیر اور مغربی نظم نگاروں کے ساتھ فرانسیسی شعرا کی علامت نگاری کی تفہیم کے بنا آصف رضا اور اس قبیل کے دیگر شعرا کی نظموں سے پورا انصاف ممکن نہیں۔ آیئے آخر میں آصف رضا کی غزلوں کے چند شعر بھی دیکھتے چلیں، جن میں بہرطور نظموں والی بند گلی کی سی کیفیت یقیناً نہیں ہے۔ یہ غزلیں اپنا ابلاغ بھی کرتی ہیں اور ان کی زبان نظموں کی طرح فارسی زدہ ہونے کے باوجود کلاسیکی غزل کی شان دار روایت سے جڑی ہونے کے باعث لطف سے خالی نہیں، اور ایک عام قاری کے لیے بھی، ان میں خاص کشش موجود ہے۔

دشتِ دیوانگی کے ٹیلوں پر
رقص کرتی ہوا بلائے مجھے

یہ مری بزم نہیں ہے لیکن
دل لگا ہے تو لگا رہنے دو

اسیرِ حلقۂ مہتاب ہوں میں
رہائی میری قسمت میں کہاں ہے

تیرا دامن بھی تار تار نہ ہو
دیکھ گرویدۂ بہار نہ ہو

سیرِ گل کو کبھی اِدھر بھی آ
میرا سینہ بھی باغ جیسا ہے

صاحبو، یہ ہیں آصف رضا اور یہ ہے ان کا تازہ مجموعہ ''بجھے رنگوں کی رونق'' جو اپنے نام کی طرح جداگانہ مزاج اور طرزِ اظہار رکھتا ہے، یقیناً اپنے ہونے کا جواز بھی رکھتا ہے اور اپنی گواہی بھی آپ ہے۔

خوشبو سے لکھی فرد
(شاعری)
شاعرہ: آمنہ عالم
مبصر: خالد معین

ضخامت: ۲۴۰
قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: دنیائے ادب، بی۔۴۵، الفلاح ہوسائٹی، شاہ فیصل کالونی، کراچی۔۷۵۲۳۰
فون: 0300-2797271

آمنہ عالم صاحبہ کے پہلے شعری مجموعے ''خوشبو سے لکھی فرد'' میں شامل متنوع نظموں اور منتخب غزلوں کو پڑھ کر احساس ہوا کہ وہ جتنی کم سخن اور ادبی محفلوں سے الگ تھلگ دکھائی دیتی ہیں، اپنے آئینۂ سخن میں کم سے کم ویسی ہرگز نہیں ہیں، جیسا اُن کے بارے میں میرا گمان تھا، کیوں کہ میں اب تک آمنہ عالم صاحبہ کی محض چند غزلیں اور ایک دو نظمیں ہی ان سے مختلف ادبی نشستوں میں سن سکا تھا۔

اس مجموعے میں جن تخلیقات کا انتخاب کیا گیا ہے، اُن پر سرسری سی نظر کرتے ہی بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ آمنہ صاحبہ نے شاعری کے ساتھ کوئی غیر سنجیدہ رویہ نہیں اپنایا، بلکہ انھوں نے تو ایک باشعور اور بالغ نظر تخلیق کار کی طرح اپنے عصر کے لامتناہی اور پُر پیچ مسائل پر اپنے

مخصوص انداز میں نظر رکھنے کی کوشش کی ہے، نسائی لب و لہجے کی ایمائیت کے ساتھ ساتھ ایک خالص مشرقی عورت کی طرح انھوں نے زندگی کی وسعتوں اور زندگی کے پیہم بدلتے ہوئے تقاضوں سے معاملہ رکھا ہے۔ انھوں نے اپنی سنجیدہ اور بردبار شخصیت کی اضافت کے ساتھ اپنی شناخت کے سفر کو برتنے کی کاوش کی بھی ہے اور رشتوں کی دھوپ چھاؤں، معاشرتی الٹ پلٹ، اقدار کی شکست و ریخت کو پہلے اپنے اندر اتارا ہے، پھر ایک نرم خوئی اور دھیمے پن کے ساتھ جو، آمنہ صاحبہ کی شخصیت کا بنیادی جوہر ہے، انتہائی دردمندی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ روش اگرچہ ان کی شاعری کا ایک عمومی رویہ ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں حیران کن طور پر ایک ایسا سماج سدھار والا انقلابی اور باغیانہ لحن بھی کہیں کہیں اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ ظہور کرتا دکھائی دیتا ہے، جو عصرِ حاضر میں شاعری کی مقصدیت اور افادیت کے حوالے سے بڑا اہم ہے، ایک جانب یہ رویہ موجودہ مادیت پرست سماج کو آئینہ دکھاتا ہے تو دوسری طرف سائنس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلابی عہد میں نئی شاعری کے بنیادی جواز کے حوالے سے اٹھائے جانے والے بعض تیکھے سوالات اور سخت اعتراضات کا کچھ نہ کچھ جواب ضرور مہیا کرتا ہے۔

یوں تو ان کی شاعری میں جمالیاتی پیرائے اظہار کے ساتھ ساتھ ایک سماجی اور نسائی شعور کی مثبت جھلکیاں بھی جا بہ جا نظر آتی ہیں، انھوں نے غزل بھی لکھی ہے اور غزل کی روایتی فضا کو اپنے نازک جمالیاتی تجربات اور روزمرہ کے عذاب ثواب تک محدود نہیں رکھا بلکہ جدید عہد کے نفسیاتی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل بھی کہیں نہ کہیں ان کی نظر میں رہے ہیں۔ محترمہ آمنہ عالم بہ ظاہر بڑی کم گو، سمٹی سمٹائی ہوئی، مرنجاں مرنج اور منکسر المزاج خاتون دکھائی دیتی ہیں لیکن اپنے ظاہری سکون اور سمندر جیسی گہری خاموشی والے پُراسرار روپ کے پیچھے چھپے ایک ایسا ہنگامہ خیز سونامی بھی رکھتی ہیں، جس سے وہ ہمیں اچانک ہی آگاہ بھی کرا دیتی ہیں۔

ان کی نظموں میں جدید عہد کی عورت کے دکھ سکھ بھی بیان ہوئے ہیں، وہ کہیں کہیں رومان کی نرم رو بارشوں میں بھی بھیگی ہیں، اور ان کی نظموں میں عہدِ حاضر کے بعض سلگتے ہوئے مسائل بھی نمود کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنے اسلوبِ سخن کے لیے نظموں کو بہ طور خاص منتخب کیا ہے، اور ان کا یہ فیصلہ درست بھی ہے، وہ پابند نظموں کے ساتھ آزاد نظموں میں بھی اپنے تخلیقی کرب کو بڑی حد تک آشکار کرتی نظر آتی ہیں اور ان نظموں میں ذات و کائنات کے رنگا رنگ موسم، انفرادی و اجتماعی عذاب و ثواب اور عصری آگہی کا کرب جگہ جگہ جھلکتا ہے۔

خیر، اب چلتے ہیں آمنہ عالم کی غزلوں کی جانب، جن کی تعداد کسی بھی طرح نظموں سے کم نہیں، تاہم مجھے ان کی نظموں سے پہلی بار آشنائی حاصل ہوئی، اس لیے فطری طور پر میں نے ان کی نظموں کا ایک سرسری سا جائزہ آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ اب جہاں تک آمنہ صاحبہ کی غزلوں کے مجموعی تاثر کی بات ہے۔ وہ نظموں کے ساتھ ساتھ یقیناً غزلیں لکھنے کا ہنر بھی جانتی ہیں، ان کی غزلیں اعلیٰ روایتی اقدار سے استفادہ بھی کرتی نظر آتی ہیں، اس کے ساتھ انھیں جدید حسیت سے بھی کچھ نہ کچھ آگہی حاصل ہے اور وہ عصرِ حاضر کے نو بہ نو مسائل اور کربِ ذات و حیات کی ترجمانی بھی کرنا چاہتی ہیں۔ اس طرح ان کی غزل کا کینوس نظم کی طرح وسیع دکھائی دیتا ہے، آیئے اب آمنہ عالم صاحبہ کے چند منتخب شعر بھی دیکھتے چلیں جو یقیناً موضوعات کا ایک رنگا رنگ امتزاج رکھتے ہیں:

متانت اور خموشی علم والوں کی شریعت ہے
مگر جب بات ہو حق کی تو یہ بے باک ہوتے ہیں

نہیں حائل کوئی دیوار دنیا
ہمارے درمیاں تو بس اَنا ہے

یوں نہ مٹی کو حقارت کی نظر سے دیکھو
کوزہ گر میں ہے نہاں اصل ہنر مٹی کا

کیسی کیسی تصویریں، مسخ ہونے لگتی ہیں
آدمی کا چہرہ جب بے نقاب ہوتا ہے

یہ اشعار ہیں آمنہ عالم صاحبہ کے اور انھوں نے آدمی کے چہرے پر موجود نقابوں کو اترتے دیکھا ہے، انھوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے، سمجھا ہے اور اس زخم زخم سفر کو خوشبو کے لہجے میں لکھا بھی ہے اور ہمارے عہد کی اجتماعی بے حسی کو آہنی لہجے کی کاٹ کے ساتھ بھی برتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا پہلا مجموعۂ کلام نئی شاعرات کے درمیان یقیناً بامعنی بھی ہے اور نئی شاعری کے حوالے سے خوش آیند بھی ہے۔

''جہانِ حمد'' کا ''قرآن نمبر''

مدیر: طاہر سلطانی

مبصر: الطاف مجاہد

ضخامت: ۱۱۵۰صفحات
قیمت: ۱۱۰۰روپے
ناشر: حمد و نعت ریسرچ سینٹر، کمرہ نمبر ۱۹، اردو بازار، کراچی

''جہانِ حمد'' طاہر سلطانی کا عشق ہے۔ وہ اس کے تحت مختلف موضوعات و عنوانات پر خصوصی نمبر مرتب کرتے رہے ہیں جن کی ایک عالم نے توصیف کی ہے۔ زیرِ نظر ''قرآن نمبر'' بھی ان کا ایک منفرد کارنامہ ہے۔ ساڑھے گیارہ سو سے زائد صفحات اور اُنیس ابواب میں درجنوں عنوانات پر جو مضامین ہیں، ان کی تعریف مختصراً ممکن نہیں کہ یہ تفصیل سے پڑھنے کی شے ہیں۔ شیخ الحدیث مفتی عبدالحلیم قادری نے درست تحریر کیا کہ ''قرآن نمبر کے مطالعے اور مضامین کے انتخاب کو دیکھتے ہوئے دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کی کاوش قبول فرمائے۔'' یہی تاثرات مفتی اسلم نعیمی، خواجہ رضی حیدر، تاجدار عادل، پروفیسر ڈاکٹر وقار رضوی، پروفیسر خیال آفاقی، اقبال عالم، خورشید احمد اور دیگر کے ہیں۔

''جہانِ حمد'' کے ''قرآن نمبر'' سے قبل بھی متعدد رسائل و جرائد اور طباعتی و اشاعتی اداروں نے اس نوع کی خصوصی اشاعتیں مرتب کی ہیں لیکن زیرِ نظر ''قرآن نمبر'' کا خاصہ یہ ہے کہ طاہر سلطانی صاحب نے موضوعات کا چناؤ بڑی دل جمعی اور دل چسپی سے کیا ہے۔ اوراق پلٹیں اور مطالعہ شروع کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ معلومات کا ایک جہاں آپ کا منتظر ہے۔ موضوعات اور عنوانات کی تفصیل ہی دیکھ لیجیے:

تفسیر کے معنی اور اس کی تحقیق (مفتی احمد یار خان نعیمی) اردو کا نثری دینی ادب اور قرآنی تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نقشبندی)، قرآن کریم میمنی ترجمے تفسیر کے ساتھ (کھتری عصمت علی پٹیل)، وجہ تالیفِ تفسیر روح البیان (مولانا اسماعیل حقی)، سبب ترجمہ تفسیرِ روح البیان (مولانا فیض احمد اویسی)، متاخرین کی چند تفسیریں (مفتی تقی عثمانی)، علم القرآن تفسیر کا تاریخی ارتقا (ڈاکٹر وقار احمد رضوی)، چند تفاسیرِ قرآن کا تعارف (ڈاکٹر شمس جیلانی)، قرآنِ کریم کی سائنسی تفسیر (مولانا اُسید الحق)، سائنسی موضوعات اور قرآنِ کریم کے انکشافات (ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری)، قرآن اور سائنسی علوم (رفاقت قادری)، قرآن اور کمپیوٹر (طاہرہ گلزار)، تدوینِ قرآن (مفتی عبدالواحد مسافر)، جمع قرآن کے ادوار (مولانا قاری شریف احمد)، فضائلِ قرآن (جسٹس پیر کرم شاہ الازہری)، فضائل آدابِ قرآن (علامہ شہزاد مجددی)، قرآن کریم: فضائل اور

محاسن (علامہ غلام مصطفیٰ مجددی)، علوم قرآن کی نوعیت (علامہ عبدالعزیز عرفی)، قرآن حکیم میں فضائلِ نماز اور اعانتِ مستحقین (طاہر سلطانی)، آیاتِ محکمات اور متشابہات (مفتی عبدالواجد قادری)، قرآنِ کریم اور اصل توریت کی تعلیمات میں مشابہت (علامہ نور بخش توکلی)، قرآن مجید کا طرزِ استدلال (ملک غلام مرتضیٰ)، روزہ اور قرآن (سید مناظر احسن گیلانی)، قرآن اور احادیث کی روشنی میں نکاح کا بیان (مولانا حکیم امجد علی اعظمی رضوی)، قرآنِ کریم میں طلاق کے مسائل، قرآنی آیات اور جادو (مولانا ابرار عالم)، قرآنی افکار کے اثرات پاکستانی زبانوں کے لوک گیتوں پر (احسان اللہ طاہر)، قرآن حکیم اور آزادی (حکیم محمد سعید شہید)، ۱۵۰ عجائبِ قرآن، غرائبِ قرآن (شاعر علی شاعر)، تذکرہ والقرا اکرام (علامہ محبت خان کوہاٹی، مشتاق احمد بالاکوٹی)، خطاطانِ قرآن کریم (انور حسین نفیس رقم)، قرآن کریم کے حیرت انگیز انکشافات (ڈاکٹر محمد اطہر اشرف)، قرآنی دلائل سے ایصالِ ثواب کا شرعی طریقہ (علامہ صالح حنفی)، قرآن نمبروں کا مختصر جائزہ (پروفیسر محمد اقبال جاوید)، مدحتِ قرآن پر ایک نظر (طاہر سلطانی)، لغات القرآن (علامہ قاری احمد)، الذنب فی القرآن (علامہ شاہ حسین گردیزی)، شعری ذوق قرآنی نقطۂ نظر (پروفیسر محمد اقبال جاوید)، صاحب قرآن کے محامد ومحاسن (شہزاد احمد)، مدحتِ قرآن (ایک سو ایک شعرا کا نذرانۂ عقیدت)، یہ معدودے چند عنوانات ہیں۔ اصل تفصیل تو مزید کئی صفحات پر محیط ہے اور ان کے مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔

مضامین کا چناؤ اور تنوع پڑھنے والے کی دل چسپی کو کم نہیں ہونے دیتا بلکہ سادہ اور عام فہم انداز کی تحریریں اپنے انتصار مگر جامعیت کے ساتھ قاری کے ذوقِ مطالعہ کو مزید مہمیز کردیتی ہیں، اس لیے بھی کہ محترم طاہر سلطانی نے اپنی عرق ریزی، جاں فشانی اور دل جمعی کے ساتھ درجنوں عنوانات پر خوب صورت تحریریں جمع کر کے ایسی قابلِ قدر دستاویز مرتب کردی ہے جو علمی حلقوں میں شان دار پذیرائی حاصل کرے گی۔ خواجہ رضی حیدر نے درست تحریر کیا کہ ”اس نمبر میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم کے حوالے سے کوئی موضوع رہ نہ جائے، بلکہ نئے موضوعات بھی قائم کیے گئے ہیں جس کے بعد یہ نمبر گراں قدر علمی سرمایے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔“

یہ واقعی بڑا کام ہے جسے طاہر سلطانی نے نہایت مستحسن انداز میں پیش کیا ہے۔

○○○

خطوط

خطوط و آرا

محمد احمد سبزواری ——————————— کراچی

عزیزہ سلمہا
دعائیں

بظاہر ایک قاری کا کسی مدیرہ کو 'عزیزہ سلمہا' سے مخاطب کرنا خاصا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن ۹۸ پلس کی ایسی لغزش سے صرفِ نظر ہی کیا جانا بہتر ہے۔

''اسالیب-۳'' ملا، ادب نوازی کا شکریہ۔ مجھے احساس ہے کہ اعلیٰ اور معیاری جریدے کے لیے مواد جمع کرنے کے لیے کن مشکل مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ پھر یہ عمل تو مسلسل ہے۔ سینئر اور جونیئر قلم کاروں کو اس خوب صورتی سے یک جا کرنا بھی بذاتِ خود ایک ادبی کارنامہ ہے۔ فی الحال میں نے اداریہ اور حضرت سحر انصاری کی نعت اور بھائی اسد محمد خاں کا افسانہ دیکھا، سب خاصے کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

ادب کا سماجی مصرف ایک نیا اندازِ فکر ہے۔ امن کے تصور کی اہمیت اور ضرورت جتنی آج ہے، اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دونوں عظیم جنگوں میں جو ہلاکتیں ہوئیں، وہ ایک مقصد کے تحت تھیں۔ یہ بات الگ ہے کہ مقصد اچھا تھا یا برا۔ آج کی زیادہ تر ہلاکتیں بلامقصد ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ امن کے مدعیوں نے دستانے پہن کر اپنے لہو زدہ ہاتھوں کو چھپا لیا ہے۔ امن کے یہ دعوے دار ہی سب سے بڑے امن شکن ہیں۔

میں آج کل برصغیر میں اردو کی داغ بیل کے ڈانڈے اٹھارویں صدی سے ملانے کی تگ و دو میں ہوں۔ پھر ہی ''اسالیب'' کے سال نامے میں شرکت کی کوشش کروں گا۔ حضرت سحر انصاری کی خدمت میں سلام، کامیابی کے لیے پُرخلوص دعائیں۔ ہم فقیروں کے پاس دعاؤں

کے سوا رکھا گیا ہے۔

انور سدید ——————————— لاہور

خوشی کی بات یہ ہے کہ ''اسالیب'' نے تین پرچے معینہ وقت پر شائع کر دیے۔ اس پابندی اور وضع داری پر برصغیر کے کئی نامور ادیبوں نے مسرت کا اظہار کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ ''اسالیب'' ایک زندہ ادبی پرچہ نظر آتا ہے، جو ماضی کی روایات کا احترام کرتا ہے اور مستقبل کو رجائیت آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ''اسالیب'' اختلاف کو قبول کرتا ہے اور تحسین سخن شناسی میں بھی پیش پیش ہے۔ پروفیسر سحر انصاری بے حد معنی خیز انداز میں شعرا کا تعارف اس انداز میں کراتے ہیں کہ ان کے فن کے داخلی اوصاف سطح پر ابھر آتے ہیں۔ تعارف کے ساتھ شاعر کی زیادہ غزلوں کی اشاعت تفہیم میں بڑی معاونت کرتی ہے۔ میں نے خالد معین صاحب کی غزلوں کو سحر انصاری صاحب کے تجزیے کی روشنی میں پڑھا تو ان کی انفرادیت، تازگی اور نکتہ آرائی کی داد دی۔ ان دنوں اکثر لوگ غزل کی یکسانیت کی شکایت کرتے ہیں۔ بیشتر شعرا چھوٹی بحر کا استعمال فراوانی سے کر رہے ہیں۔ حمیرا رحمان کے ہاں بحر کے زیادہ ارکان سے استفادے کا رجحان نمایاں نظر آیا۔ الفاظ کے انتخاب میں تجدد کی دل آویزی نظر نہ بھی آئے تو حمیرا رحمان نے ان کی ترتیبِ نو سے مضمون آفرینی اور نکتہ آرائی کا حق ادا کر دیا ہے۔

میں نے مقالہ ''راشد کا داستانوی اسلوب'' خصوصی دل چسپی سے پڑھا۔ اس موضوع پر شاید یہ پہلا مقالہ ہے۔ میراجی جب نظم کا تجزیہ کرتے تھے تو پہلے نظم کے باطن سے ''کہانی'' تلاش کرتے اور پھر اس کی معنویت کو روشن کرتے تھے۔ لیکن راشد داستان کے اسلوب میں نظم کہتے ہیں اور پھر اسی کے حوالے سے اپنی معنویت بیدار کرتے ہیں۔ میں اس دریافتِ نو پر جو راشد کی نظموں کے حوالے سے اپنا اعتبار خود قائم کرتی ہے، مصنفہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

میں نے اردو کے ممتاز ادیب عزیز احمد کے ساتھ کچھ وقت گزارا اور ان کے ناول اور افسانے پر سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی۔ ماضی کے بہت سے نامور ادیبوں سے نئی نسل شناسا نہیں۔ آپ نے غلام عباس پر ایک خوب صورت گوشہ شائع کر کے انھیں یاد کرنے اور نئی نسل سے ان کی شناسائی پیدا کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ ممتاز احمد خاں (مدیر ''قومی زبان'' کراچی) نے مجھے بتایا ہے کہ وہ ہر شمارے میں کسی بڑے ادیب پر، جو مرحوم ہو چکے ہیں اور اب نظروں سے اوجھل بھی، ہر ماہ مضامین شائع کریں گے۔ اس یادنگاری میں ''اسالیب'' بھی شامل ہے۔ یہ بڑی

خوشی کی بات ہے۔ عزیز احمد پر مضمون اس سلسلے کی کڑی قرار دی جاسکتی ہے۔

اقبال مجید صاحب نے ''اسالیب'' میں چند شائع شدہ تحریروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات شاید نظر انداز کردی ہے کہ دونوں ملکوں نے ڈاک کی شرح اتنی بڑھا دی ہے کہ اب رسائل کا تبادلہ ممکن نہیں رہا۔ میں ہندوستان کے اردو ادب سے بالکل کٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اسی طرح ہندوستان کے ادیبوں کی پاکستانی ادب تک افراط سے رسائی ممکن نہیں۔ ہندوستان کے رسائل میں چھپے ہوئے اچھے مضامین اگر پاکستان میں بھی چھپ جائیں تو یہ قطعاً صحافت کے خلاف نہیں ہوگا۔ زبیر رضوی صاحب اپنے رسالے ''ذہنِ جدید'' میں پاکستانی مضامین سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں انھوں نے ایک شمارہ پاکستانی خواتین کے مطبوعہ افسانوں کے لیے مختص کیا تھا۔ درخواست ہے کہ آپ بھی اس پابندی کو قبول نہ کریں۔ اور اقبال مجید، عبدالصمد، نثار احمد صدیقی، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، سکندر احمد، جوگندر پال، ترنم ریاض، شمیم حنفی، ارمان نجمی اور ڈاکٹر مشتاق اعظمی صاحب جیسے ادیبوں کی تخلیقات سے اپنے قارئین کو محروم نہ رکھیں۔ اردو زبان کو فروغ اور وسعت دینے کے لیے ضروری ہے کہ رسائل اور تخلیقات کا رابطہ ادیبوں سے قائم رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ''قومی زبان'' کراچی نے کچھ وقت ''غیر ملکی کتابوں کے ساتھ'' کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اظہر جاوید اپنے رسالہ ''تخلیق'' میں غیر ملکی کتابوں پر تفصیلی تبصرے چھاپتے ہیں۔ اور یہ سلسلے پسند کیے جا رہے ہیں۔

اسد محمد خاں ———————— کراچی

کئی ماہ سے اپنے آنجہانی دوست، ہندی کے بڑے شاعر سرویشور دیال سکسینہ کے دو شعری مجموعوں کو اردو میں ترجمہ کر رہا تھا۔ ایک کتاب ''جنگل کا درد'' سے چالیس نظمیں لی ہیں۔ پوری کتاب میں کوئی پینتالیس، چھیالیس نظمیں ہوں گی۔ پانچ، چھ نظمیں میں نے اس لیے چھوڑ دی ہیں کہ مجھے اردو میں ان کی مناسبت (relevance) زیادہ اہم نظر نہیں آئی۔

فی الوقت سترہ مختصر نظمیں بھیج رہا ہوں۔ ترتیب وہی رکھی ہے جو ''جنگل کا درد'' میں ہے۔ نہ معلوم کیوں، میں اس ترتیب سے زیادہ خوش نہیں ہوں۔ یہاں شاید ''قدرے طویل'' نظم سے آغاز نہیں ہوا ہے۔ بہر حال، مناسب سمجھیں تو آپ ان سترہ کی ترتیب بدل دیں۔

''اسالیب'' شمارہ ۳ کے افسانوں کے شعبے میں اپنے جانے مانے کہانی کاروں سے

ملاقات رہی۔ واہ! بھی خوب لکھ رہے ہیں۔ برادرم رشید امجد اور عزیزہ طاہرہ اقبال کی جو کہانیاں درج ہوئی ہیں، میں نے بار بار پڑھیں۔ رشید امجد صاحب کی کہانی ''سبزۂ زہراب'' اُن متحرک اور زندہ علامتی کہانیوں میں سے ہے، جو رشید صاحب کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔

طاہرہ اقبال کی کہانی ''زندہ انسانوں کا عجائب گھر'' مجھے ایسی کہانیوں میں لگی جو آپ کو نہ صرف آبدیدہ کردے بلکہ دنوں تک سوچ میں ڈال دے۔ طاہرہ اقبال صاحبہ کے موضوعات بہت ہیں، تاہم مجھے اُن کی اس کہانی اور دوسری کہانیوں میں جو بات الجھا لیتی ہے، وہ پچھڑے ہوئے، درماندہ لوگوں کی... خاص طور پر عورتوں کی... اِبتلا کا بیان ہے۔ میں نے ہندی، مراٹھی اور گجراتی زبانوں کے بہت سے ادیبوں میں— اپنے منشی پریم چند کی طرح کا یہ وصف دیکھا ہے کہ وہ ''خطِ غربت سے نیچے'' زندگی بسر کرنے والوں کے بھیانک شب و روز سے کہانی اٹھاتے ہیں اور ہمیں حقائق سے روشناس کرتے ہوئے لرزا دیتے ہیں۔ خاص طور پر مراٹھی کے مردھیکر اور ولاس سارنگ، ہندی کے نرمل ورما وغیرہ۔ اس کہانی ''عجائب گھر'' کا دائرہ مختصر سمجھیے کہ وادیِ کیلاش کے ڈھائی تین ہزار انسانوں (عورتوں) کی ابتلا بیان کی ہے۔ پاکستان میں میڈیا پر اُن چند ہزار عورتوں کا پیش کیا جانا ویسا تو نہیں ہے جیسا ریڈ انڈینز پر لکھی ہزار کتابوں اور دسیوں ہزار کہانیوں میں آتا رہا ہے... اور آ رہا ہے۔ کیا رومینس ہے! اللہ غنی! ہمارے ٹوورازم کے بیان میں اشتہاروں جیسے حوالے نظر آتے ہیں، جو ایک انتہائی رومانی فضا قائم کرتے ہیں۔ طاہرہ بی بی پہلی بار ہمیں اس اشتہاری بیانیے کے عقب میں دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں، جہاں غلاظت، عفونت، بوسیدگی اور کہنگی کی— بہ قول طاہرہ— ''حفاظت'' کی جا رہی ہے۔ اللھم احفظنا

•

کشور ناہید —————————————— اسلام آباد

عزیزی عنبریں! جیتی رہو۔

مجھے نہیں معلوم کہ تم دن کا کتنا حصہ صرف کرتی ہو ''اسالیب'' کو مرتب کرنے پر۔ میں چونکہ خود کئی پرچوں کی مرتب رہی ہوں، اس لیے سمجھ سکتی ہوں کہ کتنا خون پسینا ایک کرتی ہو کہ یہ شمارہ محض شمارہ نہیں۔ تمکین و تہذیب سے مرصع وہ مجلّہ ہے جس میں آج کے جاگتے نامور ڈاکٹر جعفر کے تبصرے کی شکل میں، حمیرا رحمان اور خالد معین کی غزلیں، اسد محمد خاں کا افسانہ اور پھر راشد پر خصوصی گوشہ اتنا پُر اثر ہے کہ میں اس پرچے کے علاوہ کچھ اور پڑھ نہیں سکی ہوں۔

کمال احمد رضوی کا شمزا پر مضمون تقاضا کرتا ہے کہ وہ اتنے سارے مصوروں سے

قریب رہے ہیں، ان پر مضامین لکھ کر ایک مجموعہ بنائیں۔

دو غزلیں اور میری جانب سے ہدیہ کہ شاید یونہی ہم ادب کی خدمت میں تمھارا ہاتھ بٹا سکیں۔

بہت دعائیں اور سحر انصاری کی خدمت میں آداب۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل ——————————— کراچی

''اسالیب'' کا شمارہ ۳ موصول ہوگیا تھا اور اسے بصد اشتیاق بالاستیعاب پڑھ بھی لیا تھا، لیکن اپنے متعدد اسفار میں رہنے اور ان کی وجہ سے بڑھی ہوئی مصروفیات کے باعث بروقت رسید ارسال نہ کر سکا، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ کا تحریر کردہ 'پیش آہنگ' مختصر ہوتا ہے، لیکن جامع اور بہت فکر انگیز اور جس موضوع کا اس کے لیے آپ انتخاب کرتی اور اس پر اپنا زاویہ نظر پیش کرتی ہیں بجائے خود یہ بھی خاصا پُرکشش ہوتا ہے اور پڑھنے پر مجبور بھی کر دیتا ہے، یہ بھی ایک بڑی کامیابی کسی تحریر کی ہو سکتی ہے۔ راشد کے مطالعے کے لیے بھی آپ نے ایک قدرے اچھوتا موضوع منتخب کیا اور حق بھی ادا کیا۔

سحر انصاری صاحب کے مطالعات بے حد جاذبِ توجہ ہوتے ہیں۔ تمیرا رحمان اور خالد معین کا انتخاب بھی دل نشیں ہے۔ ''اسالیب'' کے خصوصی مطالعات اور اس کا خصوصی گوشہ بہت معیار ہوتے ہیں اور ایک اہتمام ان کے لیے نظر آتا ہے، جس کے باعث ایک انفرادیت ان میں موجود ہوتی ہے۔ یہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے رسالہ محفوظ رکھا جائے اور بطور حوالہ یہ گوشے استعمال ہوتے رہیں۔ نظم و نثر کی تخلیقات اور مضامین سب ہی پُرکشش اور پُرمغز ہیں۔ واقعتاً سارا رسالہ ہی پڑھنے کے لیے ہوتا ہے۔

شہاب صفدر ——————————— راولپنڈی

اسد محمد خاں، رشید امجد، نجم الحسن رضوی، سلطان جمیل نسیم اور طاہرہ اقبال کے افسانے دل چسپ اور متنوع ہیں۔ اسد محمد خاں کے افسانے میں قصے کی تفصیلات غیر ضروری ہرگز نہیں، تاہم طوالت کا باعث بن گئی ہیں۔ آخر میں ایک دم کہانی کا ختم کرنا بھی تھوڑا سا غیر روایتی ہے۔ ہو سکتا ہے انھیں خود طوالت کا احساس ہونے لگا ہو، جس کی وجہ سے ایسا انجام سامنے آیا مگر میری ناقص

رائے میں یہ منطقی نہیں تھا۔ زبان اور اسلوب اتنا جان دار تھا کہ کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔

سرشار صدیقی، آفتاب اقبال شمیم، زبیر رضوی کی نظمیں بھی خوب ہیں مگر فہیم شناس کاظمی کا نتیجہ فکر ''ساحلوں کو بھول جاؤ'' اپنے اندر زیادہ کشش کا جواز چھپائے ہوئے ہے۔ سمندر کی قربت نے انھیں ''نیلے گہرے سرد پانی'' کے اسرار لفظوں میں سمونے کا ہنر بخش دیا ہے۔ رسا چغتائی، ظفر اقبال، انور مسعود، انور شعور، سحر انصاری، عباس رضوی، صابر ظفر، خوشبیر سنگھ شاد، سعود عثمانی اور خالدہ عظمیٰ کی غزلیں پڑھ کر لطف آیا۔ زیادہ مزا حمیرا رحمان اور خالد معین کے انفرادی مطالعوں نے دیا۔ مبین مرزا ایک سنجیدہ فکر شاعر، ادیب اور نقاد ہیں، مجھے اُن کی مدلل بحث نے ہمیشہ تحریک دی ہے کہ مسائل کو باریک بینی سے دیکھنا کتنا ضروری ہے۔ جب ظفر اقبال جیسے سینئر لکھنے والے سرسری انداز میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین کریں، پریشانی ہوتی ہے۔ خالدہ حسین نے شبنم شکیل صاحبہ کی شعری قلمرو کی خوب سیاحت کی اور کرائی ہے۔

راشد کا خصوصی گوشہ پرانی اور نئی تحریروں سے بھرا پُرا محسوس ہوا۔ خطوط کا حصہ اگر ذات اور انا سے بلند ہو کر مشمولہ فن پاروں کو میزان نقد و نظر پر تولنے کا موقع عطا کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں، یہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا۔ مدیر اگر یہاں تھوڑا سا بھی تساہل دکھاتا ہے تو معاملہ پھر ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اقبال مجید، زبیر رضوی جیسے احباب کے والا ناموں سے امید بندھتی ہے کہ آئندہ یہ محفل خوب جمے گی۔

میں ''اسالیب'' کی مجموعی شکل وصورت، طباعت و پیش کش سے بھی بہت خوش ہوا۔ کتابت کی غلطیاں کم ہیں، تاہم ص ۱۹۲ پر کمال احمد رضوی کے خاکہ نما مضمون میں ''وہ وہاں اسپتال میں نرسنگ کے کام پر معمور ہو گئے'' پڑھ کر حیرت ہوئی۔ معلوم نہیں ''مامور'' کیسے ''معمور لکھا گیا''۔ عنبریں بہن! اللہ آپ کی توفیقات میں اضافہ کرے، تاکہ یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

محمد حامد سراج ——————————— میانوالی

محترمہ عنبریں حسیب عنبر صاحبہ!

آپ پر رب کریم کی رحمت بے کنار!

''اسالیب۔۴'' اپنی تمام تر رعنائی، معنویت اور دانش سمیت میرے مطالعے کی میز پر

ہے۔ آج نمازِ فجر کے بعد مطالعہ مکمل کیا۔ ایسا وقت جب میرے صحن میں لگے دریک، کھجور اور سکھ چین کے درختوں میں پرندے سورج نکلنے سے پہلے اپنی میٹھی اور سریلی آواز میں اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ بہت کم — جی بہت کم ادبی جرائد ایسے ہوتے ہیں جن کا ایک ایک حرف مطالعہ اور توجہ مانگتا ہے۔ ''اسالیب'' کا شمار ان ہی جرائد میں ہوتا ہے۔ عزم بہزاد گزر گئے۔ اللہ کریم انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

میں عمر کے رستے میں چپ چاپ بکھر جاتا
اک دن بھی اگر اپنی تنہائی سے ڈر جاتا
کل سامنے منزل تھی، پیچھے میری آوازیں
چلتا تو بچھڑ جاتا، رُکتا تو سفر جاتا

مجلت میں آپ نے عزم بہزاد پر جو گوشہ ترتیب دیا ہے، کمی اس میں بھی نہیں ہے۔ آپ نے ''عزم بہزاد — ساعتِ گفتگو اب نہیں آئے گی'' لکھ کر نہ صرف اپنے درد کو زبان دی ہے بلکہ ادب کے ساتھ اپنی سنجیدہ وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔ رفتگاں پر اب بہت کم جرائد دکھ کو زبان دیتے ہیں۔ مبین مرزا نے ''اس جلتے بجھتے ملال میں'' بہت خوب صورت انداز میں درد بانٹا ہے۔

افسانوں میں منشا یاد کا ''واپسی'' اور طاہر نقوی کا ''اکیلا'' بہت شان دار، کاٹ دار اور دل میں اتر جانے والے افسانے ہیں۔ اخلاق احمد کا افسانہ ''فسانہ ختم ہوتا ہے'' اس شمارے کا حاصل ہے۔ craft اور readibility کی خوبی اپنی جگہ، اخلاق احمد نے افسانے کو اتنا عمدہ تراشا ہے کہ جی سرشار ہو گیا۔ افسانہ پڑھ کے من میں ایک دھنک سی اتری ہوئی ہے۔

رضی مجتبیٰ پر خصوصی مطالعہ اور جوش ملیح آبادی پر خصوصی گوشہ ''اسالیب'' کی سنجیدہ ادبی commitment کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے، بلکہ ادب کے متین قاری کے لیے خوشی کا ایک دریچہ ہے۔ ادب کے زوال پر ظفر اقبال اور امجد طفیل کے مباحث نے کئی سوالوں کو جنم دیا ہے۔ اگر اردو ادب میں کوئی جینوئن نقاد ہے تو اس پر کھل کر بات کرے تا کہ ڈسکورس قائم ہو اور ابر آلود مطلع کی اس جانب کا شفاف منظر دیکھنے میں آسانی ہو۔

نیری سے آپ کی بات چیت نے بہت لطف دیا۔ ان کا کہنا کہ آج ہم نے بنیان نہیں پہنی ہوئی، اس لیے کم زور نظر آ رہے ہیں۔'' میں بے اختیار مسکرا دیا۔ کالج کے زمانے میں یاد ہے، میں نے وحید مراد، ندیم اور محمد علی کی کوئی فلم چھوڑی ہو تو چھوڑی ہو۔ آپ نے ''اسالیب''

میں فلم کو شامل کر کے فن کی قدر دانی کا ثبوت دیا ہے۔ عرفان احمد کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے وحید مراد پر ''کبھی بھی نہ بھلا سکو گے'' جیسا عمدہ اور شان دار مضمون لکھا۔

مکتوباتی حصے میں مشاہیر ادبا کے مکتوب دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ہمارا جریدہ سنجیدہ ادبی حلقوں میں اپنا آپ منوا چکا ہے۔ ماشاء اللہ، نظر نہ لگے۔

سحر انصاری صاحب کی خدمت میں سلام۔

○○○

میر، ن م راشد، میراجی اور فیض کے فکر و فن کے مطالعات، چار گراں قدر تنقیدی دستاویزات

میر تقی میر

(میر شناسی: منتخب مضامین)

مرتبین: ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ن م راشد

(راشد صدی: منتخب مضامین)

مرتبین: پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر ضیاء الحسن

میراجی

(میراجی صدی: منتخب مضامین)

مرتبین: ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر عابد سیال

فیض احمد فیض

(فیض صدی: منتخب مضامین)

مرتبین: پروفیسر یوسف حسن، ڈاکٹر روش ندیم

ناشر: مقتدرہ قومی زبان

H-8/4، اسلام آباد، پاکستان

اردو ہماری قومی زبان اور ہماری تہذیب کی زندہ علامت ہے۔
اس کی بقا اور فروغ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

آپ بھی اردو پڑھیے، اردو لکھیے اور اردو کے فروغ میں
اپنا کردار ادا کیجیے۔

آیئے عہد کریں کہ آئندہ ہم سب اردو کے رسائل اور کتابیں
خرید کر پڑھیں گے۔

احمد عمر شریف	احمد رضا احمدی	احفاظ الرحمٰن	اختر رضا سلیمی
اخلاق احمد	اسد محمد خاں	اسلم انصاری	اقبال مجید
افتخار عارف	اکرام بریلوی	البیئر کامیو	امجد اسلام امجد
امر جلیل	امر لعل ہنگورانی	انتون چیخوف	آصف رضا
آصف فرخی	انور سدید	انور شعور	آمنہ عالم
باصر سلطان کاظمی	باقر نقوی	تا کا ہاشی شنکیچی	توقیر تقی
ثروت زہرا	جاوید منظر	جلیل عالی	جمال میر صادقی
جیمز جوئس	حارث خلیق	حمیدہ شاہین	خالد معین
خلیل اللہ فاروقی	رخسانہ صبا	رسا چغتائی	رشید امجد
رضی مجتبیٰ	رئیس فاطمہ	رفیع الدین	رفیق احمد نقش
زبیر رضوی	سحر انصاری	سجاد بلوچ	سرشار صدیقی
سلمیٰ اعوان	سلیم صدیقی	سلیم کوثر	سیمرا نقوی
سریشور دیال سکسینہ	سید حسیب احمد	سید رضی محمد	سید سعید نقوی
سید کاشف رضا	شاہین مفتی	شاہدہ تبسم	شبنم شکیل
شبیر نازش	شرلی جیکسن	شکیل جاذب	شمشیر حیدر
شہاب صفدر	شہناز نور	صابر وسیم	صبیحہ صبا
طاہرہ اقبال	عباس رضوی	عدیل انصاری	عطاء الرحمٰن قاضی
علی یاسر	عنبرین حسیب عنبر	فاطمہ حسن	فراست رضوی
فہیم شناس کاظمی	فوقیہ مشتاق	فیصل عظیم	کامی شاہ
کرن سنگھ	کمار پرساد مکھرجی	گنٹر گراس	لیڈی کاسا
ماجد خلیل	ماہور احمدی	مبین مرزا	محمد احمد سبزواری
محمد حامد سراج	محمد حمید شاہد	محمود شام	معین نظامی
مشرف عالم ذوقی	ملکہ نسیم	نزار توفیق قبانی	نسیم نازش
نصرت مسعود	نعیم صبا	ن م دانش	نیلم احمد بشیر
والٹیئر	وائی زیڈ چن	یاسمین حمید	یحییٰ خان یوسف زئی
یونس جاوید			